ہندستانی ادب
حیدرآباد دکن

تقدیس جمال

برسات کی رنگین فضاؤں میں چلا میں ... مستانہ وہ مے ریز ہواؤں میں چلا میں

کچھ جھومتا مخمور جوانی کے سہارے ... پہنچا جو دم صبح میں گنگا کے کنارے

مے بار نگاہوں نے مری چاند کا ٹکڑا ... سایہ میں درختوں میں چمکتا ہوا دیکھا

مشرق سے نکلتی ہوئی سورج کی شعاعیں ... رک رک کے حسیں چہرہ کی لیتی ہیں بلائیں

اٹھلائی ہوئی چال تھی ممنون جوانی ... دریا کی روانی بھی ہوئی شرم سے پانی

ماتھے پہ وہ قشقہ کا دل افروز نظارا ... جیسے کہ شب ماہ میں چمکے کوئی تارا

اک سبز سی ساڑی میں گلابی سا وہ مکھڑا ... نوخیز مہکتا ہوا جیسے کوئی غنچا

آنچل تھا جدا سر سے پریشان تھے گیسو ... پیغام جنوں دیتی تھی عریانی بازو

تھے محو خیالوں میں جہاں تھی وہ جدھر تھی

موجودگی غیر کی مطلق نہ خبر تھی

دریا پہ جو پہنچی نئے فتنوں کو جگایا ... چلو میں چمکتے ہوئے پانی کو اٹھایا

منتر سے تھے کچھ لب پہ نظر جانب خورشید ... جیسے کسی اوتار کے آنے کی ہو امید

گردن کبھی خم کرتی تھی رقصاں تھی کبھی وہ ... واقف نہ تھی آداب پرستش سے ابھی وہ

دوشیزہ وہ دریا پہ بھی تصویر حیا تھی ... بکھری ہوئی زلفوں کو لیے صرف دعا تھی

جذبات تعشق نے بصد شوق دکھایا

سوئی ہوئی دنیائے محبت کو جگایا

ارمانوں کی دنیا لیے سینہ میں بڑھا میں ... اس حسن مکمل کے قریں آ ہی گیا میں

دل تھامے ہوئے میں نے کہا حسن کی دیوی ... پوجا کی ضرورت لب دریا تجھے کیا تھی

کیوں پیش بتاں خم نگہ ناز کیے ہے

تو خود مے خوبی ہے پرستش کے لیے ہے

تقدیس کی دنیا سے الگ ہو کے وہ بولی ... پھر نیچی نگاہوں سے مجھے دیکھ کے بولی

تخلیق کا اپنی تمہیں احساس نہیں ہے ... بندے ہو عبادت کا مگر پاس نہیں ہے

ہر ذرہ ہے خورشید کی تابش سے منور ... ہے بندگی خالق کل فرض جہاں پر

دنیا کی ہر اک چیز ہے جب پرتو باری ... ہر شے کی ہے تقدیس نگاہوں میں ہماری

تم بھی تو صباحت کی ملاحت کی ہو تصویر ... تم میں بھی تو صورت گر عالم کی ہے تنویر

آؤ کہ عقیدت کی نگاہوں سے میں دیکھوں

معصوم محبت کی نگاہوں سے میں دیکھوں

خضر القادری

جملہ سوالات کا صرف ایک جواب

"پھول" حقیقتاً ہندستان کی وہ سب سے پہلی تصویر ہے جس میں درگا کھوٹے۔ وینا۔ ستارا۔ ثریا۔ زلو۔ پرتھوی راج۔ مظہر خاں۔ یعقوب۔ ایم اسمٰعیل واسطی۔ مجید۔ اشرف خاں جیسے بڑے ہر دلعزیز اور کہنہ مشق آرٹسٹ یہاں جلوہ گر ہو رہے ہیں "پھول" کی کہانی اور مکالمے اور گانے ایک دو نہیں بلکہ پانچ پانچ چوٹی کے لکھنے والوں کی دماغی کاوشوں کا زریں پھل ہے اور اس تصویر کی میوزک ماسٹر غلام حیدر کی فنکارانہ صلاحیتوں کا مظہر ہے اسے ماسٹر کے آصف مسٹر کے عبداللہ کے پروڈکشن میں ڈائرکٹ کر رہے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں جوان سال دل و دماغ "پھول" پیش کر کے آپ کے دل و دماغ کو معطر بنائیں گے۔

تعارف

لفظ تعارف ایک عام لفظ ہے مگر کسی زندہ دل آدمی کے خفیہ خوابیدہ جذبات کو بیدار کرنے کے لیے نہایت موزوں ہے۔ لوگوں کی بہت بڑی تعداد اس لفظ کو نظر انداز کر دیتی اور اس کی قیمت ان کے دلوں میں فقط اتنی ہی ہوتی ہے کہ تعارف کا لفظ صرف ملاقات کے وقت نام پتہ اور شغل پوچھنے کے لیے امداد دیتا ہے اور جب تعارف ہو جاتا ہے تو چند گھڑیوں کے بعد فوری طور پر پہلے تعارف کا اثر زائل ہونے لگتا ہے حتیٰ کہ دوسرے دن تک نام بھی بھول جاتا ہے لیکن شاید بہت لوگ اس لفظ کی گہرائیوں میں جانا پسند نہیں کرتے حالانکہ یہی لفظ تعارف بہترین دوست بنانے میں معاون ثابت نہیں ہوتا بلکہ صحیح طریق پر [illegible]

(۱) تعارف سے آپ کے حلقہ احباب میں وسعت ہوتی ہے (۲) تعارف سے آپ کو اپنی قیمت کا صحیح اندازہ لگتا ہے (۳) تعارف سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور احساسات میں پختگی ہوتی ہے (۴) تعارف سے دوست ملتے ہیں اور وہ دوست اداسی کے لمحات کو خوشی میں تبدیل کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں (۵) تعارف سے وسیع دنیا کے لوگوں سے تبادلہ خیالات کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اور کامیابی کی راہیں زیادہ نظر آتی ہیں (۶) تعارف سے آپ کو دنیا کے پردہ اسٹیج پر آنے کا موقع ملتا ہے اور اس طرح آپ اپنے چھپے ہوئے قیمتی جذبات کو دنیا کے آگے پیش کر کے ایک وسیع شہرت حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ (۷) اپنے آپ کو ہر دلعزیز مقبول اور بڑا بنانے کے لیے آپ کا دائرہ احباب جتنا وسیع ہو کم ہے دائرہ احباب وسیع ہونے سے آپ کے ذرائع وسیع ہو جاتے ہیں جن سے بہت سے [illegible] کا راستہ جلد ہو جاتا ہے۔ (۸) اپنے کاروباری معاملات کی صحیح تکمیل کے لیے زیادہ سے زیادہ تجربات اور دوستوں کا ہونا ضروری ہے اس سے زیادہ کامیابی کی امید ہوتی ہے جتنے دوست بہت ہوں۔ (۹) تعارف سے آپ جتنے لوگوں کو اپنا گرویدہ کر لیں گے اسی قدر وہ آپ کی عزت کریں گے۔ اور یہ دوستی دائمی ہو جائے گی (۱۰) دور دراز شہروں کے معزز لوگوں سے تعارف کرنے کا ایک یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ آپ جہاں بھی جائیں ایک بہترین دوست پا سکتے ہیں جو آپ کے [illegible] ساتھ [illegible] ہے اور [illegible] آپ اپنے [illegible] تعارف سے کوئی [illegible] ہے [illegible] کی [illegible] ہے [illegible] شہرت عزت اور کامیابی [illegible]
[illegible]

رجسٹرڈ آصفیہ (۱۸۴)
رجسٹرڈ برطانیہ
ام (۳۴۳۴)
چندہ سالانہ (عہ)

ہندستانی ادب

ایڈیٹر۔ غلام محمد خاں ام۔اے (عثمانیہ)

جلد (۴)	اسفندار ۱۳۵۳ ف	جنوری ۱۹۴۴ء	نمبر (۴)

فہرست مضامین

ہمارے خیالات

ہز اکسلنسی نواب سر صدر اعظم بہادر کے ملاحظہ کیلئے

فضیلت مآب! آج سے تقریباً دو سال پہلے ملک کی دفتری اور سرکاری زبان کے بارے میں آپکے حکم نے سرکاری زبان کے پڑھنے والوں کے دلوں میں امید اور شادکامی کی ایک لہر سی دوڑادی تھی جس صراحت اور وضاحت کے ساتھ آپکا حکم جاری ہوا تھا اس سے تو یہی اندازہ ہو سکتا تھا کہ جس طرح بتایا گیا ہے تین سال کے عرصے میں دفتروں اور سرکاری محکموں کے کاروبار سے ایک غیر اور غیر ضروری زبان کی بدعت کو دور کر کے اس ملک کی سرکاری زبان کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا جائیگا۔

فضیلت مآب! اوروں کی طرح ہم نے بھی یہی امید باندھ رکھی تھی کہ آپکا حکم محکم ثابت ہو کر رہیگا اور ملک کی سرکاری زبان کی پژمردہ رگوں میں زندگی نمو اور ترقی کی لہر دوڑ جائیگی۔ ہم سمجھتے تھے کہ آنجناب کا حکم سرکاری آدھی مردہ زبان کے حق میں مسیحائی کا کام کریگا۔ ہمیں یہ توقع تھی کہ ہر دفتر سے اس بدعت کو آہستہ آہستہ دور کر دیا جائیگا لیکن جناب عالی! آج ہمیں سخت افسوس اور انتہائی مایوسی کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ زبان کی یہ بدقسمتی ہے کہ کسی عہدیدار نے آجتک اس طرف توجہ نہیں کی بلکہ شاید ہم یہ کہیں تو بیجا نہ ہوگا کہ ایک غیر زبان کا رواج اس عرصے میں اور بھی بڑھ گیا۔ فینانس، مال، پولیس، آرائش بلدہ، ترقی، تعمیرات، برقی، ریلوے اور دوسری سرکاری سرکاری ادارے چلے آتے ہیں اسکے علاوہ آپکے حکم کے بعد جن محکموں کا قیام ہوا ہے مثل اسٹیٹ[illegible]، رسد، اغذیہ تحصیل معیشت، نیشنل کارپوریشن وغیرہ وغیرہ انکا دفتری کاروبار پورے کا پورا غیر سرکاری زبان میں ہو رہا ہے۔ پرانے اور نئے محکموں کے عہدیداروں کو سرکار عالی کے اس حکم کا کوئی خیال ہوتا تو ہمیں اس بات کا پکا یقین ہے کہ وہ لازمی طور پر اس پر عمل کرنا شروع کر دیتے۔ انکی اس بے پروائی کو نہ صرف ملک کی بلکہ خاص طور پر ہندستانی زبان اور ادب کی بدقسمتی سمجھنا چاہیے کہ ہمارے ملک کے عہدیدار فرض شناس واقع نہیں ہوئے ہیں ورنہ ہر حالت میں آپکے حکم کی تعمیل کی طرف فوری توجہ کرتے اور اس سرکاری زبان کے پھلنے پھولنے میں اپنی امکانی مدد کرتے۔

کیسی حیرت کا مقام ہے کہ ہندستان کی عام اور یہاں عام زبان یعنی "ہندستانی" کے بجائے خود ہندستانی ہی ظلم کے آسیب چلا رہے ہیں۔ شاید وہ یہ بھول رہے ہیں کہ زبان کی خدمت صرف ادب کی خدمت ہوتی ہے بلکہ ملک و ملت کی خدمت بھی اسکے ذریعے ہوا کرتی ہے اور جو شخص ملک و ملت کا احساس رکھتا ہو اس سے زیادہ فرض شناس اور کون ہو سکتا ہے۔

آخر میں آنجناب سے ہماری یہ درخواست شاید بیجا نہ ہو کہ سرکاری زبان کے حق میں حقیقی مسیحائی کیلئے آپکے ایک ایسے حکم محکم کی ضرورت ہے جس پر ہر محکمہ اور عہدیدار پورا عمل کرے تاکہ ایک مناسب مدت میں ملک کی سرکاری زبان اپنا اصلی مقام حاصل کر سکے۔

آنیوالے نمبر کے بعض خاص مضمون

ہم نے بارہا کہا ہے کہ ہم خود اپنے رسالے کے معیار کے متعلق تعریف کے پل باندھنا پسند نہیں کرتے۔ ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ ہر آنیوالے نمبر کے مضمون پچھلے نمبر کے مضمون سے بہتر ہوں نظم کے حصے کا بھی یہی خیال رکھا جاتا ہے۔ اسکے علاوہ "نذ پاروں" کا مستقل عنوان بھی نہ صرف معیاری بلکہ دلچسپ مفید اور معلومات سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ تبصروں کے بارے میں ہم ہر وقت یا اعلان کرتے آئے ہیں کہ ہندستانی ادب کے صفحے بے لاگ تبصروں کیلئے ہر وقت کھلے ہیں چنانچہ ہر کتاب کے تبصرے میں ہمارا اس دعوے کا ثبوت پورے طور پر موجود رہتا ہے۔ ہندستانی ادب کے بعض ادب نواز اور علم دوست حضرات نے خطوں کے ذریعے ہماری ان خدمتوں کو جن مناسب لفظوں میں سراہا ہے انکے پیش کرنے کا یہ کوئی موقع نہیں۔ اگر ایسی کوئی ضرورت ہو تو موقع محل کا لحاظ کر کے وہ تمام چیزیں ہم منظر عام پر لائیں گے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے کہ ہماری مسلسل یہ کوشش ہے کہ ہمارا ہر آنیوالا نمبر پچھلے نمبر سے بہتر ہو اسکا ثبوت آنیوالے نمبر کے ان چند خاص عنوانوں سے ہوگا:—

(۱) سنہ ہجری (۲) اقبال اور جدید شاعری (۳) ہمارے نوجوان شاعر (۴) مرزا رسوا کی ایک نایاب مثنوی (۵) مصنف کے مسائل (۶)

ان عنوانوں کے علاوہ اگر گنجایش نکل آئے تو بعض اور خاص مضمون بھی آپ کے ملاحظے کے لیے پیش کیے جائیں گے۔

ہندستانی ادب کی قلمی امداد ہر ہندستانی ادیب کا پہلا فرض ہے۔ ایسے کہ ہندستانی زبان اور ادب کی تو ملک میں یہی ایک سچا اور مخلص خدمت گذار ہے ہمیں امید ہے کہ اپنی زبان اور ادب سے محبت رکھنے والا ہر شخص ہماری تحریک سے اتفاق کرے گا۔

افسانا نمبر پچھلے نمبر میں ہم نے یہ اعلان کیا تھا کہ ہندستانی ادب کے ادارے نے "افسانا نمبر" نکالنے سے متعلق طے کر لیا ہے۔ حالانکہ ہندستانی ادب کو جاری ہوئے کافی عرصا گزر چکا لیکن ابتک اسکا کوئی "افسانا نمبر" نہیں نکلا اسکا سبب یہ ہے کہ ہندستانی ادب افسانوں کو پہلے خاص جگہ دینا چاہتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہندستانی ادب شروع ہی سے افسانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ احتیاط برتا ہے ہم نے کبھی اس کا خیال تک نہیں کیا کہ ہمارے رسالے میں افسانوں کی تعداد ہمیشہ کم رہتی ہے اس سلسلے میں ہندستانی ادب کے بعض پڑھنے والوں کا اکثر یہ تقاضا رہا کہ افسانوں کی تعداد کو بڑھایا جائے مگر سوال یہ ہے کہ جو چیز حقیقی معنی میں افسانا کہا جاتا ہے وہ اب ہیں کہاں ہے — یہ ایک عام اصول ہے کہ اچھی چیز ہمیشہ کم ہوا کرتی ہے ایسے ہم جو کم تعداد میں افسانے پیش کرتے ہیں وہ خود اچھے ہی ہوا کرتے ہیں اسلیے ہندستانی ادب کے پڑھنے والوں کو تعداد کی کمی کی شکایت نہ ہونی چاہیے۔ اوپر کے واقعات کا لحاظ کرتے ہوئے ہم ادا[illegible]

کیا ہے

ولولے ہیں، نہ صہبا، نہ سرخوشی کیا ہے — یہ زندگی ہے تو پھر مرگِ زندگی کیا ہے

شی بقدرِ تمنا نہ غم بقدرِ طلب — کسے خبر ہے کہ آئینِ زندگی کیا ہے

ہی ہیں خاک کے اجزا اگر برنگِ دگر — چمن فروش نہ ہو گر تو پھر کلی کیا ہے

داس شمع، لہو سرد، شب کا سناٹا — اگر یہ موت نہیں ہے تو بیکسی کیا ہے

رواں ہے جانبِ منزل جو کاروانِ حیات — کوئی بتائے کہ پھر شرحِ گمرہی کیا ہے

حجابِ پردۂ ہستی میں کون ہے آخر — تمہیں بتاؤ یہ انکارِ دلبری کیا ہے

نجات بیمِ فنا سے نہ مل سکی اختر — جو رازِ دہر ہے وہ حسنِ سرمدی کیا ہے

علی اختر

بڑھا کے حوصلہ ناز دلبراں میں نے
بنا دیا ہے محبت کو نوجواں میں نے

الجھ گئی مری آشفتگی میں بزم حیات
ملا دیے ترے گیسو سے دو جہاں میں نے

اب آپ ہی کی جفا آپ کے مقابل ہے
وفا کا یوں ہی دیا تھا نہ امتحاں میں نے

ہجوم اشک میں کچھ بھی نظر نہیں آتا
ڈبو دیا ہے ستاروں میں آسماں میں نے

وہاں وہاں ترے جلووں نے پردہ داری کی
نظر اٹھائی ہے تجھ پر جہاں جہاں میں نے

مری نگاہ نے پردے اٹھا دیے شاید
مکاں میں دیکھ لیا راز لامکاں میں نے

یہ آپ کس لیے مجھ سے بچا رہے ہیں نظر؟
کیا ہے جرم محبت تو مہرباں میں نے

جہاں ہو اس کی تمنا وہیں کرے سجدے
جبیں کو سونپ دیا تیرا آستاں میں نے

گرے گی اس پہ کسی آسماں سے برق فنا
یہی سمجھ کے بنایا تھا آشیاں میں نے

چھپا چھپا کے نگاہوں سے عشق کے آنسو
کیا ہے کتنے ستاروں کو رازداں میں نے

زمیں پہ اس سے سوا کیا ہو احتیاط وفا
اٹھا لیا ہے نگاہوں پہ آسماں میں نے

چھپا لیا کبھی آنکھوں میں حسن کون و مکاں
لٹا دیے کبھی ہاتوں سے دو جہاں میں نے

دکھا کے فصل بہاراں کو اک نظر رکھ دی
گلوں کی جیب میں تصویر باغباں میں نے

یہ کس کے حسن تصور کی شان ہے باقی
نظام عشق میں دیکھی ہیں خامیاں میں نے

عبد القیوم خاں باقی ایم۔ اے (عثمانیہ)

کلیہ ا، جامعہ عثمانیہ

تہذیب اور تمدن کا مفہوم

"تہذیب" کے لفظی معنی پاکیزہ اور صاف کے ہیں۔ چنانچہ
لحاظ سے روزمرہ بول چال میں اس سے مراد پاکیزہ اخلاق،
کردار، شستہ مذاق وغیرہ ہے، اور ایک ایسے شخص کو جس میں
صاف پائے جائیں مہذب کہا جاتا ہے انگریزی زبان میں
کا مرادف کلچر ہے جو ایک لاطینی لفظ کلچرا سے ماخوذ ہے
کے معنی زراعت اور کاشت کے ہیں اور چونکہ کاشت
لیے زمین کو ہل چلا کر اور پاک صاف کر کے کام میں لایا جاتا
غالباً اسی مناسبت سے لفظ کلچر سے مراد بھی پاکیزہ
ق اور تہذیب ہے۔

لفظ "تمدن" کا تعلق بلحاظ ماخذ "مدینہ"
ہے جس کے معنی شہر کے ہیں اور
مناسبت سے تمدن
شہریت کا مفہوم پنہاں
یعنی ایسی حالت جو
ت انسانی میں دیہات کے
ی ماحول کے برعکس شہر کے خود ساختہ اور
نوعی ماحول میں پائی جائے اور جو بدویت یعنی
بانی پن کی ضد ہو۔ انگریزی زبان میں اس کا مرادف
ی لائیزیشن، بھی بلحاظ ماخذ اور مفہوم کم و بیش یہی نوعیت
تا ہے چنانچہ اس کا تعلق بھی ایک لاطینی لفظ "سوس"
ہے جس کے معنی شہری کے ہیں۔

غرض یہ ہے "تہذیب" اور "تمدن" کا عام مفہوم لیکن
ب نہایت تعجب خیز حقیقت ہے کہ انسان کی اجتماعی
کی جن خاص ترقی یافتہ حالتوں کو واضح کرنے کے لیے
نوں لفظ علمی اصطلاح کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں
یں نہ صرف اختلاف بلکہ تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ آج تک
ن علوم عمرانی کسی ایک خاص مفہوم پر متفق نہ ہو سکے اور
کے طور پر یہ ادب اور زبان کی ایک دل چسپ بحث کے
سے نکل کر اصطلاح کا ایک ایسا ناخوش گوار مسئلہ
بن گیا ہے جس سے انسان کی عمرانی زندگی کے بعض حالات
کے مطالعے اور تفہیم میں سوائے ابہام اور پیچیدگی کے کچھ
حاصل نہیں۔

بہرحال ان دونوں لفظوں کے اصطلاحی معنی اور مفہوم
میں جو کچھ اختلاف اور تضاد پایا جاتا ہے اس کو بیان کرنے
سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی عمرانی زندگی
کی اس خاص حالت اور خصوصیت کی مختصر وضاحت کر دی
جائے جس سے ان دونوں اصطلاحوں کا مفہوم وابستہ ہے۔

آپس میں مل جل کر رہنے کی خصوصیت جسے اجتماعی
یا معاشری کہتے ہیں نہ صرف انسانوں میں بلکہ حیوانوں میں
بھی پائی جاتی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ حیوانوں کی اجتماعی
زندگی میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوتی ہمیشہ سے جو ہے وہی
کم و بیش قائم رہتی ہے برخلاف اس کے انسانوں
کی معاشری زندگی میں ہمیشہ تغیر ہوتا
رہتا ہے یعنی حیوان محض
اپنی فطری خصوصیات کے
زیر اثر اپنے کو زندہ اور باقی
رکھنے، غذا حاصل کرنے اور
نسل بڑھانے کے خاص خاص طریقے پر
کاربند رہتا ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا
لیکن انسان اپنی معاشری زندگی کے طریقے کا علم اور
تجربہ رکھتا ہے اور مختلف ذریعوں کو کام میں لا کر اس
میں تبدیلیاں کرتا ہے وہ بہت کچھ دوسروں سے سیکھتا
ہے اور دوسروں کو سکھلاتا بھی ہے اور اس طرح انسان
کی معاشری زندگی کی خصوصیت بالکل فطری نہیں رہتی بلکہ
مصنوعی ہوتی جاتی ہے اس کے ماحول اور طریق زندگی میں
تبدیلی اور ترقی ہوتی رہتی ہے اور اس کے خیالات اور
عمل میں اختلاف اور تغیر ہوتا ہے چنانچہ یہی خصوصیت جو
اس کی معاشرت کو حیوانوں کی معاشرت سے ممیز کرتی ہے

عام طور پر عمرانیات میں تہذیب یا کلچر کہلاتی ہے جو فرد انسان نے فطری دنیا کے مقابلے میں ایک تہذیبی دنیا خود پیدا کرلی ہے جس میں اس نے فطرت اور اپنی ذات پر قابو پانے کے گر سیکھ لیے ہیں۔ بقول پروفیسر ہی۔ ای ایل ووڈ "انسان کی وہ تمام حالتیں جن سے وہ خود اپنے اور فطرت پر قابو پاتا ہے تہذیب میں شامل ہیں۔ چنانچہ ایک طرف تو اس میں وہ تمام مادی چیزیں مثلاً آلات اوزار، اسلحہ، لباس، مکان، مشین، صنعت اور حرفت اور دوسری طرف غیر مادی یا روحانی چیزیں مثلاً زبان ادب، فنون، مذہب، اخلاق قانون اور حکومت شامل ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "تمدن" کا آخر مفہوم کیا ہے؟ معاشری زندگی کی مذکورہ بالا حالت اگر تہذیب کہلاتی ہے تو پھر تمدن کس حالت کو ظاہر کرتا ہے؟ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے جب ہم مختلف علمائے عمرانیات کی تصانیف کی ورق گردانی کرتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو ان دونوں لفظوں کو کم و بیش ایک ہی مفہوم کے لیے استعمال کیا گیا ہے یا اگر ان میں فرق کیا بھی گیا ہے تو وہ بڑی حد تک مبہم اور غیر واضح ہے لیکن حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اکثر علما تہذیب پر بحث کرتے کرتے اکثر اس کی بجائے تمدن کا لفظ استعمال کر جاتے ہیں یا اس کے برعکس تمدن کی تشریح کرتے وقت بسا اوقات تہذیب کا لفظ لکھ جاتے ہیں۔ اور گویا اس طرح تہذیب اور تمدن میں خلط ملط کر دیتے ہیں جس سے نہ تو دونوں لفظوں کا کوئی جداگانہ مفہوم سمجھ میں آتا ہے اور نہ صاف طور پر یہ پتا چلتا ہے کہ دونوں ہم معنی ہیں البتہ تفہیم اور تشریح کا رجحان یہ ضرور بتاتا ہے کہ دونوں مترادف لفظ ہیں۔ تہذیب اور تمدن کے کم و بیش ایک ہی معنی ہیں اور ان دو لفظوں میں کوئی خاص تفریق اور امتیاز دشوار ہے۔ چنانچہ ای۔ بی ٹائیلر ایک انگریز ماہر بشریات لکھتا ہے کہ "تہذیب یا تمدن ایک ایسی حالت ہے جس میں علم، اعتقاد، فن، اخلاق قانون، رسم اور وہ تمام صلاحیتیں اور عادتیں شامل ہیں جو انسان معاشرے کے ایک رکن کی حیثیت سے حاصل کرتا ہے"

لیکن باوجود اس کے بعض فلسفیانہ اور اخلاقی نقطۂ نظر رکھنے والے علما نے تہذیب اور تمدن میں مختلف اسباب کی بنا پر فرق پیدا کیا ہے۔ چنانچہ مشہور جرمن فلسفی کانٹ کے نزدیک تہذیب کے لیے اخلاق کا تصور ضروری ہے یعنی اخلاق ایک داخلی حیثیت ہے اور برخلاف اس کے تمدن ایک خارجی چیز ہے۔ کانٹ کے بعد سے اکثر لوگوں نے اسی قسم کا فرق پیدا کرنے کی کوشش کی مثلاً میتھو آرنلڈ کے نزدیک تہذیب خارجی حالات کی بجائے دماغ اور روح کی ایک داخلی حالت میں کچھ بننے پر مشتمل ہے نہ کہ کچھ حاصل کرنے پر۔ گویا اس لحاظ سے تہذیب کے مقابلے میں تمدن نسبتاً میکانی اور خارجی شے ہے۔ فلسفۂ تاریخ میں اشپنگلر بھی یہی تفریق کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تمدن تہذیب کا ایک ایسا زوالی پہلو ہے جس میں تہذیب اپنی تخلیقی قوت کھو دیتی ہے اور میکانی اور تقلیدی بن جاتی ہے۔ جدید علما میں میک آئیور تہذیب اور تمدن میں ذریعوں اور مقصدوں کے لحاظ سے فرق کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "ہم جو کچھ ہیں وہ ہماری تہذیب ہے اور ہم جو کچھ استعمال کرتے ہیں وہ ہمارا تمدن ہے"۔ بلاشبہ یہ ایک نہایت واضح تفریق ہے جس کی رو سے تمدن میں تمام معاشری تنظیم کی کل اور وہ تمام آلات اور مشنری شامل ہے جس کو انسان اپنی زندگی قابو میں رکھنے کے لیے استعمال کرتا ہے اس کے خلاف تہذیب کا تعلق ذاتی قدر و قیمت اور ان چیزوں سے ہے جن کی خواہش بہ اسے خود کی جاتی ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "تہذیب ہماری طرز زندگی میں ہماری فطرت اور ہمارے روزمرہ باہمی تعلقات میں ہمارے خیالات کا اظہار ہے۔ جو فن، ادب، مذہب تفریح اور مسرت میں پیدا ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر الفرڈ ویبر نے بھی تہذیب اور تمدن میں کچھ اسی قسم کا امتیاز پیدا کیا ہے اس کے نزدیک تمدن کا مسئلہ

فطرت کی طاقتوں پر فنی طور سے قابو پانے اور علم کی ترقی کے لیے لازمی ہے نیز تمدن میں مسلسل ترقی ہوتی ہے اور یہ تمام انسانوں کے لیے ہوتا ہے۔ اس میں ایک قسم کی وحدانیت اور عمومیت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کا تعلق خاص خاص انسانوں کی بجائے تمام انسانوں سے ہوتا ہے اس کے برخلاف تہذیب میں کوئی لازمی تسلسل نہیں پایا جاتا اور اس میں عمومیت، وحدانیت نہیں ہوتی اس کی نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں اور اس کا تعلق خاص خاص انسانوں سے ہوتا ہے۔

تہذیب اور تمدن کے مذکورہ بالا دو مختلف اور جداگانہ مفہوم کے علاوہ یعنی علما کے یہاں ایک متضاد قسم کی تفریق بھی نظر آتی ہے یعنی تمدن کے برعکس تہذیب ہی کی خصوصیت خارجی اور مادی سمجھی جاتی ہے چنانچہ جے۔ ایس ہائیلنڈ نے اپنی مختصر کتاب "تاریخ تمدن" میں تہذیب کو محض مادی خود غرضانہ قرار دیا ہے جو اگرچہ بہت بڑی درست اور علم وفن کی وسعت کو ظاہر کرتا ہے لیکن یہ آزادی اور خدمت کے جوہر سے خالی ہوتی ہے اس کے برخلاف تمدن ایک داخلی اور روحانی چیز ہے جس کا انحصار آزادی اور خدمات کے تصورات کی تعبیر پر ہے جس کی وجہ سے افراد تمام انسانیت کے لیے مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔

بہرحال تہذیب اور تمدن کے دو جداگانہ مفہوم کو مختصر واضح کرنے کے بعد فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر دونوں لفظ ہم معنی نہ سہی لیکن مختلف ہونے کی صورت میں کون سی تفریق زیادہ بہتر قرار دی جاسکتی ہے؟ میرا خیال ہے کہ ہائیلنڈ کی تفریق سے زیادہ بہتر اور مناسب تفریق دوسرے علما کی ہے جس کا ذکر پہلے کیا گیا اس لیے کہ اس تفریق میں بھی جو خوبی نظر آتی ہے وہ یہ کہ روزمرہ بول چال میں ان دونوں لفظوں سے جو عام مفہوم ظاہر ہوتا ہے وہ اس کے بہت ہی قریب ہوتا ہے [illegible] باقی رہتا ہے اور تعلق بھی عام عام استعمال اور اصطلاحی معنی کے اعتبار سے زیادہ فرق اور تضاد باقی نہیں رہتا لہٰذا اعلیٰ طور پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب اور تمدن کو دو مختلف چیزیں سمجھتے ہوئے پہلی شکل ہی کو ایک داخلی اور موضوعی حالت کے لیے اور دوسری کو خارجی اور معروضی حالت کے لیے مخصوص کردیا جائے۔

فخر الحسن ام۔ اے
لکچرار معاشیات جامعہ عثمانیہ

ارادہ

میں شمع ازل کو فروزاں کروں گا
ہر اک انجمن کو درخشاں کروں گا

نگاہ چمن آفریں ڈال کر میں
بیاباں کو رشک گلستاں کروں گا

مجھے شورشوں سے ہے امید تسکیں
سکوں کو مبدل بہ طوفاں کروں گا

گھٹا بن کے چھا جاؤں گا ہر فضا پر
غلامی کی لعنت کو پنہاں کروں گا

اچھلتا ہوا موج گنگ و جمن سا
سر کبر کو نذر طوفاں کروں گا

مچلتا ہوا مثل نغمات رنگیں
جہاں کو مسرت بداماں کروں گا

چمکتا ہوا برق کے پیرہن میں
سواد غریباں کو تاباں کروں گا

چھلکتے ہوئے ساغروں کے جلو میں
جمال حقیقت نمایاں کروں گا

کسی کے نظاروں میں گم ہو کے وحیدی
علاج غم درد پنہاں کروں گا

وحیدی الحسینی (بھوپال)

تقدیس جمال

برسات کی رنگین فضاؤں میں چلا میں
مستانہ وہ مے ریز ہواؤں میں چلا میں

کچھ جھومتا مخمور جوانی کے سہارے
پہنچا جو دم صبح میں گنگا کے کنارے

بے باک نگاہوں نے مری چاند کا ٹکڑا
سایہ میں درختوں میں چمکتا ہوا دیکھا

مشرق سے نکلتی ہوئی سورج کی شعاعیں
رک رک کے حسیں چہرہ کی لیتی ہیں بلائیں

اٹھلاتی ہوئی چال تھی ممنون جوانی
دریا کی روانی بھی ہوئی شرم سے پانی

[illegible] پہ وہ دوشیزہ کا دل افروز نظارا
جیسے کہ شب ماہ میں چمکے کوئی تارا

اک سبز سی ساڑی میں گلابی سا وہ مکھڑا
نوخیز مہکتا ہوا جیسے کوئی غنچا

آنچل تھا جدا سر سے پریشان تھے گیسو
پیغام جنوں دیتی تھی عریانی بازو

تھے محو خیالوں میں جہاں تھی وہ جدھر تھی
موجودگی غیر کی مطلق نہ خبر تھی

دریا پہ جو پہنچی نئے فتنوں کو جگایا
چلو میں چھلکتے ہوئے پانی کو اٹھایا

منتر سے تھے کچھ لب پہ نظر جانب خورشید
جیسے کسی اوتار کے آنے کی ہو امید

گردن کبھی خم کرتی تھی رقصاں تھی کبھی وہ
واقف نہ تھی آداب پرستش سے ابھی وہ

دوشیزہ وہ دریا پہ بھی تصویر حیا تھی
بکھری ہوئی زلفوں کو لیے صرف دعا تھی

جذبات تجسّس نے بصد شوق دکھایا
سوئی ہوئی دنیائے محبت کو جگایا

ارمانوں کی دنیا لیے سینہ میں بڑھا میں
اس حسن مکمل کے قریں آ ہی گیا میں

دل تھامے ہوئے میں نے کہا حسن کی دیوی
پوجا کی ضرورت لب دریا تجھے کیا تھی

کیوں پیش بتاں خم نگہ ناز کیے ہے
تو خود ہی خوبی ہے پرستش کے لیے ہے

تقدیس کی دنیا سے الگ ہو کے وہ بولی
پھر نیچی نگاہوں سے مجھے دیکھ کے لیلی

تخلیق کا اپنی تمہیں احساس نہیں ہے
بندے ہو عبادت کا اگر پاس نہیں ہے

ہر ذرہ ہے خورشید کی تابش سے منور
ہے بندگی خالق کل فرض جہاں پر

دنیا کی ہر اک چیز ہے جب پرتو باری
ہر شے کی ہے تقدیس نگاہوں میں ہماری

تم بھی تو صباحت کی ملاحت کی ہو تصویر
تم میں بھی تو صورت گر عالم کی ہے تنویر

آؤ کہ عقیدت کی نگاہوں سے ہمیں دیکھیں
معصوم محبت کی نگاہوں سے ہمیں دیکھیں

خضر القادری

دیکھیں خوب استعمال کی ہیں، پاہیراں کا استعمال ذرا اچھا نہیں معلوم ہوتا مگر آج کل بانکے نوجوان اس ٹوپی کو بہت استعمال کرنے لگے ہیں خصوصاً تنگ آستینوں کی گھٹنے سے اونچی اور اسپے کالر کی موڑ والی اور سینے پر پینٹنگ کی ہوئی شیروانی، تیس انچ پاینچوں کا ڈھیلا اور ایڑی سے نیچے لٹکتا ہوا پاجامہ، پاؤں میں سینڈل پہن کر ایسی سہانی ٹوپی ترچھی چپکائے ہوئے کنپٹی کے بالوں کو سنوارے، پان کی گل دیتے ہوئے قدم قدم پہ ٹھنے بجاتے، ٹھیرتے، رکتے، جھجکتے لجاتے، شرماتے، مسکراتے جب کوئی نونہال نظر آتا ہے تو بے تحاشا یہ شعر زبان پر آجاتا ہے۔

بلغ میں جاتے ہو پہنے ہو گلابی ٹوپی
بلبل بے ادب آبیٹھے نہ اے جاں سر پر

مشہور ہے کہ کلاہ نمدی اور کلاہ کاغذی ایران میں بہت مستعمل تھی افسوس ہے کہ نمدہ اور کاغذ دونوں اس وقت کمیاب ہیں ورنہ لوگ ان دونوں ٹوپیوں کو شروع کر دیتے خصوصاً کلاہ کاغذی کیا ہی ر[illegible] تھی، ایک زمانے میں جبکہ اشتہار چھپوانے کا رواج نہ تھا اور سٹر ایجاد نہ ہوئے تھے اخبارات کم تھے اور وہ بھی ناٹک کے اشتہار چھاپنے سے پرہیز کرتے تھے تو ناٹک والے چند لونڈوں کو کلاہ کاغذی پہنا کر مضحکہ خیز لباس سے آراستہ کرکے باجے کے ساتھ سڑکوں پر گھماتے تھے تاکہ ناٹک کی تشہیر ہو غالباً ایران میں بھی کلاہ کاغذی ایسے ہی مواقع پر استعمال کی جاتی تھی چنانچہ مشہور ہے کہ کلاہ کاغذی بہر سہرہ کہ فقد فہو المتبول''

قدیم زمانے میں ہر فرقے اور طبقے کا لباس الگ تھا علما کا لباس الگ، امرا کا لباس جدا، عوام کا لباس کچھ خواص کا لباس کچھ، اس طرح لباس اور مخصوص ٹوپیوں سے آدمی کے متعلق بہت سی معلومات ہو جاتی تھیں دور کیوں جائیے دکن میں قدیم زمانے سے پگڑیوں کا رواج تھا، شاہزادہ آصفی مانکیی پگڑی استعمال کرتا تھا امرا کی پگڑیاں الگ الگ تھیں [illegible] الگ سے دستار کا رواج ہوا، شاہزادہ آصفی کی دستار اونچی کلاہ کی بنائی جانے لگی اور امرا نے بھی اپنی اپنی وضع الگ الگ مقرر کرلی چنانچہ آج بھی آپ کسی تقریب میں شاہی عہدہ داروں اور امیروں کو دیکھ کر صاف پہچان سکتے ہیں کہ راجا شام لال، راجا دھرم وقت، بنسی راجا، راجا نرسمہا، نواب شمس الامرا، وقار الامرا، رکن الملک، شاہ یار الدولہ، خانخاناں، وغیرہ وغیرہ کے خاندانوں کی دستاریں الگ الگ ہیں، جمعداران فوج کی دستاریں اور پگڑیاں بھی بالکل جدا وضع کی ہوتی تھیں، عوام کے لیے ان چیزوں کے دیکھنے کا ایک موقع محرم کا لنگر تھا جو اب باقی نہیں رہا البتہ اب بھی سرکاری تقاریب اور دعوتوں میں ان کی بہار نظر آتی ہے مگر عوام اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

منصبداری پگڑی جو آج کل دستار کہلاتی ہے پہلے صرف وہی لوگ استعمال کرسکتے تھے جو منصبدار ہوں دوسروں کی مجال نہ تھی کہ اس پگڑی کا استعمال کرسکیں حضرت غفران مکان کے زمانے میں درباری یونیفارم مقرر ہوا تو عہدہ داروں کے لیے بھی یہی دستار مقرر کی گئی اور حیدرآباد میں قدیم سے یہ دستور ہے کہ بادشاہ ذیجاہ، شہزادگان والا شان اور مدارالمہام وقت کے پاس کوئی شخص بغیر پگڑی باندھے یا دستار پہنے نہیں باریاب ہوسکتا، چند سال ہوئے کہ عدالتوں میں وکیلوں کے لیے بھی دستار مقرر ہوگئی اور ہر شخص دستار پہننے لگا اب تو پیرو کار مختار وغیرہ بھی دستار ہی پہنتے ہیں، سپاہی متصدی صراف، خدمتگار وغیرہ کی پگڑیاں علحدہ علحدہ تھیں جنہیں دیکھ کر آپ پہچان سکتے تھے کہ کس طبقے سے کون ہے مگر اب ٹوپی ایسی سر چڑھ گئی ہے کہ آپ خانگی لباس میں عہدہ دار اور اہلکار اور چپراسی اور فراش کسی میں بھی کوئی تمیز نہیں کرسکتے علما عمامہ مثلاً استعمال کرتے تھے مگر اب وہ بھی نہ رہا سبھوں نے ٹوپی کو سر چڑھا لیا۔ خیر اس حد تک بھی غنیمت تھی مگر اب رہی سہی ٹوپی بھی اتر رہی ہے عام طور پر طلبا اور شوقین نوجوان ٹوپی کے بغیر کھلے سر پھرتے ہیں [illegible]

بنگال سے چلا ہے اور یہاں عام ہو گیا۔ خیر یہ تو تھی ٹوپی کے
متعلق قدرے سنجیدہ گفتگو اب ذرا ان ٹوپی پوشوں کے متعلق بھی
کچھ سنیے جو "وضع شیٔ فی غیر محلہ" یعنی گول خانہ میں چوکھنٹی کا اظہار
کرتے ہیں۔ کبھی چوراہے پر آپ ٹھہر جائیے اور راستے سے
آنے جانے والوں کی ٹوپیوں کا مطالعہ کیجیے تو آپ کو بھانت
بھانت کی صورتیں نظر آئیں گی۔ سیاہ فام پست قد کوتہ گردن
گول پکے جیسا چہرہ مگر سر پر لمبی مصری سرخ رنگ کی ٹوپی بس
ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے کسی نے ہیلے سلاسی کے رعایا یعنی
حبشی کو مصری ٹوپی پہنا دی ہے۔ اس طرح دبلا جسم لمبی گردن
چھپکلی کا سا چہرہ جس پر لاکھوں چیچک کے داغ اور سر پر گول ایرانی
لمبے لمبے بالوں والے چہرے کی ٹوپی!

ہمارے پاس دو موقع ایسے آتے ہیں جہاں مناسبت
کا کبھی خیال نہیں کیا جاتا، ایک موقع شادی کا اور دوسرا ٹوپی کا!
غضب خدا کا میاں چھبیلے جوان گاما پہلوان کی جوڑ مگر بیوی
ٹینی مرغی! اس طرح چہرہ توے جیسا سیاہ اور سر پر پیچ پیچ
ٹوپی گول چہرے پر لمبی ٹوپی لمبے چہرے پر چھوٹی دیوار کی ٹوپی
طباقی چہرے پر کشتی نما ٹوپی، غرض آپ کو سو میں سے بچانوے
ٹوپیاں غیر موزوں نظر آئیں گی۔

آج کل بعض نفیس مزاج لوگوں نے ایک نیا طریقہ
اختیار کیا ہے، شیروانی ٹوپی اور جوتا ایک ہی کپڑے کا بنوایا
جاتا ہے خصوصاً علی گڑھ اور امرتسر کی رنگین دھاری دار اور
چوخانے دار کھادی کے اس قسم کے تھری پیس سوٹ اکثر لوگ
بنوا رہے ہیں۔ بعض لوگوں کو تو یہ بھلا بھی لگتا ہے مگر بعض بالکل
جانگلو بن جاتے ہیں، بعض نفیس مزاج حضرات نے سفید بانا اختیار
کر لیا شیروانی پاجامہ جوتا اب تک سفید پہنتے ہی تھے اب ان
پر سفید ٹوپی کا بھی اضافہ ہو گیا ہے، گویا سراپا رنڈاپا یا از
سرتاپا رنڈوے!!

بعض لوگوں کو مختلف قسم کی ٹوپیوں کا شوق ہوتا
ہے مثلاً کشتی، مصری، مینا ٹوپی، ایرانی ٹوپی، گاندھی ٹوپی [illegible]
سبھوں کو استعمال کرتے ہیں غور کیجیے ایک سر ان سب ٹوپیوں کا
کس طرح متحمل ہو سکتا ہے، بہر صورت ہو کر رہ جاتے ہیں عام
طور پر مصری ٹوپی کے بعد کشتی اور ایرانی ٹوپی کے بعد مینا ٹوپی
کھل جاتی ہے مگر مصری اتار کر ایرانی اور اس کے بعد [illegible]
اچھے خاصے آدمی کو ہوّا بنا دیتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات
کبھی اپنے چہرے کو آئینے میں دیکھنے کی زحمت نہیں گوارا کرتے
یا اگر دیکھتے بھی ہیں تو شاید بکمال انکسار اپنے تئیں خوبصورت
اور جامہ زیب پاتے ہیں:

عجائب خانۂ عالم میں ایک مخلوق ایسی بھی ہے جسے
شیروانی، ٹوپی، جوتا، کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں جو مل گیا
پہن لیا، یہ لوگ سب سے زیادہ مطمئن ہیں نہ تو رنگ کی فکر
نہ وضع کا خیال انھیں کے متعلق تو کہا گیا ہے ؎

درویش صفت باش و کلاہ تتری دار — در عمل کوش و ہرچہ خواہی پوش

پاگل پیرا ہیں، ان میں بعض ذرا آگے بڑھ جاتے ہیں تو اور زیادہ مستغنی
ہو جاتے ہیں۔

بستر ٹاٹ کا دو پارچہ کمبل کی کلاہ، تاج خسروی ہے تخت سلیماں ہے یہی
اس درجے پہ پہنچ کر حیوان ناطق عجائب مخلوقات میں نہیں
رہتا بلکہ مجلس روحانیاں میں پہنچ جاتا ہے۔

مغلائی یا ہندستانی ٹوپیوں کی سرگزشت تو ہو چکی
انگریزی ٹوپیوں کا بھی حال یہی ہے، کسے کا رنگ صورت [illegible]
لاجواب مگر فلٹ ہیٹ سر پر، اسی طرح پاؤں میں چپل جسم پر شیروانی
اور سر پر سن ہیٹ (اس میں راقم الحروف بھی شریک ہے)، بعض تو
اور غضب کرتے ہیں شلوار اور کوٹ [illegible] جبہ بھی پہنی سر پر ہیٹ۔

چونکہ پاگل پن کا تعلق دماغ ہی سے ہے اور دماغ
بجائے ایڑی یا گھٹنے کے سر میں رکھا گیا ہے، اس لیے جو ٹوپی کا
جتنی حرکات بھی ہیں ان کا ظہور بھی سر سے ہوتا ہے مگر [illegible]

بر سر کلاہ و آدم [illegible]

تمکین کاظمی

فرشتہ اور شاعر

(ایک طنزیہ مکالمہ)

پہلا منظر — فضائے آسمانی

(دو فرشتے آپس میں گفتگو کر رہے ہیں)

ایک فرشتہ — میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خدائے بزرگ و برتر نے اس مٹی کے پتلے کو ہم نورانی فرشتوں سے کیوں بڑا بنایا ہے جبکہ اس کی فطرت میں برائیاں اور شرارتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ وہ جب چاہتا ہے زندگی کے اصولوں کو مکڑی کے جالے کی طرح توڑ پھوڑ ڈالتا ہے۔ وہ ذرا بھی دوسرے انسانوں کے دکھ درد کو محسوس نہیں کرتا۔ اور سچ پوچھو تو انسانوں میں اب اپنے بھائیوں سے ہمدردی کرنے کا جذبہ بالکل مفقود ہو چکا ہے۔

دوسرا فرشتہ — میرے دوست تم نے انسان کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس میں بڑی بڑی خوبیاں موجود ہیں اس نے خدائے بزرگ و برتر کی وسیع اور لامحدود دنیاؤں کو اپنی تہذیب و تمدن کے جادو سے رشک ارم بنا دیا ہے۔ وہاں زندگی ہے۔ مسرت ہے۔ شادمانی ہے۔ شور و ہنگامہ ہے سکون ہے۔ انقلاب ہے۔ غرض کہ سب کچھ ہے۔ خدائے بزرگ و برتر انسان کی اس آفرینش پر بہت نازاں ہے۔ اگر تم مقابلہ کرو تو دیکھو کہ ہماری زندگی ابتدا سے ابتک یکساں چلی آ رہی ہے اور ہم جس مقام پر تھے آج تک وہی ہیں۔ ہم نے ایسا کوئی کارنامہ نہیں کیا جو خدائے بزرگ و برتر کی نظروں میں کوئی وقعت رکھتا ہو۔

پہلا فرشتہ — عزیز دوست ٹھیک کہتے ہو لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم انسانیت اور دنیا کی صرف ایک رخی زندگی سے واقف ہو۔ تم نے ابھی دنیا کو خوب گھوم پھر کر نہیں دیکھا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اب وہ اگلی سی دنیا نہیں رہی۔ اور نہ انسان اب وہ اگلا سا انسان رہا ہے۔ اب تم جہاں جا کر بھی ڈھونڈھو تو تم کو انسانیت کا کہیں پتا نہ ملے گا۔ تم انسانوں میں برادری، ہمدردی، محبت، خلوص، غمگساری، سچائی اور دوستی کا نشان بھی نہ پاؤ گے اب تو صرف دکھاوا ہی دکھاوا ہے اور بے مروتی ہی بے مروتی۔

دوسرا فرشتہ — میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ انسان میں اب بھی اگلی سی انسانیت موجود ہے۔

پہلا فرشتہ — کیا کہا۔ انسانیت —! تھوڑی سی زمین کے لیے بے شمار انسانوں کو بیگناہ قتل و برباد کرنے کا نام انسانیت ہے؟

دوسرا فرشتہ — میرا خیال ہے کہ ابھی انسان میں ہمدردی خلوص اور مروت کا جذبہ موجود ہے۔

پہلا فرشتہ — ہم جلیس! تم جس کو خلوص کہتے ہو اب دنیا میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ مروت کی بجائے اب تم کو ہر طرف خود غرضی ہی خود غرضی نظر آئے گی مروت کرنا انسان بھول گیا ہے۔

دوسرا فرشتہ — میں یہ سب کچھ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں میں جانتا ہوں کہ خدائے بزرگ و برتر نے انسان کو اسی لیے بڑا بنایا ہے کہ اس میں ہمدردی اور غمگساری کا جذبہ ہوتا ہے۔ اور یہی انسان کی وہ خوبی ہے جس سے وہ فرشتوں سے بڑا ہو گیا ہے۔ کیا تم نے نہیں سنا ؎

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

پہلا فرشتہ — بس۔ میرے مونس! انسان کی تعریف اور قصیدہ خوانی رہنے دو۔ جو بھائی دولت کی خاطر بھائی کا گلا کاٹنے کو جوانمردی سمجھتا ہے۔ وہ دم توڑنے والوں پر اور مصیبتیں ڈھاتا ہے جو دکھے ہوئے دل پر تیر و نشتر چلاتا ہے اسی انسان کو فرشتوں پر فوقیت پانے کا اب کوئی حق حاصل نہیں بلکہ خدائے بزرگ و برتر کی بارگاہ میں انسان کی اس تباہ و برباد کرنے والی ذہنیت کی شکایت کر کے اپنی بڑائی اور برتری کے لیے التجا کرنی چاہیے۔

دوسرا فرشتہ — میں یہ کیسے مان لوں کہ انسان اپنی آفرینش کے زمانے سے اب تک تو اپنی اصلی حالت پر قایم رہا۔ اور اب تھوڑی ہی مدت سے اپنی انسانیت کھو بیٹھا۔

پہلا فرشتہ — اے ملائے اعلیٰ کے باشی تو بہتر یہ ہے کہ جاکر اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ جاو۔ اور دنیا کی سیر کرو۔ دیکھو وہاں دولت مندوں نے غریبوں کو کس طرح مجبور اور بے بس بنا کر رکھا ہے جاو اور دیکھو وہاں حاکم اپنے محکوم سے کیا برتاؤ کرتا ہے۔ وہاں کے رئیس اور مالدار لوگ اپنی دولت کن بیکار کاموں اور تعیشات پر صرف کرتے ہیں جاو اور دیکھو وہاں ایک "خود ساختہ" "بڑا انسان" دوسرے انسانوں کو کتنا حقیر اور ذلیل سمجھتا ہے یہ سب کچھ تم خود ہی جاکر دیکھو تب تمھیں میری باتوں پر یقین آئے گا۔ یوں کہنے سے کچھ فائدہ نہیں۔

دوسرا فرشتہ — میں ضرور آزماؤں گا۔ میں جاکر اپنی آنکھوں سے اس انسان کی موجودہ ذہنیت کو دیکھوں گا جس کو تم اور ہم سب اب تک اپنے سے بڑا اور برتر سمجھتے رہے ہیں۔

پہلا فرشتہ — ہاں جاو اور اس وقت انسانوں کی دنیا میں جاو اور دیکھو کہ میری باتوں میں کہاں تک سچائی ہے جاو اور بزرگ و برتر کی بارگاہ میں انسان کے خلاف شکایت کرنے کے لیے تم بھی شہادتیں فراہم کر لاو۔

دوسرا فرشتہ — بہت بہتر ہے — میں جاتا ہوں —
تم کو میرا دوامی سلام!

(منظر تبدیل ہوجاتا ہے)

دوسرا منظر

ایک بڑا شہر — ایک بڑے رئیس کا مکان۔ مکان سے باہر گانے کی دلکش آواز آرہی ہے —

"عیش کر دنیا میں، انسان عیش کر"

.... فرشتہ ملائے اعلیٰ سے پرواز کرکے زمین پر آتا ہے اور ایک غریب انسان کا بھیس بدل کر، شہر کی سیر کرنے لگتا ہے سردی سخت پڑ رہی ہے اور برف گر رہی ہے — وہ سیر کرتے کرتے اس رئیس کے مکان کے قریب پہنچتا ہے اور گانے کی آواز سنتا ہے ....

فرشتہ — (خود سے) کتنی دلکش آواز ہے — یہ کسی بڑے آدمی کا گھر معلوم ہوتا ہے۔ چلوں آج رات کو یہیں پناہ لوں (گانا ختم ہونے کا انتظار کرتا ہے) (پہرہ دار سے مخاطب ہو کر) .... کیوں بھائی پہرہ دار، یہ مکان کس کا ہے؟

پہرہ دار — یہاں کے ایک بہت بڑے رئیس کا۔

فرشتہ — میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔

پہرہ دار — (نفرت کے لہجے میں) تم اور اس وقت ہمارے آقا سے ملنا چاہتے ہو۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ کیا خوب — ذرا اپنی حالت کو دیکھو۔ یہ پھٹے ہوئے کپڑے۔ یہ پاگلوں کی سی صورت یہ بھکاریوں جیسا حلیہ — ہا۔ ہا۔ ہا — تم اور اتنے بڑے رئیس سے ملنا چاہتے ہو۔

فرشتہ — (تعجب کے لہجے میں) — ایں۔ تم ہنستے کیوں ہو؟ کیا میں انسان نہیں ہوں کیا تمہارا آقا ہی انسان ہے؟

پہرہ دار — میاں انسان۔ تم جیسے لوگوں پر تو میرا آقا نظر تک ڈالنا پسند نہیں کرتا۔ پھر وہ تم سے ملنا کیونکر گوارا کرے گا ...... مگر خیر، تو کہو کہ اس سے تمھیں کام کیا ہے؟

فرشتہ — کام کچھ نہیں — میں مسافر ہوں۔ تھکا ہوا پریشان تم دیکھ رہے ہو اس وقت سردی کس بلا کی ہو رہی ہے۔ برف گر رہی ہے۔ میں جاڑے سے کانپ رہا ہوں اور تمہارے آقا کے یہاں پناہ لینے آیا ہوں — میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ ذرا جلد اپنے آقا کو اطلاع کردو۔

پہرہ دار — پناہ — ہا۔ ہا۔ ہا — میاں انسان۔ سرائے تو تم نے اچھی تلاش کی۔ اگر میرا آقا تم جیسے مسافروں کو اس طرح پناہ دیا کرے تو پھر اس مکان میں رہنا بھی سکے لیے عذاب جان ہوجائے گا

شتہ ۔ افسوس ہے کہ تم کو میری حالت پر ترس نہیں آتا۔ خیر
ہانہ بناؤ، جلد اپنے آقا سے جا کر کہو کہ مجھے آج رات یہاں
بیٹھنے دے۔

چوکیدار ۔ میاں انسان ۔ تم بڑے چرب زبان معلوم ہوتے
باتیں بنانا خوب جانتے ہو۔ لیکن تمہاری اس بکواس کا میر
ں صرف ایک ہی علاج ہے۔ وہ یہ کہ تمہاری گردن میں ہاتھ
ے کر یہاں سے بڑھا دوں۔

شتہ ۔ یہ کیا کہہ رہے ہو! کیا انسانیت اسی کا نام ہے؟
تمہارے ملک میں مسافروں سے ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے؟

دار ۔ بھکاریوں کے پاس انسانیت نہیں ہوتی۔ انسانیت
ں صرف ان کے پاس ہے جن کے گھر دولت سے پٹے
ے ہیں۔ انسانیت دولت مندوں نے خرید لی ہے اور
ں کے لیے صرف حقارت اور ذلت باقی رہ گئی ہے۔

شتہ ۔ میں نہ سمجھتا تھا کہ اتنے بڑے رئیس کے گھر میں ایک
فر کے لیے بالشت بھر جگہ بھی نہیں نکل سکیگی۔ مجھے تمہارے
ں اس بے رحمی اور خود غرضی پر بڑا افسوس معلوم ہوتا
ہے ...... افوہ ...... کس قدر سخت سردی ہو رہی
راستہ تک دکھائی نہیں دیتا۔ برف تیزی سے گر رہی
۔ آج رات یہاں پڑ رہنے دو، میں سردی سے اکڑا
جا رہا ہوں۔

دار ۔ بس بس میاں انسان ۔ آپ چپ چاپ
جائیے۔ مجھے زیادہ نہ ستائیے دیکھیے آپ کا راستہ ۔۔

شتہ ۔ بہت اچھا۔ جاتا ہوں۔ آداب عرض ہے۔

(منظر تبدیل ہوتا ہے)

تیسرا منظر

(فرشتہ کے چلنے کی آواز آ رہی ہے۔ ایک لمحہ گزر جاتا ہے
[illegible] ایک عالیشان [illegible] نظر آتا ہے
[illegible] آ [illegible] دکان [illegible] آتا ہے)

اب اس مکان میں تو کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ مگر اس میں
سے خوشبوئیں کیسی عجیب و غریب آ رہی ہیں۔ شاید [illegible]
ہو۔ (دروازہ کھٹکھٹاتا ہے) .... دروازہ کھولو
...... (ذرا دیر کے بعد) ۔۔ دروازہ کھولو (اندر سے آواز
آتی ہے) ۔۔ کون ہے؟

فرشتہ ۔ ایک تھکا ہوا مسافر جو سردی سے بے حد پریشان
ہو رہا ہے۔ (ایک ملازم باہر آتا ہے)

ملازم ۔ کہو کیا کہنا ہے؟

فرشتہ ۔ یہ کس کا مکان ہے؟

ملازم ۔ یہ ہمارے مالک کا ہے جو ایک حکیم ہیں۔

فرشتہ ۔ اچھا تو حکیم صاحب سے کہو کہ ایک مسافر آپ سے
ملنا چاہتا ہے۔

ملازم ۔ کیا تم مریض ہو۔ حکیم صاحب کی فیس لائے ہو؟

فرشتہ ۔ نہیں نہیں ...... میں مریض نہیں ہوں بلکہ مسافر ہوں۔

ملازم ۔ تو پھر آپ حکیم صاحب سے مل کر کیا کریں گے۔ ان کے
پاس مسافروں سے ملنے کا کوئی وقت نہیں ہے۔ وہ ایک حکیم
ان کو تو مریضوں ہی کی ملاقات سے فرصت نہیں ملتی۔

فرشتہ ۔ میرے دوست تم اطلاع تو کر دو۔

ملازم ۔ کیا اطلاع کر دوں؟

فرشتہ ۔ یہی کہ ایک مسافر ...... نہیں نہیں بہتر ہے کہو کہ
ایک مریض جاڑے کی شدت سے بہت بے چین ہے۔

ملازم ۔ اچھا تو پھر یوں کیوں نہیں کہتے کہ بیمار ہو۔ علاج کرانے
آئے ہو لیکن فیس کے لیے روپے بھی ہیں تمہارے پاس۔
صورت اور کپڑوں سے تو بہت غریب معلوم ہوتے ہو۔

فرشتہ ۔ ہاں بہت غریب ہوں۔ فیس نہیں دے سکتا
لیکن خدا کے لیے تم حکیم صاحب کو فوراً اطلاع تو کر دو۔
میں تم کو انعام دوں گا۔

ملازم ۔ انعام دے سکتے ہو تم ۔۔ بھکاری تو معلوم ہوتے ہو [illegible]

فرشتہ ۔ نہیں تم کو ضرور انعام دوں گا۔ مجھے [illegible]

کر دو ذرا جلدی - ہو لو۔

ملازم - (لا مچے) شکریہ - آپ ذرا دیر ٹھہریے میں ایک منٹ میں آکر آپ کو حکیم صاحب کے پاس لے چلتا ہوں - بس ایک منٹ - (جاتا ہے)

فرشتہ - (خود سے) لالچی اور حریص دنیا - مسافروں پر ترس کھانے والے بھیڑیے -

ملازم - (آتا ہے) آؤ - چلو، حکیم صاحب سے چلکر ملاقات کرو۔
(وقفہ - ایک منٹ)

حکیم - کہو تم کون ہو اور اس وقت کونسی مصیبت تم کو یہاں کھینچکر لائی ہے؟

فرشتہ - میں تھکا ماندہ مسافر ہوں - حکیم صاحب، بے حد تھکا ہوا - سردی سخت ہو رہی ہے - میں جاڑے کی شدت سے اکڑا جا رہا ہوں - میں آج رات آپ کے گھر میں پناہ لینا چاہتا ہوں - مجھے آج رات یہاں پڑا رہنے دیجیے۔

حکیم - دھوکا - فریب - تم مریض بن کر آئے تھے - میرے گھر کو تم نے محتاج خانہ سمجھ رکھا ہے - جاؤ یہاں سے میرا وقت برباد نہ کرو - میں حاتم طائی نہیں ہوں کہ سارے بھکاریوں اور مسافروں کو پناہ دیتا رہوں - مجھے پیسوں کی ضرورت ہے - مجھے مریض چاہئیں، تم جیسے بھکاریوں اور مسافروں کے لیے میرے گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے - فوڑا باہر نکل جاؤ -

فرشتہ - (عاجزی سے) اور میری حالت پر رحم کیجیے - حکیم صاحب آپ بیماروں کو اچھا کیا کرتے ہیں کمزوروں کو طاقتور بناتے ہیں مرنے والوں کو موت کے منہ سے چھڑاتے ہیں - پھر یہ ظلم کیسا ہے کہ آپ ایک اچھے خاصے انسان کو مصیبت کے غار میں ڈھکیل دینا چاہتے ہیں - سردی شدت کی ہو رہی ہے - اور میں اکڑا جا رہا ہوں - آپ مجھے اپنے گھر میں ذرا سی جگہ نہیں دے سکتے - نہیں ایسا نہ کیجیے - میں سردی سے اکڑ جاؤں گا -

حکیم - فضول باتوں سے میرا سر نہ کھاؤ - وہ زمانہ گزر گیا جب لوگ انسانیت کی آڑ میں بہت کچھ ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے - اب مشین کا زمانہ ہے - مشینی زندگی اور تجارتی میل ملاپ نے ہمدردی اور خلوص کو کھوکھلا کر دیا ہے - اب جس چیز کا وجود نہیں اس کے نام سے مجھے دھوکا اور فریب دینے کی کوشش نہ کرو - میں روپیہ چاہتا ہوں - میں مریض چاہتا ہوں - مجھے تم جیسے بھکاریوں کی ضرورت نہیں ہے -

فرشتہ - تمہارے دل میں ذرا بھی مروت نہیں ہے - تم اپنے ایک بھائی کی تکلیف سے ذرا بھی بے چین نہیں ہوتے - تم کو اپنے ایک بھائی کی مصیبت پر ذرا بھی ترس نہیں آتا - حکیم صاحب زمانے نے تم کو کتنا بدل دیا ہے - لالچ نے تمہاری آنکھوں پر نقاب ڈال دی ہے - تم نیک و بد میں فرق نہیں کر سکتے تم ایک تندرست کو بیمار بنا دینا چاہتے ہو - ایک شخص کو زندگی کی طرف بلانے کی بجائے موت کی طرف ڈھکیل دینا چاہتے ہو خیر میں جاتا ہوں - انسانیت کی طرف سے سینہ پر بہت بڑا داغ ملا کر مگر تم بھی ہوشیار رہنا - ایک مسافر کا دل دکھایا ہے کہیں بعد میں پچھتانا نہ پڑے (فرشتہ روانہ ہوتا ہے) ....

(خود سے) کیا میرے دوست نے سچ کہا تھا - یہ دنیا مجھے کیسی عجیب و غریب نظر آ رہی ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان وہ انسان ہی نہیں رہا جسے پروردگار عالم نے پیدا کیا تھا بلکہ یہ تو کوئی عجیب ہی سرکش ہستی بن گیا ہے ـــــ خیر ذرا اس کی آزمایش اور کر کے دیکھوں -

(منظر تبدیل ہو جاتا ہے)

چوتھا منظر

[فرشتہ ایک بڑے سوداگر کے نہایت عالی شان مکان کے پاس پہنچتا ہے جو بہت روشن ہے]

فرشتہ - (خود سے) یہ مکان تو بہت روشن اور عالیشان نظر آتا ہے - ذرا چل کر دیکھوں کہ اس گھر کے [illegible] رہنے والوں کے دل کتنے روشن ہیں - گھر کے پاس پہنچ کر [illegible] [illegible]

سوداگر کی بیٹی۔ (گھر کے اندر سے) اور ابا جان اس کے علاوہ مجھے ایک نیا گانا بھی اسکول میں سکھایا گیا ہے۔ کیا آپ سنیں گے؟

سوداگر۔ نہیں نہیں بیٹے اس وقت گانا سننے کی فرصت نہیں ہے۔ مجھے تو ابھی حساب کتاب کرنا ہے۔ اس سے تو ایک منٹ کو فرصت نہیں ملتی۔

بیٹی۔ مگر میرا گانا آپ کو سننا ہی پڑے گا۔ سنیے (گاتی ہے)...

"میں کنول مسکائے ...... بھونرا ...... بیل"

سوداگر۔ (گانا ختم ہونے کے بعد) واہ بیٹی گانا تو تم نے بڑا اچھا سیکھا ہے۔

بیٹی۔ ابا جان اب تو میں ناچ بھی سیکھوں گی۔ اسکول میں یہ بھی سکھایا جاتا ہے۔ میری سہیلیاں اچھا ناچتی ہیں۔

سوداگر۔ کیا کہا۔ ناچ؟...... نہیں بیٹی ناچ نہیں۔ یہ تو خراب بات ہے۔ تم ناچ واچ مت سیکھنا۔ البتہ گانا اچھی چیز ہے۔

(ملازم داخل ہوتا ہے)

ملازم۔ جناب کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

سوداگر۔ (رکھائی سے) کہہ دو اس وقت فرصت نہیں ہے۔

بیٹی۔ ابا جان۔ ایسی سخت سردی میں جو بھی آیا ہوگا اسے آپ سے کچھ بہت ضروری ہی کام ہوگا آپ اس سے ایک ہی منٹ کے لیے بلا لیجیے۔

سوداگر۔ کون ہے کیا کام ہے؟

ملازم۔ جناب وہ کہتا ہے کہ وہ ایک مسافر ہے اور آپ ہی سے ملنا چاہتا ہے۔

سوداگر۔ اچھا جاؤ۔ اندر بلا لاؤ۔ (ملازم جاتا ہے۔ فرشتہ داخل ہوتا ہے)

فرشتہ۔ آداب عرض ہے جناب!

سوداگر۔ آداب عرض (بے پروائی سے) کہاں سے آنا ہوا

فرشتہ۔ میں مسافر ہوں بہت تھکا ہوا، پریشان حال، سردی [illegible] اس وقت آپ کے گھر میں پناہ لینے آیا ہوں۔

سوداگر۔ (تلخی سے) پناہ لینے؟ کیا میرا مکان کوئی سرائے یا یتیم خانہ ہے کہ تم جیسے بھکاری بھی پناہ لینے چلے آتے ہیں۔

فرشتہ۔ جناب یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ میں تو آپ سے عاجزی سے کہہ رہا ہوں کہ میں مسافر ہوں اور سردی سے اکڑا رہا ہوں۔ آپ جیسے بڑے آدمی کا مکان دیکھ کر چلا آیا کہ شاید مجھے آج رات پناہ مل سکے۔

بیٹی۔ ابا جان۔ مجھے یہ آدمی بہت پریشان حال اور تھکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اسے آج رات کو یہاں ٹھہر جانے دیجیے۔

سوداگر۔ بیٹی تم آج کل کے انسانوں کا حال کیا جانو۔ اکثر جبہ اور داڑھی والے بہروپ بدل کر بدنیت اور دھوکا باز ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ انسانیت سے پیش آنا دراصل اپنا ہی نقصان کرنا ہے۔

فرشتہ۔ ممکن ہے کہ آپ کو مجھ جیسے غریب اور پریشان حال آدمیوں کی طرف سے کچھ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہو۔ لیکن میری طرف سے آپ کچھ اندیشہ نہ کیجیے۔

سوداگر۔ اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم ایک نیک اور شریف انسان ہو۔ ذرا اپنی صورت دیکھو، اپنا لباس دیکھو۔

فرشتہ۔ آپ میری صورت اور لباس دیکھتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ آپ میرا دل کیوں نہیں دیکھتے؟

بیٹی۔ ابا جان۔ اس غریب مسافر پر رحم کیجیے۔ یہ کوئی شہدا اور آوارہ آدمی نہیں معلوم ہوتا۔ آپ اتنے بڑے سوداگر ہیں اگر اس مسافر کو اس عالیشان عمارت میں ذرا سی جگہ دے دیں تو اس میں آپ کا کیا نقصان ہوگا؟

سوداگر۔ بیٹی میں سوداگر ہوں۔ اور مجھے ایسے شریف صورت انسانوں سے بہت سابقہ پڑ چکا ہے۔ میں ان ٹھگوں کی رگ رگ سے واقف ہوں اور ان کے حیلے میں ایسے آدمیوں کا گھر میں ٹھہرانا مناسب نہیں سمجھتا۔ تم لوگ ان باتوں کو کیا سمجھو۔

فرشتہ ۔ (مایوس ہو کر) میں سمجھتا تھا کہ مجھے آپ کے یہاں تو پناہ ضرور مل جائے گی لیکن افسوس آپ نے بھی اوروں کی طرح ٹھکرا دیا۔

بیٹی ۔ ابا جان مجھے اس مسافر کی حالت پر بہت ترس آتا ہے آپ اس کو روک لیجیے۔

فرشتہ ۔ میں نے آپ کا بہت قیمتی وقت ضائع کیا معاف کیجیے ۔ میں اب جاتا ہوں کہیں اور پناہ ڈھونڈوں گا لیکن میں یہ سبق لے کر جا رہا ہوں کہ آپ جیسے بڑے لوگ جو محلوں میں عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں، غریبوں اور جھونپڑیوں میں بسنے والوں پر ترس کھانا نہیں جانتے۔ آپ کے دلوں میں محبت نام کو بھی نہیں رہ گئی ——— لیجیے آداب عرض ہے ——— افسوس کس قدر سخت برف گر رہی ہے .... الاماں .... خدا کی پناہ ——— دنیا والوں کی حالت معلوم ہو چکی اب عالم بالا کو واپس جاؤں اور اپنے دوست سے انسان اور اس دنیا کا حال بیان کروں (روانہ ہوتا ہے)

(منظر تبدیل ہوتا ہے)

پانچواں منظر

(شاعر کا مکان ۔ بستی سے دور ایک مقام پر)

(شاعر اپنی رفیقۂ حیات سے گفتگو کر رہا ہے)

شاعر ۔ آخر شاعر کی زندگی تم کو کیوں پسند نہیں۔

رفیقۂ حیات ۔ شاعر ہمیشہ پریشان حال رہتے ہیں ان کی زندگی ہمیشہ تنگدستی اور مصیبت میں بسر ہوتی ہے۔ انھیں کبھی سکھ اور چین نصیب نہیں ہوتا میں تو ہر ایک سے سنتی چلی آ رہی ہوں اور اسی لیے ......

شاعر ۔ (قطع کلام کرتے ہوئے) تم نہیں جانتیں کہ سچا شاعر دنیا کی ان فروعی پریشانیوں اور تکلیفوں کی ذرا بھی پروا نہیں کرتا۔ یہ سب تو معمولی سی چاشنیاں ہیں جو چکھی ہیں اور نکل جاتی ہیں۔ شاعر دنیا کے معمولی انسانوں سے بڑا مرتبہ رکھتا ہے۔

رفیقۂ حیات ۔ عام انسانوں سے بڑا مرتبہ رکھتا ہے! کیا وہ فرشتہ ہے؟

شاعر ۔ فرشتے سے بڑھ کر۔

رفیقۂ حیات ۔ یہ تو اپنی آپ تعریف ہے۔

شاعر ۔ یہ حقیقت ہے۔

رفیقۂ حیات ۔ ممکن ہے کہ آپ کا خیال درست ہو لیکن دنیا میں جس طرح سائنس داں، مورخ، ہیئت داں، مذہبی پیشوا اور دوسرے عالموں کی قدر و منزلت کی جاتی ہے۔ ویسی شاعر کی نہیں۔

شاعر ۔ دنیا فریب میں مبتلا ہے اگر وہ ایک سچے اور ایک بڑے شاعر کی قدر نہیں کرتی۔

رفیقۂ حیات ۔ جس طرح سائنس داں، کیمیاگر، حکیم، ڈاکٹر اور موجد، دنیا کو کسی نہ کسی طرح فائدہ پہنچاتے ہیں، کیا اسی طرح شاعر بھی دنیا کو فائدہ پہنچاتا ہے؟

شاعر ۔ کیمیاگر، سائنس داں، حکیم اور ڈاکٹر، مورخ اور موجد دنیا کو اتنا فائدہ نہیں پہنچا سکتے جتنا کہ ایک شاعر ——— وہ سوئی ہوئی قوموں کو غفلت سے جگاتا ہے۔ بگڑوں کو بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنے شعر کے جادو سے قوموں میں زندگی کی روح دوڑاتا ہے، وہ ماضی کے نغمے سنا کر دنیا کو حال اور مستقبل کی طرف بلاتا ہے، اس کے ایک شعر سے ملک میں انقلاب، اس کی ایک نظم سے جمعیتوں میں جوش اور ولولہ اور اس کے ایک مصرع سے دلوں میں جرأت اور حوصلے پیدا ہوتے ہیں۔ جو کام شاعر کا ایک شعر کر سکتا ہے وہ بڑے بڑے وعظ اور لکچر نہیں کر سکتے۔

رفیقۂ حیات ۔ اور کچھ؟

شاعر ۔ شاعر ملک کی تباہ حالی اور پریشانی کو محسوس کرتا ہے قوم کی تکلیف اور دکھ سے اسے تکلیف اور دکھ پہنچتا ہے۔ قوم کی ترقی اور کامیابی کو دیکھ کر اس کا دل خوشی سے [illegible] ہے وہ ہمیشہ [illegible]

ہے۔ وہ نصیحت بھی کرتا ہے اور افسوس بھی۔ وہ ہدایت بھی
ہے اور اس پر عمل کرنے کا طریقہ بھی بتاتا ہے۔ ایک بڑا شاعر
ان میں خودداری، غیرت، حمیت اور پرجوش زندگی دیکھنا چاہتا
اور جوش عمل بھی۔ سنو، میں تم کو چند اشعار سنانا چاہتا ہوں، جن کو
ز تمہیں شاعر کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے گا۔

(شاعر لحن کے ساتھ پڑھتا ہے)

عشق میں اپنا مقام پیدا کر ❊ نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
ر دل فطرت شناس و نکتہ گو ❊ سکوت لالہ و گل سے کلام پیدا کر
خ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر ❊ مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر
ہتا امیری نہیں فقیری ہے ❊ خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

تہ حیات۔۔ یہ اشعار تو نہایت بلند پایہ اور سبق آموز ہیں۔

ر۔ سنو شاعر انسان سے اور کیا کہتا ہے۔

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے، بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

تہ (چلتے چلتے شاعر کے جھونپڑے کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اور
ر کی آواز سنتا ہے)

یہ کون اس قدر لحن سے پڑھ رہا ہے۔ ذرا میں بھی چلکر
ں۔ یہ معمولی سا جھونپڑا اور اس میں ایسا دلکش نغمہ.....
ازہ کھولو........!

ر۔ (اندر سے) کون ہے؟

تہ۔ ایک تھکا ہوا مسافر!

عر۔ (باہر آکر) کہیے مہربان کیسے آنا ہوا۔ ہم آپ کی کیا
مت کر سکتے ہیں؟

تہ۔ میرے عزیز دوست۔ میں تمہاری زبان سے یہ کیسے
ب الفاظ سن رہا ہوں۔

عر۔ نہیں میں تو کوئی عجیب بات نہیں کہہ رہا ہوں۔

تہ۔ میرے لیے تو عجیب ہی ہے

عر۔ کیوں؟

تہ۔ دنیا میں آپ پہلے آدمی ملے ہیں جو مجھ سے اس قدر

مروت اور مہربانی سے گفتگو کر رہے ہیں۔ یہ تو فرمایئے کیا آج رات
آپ مجھے اپنے گھر میں پناہ لینے دیں گے۔ اس لیے کہ میں سردی
سے اکتا گیا رہا ہوں۔

شاعر۔ بڑی خوشی سے۔ میرے دوست آپ شوق سے آج رات
میرے مہمان رہ سکتے ہیں یہ جھونپڑا آپ ہی جیسوں کے لیے ہے
میں آپ کی اس تشریف آوری سے بہت خوش ہوں۔
۔۔۔۔ کیا دنیا میں کسی نے بھی آپ کو پناہ نہیں دی؟

فرشتہ۔ کسی نے بھی نہیں۔ میں بڑے بڑے محلوں میں رہنے
والوں کی چوکھٹ پر گیا لیکن کسی نے اندر تک نہ جانے دیا۔
میں عالی شان کوٹھیوں میں عیش کرنے والوں کے یہاں پہنچا لیکن
وہاں سے بھی ٹھکرا دیا گیا۔

شاعر۔ مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔

فرشتہ۔ اس قدر سخت سردی دیکھیے اور ان لوگوں کا میرے
ساتھ یہ بیدردانہ سلوک۔ میں محلوں میں رہنے والوں سے ان
کے محل نہیں مانگتا۔ ان کے محل ان کو مبارک۔ میں کوٹھیوں میں عیش
کرنے والوں سے ان کا عیش و نشاط نہیں طلب کرتا۔ میں صرف
پناہ ۔۔۔ ایک رات کی پناہ مانگتا تھا۔ لیکن ظالم انسانوں
نے وہ بھی دینے سے انکار کر دیا۔

شاعر۔ میرے دوست، انسان زمانے کے انقلابات کا شکار
ہو گیا ہے اور اس لیے اپنی ساری اگلی خوبیاں کھو بیٹھا ہے
مجھے پھر ایک بار اس بات پر تاسف کرنے دیجیے کہ آپ کو کہیں
بھی پناہ نہیں ملی۔ اب آپ یہاں آرام کیجیے۔

فرشتہ۔ میں دنیا اور دنیا والوں سے بیزار ہو چکا تھا ۔۔۔
لیکن اس گھر سے مجھے ایک شاعرانہ نغمہ سنائی دیا اور میں ادھر
چلا آیا۔ کیا آپ شاعر ہیں؟

شاعر۔ ہاں یہ اسی غریب شاعر کا جھونپڑا ہے۔

فرشتہ۔ اچھا تو اب مجھے معلوم ہوا کہ اگر کسی غریب آدمی کو دنیا
میں کہیں پناہ مل سکتی ہے تو وہ صرف شاعری کا گھر ہے۔ وہ
شاعر جس کا دل اس تاریکی اور ظلم و فرعونیت سے بھرے ہوئے

شاعر ہی انسانیت اور انسان کے درد کو محسوس کر سکتا ہے ...... اچھا اے دنیا کے اپنے آسمانی اور روحانی نغموں سے مالا مال کرنے والے شاعر اب تو پھر کوئی نغمہ سنا کہ میں دنیا کی بے دردی، خود غرضی اور نفسانیت کو فراموش کر دوں اور شعروں کی لطافت میں گم ہو کر رہ جاؤں ......

...... ہاں یہ کہنے دو کہ "سچا شاعر" دنیا کا سب سے بڑا ہمدرد انسان ہوتا ہے۔

شاعر (دھن سے پڑھتا ہے)

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر

(آہستہ آہستہ آواز مدھم ہوتی جاتی ہے)

—— منظر ختم ہوتا ہے ——

محشر عابدی ایم۔ ایس سی (عثمانیہ)

آج کل

آسمانوں سے نزول قدسیاں بھی آجکل | نور سے معمور انکا آستاں ہے آجکل
دشمن حسن عنایت فطرت کا بیان [illegible] | جوش ارماں ضبط دل کا امتحاں ہے آجکل
اپنی بربادی کا کچھ ایسا سماں ہے آجکل | ہم زمیں پر روتے آسماں ہے آجکل
آسمان پر کا بھی دل روشن ہے آجکل | جو غم پر کالی گھٹاؤں کا سماں ہے آجکل

جب نہیں پہلو میں ہے وہ بہار رنگ و بو | پھر تو یہ فصل بہار بھی خزاں ہے آجکل
روح مست و جان مست و عقل و ہوش مست | مست کیفیت خودی پیر جواں ہے آجکل
شیشہ مست و جام مست و مینا مست | مست اپنے حال میں پیر مغاں ہے آجکل
دیکھیے اس وسعت شوق تکلم دیکھیے | ہر زباں کی بات گویا داستاں ہے آجکل
کر دیا ابر کرم نے سوز کو ساز بہار | جگمگاتی ہر کلی چراغ آشیاں ہے آجکل
یاد وہ کرتی ہے کسی کی لالہ کا تو مرا | ہر چشم گریہ اشک سے ان کے آجکل
فیض ساقی سے زمانہ بھی سرشار ہے | کیف میں ڈوبی فضائے دو جہاں ہے آجکل
دیکھیے حسن کا چلا آتا ہے جو کے لیے | سجدہ گاہ خلق انکا آستاں ہے آجکل
ہر ادا ہے روح پرور ہر نگہ ہے جاں نواز | حسن سے رنگیں کسی کی داستاں ہے آجکل

کس کو لطف آشیاں حاصل نہیں ہے ساعت میں
لیکن اک افسر خراب آشیاں ہے آجکل

افسر سوانی (دہلوی)

صبح روٹی کھاتا ہوں۔ پھر بھی اس نے روٹی پکانے سے جی چرایا!
اس کا مطلب۔ مطلب کیا! محبت کا رنگ جتنا شوخ ہوتا جاتا ہے
پھیکا ہوتا ہے! شادی کے دو برس بعد تک بھی بیوی مجھ پر فدا
ہو تی جاتی تھی۔ میری تیوری کے بل اس کا دل ڈبو دیتے تھے
لیکن اب سیدھی سادی اور میرے آرام کی چیزوں کا بھی اسے
خیال نہیں۔ میں پان نہیں کھاتا تو اس وقت منت اور التجا
کرکے مجھے پان کھلاتی تھی اور آج! میں نے پیٹ بھر کھانا بھی
کھایا یا نہیں۔ پروا تک نہیں۔"

شام میں جب وہ کچہری سے باہر آیا تو دھوپ کی شدت
کم ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے غم اور غصے کا پارا بھی بلند ہو گیا تھا
اس نے رات میں جاگ کر اور پانی پی پی کر کام ختم کیا تھا!
لیکن حاکم نے ناقابل معافی غلطیوں کو پہاڑ بنا دیا تھا۔

جب وہ گھر آیا تو سامنے ہی اس کے دو دوست
کھڑے تھے۔ کہنے لگے "کیا بھئی۔ چائے ملیگی"۔ وہ انکار نہ کر سکا
دوستوں کو دیوان خانے میں بٹھا کر اندر گیا۔ دیکھا تو کیتلی میں
چائے تیار تھی۔

"دو پیالی اور چاہیے"۔

"رفیق سو رہا ہے۔ اس کی آدھی پیالی بچی تو ہے!"
عتیق نے غصے سے آدھی پیالی چائے دو پیالی میں
انڈیلی اور چلتا بنا۔

وہ بھری پیالیاں دیکھ کر دوستوں نے پوچھا "اور تم؟"
ایک نے کہا۔ وہ تو اندر ہی پی چکے۔ میاں راجا اور بیوی ملی
عتیق کو رات کا خواب یاد آ گیا۔ گھر ایک قید خانہ ہے
اس کے جی میں آئی۔ قیدی کو راجا کہہ کر اسے بنایا جا رہا ہے اور
اندر آیا۔ اس کی بیوی اسٹو جلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میں باہر جا رہا ہوں"

"پانچ منٹ ٹھیر جائیں تو"

عتیق بغیر جواب دیے نکل گیا۔ دوستوں کو رخصت
کرکے ذرا جلدی کے ارادے سے وہ دور نکل گیا۔ تنہائی

اسے محسوس ہوا کہ دور کہیں تنہائی میں کوئی چھوڑ رہے ہے۔ لیکن رات
کے جاگنے اور دن بھر کے اضطراب کے سبب وہ تھکن محسوس
کر رہا تھا۔ کچھ دیر رہا۔ خیالات کی موجوں میں دل و دماغ برابر
بہے جا رہے تھے۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی زندگی کے دریا اور
اس کے پرسکون بہاؤ میں ایک پتھر گر گیا ہے، گر جدار آواز ہوئی
اور پانی کی سطح پر ہزاروں لہریں اور بلبلے ناچنے لگے، پانی گدلا
ہو گیا۔ اس کا دل بیٹھ گیا۔ دل کی ایسی فضا گمان، شک، غصے اور
نفرت کے لیے بڑی راس آتی ہے!۔

رات بڑھتی جا رہی تھی نو بج چکے تھے۔ وہ اٹھا اور
گھر کا رخ کیا۔ اب بھی فضا میں گرمی تھی، حبس تھا، ٹھنڈی ہوا کا
ایک جھونکا بھی نہ تھا۔ سڑکیں اور پختہ عمارتیں اس قدر گرم ہو گئی
تھیں کہ ہوا میں ابھی تک خنکی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا
کہ ابھی رات نہیں ہوئی ہے۔ گرمی کے مارے ہوا کے جھونکے
کہاں چھپ گئے تھے۔ کون جانے۔ عتیق کو محسوس ہوا ایسا باہر
اس قدر گرمی ہے! پھر گھر میں۔

اسے خیال ہوا کہ رعنا کھانا پی کر سو گئی ہوگی۔ اس نے
سوچ لیا کہ اگر رعنا کھانا دینے کے لیے اٹھے تو وہ
کہہ دیگا کہ اسے بھوک نہیں ہے۔ لیکن وہ اسے اطمینان سے سونے
دینا بھی نہیں چاہتا تھا۔

جب وہ گھر پہنچا تو رعنا جاگ رہی تھی۔ بولی "اتنی
دیر میں کب سے راہ دیکھ رہی ہوں! میں اب تک بھوکی بیٹھی"
عتیق چکرا کر رہ گیا۔ اس کی توقع کے خلاف! یعنی رعنا
نے اس کے لیے ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ بھوکا رہ کر تو میں
شکست دینا چاہتا تھا مگر وہ خود بھوکی رہ کر مجھ پر فتح پا گئی!
لیکن پہلی ہی بات میں کوئی اس قدر جلدی مان جاتا ہے؟
"یہ کیا روٹھنے کا کھیل نکالا ہے؟"

رعنا باورچی خانے میں جاتی ہوئی بولی "آپ تو جو
جی چاہے کہہ دیجئے۔ میں نے رفیق کے لیے پہلے کیا تھی؟
رفیق کے واسطے؟"

"ہاں کل رات اسے بے حد بخار تھا۔ اب بھی رہ گیا۔
میں تو ساری رات گود ہی میں لیے بیٹھی رہی!"

"مجھے کیوں خبر نہیں دی؟"

"آپ کو دفتر کا کیا کچھ کم کام ہوتا ہے۔ اگر کوئی پڑھی لکھی بیوی ہوتی تو ضرور آپ کا کام ہلکا کر دیتی" رعنا مسکرا کر کچھ عجیب انداز سے بولی۔

عتیق سمجھ گیا کہ آج اس کی بیوی نے روٹی کیوں نہیں پکائی۔ رات بھر وہ جاگتی رہی! کھانا کھاتے ہوئے وہ سوچنے لگا "پانی کی سطح پر کوڑا کرکٹ دیکھ کر سارے پانی کو گندا سمجھ لینا عقلمندی نہیں ہے۔ مرد کی تکلیفیں زمین پر ابھری ہوئی چٹانوں کی طرح ہیں"۔

لیکن عورت کے دکھ جوالا مکھی کی طرح اندر ہی اندر پکتے رہتے ہیں۔ وہ نظر نہیں آتے مگر کیا کم تکلیف دہ ہوتے ہیں!

رعنا باورچی خانے کا سب سامان ٹھیک ٹھاک کر کے اپنے کمرے میں گئی۔ رفیق بستر پر نہ تھا۔ وہ گھبرا گئی۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد وہ ہنسنے لگی۔ رفیق، عتیق کے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ اور عتیق بیٹھا پنکھا جھل رہا تھا۔ وہ جان گیا کہ زندگی کے تپتے ہوئے صحرا میں بھی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اسی طرح چلتے رہتے ہیں!

عبدالقادر فاروقی (عثمانیہ)

تبادلے کے بعض رسالے

تک ہندستانی ادب کا پورا ہی پتا لکھ رہے ہیں۔ حالانکہ [illegible] ایک سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔ براہ کرم تبادلے کے چند اخبار وغیرہ ہمیں کے پتے پر بھیجیے۔

دفتر ہندستانی ادب۔ اعظم پورہ۔ حیدرآباد دکن۔

اے دوست

۱

اے دوست جب سے ہم ملے ہیں،
میرے خیالات کی دنیا میں بے شمار نورانی شمعوں کی ایسی جگمگاہٹ ہے، جیسے اندھیری رات میں گنگناتے ہوئے تاروں کی شرابی روشنی!

میرا دل حق و صداقت کے نور سے منور ہو گیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ تیری ذات حق و صداقت کا سرچشمہ ہے، جس کی نرم موجوں کی سبک روی آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو تازگی بخشتی ہے۔

تجھ میں کتنی گہرائی ہے، تیرے خیالات میں کیسی بلندی ہے اور تیری باتوں میں کس قدر رس ہے — گھنٹوں تجھ سے باتیں کرتا ہوں، جی سیر نہیں ہوتا!

اے دوست! میں تجھ سے محبت کرتا ہوں —
ایسی محبت جس کی لطافتیں غیر فانی ہیں اور جن میں غم بھی نکھرا ہوا ہو پانی کی سطح پر مسکرانے والے کنول کی طرح بے داغ ہے۔

۲

اے دوست! جب تک تیرے ماتھے پر حقیقتوں کی روشنی ہے اور تیری نظریں صبح کی سہانی کرنوں کی طرح دلوں میں صداقت کو جگا رہی ہیں، میں تیرا ہوں۔

جب تک تیرے خیال کی پاکیزگی تیری آنکھوں میں جھلکتی ہے، بجلی کی روشنی سے جگمگاتے ہوئے مکان کیا ہیں؟

اے میرے دوست
تیرا دل تو ایسے انداز سے جگمگا رہا ہے جیسے سمندر کی اتھاہ گہرائی میں رہنے والے موتیوں کی چمک اور نیلے نیلے آسمان پر چمکنے والے ستاروں کی آب و تاب اپنی ساری رعنائیوں کے ساتھ قربان ہونا چاہتی ہے۔

عزیز احمد صبا (عثمانیہ)

بیوہ کا خط

پیاری نجمہ!

جیو اور خوش رہو۔ میں سمجھی تھی کہ میری شادی کے بعد پیاری نجمہ کی مبارک باد کا خط آج نہیں کل نہیں پرسوں ضرور آئے گا۔ لیکن پورے دو مہینے بعد تیرا خط ملا۔

میں نے تو تجھے اپنی شادی کی اطلاع نہیں دی تھی، تو پھر کس طرح تجھے معلوم ہوا کہ میری شادی ہوئی۔ خیر مبارک باد کا شکریہ!! اور اس کا بھی شکریہ، پہلے ہی ادا کرتی ہوں کہ جب تو میرا خط پا کر تعزیت لکھ بھیجے گی۔ دنیا میں دونوں خبریں بہت جلد پھیل جاتی ہیں، شادی اور موت۔ جس طرح میری شادی کی خبر تجھ تک پہنچی اسی طرح میرے پتی کی موت کی خبر بھی کسی ذریعے اور کسی سو پہنچ ہی جائیگی اس لیے میں نے کہا چلو شادی کی خوشخبری نہیں پہنچا سکی موت ہی کی خبر سہی۔ میں خوب جانتی ہوں جس طرح تو میری شادی کی خبر سن کر پھولے نہیں سمائی اسی طرح میرے بیوہ ہونے کی خبر معلوم کر کے تیرے نرم و نازک دل پر بہت اثر ہوگا۔ خیر ایسے واقعات تو آئے دن ہندستان میں ظہور پذیر ہوا ہی کرتے ہیں۔ اب تو ذرا دل کو مضبوط کر کے میری درد بھری کہانی سن، جس سے میرا غم بھی ہلکا ہوگا اور تجھے بھی معلوم ہوگا کہ میں کس حد تک شادی کی خبر تجھے معلوم کرانے پر مجبور تھی۔

ہاں نجمہ! بس، لیکن تیری آنکھ سے ابھی آنسو جاری ہونے تھے، تب تو میری کہانی سن چکی [illegible] میں کہہ چکی اچھا سن! ایک مہینہ ہوا میری چوڑیاں ٹوٹ گئیں اور میں بیوہ بن گئی نہیں نہیں میری چوڑیاں ٹوٹی نہیں بلکہ توڑ ڈالی گئیں اور میں بیوہ بنی نہیں بلکہ بنائی گئی۔ اب تو سوال کر بیٹھے گی کہ تیری چوڑیاں کس نے توڑیں؟ اور کس نے تجھے بیوہ بنایا! سوچتی ہوں میں اس کا کیا جواب دوں؟ دل میں آتا ہے کہہ دوں کہ والدین نے مجھے بیوہ بنایا اور کبھی سوچتی ہوں کہ سماج نے اور کبھی من کہتا ہے کہ سوسائٹی نے میری چوڑیاں توڑ ڈالیں اور کبھی ارادہ کرتی ہوں کہ برہمن، جس نے میرا سبھ مہورت ادا کرنے آیا تھا مجھے بیوہ بنا دیا۔ بھلا تو ہی تو بتا کہ کونسا جواب تجھے بھلا معلوم ہوتا ہے؟ والدین! سماج!! سوسائٹی، یا برہمن۔ بہرکیف ان چاروں نے مل کر میری چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ خیر مجھے ان میں سے کسی کا بھی شکوہ منظور نہیں۔ والدین کا، نہ سماج کا، نہ سوسائٹی کا اور نہ پوتر گھنٹہ بجانے والے برہمن کا۔ شاید کاتب تقدیر نے ایسا ہی لکھا ہو کہ شادی کے دو مہینے بعد ہی بیوہ بن کر رہ جاؤں۔ اس میں کسی کا کیا قصور!

ع شمع کی تقدیر میں جلنا تھا جلتی رہ گئی۔

والدین نے یہ خیال کیا کہ ہماری پریما بوڑھے زمیندار کے دل پر رانی بنکر حکومت کرے گی اور اپنی زندگی نہایت عیش سے بسر کرے گی" بوڑھے لوگ منصوبے تو خوب باندھتے ہیں مگر نجمہ! انھیں یہ خیال نہیں آتا کہ بھلا (۴۰) برس کے بوڑھے سے ایک سولہ سالہ لڑکی کا بھی کوئی جوڑا ہے؟ کیا شادی اسی کا نام ہے؟ میں سمجھی تھی کہ "شادی نام ہے دو روحوں کے ملنے کا" لیکن یہاں تو معاملہ الٹا ہی نکلا یعنی ایک روح نے دوسرے سے ملنے کے لیے قدم بڑھانے دو اس سے دور بہت دور چلی گئی۔

پڑوسی میرے والدین سے آکر کہتے رہے "اب تیری بیٹی کے بھاگ کھلیں گے" وہ ہیں پوچھتی تھی ہیں ابھی سے ہم سے لیے رخصت رہی ہے" سنا نجمہ تونے! کہتے ہیں [illegible] لوگ شادی سے پہلے ہی ان کو اس قسم کی [illegible] رہی تھی۔ مجھے اس برہمن پر بہت غصہ آتا ہے جس نے [illegible] ہم دونوں کے جنم نام اور [illegible] کیا [illegible]

[illegible] اور سیتا جیسی پاکدامن رہے لیکن اس سے پوچھنے [illegible] "رام" بنکر رہے۔ اور اگر کوئی بیچ عورت سر[illegible] [illegible] اس سے اظہار محبت کرے تو اس کی ناک کٹوا [illegible] ناک کاٹ دینے کی دھمکی ہی دے۔ نہیں نجمہ یہ اس سے کون پوچھے؟ بھلا عورت پوچھ سکتی ہے؎

شکایت کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مرجاوں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

تو ہی کہہ کر اگر نفس کا غلام مرد اپنی پتنی کے علاوہ کسی اور عورت کے حسن پر ڈاکہ ڈال کر اس کے جیون کو ناش کرتا ہے اور اس کی زندگی کو تباہ و برباد کرکے اس سے اس طرح الگ ہوجاتا ہے جیسے کبھی اس سے کسی قسم کا سابقہ ہی نہیں پڑا تھا۔ اس میں عورت کا کیا قصور ہے؟ ایک شخص کو دریا میں پھینک کر اس سے یہ امید رکھنا کہ اس کا لباس پانی سے نہ بھیگے اور پھر بھیگنے پر تر دامنی کا خطاوار اس کو ٹھیرانا کہاں کا انصاف ہے پیاری نجمہ! انصاف کی بھی میں نے ایک ہی کہی سماج اور عدالت سے ایک بیچاری بدنصیب عورت انصاف کی بھیک نہیں مانگ سکتی۔

نجمہ! بول کہ مجھ جیسی ایک بدنصیب بیوہ ایک بدمعاش مرد نفسانی خواہشوں کا شکار ہوکر بدقسمتی سے ماں بن جائے تو یہ سماج کی نظر میں بدترین پاپ اور گناہ ہوگیا سوسائٹی عورت کو مجرم قرار دے گی لیکن اس بدمعاش مرد کو سولی پر ہرگز نہیں لٹکایا جائے گا۔

قاضی صاحب لڑکی سے یہ پوچھتے ہیں "تمہارا عقد فلاں بن فلاں سے ہورہا ہے" لیکن نجمہ میں بھی کتنی دیوانی ہوں بھلا ایک مرد سوسائٹی کے بنائے ہوئے قوانین کی پروا نہ کرتے ہوئے عورت اور وہ بھی پاپی اور مجرم کا طرفدار بننا کب گوارا کرتا ہے۔ سوسائٹی اس کو بے وفا اور دغاباز کہیگی نا۔

نجمہ! میری صرف خواہش یہی ہے کہ تو دستور سے بیزار بنا کر کہ وہ تیری پریما کو گناہ کے راستے سے بچائے۔

ہاں نجمہ کیا تو یہ سننا چاہتی ہے کہ میرے پتی دیو کے آخری شبد کیا تھے؟

"میری پیاری پریما! دنیا بری جگہ ہے بہت بری مکروفریب، دغا، جفا، یاس اور بےبسی اور بہتان اور تہمتیں یہی چیزیں ہیں جن سے یہ آباد ہے۔ آسمان سے میری آنکھیں تجھے اور صرف تجھے ہی دیکھیں گی کہ میری پریما میرے بعد اس گناہ سے آلودہ دنیا میں کس قسم کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ وہ اپنے دامن کو اس گندگی سے بچاتی ہے کہ نہیں۔ پریما اس وقت تیرے قدم کی ایک لغزش بھی تباہی کا پیغام لائے گی۔"

نجمہ! سن لیا تو نے کیسی نصیحت ہے؟ اب میرا بھی یہی فرض ہے کہ اپنے پتی کی اس وصیت پر عمل پیرا رہوں اور ان کی آتما کو شانتی پہنچاؤں۔

میری نجمہ! کیا تو دو دن کے لیے جان جگر کے پاس نہیں آسکتی جب زبانی بہت سی باتیں ہونگی اور آنسوؤں سے بڑی تسلی نصیب ہوگی۔ بھلا ہمارے رونے کا مقابلہ ساون اور بھادوں کیا خاک کرسکتے ہیں اس میں ہماری ہی جیت ہوگی۔ اچھا نجمہ اب دل بہت غمگین ہے اس سے زیادہ لکھا نہیں جاتا معاف کر۔ اگر زندگی باقی رہی تو پھر لکھونگی اب اس ایک مشغلے کے سوا کیا رہ گیا کہ داستان غم تجھ کو سناؤں بشرطیکہ تو سن سکے؎

فسانہ جگر و قلب خونچکاں سن لو
جو سن سکو تو ہماری داستاں سن لو

بیوہ بہن (پریما)

ایس۔ ملک ارجن (عثمانیہ)

کمی

کسی کے لطف میں گرچہ کمی نہیں ہوتی
مزاج حسن میں اب برہمی نہیں ہوتی
یہ زندگی بھی مگر زندگی نہیں ہوتی!
نہ جانے کس کے لیے بیقرار ہوں اب بھی!

خمار چشم کی زد میں ہے زندگی ابتک
کمر کے لوچ میں رقصاں ہے سرخوشی ابتک
وہی ہے حسن میں شان سپردگی ابتک!
نہ جانے کس کے لیے بیقرار ہوں اب بھی!

وہی دماغ پہ گو بیخودی سی طاری ہے
کسی کے پاؤں پہ سر، لب پہ ذکر باری ہے
کسی کی کاکل برہم سے چھیڑ جاری ہے!
نہ جانے کس کے لیے بیقرار ہوں اب بھی!

وہی ہیں موسم سرما کی چاندنی راتیں
وہی شراب سے دھوئی ہوئی ملاقاتیں
کبھی فراق کبھی انتظار کی باتیں!
نہ جانے کس کے لیے بیقرار ہوں اب بھی!

کسی کا پھول سا گو ہات میرے ہات میں ہے
طلوع حسن کا عالم اندھیری رات میں ہے
خمار نیم شبی گرچہ بات بات میں ہے!
نہ جانے کس کے لیے بیقرار ہوں اب بھی!

تصورات میں پاکیزہ لالہ زار بھی ہیں
خیال و خواب سے پیارے گل بہار بھی ہیں
مرے شباب کے مانند آبشار بھی ہیں!
نہ جانے کس کے لیے بیقرار ہوں اب بھی!

نفس نفس میں پریشاں جمال شوق بھی ہے
حسین ہونٹوں پہ رنگ سوال شوق بھی ہے
کمال شوق بھی ضبط کمال شوق بھی ہے!
نہ جانے کس کے لیے بیقرار ہوں اب بھی!

ہوائیں نغمۂ عہد بہار گاتی ہیں
فضائیں چاندنی پی کر بہکتی جاتی ہیں
نگاہیں دل کے دھڑکنے میں کیف پاتی ہیں!
نہ جانے کس کے لیے بیقرار ہوں اب بھی!

[illegible]

ایک کہانی

رضیہ نے آنسو بہاتے ہوئے کہا "ڈاکٹر صاحب میرا وقت قریب آچکا ہے اس لیے میں چاہتی ہوں کہ اپنی داستان زندگی آپ سے بیان کروں۔ وہ کہانی جس میں میری زندگی کا راز پنہاں ہے ممکن ہے اس کے کہہ دینے سے میرے دل میں لگی ہوئی آگ سرد پڑ جائے۔ غور سے سنیے میری کہانی دلچسپ اور عبرت سے معمور ہے۔ میں متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں آج سات سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ میں اپنا گھر چھوڑنے پر مجبور ہوئی اور پھر قسمت کی گردش نے مجھے نئے نئے روپ دکھائے۔ جب میں انٹرنس کا امتحان کامیاب ہوئی تو میرے والدین کو میری شادی کی فکر دامن گیر ہوئی۔ آہ کسے معلوم تھا کہ یہی کامیابی اور اس کی مسرت میری تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ بنے گی۔ بچپن ہی سے مجھے چچازاد بھائی ممتاز سے محبت تھی اور جب ہم بڑے ہوئے تو ہماری یہ محبت عشق کی نوبت تک پہنچ گئی۔ آہ ممتاز کے ساتھ گذری ہوئی ایک ایک ساعت اب تک میرے سینے پر نقش ہے اس کے "الفاظ محبت" ابھی تک میرے کان میں بار بار گونج رہے ہیں میری دلی آرزو تھی کہ اپنے جسم و جان کو ممتاز کے قدموں پر نچھاور کر دوں مگر میرے والدین اس چیز کے لیے تیار نہ تھے کہ میری شادی ممتاز کے ساتھ ہو۔ باوجود ممتاز کی منت و سماجت کے میرے والدین راضی نہ ہوئے کیونکہ ممتاز کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ قصہ مختصر یہ ہے ہزار انکار اور نارضامندی کے باوجود مجھے ایک ایسے شخص کے حوالے کر دیا گیا جو کسی طرح مجھے پسند نہ تھا آپ اسے جو چاہیں کہیں مگر یہ فطرت انسانی ہے کہ انسان ایک چیز کو پسند کرتا ہے میں دل سے مجبور تھی اپنے شوہر کو کسی طرح پسند کرنے پر تیار نہ تھی۔ میرے شوہر اور مجھ میں کچھ مناسبت نہ تھی [illegible] اور

جاہل تھے اور میں پڑھی لکھی اس لیے ان کا ہم سے کم ہی تعلق رہا۔ البتہ مالدار ضرور تھے۔ ان کی دولت اور ثروت نے میری روح کو نہیں میرے جسم کو ایک بے حس جسم کو خرید لیا تھا۔ امیروں کی دولت غریبوں کی آزادی زندگی اور عصمت خریدنے کے لیے ہوتی ہے اپنی دولت ہی سے تو وہ غریبوں کی عصمت اور عزت سے کھیلا کرتے ہیں۔ بہرحال میرا ان کا نباہ ناممکن تھا۔ میں دولت کی بھوکی نہ تھی بلکہ محبت کی۔ میرا دل ممتاز کے نذر ہو چکا تھا۔ وہ دولت کے نشہ میں مجھ جیسی پاک شے کو لینا چاہتے تھے آخر ان کو آہستہ آہستہ ہماری محبت کا علم ہو گیا ہماری زندگی ناخوش گوار گذرنے لگی۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے ایک سال کے اندر ہی مجھے طلاق دے دیا گیا۔ والدین کے دروازے میرے لیے بند تھے۔ اپنی عزت اور دوشیزگی کو چور کرنے کے بعد میری صورت اس قابل نہ تھی کسی شخص کو دکھانے کے قابل نہ تھی کسی شخص سے شادی یا نکاح کا پھر خیال کرنا سماج، دنیا والوں اور نیک بندوں کی لعنتوں اور ملامتوں کا مرکز بننا تھا۔

رضیہ کے گال پر آنسو ڈھلک رہے تھے۔ ڈاکٹر حیرت اور تعجب سے اس کی کہانی سن رہا تھا۔ "اب میرے لیے فلم کمپنی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اس کو غنیمت سمجھا۔ کیا کرتی پیٹ بھرنا تھا۔ فلم کمپنی میں پہنچ کر مجھ جیسی حسین اور تعلیم یافتہ عورت کا مشہور ہونا کوئی تعجب کی بات نہ تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے اپنی عزت اور عصمت کی قربانی کرنا پڑی۔ شہرت اور دولت میں ترقی کے لیے یہ ضروری تھی کیا کرتی مجبور تھی۔ غرض کامل تین سال تک فلم کمپنی میں ملازم رہی مگر اس گندہ اور گناہ آلود زندگی نے طبیعت اکتا دی۔ میں نے ملازمت چھوڑ دی۔ تھوڑی بہت جو پیسہ اور دولت تھے اپنی زندگی گذارنے [illegible] فلم کمپنی کی ملازمت نے [illegible]

آرائشی مدتیں بالیش ہیں اور اضافہ کر دیا تھا چنانچہ میں
روزانہ بناؤ سنگھار کر کے آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی
اور اپنے وجود جسم اپنے قدرتی حسن اور آرائش و زیبائش
دیکھتی تو جذبات سے مغلوب ہو جاتی تھی۔ اس وقت مجھے
میرا محبوب عثمان یاد آتا کاش اس وقت میرے پاس موجود
ہوتا مگر وہ کہاں اور میں کہاں۔ دولت حسن کا ساتھ دیتی
ہے جو میرا بھی میری آرائش نے جو فطرت ثانی بن چکی تھی
آہستہ آہستہ سادگی پوری ختم کرالی اور میں پھر سے مبتلائی
اور فاقہ زدہ ہو گئی۔ پیٹ کی آگ بری ہوتی ہے اس نے
دوسرا راستہ سوجھایا۔

میرے لیے حسن پرستوں اور ہوس کاروں کی کمی
نہ تھی۔ صبح سے شام تک میری چوکھٹ پر مجمع لگا رہتا مگر
اب میری حیثیت ایک بازاری حسن فروش سے زیادہ
نہ تھی۔ شرافت و عزت کے آئینے چکنا چور ہو چکے تھے
صبح سے شام تک پرستاروں اور شیدائیوں کا مجمع رہتا،
ہر شخص اپنی محبت میں سرشار اور اس کا اظہار اس طرح
کرتا کہ مجنوں بھی اس کے آگے گرد ہوتا۔ فرہاد پانی بھرتا
مگر میں خوب سمجھتی اور جانتی تھی کہ ان کی محبت کی کتنی
قیمت ہے اور یہ محبت وہی جو بلبل کو پھول سے ہوتی ہے
جب تک پھول کا جوبن اور رعنائی زینت گلستاں ہو سب
اس کی طرف لپکتے ہیں لیکن جب خزاں کا نفس گرم اسے
جھلس ڈالتا ہے۔ اور ترو تازگی کافور ہو کر پنکھڑیاں مرجھا
جاتی ہیں تو پھر کوئی اس کی طرف دیکھتا ہی نہیں۔ مگر اس
کے باوجود مجبور تھی اور وہ کرتی جس سے میرا دل نفرت کرتا
جس سے میرا ضمیر متنفر کرتا۔ ان لوگوں کو خوش کرنے کے لیے
بناوٹی قہقہے لگاتی ان کی دلجوئی اور تسخیر قلب کرتی۔ مگر
میرا دل روتا تھا میرے تبسم میں میرے دل کی آہیں پنہاں
ہوتیں میری باتوں میں میرے دل کی درد بھری داستان
پوشیدہ ہوتی۔ مگر نفس اور ہوس پرستی کے بندوں کو

کیا اچھا ہی تھا غور تو کیجیے کہ کیسے کیسے لوگ میرے در پر
جبیں سائی کر لیتے تھے۔ وہی لوگ جن کو اپنی شرافت پشت
پشت پر زعم تھا۔ وہی لوگ جو بڑے باعزت اور نیک
مشہور تھے زاہدوں اور عابدوں کا زہد و تقوا بھی شاید
میرے دروازے پر ہی مرتا نوٹ گیا تھا تو جوانوں کا تو ذکر ہی
کیا ایسے مقدس انسان بھی میری پابوسی کرتے نہ جھجکتے جن کے
چہرے نورانی داڑھی سے منور ہوتے۔ انہوں نے دنیا کی
آنکھوں میں خاک جھونک کر اپنے آپ کو نیک مشہور کیا
تھا مگر میرے آگے ان کے سب طلسم ٹوٹ چکے تھے۔ مجھے ان
لوگوں سے سابقہ تھا جو شراب کے نشہ میں چور میرے
کمرے میں لوٹتے پھرتے ہیں ان زاہدوں نورانی بزرگوں
اور ان شرابیوں سے نفرت کرتی ان کو ٹھکراتی مگر پھر بھی
یہ لوگ اپنی شیطانی فطرت سے باز نہ آتے میرے در پر جبیں سائی
کرتے۔ میں بھی اپنے پیشے کا خیال کر کے چپ ہو جاتی اور دنیا کا
تماشا دیکھتی۔

آہ وہی لوگ جن کو معذوروں محتاجوں اور فقیروں کو
ایک حبہ خیرات دینا بار معلوم ہوتا تھا! مجھ ایسی معمولی
معمولی ادا اور اشارے پر ہزاروں روپیہ نچھاور اور تصدق
کر دیتے تھے۔ کیا انصاف کے یہی معنی ہیں کہ عبادت گذار اللہ
محتاجوں غریبوں کو ایک وقت پیٹ بھر کھانا نصیب ہو
لیکن عیاشوں حسن پرستوں اور بدکاروں کے جیب
دولت سے بھاری ہوں۔ خداوندا! تیرے کارخانے
تو ہی جانے۔ غرض زمانہ گذرتا گیا تقریباً چار سال
عصمت فروشی میرا ذریعہ معاش بنا رہا لیکن یقین
جانیے ممتاز کی یاد مجھ [illegible]
نہ ہوئی۔ میں خود اپنی اس زندگی سے متنفر اور شرمندہ تھی
مگر کیا کرتی پیٹ بھرنا تھا۔ [illegible]
اور سوسائٹی کی [illegible]
[illegible]

پرتھوی ولبھ
جگمگاتا
یہ قدیم زمانے کا ایک زرین ورق پیش کرتا ہے ۔ منروا نے اس کی تیاری پر
۲ لاکھ سے زاید روپیہ صرف کیا ہے! جس کو مشہور تاریخی ہدایت کار مسٹر
سہراب مودی نے اپنی پوری قابلیت سے بنایا ہے! جس میں چند خاص
اداکار اور ہزاروں دوسرے اداکار کام کر رہے ہیں!
اپنے چست مکالمے، شاندار سٹینگز اور اعلیٰ ہدایت کاری میں جواب نہیں رکھتا۔
اداکار = سہراب مودی۔ درگا کھوٹے۔ سنکشا پرشاد۔ مینا۔ صادق علی۔ کے این سنگھ کمن وغیرہ
نشاط سینما
عابد روڈ۔ حیدرآباد

ایجادات

پھدکنے والی موٹر گاڑیاں

ولیم اسٹاوٹ مشہور ہوائی جہاز بنانے والے نے بیان کیا ہے کہ جنگ کے بعد استعمال کے لیے ایک ایسی موٹر گاڑی بنائی جائیگی جو سڑک پر ۰۰ میل گھنٹہ اور ہوا میں ۰۰ میل ایک گھنٹہ کی رفتار سے چلے گی۔ یہ ہوائی موٹر گاڑی تین مسافروں کو لیجا سکے گی۔ اس کا وزن ۰۰ ۵ اپونڈ یعنی ہلکی موٹر گاڑی کا آدھا ہوگا۔ ہوا میں اڑنے کے لیے گاڑی میں پنکھے ہوں گے۔

اسٹاوٹ نے یہ بھی بیان کیا کہ عمومی استعمال کے لیے بھاپ سے چلنے والے جہاز ہوں گے جن میں دو سے پانچ تک مسافر سفر کر سکیں گے۔ سڑک پر چلنے والے ہوائی جہاز بھی ہوں گے۔

سائنس

دھاتوں سے مویشیوں کو موٹا کیا جا سکتا ہے

ابرڈین کے ڈاکٹر اے۔بی اسٹورٹ جو طبقات ارض کے ماہر ہیں انہوں نے یہ دریافت کیا ہے کہ اگر ۲۰ حصے معدن کوبالٹ (جو سرخی مائل بھورے رنگ کی دھات ہے اور نکل سے بڑی حد تک مشابہت رکھتی ہے) دس کروڑ حصے زمین میں داخل کی جائے تو نہایت زرخیز چراگاہ تیار ہو جائے گی اور اس چراگاہ سے مویشیوں کی اچھی نشو نما ہوگی اور وہ بہت موٹے ہوں گے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے تجربے کے طور پر ایک کھیت کے دو حصے کیے ان میں سے ایک حصے میں کوبالٹ ڈالا اور دوسرے حصے کو طبعی حالت میں چھوڑ دیا تھا کوبالٹ والے حصے پر مویشیوں کی نشو نما حیرت انگیز رہی اس طریقے کو وسیع پیمانے پر کام میں لایا جا رہا ہے۔ کیونکہ

یہ سستا بھی ہے اور ایک ایکڑ زمین کے لیے صرف ۸ شلنگ قیمت کی کوبالٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔

مچھلیوں میں مصنوعی اضافہ

سر جان گراہم کر جو گلاسگو یونیورسٹی کے پروفیسر اور حیوانیات کے ماہر ہیں۔ اسکاٹ لینڈ کے لوکس مچھلیوں پر تجربے کیے ہیں جس سے مچھلیوں کی زندگی میں دس گنا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ پانی میں نائٹروجن اور فاسفیٹس شامل کر دینے سے مچھلی کی تعداد میں ایک ہزار فیصد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور مچھلیاں بہت موٹی ہو جاتی ہیں۔ یہ طریقہ عمل آج کل سمندری اور دریائی مچھلیوں پر کیا جا رہا ہے۔

حشرات کھاد کا کام دیتے ہیں

سائنس دانوں نے معلوم کیا ہے کہ جب بھاپ مٹی میں سے گذاری جاتی ہے تو نقصان پہنچانے والے جراثیم مر جاتے ہیں لیکن فائدہ پہنچانے والے جراثیم نہیں مرتے اور زمین کی قوت پیداوار میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔ کاشتکاروں اور سائنس داں کے ایک طبقے نے اس طریقے سے تقریباً دو ہزار ایکڑ زمین کاشت شروع کر دی ہے۔

سمندری جراثیم سے غذا

جنگ کے زمانے میں غذا کی فراہمی کے لیے سائنس دانوں نے ایک انوکھی تحقیق کی ہے جس کے ذریعے سمندر سے بھی غذا حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ غذا ان کیڑوں سے تیار کی جا سکتی ہے جو چھوٹے چھوٹے جراثیم کی شکل میں ہیں اور جو سمندر اور مچھلیوں میں پائے جاتے ہیں اور جن کو مچھلیاں کھاتی ہیں۔ ان کیڑوں کو پلنکٹن کہتے ہیں۔

سر جان گرنے یہ تحقیق کی کہ ان کیڑوں سے ناشتہ

اور جانوروں کے لیے قوت بخش غذا تیار کیا جا سکتی ہے۔ اس کی تحقیقات ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے لیکن تجربہ کرنے والوں کا بیان ہے کہ وہ عظیم کامیابی سے قریب پہنچ چکے ہیں۔

دلچسپیاں

الٹی گنگا

بخارسٹ میں ایک اعلامیہ کے ذریعے رومانیہ کی تمام عورتوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ اتنے لمبے لہنگے پہنا کریں کہ سائیکل اور موٹر سائیکل چلاتے وقت ان کے گھٹنے نہ دکھلائی دیں۔ جو کوئی اس حکم کی خلاف ورزی کرے گا اس کو سزا دی جائے گی اور ایک مرتبہ سے زیادہ خلاف ورزی کرنے والوں کو مزدوروں کے کیمپ میں بھیج دیا جائیگا۔

گہوارے سے قبر تک

مولڈ فلنٹ تا جرمیں سو گز لمبی ایک سڑک ہے جس کا نام گہوارے سے قبر تک ہے اس سڑک پر آپ کو ہر وہ چیز ملے گی جس کی شہود سے عدم تک ضرورت پڑتی ہے۔ بچوں کی پیدائش کے لیے وہاں پر زچگی خانہ اور ڈاکٹر مل جائے گا۔ اس کے بعد بچوں کے کپڑوں کی دکان۔ دوا گھر۔ کپڑا بیچنے والے۔ مٹھائی بیچنے والے۔ پھل والے۔ نان بائی۔ تمباکو والا۔ حجام۔ پبلک آرام گاہ۔ کلب اور نائٹ کلب بھی ملیں گے۔ پھل پھول کی دکان۔ شادی گھر۔ بیمے کا دفتر۔ جوہری۔ دانت بنانے والے۔ بوٹ درست کرنے والوں کی دکانیں۔ پیدائش کے اندراج کا دفتر۔ محافظین شہر۔ اور وکیل کا دفتر تک نظر آئے گا۔ اس کے علاوہ تجہیز و تکفین کے سامان کی دکان یہاں تک کہ قبرستان تک اس سڑک پر موجود ہے۔

ٹرین میں زچگی

چلتی ریل گاڑی ٹھہر سکتی ہے لیکن بچوں کی ولادت کو روکا نہیں جا سکتا بسفر ہو یا حضر۔ حال ہی میں ایک آئی۔ ٹی۔ [illegible] طوفان [illegible] کو [illegible] اسٹیشن پر ایک گھنٹے [illegible] اس لیے ٹھہرنا پڑا۔ اس گاڑی میں ایک ذات بابرکات کتم عدم سے منصہ شہود پر تشریف لا رہے تھے اور اس گاڑی سے سفر کرنا چاہتے تھے۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک خاتون انٹر کلاس کے مردانے ڈبے میں سفر کر رہی تھیں۔ اور عجیب کشمکش کی حالت میں تھیں کیونکہ ان کو بار بار یہ محسوس ہوتا تھا کہ بس اب اور اب بچہ پیدا ہونے کو ہے۔ اس کا علم ریلوے کے حکام کو بھی ہو گیا۔ اور انہوں نے ریل کو ٹھہرا لیا اور زچگی کا انتظام کر دیا۔ انتظامات کی تفصیل کے لیے آپ ریلوے بورڈ کی آنے والی سالانہ رپورٹ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

ہم اپنی جانب سے بطور یادگار اس نومولود کا نام اگر صنف غالب ہے تو ریل ٹیک اور اگر صنف نازک ہے تو ریل چھیڑ تجویز کرتے ہیں۔

وائلن کے راگ سے دوا کا کام

اسٹاکہوم [illegible] میں ایک آٹھ سالہ لڑکی ۶۵ دن تک سوتی رہی اس کو بیدار کرنے کے لیے ہر طبی طریقے کو استعمال کیا گیا۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی آخر کار اس کی ماں نے یہ خیال کر کے کہ گانا بجانے سے لڑکی کو بہت محبت ہے شاید دواؤں کے مقابلے میں زیادہ موثر ثابت ہو۔ اس لیے اس نے اس آدمی کو طلب کیا جو لڑکی کو وائلن سکھایا کرتا تھا۔ استاد نے وائلن بجانا شروع کیا۔ اور لڑکی نے مسلسل نو ہفتوں کے بعد پہلی بار آنکھیں کھولیں۔ لیکن پھر سو گئی۔ استاد نے دوبارہ وائلن بجانا شروع کیا۔ لڑکی ہر مرتبہ آنکھ کھولتی اور سو جاتی تھی ڈاکٹروں کا بیان ہے کہ لڑکی کا مرض دور ہوتا نظر آ رہا تھا۔

لمبی مونچھوں سے فائدہ

بیچ ٹیلڈ کے باشندے مسٹر ڈبلیو ہاپس کی مونچھ کی موجودہ لمبائی ساڑھے اٹھارہ انچ ہے۔ اتنی لمبی مونچھ کے بڑھانے میں موصوف کو ۴ ۱/۲ سال لگے پہلے ان کی مونچھ کی لمبائی ۲۱ انچ تھی۔ لیکن بعد میں انہوں نے مونچھوں کو کٹوا دیا۔ ہاپس نے [illegible] زیادہ لمبی اس لیے رکھی [illegible]

اس بات کا یقین دلا دیا ہے کہ ان کی مونچھیں جتنی لمبی ہوں گی وہ اتنے ہی بڑے عہدے پر پہنچ جائیں گے۔ یہ سچ ہے کہ بعض لمبی مونچھوں والے ہندستان میں بھی بڑے عہدوں پر نظر آتے ہیں۔

جورو کا مزدور

ریلوے کے ایک ملازم نے لاہور کی عدالت میں ایک فوجداری استغاثہ دائر کیا۔ اپنے استغاثے میں اس نے بیان کیا کہ اس کی بیوی بہت سنکی ہے۔ وہ بہت دیر گئے رات کو گھر لوٹتی ہے۔ میں نے اس کو ٹھیک راستے پر لگانے کی بہت کوشش کی لیکن اس نے نہ مانا۔ اب جب کہ میں اس کے معاملات میں دخل نہیں دیتا ہوں تو اس نے مجھے مارنا شروع کر دیا ہے۔ وہ بڑی لڑاکا اور بکی عورت ہے۔ میں اپنی تنخواہ ہر مہینہ اسے دیدیتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے ایسا نہیں کیا اور تنخواہ والے دن گھر سے غائب ہو گیا دوسرے دن وہ میرے دفتر پہنچی۔ اس کے مطالبہ پر میں نے اپنی تنخواہ اس کے حوالے کر دی۔ چونکہ تنخواہ میں دس روپے کی کمی ہو گئی تھی۔ اس لیے اس نے مجھے بہت ہی سخت سست کہنا شروع کر دیا اور مارنے کی دھمکی دی۔ اس وقت سے میں نے اپنے تعلقات اس سے منقطع کر لیے ہیں۔ لیکن وہ اب مجھے خوفناک دھمکیاں دے رہی ہے تاکہ میں اسے واپس بلا لوں

آخر میں مستغیث نے عدالت سے پناہ طلب کی۔

عدالت نے عورت کے نام سمن جاری کر دیا ہے۔

معلومات

بھاپ کا غسل

گرمی کے دنوں میں چہرے کی جلد غیر معمولی توجہ کی محتاج ہوا کرتی ہے۔ گرمی کی وجہ سے مسامات بند ہو جاتے ہیں اور جب تک خاص طور پر حفاظت نہ کیجائے گرد و غبار ان مسامات میں جمع ہو جاتا ہے۔ اور جلد کو بھدا اور کھردرا بنا دیتا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے ہفتے میں ایک بار بھاپ کا غسل جلد کیلیے مفید ہوگا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک برتن میں خوب گرم پانی لو اور اس میں آدھے لیموں کا عرق ملا دو۔ پھر تولیہ کو سر سے اس طرح باندھو کہ تمہارا چہرا اچھی طرح ڈھک جائے اس کے بعد برتن کے اوپر جھک جاؤ اور اتنی دیر تک ٹھہرے رہو کہ تمہارے چہرے کو خوب اچھی طرح بھاپ لگ جائے۔ اس کے بعد تم اپنے چہرے کو صابن سے اچھی طرح دھو ڈالو اس طرح مسامات سے سارا میل نکل جائے گا چہرے کو پھر اچھی طرح دھو ڈالو جس سے مسامات بلکل صاف ہو جائیں گے۔

کتابوں کی کمی

کاغذ کی پابندی کی وجہ سے پچھلے سال برطانیہ میں صرف ۷۰۴۲ نئی کتابیں طبع ہوئیں حالانکہ امن کے زمانے میں ان کا اوسط دس ہزار تو سو تھا۔

جرمانہ

برطانوی پولیس کی عدالتوں میں جرمانے کی جو رقم عاید اور وصول کیجاتی ہے اس کا اوسط تقریباً سات لاکھ پچاس ہزار پونڈ یا ..... ۱۱۲۵ روپے ہے

دنیا کے چار عجیب و غریب دریا

۱۔ اس میں سے ایک ملک الجیریا میں ہے جس کو لوگ روشنائی کا دریا کہتے ہیں۔ اس کا یہ نام محض یوں ہی نہیں ہے بلکہ حقیقت پر مبنی ہے کیونکہ نہ صرف اس کا رنگ بلکہ اس کی کیمیائی ترکیب بھی بلکل روشنائی کی طرح ہے۔

اس اصل روشنائی کے دریا کے دو سر چشمے ہیں جن میں سے ایک میں فولاد کے نمکیات اور دوسرے میں گیلک ایسڈ [illegible] بڑی کثرت سے پایا جاتا ہے۔ اور یہی اجزا ہیں جن کی ترکیب سے روز مرہ کے استعمال کی روشنائی تیار کیجاتی ہے اس حیرت انگیز دریا کا پانی کافی گاڑھا اور لکھنے کے کام میں لایا جا سکتا ہے۔

۲۔ ایک دوسرا عجیب و غریب دریا امریکہ کی ریاست نبراسکا میں ہے۔ اس کے پانی کا ذائقہ میٹھا ہے۔ ابتک سائنس اس کی وجہ دریافت کرنے سے قاصر ہے۔

یہ دریا غیر متوقع طور پر ۱۹۳۰ء میں عالم وجود میں [illegible]

اور اس وقت سے اس کی وسعت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ماہرین طبقات ارض کی رائے میں قدرت کا یہ نادر عجوبہ زیر زمین پانی کی سطح کے غیر معمولی طور پر اونچا ہو جانے کی وجہ سے ظاہر ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے آخرکار ایک سطحی دریا رونما ہو گیا۔

۳۔ چلی اور ارجنٹائن کے درمیان ایک دریا بطور حد فاصل ہے جو ترش دریا کے نام سے موسوم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پانی کا مزا عرق لیموں کی طرح کھٹا ہے۔ اس میں سے اگر ایک گلاس پانی لے لیا جائے اور اس میں تھوڑی سی شکر ملا دیا تو لیمونیڈ بن جاتا ہے۔

۴۔ ایک اور دریا مشرقی افریقہ میں ہے جس کا نام انگاری نیوکی ہے۔ اس کے پانی کا مزا کڑوا ہے عجیب و غریب بات یہ ہے کہ جو جانور اس کے پانی کو پیتے ہیں ان پر کوئی مضر اثرات ظاہر نہیں ہوتے۔

نوح کی کشتی مل گئی

وہ کشتی جو طوفان سے نجات پانے کے لیے حضرت نوحؑ نے بنائی تھی۔ آخرکار آرمینیا میں پہاڑ کی چوٹی ارارات پر مل گئی۔ حضرت نوحؑ نے یہ کشتی گوفر کی لکڑی سے تیار کی تھی۔ یہ لکڑی بہت سخت ہوتی ہے اور دنیا میں غالباً صرف یہی ایک لکڑی ہے جو صدیوں تک ہر موسم کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ اس لکڑی سے اتنی ہی بڑی دوسری کشتی تیار کرنا مشکل ہوگا کیونکہ اب دنیا میں یہ لکڑی کافی مقدار میں باقی نہیں رہی۔

عام روایت ہے کہ حضرت نوحؑ کی یہ کشتی ارارات پہاڑ پر جاکر ٹھہر گئی تھی۔ ان پہاڑوں پر رسائی بہت مشکل ہے اور یہی وجہ ہے کہ بہت سی جماعتوں نے ان چوٹیوں تک پہنچنے کی کوشش کی اور ناکام واپس ہو گئیں۔ مگر یہ جماعتیں خالی ہاتھ واپس نہیں آئیں بلکہ اپنے ساتھ افواہیں اور داستانیں لیتی آئیں کہ ایک بڑا جہاز ایک پہاڑ کی چوٹی پر رکھا ہوا ہے۔ بدقسمتی سے ان افواہوں کے متعلق کسی کو کوئی سائنٹفک تحقیقات نہیں کی گئیں کیونکہ کوئی اس کا یقین نہیں کرتا تھا کہ لکڑی کا ڈھانچہ اتنے زمانے تک عناصر کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ ان علاقوں کی زبانی قصے مشہور ہیں کہ یہ عجیب و غریب ڈھانچہ اوپر سے دیکھنے میں پتھر کے مانند معلوم ہوتا ہے۔ اور بالکل جہاز کے مشابہ ہے جو پہاڑ کی ایک چوٹی پر ٹھیرا ہوا ہے۔ چونکہ بہت سے ہوابازوں نے متواتر اس قصے کو بیان کیا ہے اس لیے اب سائنسدانوں نے مہاتی جماعتوں کی پچھلی اطلاعوں پر غور و فکر کرنا شروع کر دیا۔

ان میں سے ایک مشہور چرچ آف انگلینڈ کا آرکڈیکن نوری ہے جو بارہ زبانیں بول سکتا ہے۔ آرکڈیکن نوری نے حلفیہ بیان کیا دو مرتبہ ناکام کوششوں کے بعد وہ ارارات کی چوٹی پر چڑھ گیا اور اس نے نوح کی کشتی کے باقیات دیکھے۔ اور ان کی چھان بین کی۔ یہ کشتی ایک بڑی چٹان سے پیوست ہے۔ اور اس کا آدھا حصہ برف سے ڈھکا ہوا اور بالکل محفوظ ہے۔ اس بیان کے درست ہونے کا اس لیے بھی امکان ہے کہ چوٹی پر درجہ حرارت مستقل طور پر نقطۂ انجماد سے نیچے رہتا ہے۔

آرکڈیکن نوری ایک مشہور مذہبی معلم ہونے کے باعث ہر حیثیت سے قابل اعتماد ہے۔ اس نے کشتی کے اندرونی حصے کی اچھی طرح پیمائش کی اور واپسی پر اس کا مقابلہ اس پیمائش سے کیا جو انجیل مقدس میں بتلائی گئی ہے۔ دونوں پیمائشیں بالکل برابر ثابت ہوئیں۔

یقین ہے جنگ کے بعد ارارات پہاڑ پر کوئی نہ کوئی جماعت بھیجی جائے گی اور اگر آرکڈیکن کا بیان درست ہے تو یہ دنیا کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہم دریافت ہوگی۔

ڈیول گھرانا

ولیم فاتح ۱۰۶۶ء میں جب انگلستان داخل ہوا تو اس کے ساتھ ایک فوجی شریف انسان ولیم ڈی ڈیول بھی تھا۔ ۱۰۶۶ء میں ولیم ڈی ڈیول موجودہ شہر وانشر کے بزرگوں سے تھا۔ ڈیول کے نام کی ہجا دو مختلف طریقوں سے کی جاتی ہے۔ انگلستان کی تاریخ میں اس خاندان کی نمایاں کارگزاریاں رہی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ڈی ڈیول نے بیت المقدس کی صلیبی جنگ میں حصہ لیا تھا۔ جہاں کئی

صدیوں کے بعد آرچی بالڈ پرسی ویول نے فوج کی کمان کی۔ لیکن اس ویول نسل میں کسی کو ایسا اہم کام سپرد نہیں کیا گیا جیسا کہ موجودہ پرسی ویول کے ذمے ہے۔ اور اگر انہوں نے اپنے کام کو پورا انجام دیدیا تو ویول خاندان میں ان کی شخصیت سب سے بڑی ہوگی۔

فیلڈ مارشل ویول کی عمر اس وقت (۶۰) سال کی ہے الڈر شاٹ میں جب وہ افسروں کو ٹرننگ دیرہا تھا تو اس نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اپنے آپ کو ڈاکو سمجھو۔ فرض کرو کہ تم ایک جوہری کی دکان میں نقب لگانے جارہے ہو اور دکان کو لوٹوگے تو تم کو چاہیے کہ تم اس طرح تمام مال لیکر آجاو کہ تمہیں کوئی گرفتار نہ کرسکے۔ ایسی اہم کام کا خاکہ بھی اس طرح تیار کرو۔

دس سال پہلے جب وہ میجر جنرل تھا۔ اور سیکنڈ ڈویژن الڈر شاٹ کی کمان کررہا تھا تو اس نے کہا کہ ایک بڑے جنرل میں ایک جواری کی جھلک ہونی چاہیے۔ اچھے جنرل اچھے دوڑ کے گھوڑوں کی طرح ہوتے ہیں۔

وہ ایک غیر معمولی سپاہی اور پھر پڑھنے لکھنے کا شوقین ہے۔ افسانے پسند نہیں کرتا۔ اشعار پسند کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہمیشہ سفر کرتے وقت ۰۸ کتابیں اشعار کی ہوتی ہیں۔ اس کا مخصوص اور پسندیدہ شاعر ریاد ننگ ہے۔

اس کا جسم فولاد کی طرح مضبوط ہے۔ اس کی ایک آنکھ سنہ ۱۹۱۴ء کی لڑائی میں جاتی رہی اس کے پاس ایک چشمی عینک رہتی ہے لیکن اسے بہت کم استعمال کرتا ہے۔

اگر ویول کے عہد حکومت میں ہندستان کو آزادی ملجائے تو دو واقعات کی اتفاقی طور پر مطابقت ہوگی۔ کیونکہ ویول کے دادا میجر جنرل آرتھر ویول نے میکسیکو کو اس کی جنگ آزادی میں مدد دی تھی۔ اس نے ریاست ہائے امریکہ کو بھی متحدہ کرنے میں کچھ کم حصہ نہیں لیا اس کو سنہ ۱۸۲۵ء میں ہزاروں ایکڑ زمین شمالی ٹکساز میں جو اس وقت میکسیکو کا حصہ تھا بطور انعام دیگئی۔ سرخ دریا کے جنوب کا ضلع جو گرنڈ شکست دریا تک پھیلا ہوا تھا۔ ویول کی نوآبادی کے نام سے موسوم تھا آرتھر ویول کی اس نوآبادی کے لوگوں نے بعد میں ٹکساز کو آزاد جمہوریت قرار دیا اس کے بعد سنہ ۱۸۴۵ء میں اس کو ریاست ہائے امریکہ میں شامل کر دیا گیا۔

جرمانا امریکہ میں دو بچے ہیں جن کے نام ذوراسٹر اور جوپیٹر تھا۔ امریکہ کی حکومت نے ان بچوں کے والدین پر ایسے ناموں کے رکھنے کی پاداش میں جرمانا کیا ہے۔

بدنصیب ہندستان دارالامرا میں بیان کیا گیا ہے کہ لندن کے ہوٹلوں میں لباس تبدیل کرنے کے کمرے کے دربان کو ہر ہفتہ (۱۴۰) پونڈ بطور انعام ملا کرتے ہیں اور یہاں ایک ہندستانی کی ماہانہ آمدنی [illegible]

فوٹوگرافی فوٹوگرافی جلد سیکھنے کے واسطے ذیل کی ہدایا مبتدی کے واسطے نہایت ضروری ہیں۔

(۱)۔ سامان عمدہ ہو۔ (۲)۔ ادویات اور مصالحہ جات ہر وقت تازہ استعمال کئے جائیں۔ (۳)۔ ہر ایک دوا الگ الگ بوتل میں رکھی جائے اور اس پر دوا کا نام لکھا ہو۔ بوتلیں بلو کے ڈھکنے والی ہوں۔

(۴)۔ مشکوک دوا کبھی استعمال نہ کی جائے۔ (۵) ہر ایک چیز مٹی گرد۔ دھوپ اور پانی سے بچاکر رکھی جائے۔ (۶) تولیں ہاتھ اور برتن صاف کرنے کے واسطے پانی آلیتہ بافراط استعمال کرنا چاہیے۔

(۷)۔ جو دوا استعمال کیجائے وزن کرکے ڈالی جائے

(۸)۔ کام کرنے میں کبھی گھبرانا نہیں چاہیے۔ استقلال سے کریں۔ اگر ایک دفعہ بگڑ جائے تو دوسری دفعہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(۹)۔ اگر کسی دوا کو ہاتھ لگائیں تو بعد میں ضرور ہاتھ دھو لیا کریں۔ چاہے دوبارہ دوا کو ہاتھ پھر لگانا پڑے کیونکہ فوٹوگرافی کی تمام ادویات زہریلی ہوتی ہیں۔

(۱۰)۔ جو کام متعلقہ فوٹوگرافی کریں ایک نوٹ بک میں درج کر لیا کریں تاکہ آیندہ آپ کی غلطی رفع ہوجائے۔

یہ دس باتیں ضرور یاد رکھنی چاہئیں۔ اب ان چیزوں کے نام لکھے جاتے ہیں جو کام شروع کرنے کے واسطے خریدنا ضروری ہیں۔

(۱)۔ کیبی نٹ سائز۔ بیلو یا ڈی کیمرہ مکمل معہ سلائیڈ و ٹرپائی۔

(۲)۔ ایک اچھا لینز کم از کم ریپڈ ریکٹی لینئر کیبی نٹ سائز۔

(۳)۔ فوکسنگ کلاتھ ڈیڑھ گز یعنی سیاہ کپڑا۔

(۴)۔ تین عدد ڈیویلپنگ ڈشیس۔ ایک کارڈ سائز دو کیبنٹ سائز۔

(۵)۔ ایک روبی لیمپ۔ سرخ روشن ہونے والا لیمپ آج کل تو بجلی والے گھروں میں لائٹ سے سرخ بلب لگایا جاسکتا ہے، لیمپ کی وہاں ضرورت ہے جہاں لائٹ نہ ہو۔ ورنہ سرخ رنگ کا بلب بہت ہی اچھا ہے۔

(۶)۔ دو عدد مثیر گلاس۔ ایک دو ڈرام کا۔ دوسرا دو اونس کا۔

(۷)۔ دو پرنٹنگ فریم ایک کارڈ سائز دوسرا کیبی نٹ سائز۔

(۸) ترازو باٹ۔ (۹)۔ چند ایک بوتلیں جن کے ڈھکنے بلورین ہوں۔ (۱۰)۔ تین عدد سفید ڈشیں۔ دو کیبی نٹ۔ ایک ۱۲ × ۱۰ انچ۔ (۱۱) فوٹوگرافک فنل ایک۔ (۱۲)۔ ڈرائی پلیٹ ایک درجن کارڈ۔ ایک کیبی نٹ سائز۔ (۱۳)۔ فوٹو ٹریمنگ مشین (۱۴)۔ کاغذ تصویر چھاپنے کے واسطے ایک پیکیٹ۔ (۱۵) ڈیولپ کرنے کے ادویات: پروگنگ ایسڈ۔ برومائیڈ پوٹاش۔

ایک اونس ایک اونس

سوڈا سلفائیٹ۔ سوڈا کاربونیٹ۔ میٹا بائی سلفائیٹ پوٹاش

۱۲ اونس ۴ اونس ایک اونس

(۱۶) ٹون کیمرے کی ادویات۔ گولڈ کلورائیڈ۔ امونیا سلفو سائنیڈ۔ ایک اونس۔ (۱۷)۔ چند ایک ماؤنٹ بھی کا کیبی نٹ کارڈ سائز کے۔

اب ذیل میں وزن بھی درج کر دیا جاتا ہے وزن جو دواؤں کے تولنے اور ناپنے میں استعمال ہوتے ہیں۔

خشک چیز تولنے کے واسطے۔

۲۰ گرین برابر ہے ایک سکروپل نشان ℈

۳ سکروپل ۔۔ ۔۔ ۔۔ ڈرام ۔۔

۸ ڈرام ۔۔ ۔۔ ۔۔ اونس ۔۔

عرق ناپنے کے واسطے

۶۰ پونڈ	برابر ہے	ایک ڈرام
۸ ڈرام	۔۔	ایک اونس
۱۶ اونس	۔۔	ایک پونڈ
۲۰ اونس	۔۔	ایک پائینٹ
۶۴ ½ ملی گرام	برابر ہے	ایک گرین
۱۵ $\frac{۴۳}{۱۰۰}$ گرین	۔۔	ایک گرام
۲۸ $\frac{۱}{۲۵}$ گرام	۔۔	ایک اونس
۴۵۳ $\frac{۱}{۱۶}$	۔۔	ایک پونڈ
۲ ¼ پونڈ	برابر ہے	ایک کیلو
اونس	۔۔	ایک لیٹر
۴½ لیٹر	۔۔	ایک گیلن

ارشمیدس

ایک بہت بڑا ریاضی دان حکیم گذرا ہے جس کے مقابلہ کا آج تک کوئی ریاضی داں نہیں ہوا۔ علم جرثقیل کا ماہر تھا۔ اس کا دعوا تھا کہ اگر مجھے زمین کے سوا کوئی جگہ ملجائے تو میں اپنی کلوں کے ذریعے اس زمین کو کھینچ لوں۔ اس نے اجرام فلکیہ کی حرکات معلوم کرنیکا ایک آلہ تیار کیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک آتشی شیشہ ایسا ایجاد کیا تھا کہ گھر بیٹھے کوسوں دور کی چیز کو پھونک سکتا تھا۔ ۲۱۲ق م میں ایک ہیئت کے مسئلے کو حل کرتے ہوئے رومیوں کی لڑائی میں ایک جاہل سپاہی کے ہات سے قتل ہوا۔

انبیا علیہ السلام کی عمریں

۱۔ حضرت آدم علیہ السلام ۹۳۰ برس

۲۔ حضرت شیث علیہ السلام ۹۱۲ ۔۔

۳۔ حضرت ادریس علیہ السلام ۳۶۵ ۔۔

۴۔ حضرت نوح علیہ السلام ۹۵۰ ۔۔

۵۔ حضرت ہود علیہ السلام	۴۶۵ برس
۶۔ حضرت صالح علیہ السلام	۵۸۵ "
۷۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام	۱۹۵ "
۸۔ حضرت اسماعیل " "	۱۳۷ "
۹۔ حضرت اسحاق " "	۱۳۰ "
۱۱۔ حضرت یعقوب " "	۱۳۷ "
۱۱۔ حضرت یوسف " "	۱۱۰ "
۱۲۔ حضرت موسیٰ " "	۱۲۵ "
۱۳۔ حضرت عیسیٰ " "	۱۸۰ "
۱۴۔ حضرت رسالت مآب خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم	۶۳ "

نیلی آنکھ

نیلگوں آنکھوں والے بندوق کے بہترین نشانہ انداز ہوتے ہیں۔

جوتے محفوظ رکھنے کا طریقہ

جوتے اگر پانی سے بھیگ جائیں تو ان کے درست کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ پالش میں پیرافین لگائیں۔ اس سے چمڑا خراب نہیں ہوتا اور چمک قایم رہتی ہے۔

کپڑوں کو محفوظ رکھنے کے طریقے

ریشمی کپڑے دھوتے وقت اگر پانی میں تھوڑا سا نمک ملا دیا جائے تو رنگ بدستور قایم رہتا ہے اور کپڑا بھی ملایم رہتا ہے۔

(۲)۔ کپڑوں کے داغ اور دھبوں کو مٹانے کے لیے سرکہ بہت مفید ہے۔ گرم گرم سرکہ داغ دھبوں پر لگایا جائے تو وہ دور ہو جاتے ہیں۔

(۳) سوتی کپڑوں کو دھوتے وقت پہلے ٹھنڈے پانی کا بھگو لینا چاہیے۔ اور اس پانی میں ایک مٹھی بھی ایپسام سالٹ (جو جلاب میں استعمال کیا جاتا ہے) ملا لیجیے۔

(۴) رنگین سوتی فراک کو خشک کرنے کے لیے کبھی کھلی تیز دھوپ میں نہ رکھنا چاہیے بلکہ اس کو سایے میں لٹکانا چاہیے۔

استری کرتے وقت خیال رہے کہ استری معتدل گرم رہے۔

فلمی

ایک فلم اسٹار کی گرفتاری

مس سنہا پربھا پردھان مشہور فلم اسٹار احمد نگر کے ایک سالانہ جلسہ کی صدارت کے لیے گئی تھی وہاں اس کو ایک گانے کی سنگیت میں شریک ہونا پڑا جو خیراتی فنڈ کے سلسلہ میں کی گئی تھی۔ گانے کے وقت مجمع بے قابو ہو گیا اور مسلسل پردھان کو گانا جاری رکھنے پر مجبور کرنے لگا۔ لیکن مس موصوفہ نے ایک نہ سنی بلکہ گانے کی شرط کو پورا کیے بغیر پبلک کو جو اسٹیج کے بازوں پر بیٹھی تھی راستہ طور پر ہٹ جانے کا حکم دیا۔ فلم اسٹار اور مشتعل مجمع میں سخت مباحثہ شروع ہو گیا۔ اس مجمع میں چند پولیس کے افسر بھی تھے۔ اسٹار کے زبان سے نکلے ہوئے بعض جملوں پر پولیس افسروں کو بہت طیش آیا اور تاج کے نمایندوں کی توہین کے الزام میں اس کو پکڑ کر پولیس کے تھانہ پر لے گئے جہاں چند گھنٹے روکنے کے بعد بلا کسی شرط کے رہا کر دیا۔

پکوان

مرغ کا سالن

مرغ نیم سیر وزن کا ایک عدد۔ پیاز ۳ چھٹانک۔ گھی آدھ پاو۔ مرچ سرخ دو تولے۔ چرونجی ایک تولہ۔ خشخاش ایک تولہ۔ بادام ایک تولہ الائچی ۳ ماشے۔ دارچینی ۲ ماشے۔ سیاہ زیرہ ۳ ماشے۔ نمک ایک تولہ۔ ادرک نیم چھٹانک۔ لہسن نیم چھٹانک۔ دہی پکا پاو سیر۔ لیمو ایک عدد۔ زعفران ۴ رتی۔

ترکیب۔ مرغ کے ٹکڑے کر کے خوب دھو لیں چرونجی خشخاش بھون کر پیس لیں اور بادام چھیل کر علحدہ رکھ دیں۔ الائچی لونگ سیاہ زیرے کو سفوف کر لیں پیاز کاٹ کر چھٹانک بھر گھی میں سرخ کر لیں باقی پیاز ادرک لہسن نمک مرچ کے ساتھ بگھار دیں اور قدرے پانی چھوڑ دیں تاکہ پیاز گل جائے۔ جب پیاز

بخوبی گل جائے تو چو دیچی خشخاش دہی مرغ کے ٹکڑے ہانڈی میں چھوڑ دیں دارچینی بھی ثابت اسی وقت چھوڑ دیں۔ ڈھانک دے کر خیال رکھیں کہ دہی پڑنے کے بعد داغ کا اندیشہ ہوتا ہے۔ آہستہ صحنک اٹھا کر چمچے سے ہلاتے رہیں۔ جب ہی خشک ہو جائے تلنے کی کفگیر سے ایسا بھونیں کہ دہی کی بو باقی نہ رہے بعد بھون لینے کے اطراف پانی سے دھو کر ہانڈی کو دم پر لگا دیں اور الائچی لونگ کا سفوف زعفران لیمو دے کر نمک ٹھیک کر لیں۔ اگر جی چاہا تو بادام کے ساتھ چھٹانک بالائی بھی دے سکتے ہیں بالائی بادام آخر میں دینے سے سالن کا رنگ سرخ رہے گا۔ خیال رہے کہ زیادہ پتلا نہ رہے بلکہ گاڑھا سمٹا ہوا رہے۔ مرغ کا سالن تیار ہو گیا۔

مونگ کی سادہ کھچڑی

چانول آدھ سیر۔ دال ۳ چھٹانک گھی ۳ چھٹانک۔ ادرک نیم چھٹانک لہسن پاؤ چھٹانک۔ الائچی ڈیڑھ ماشہ۔ لونگ ڈیڑھ ماشہ۔ دارچینی قدرے۔ نمک ایک تولہ۔ پیاز ایک چھٹانک۔

ترکیب۔ چانول اور دال کو ملا کر دھو لیں۔ تین چھٹانک گھی میں پیاز کو ہیں یعنے باریک تراش کر داغ کر کے ادرک لہسن پسا ہوا اور دارچینی سالم ڈال کر سرخ کر لیں جب سرخ ہو تو پانی کا چھینٹا دیں تاکہ لہسن کی بو جاتی رہے اس کے بعد چانول دھو کر چھوڑ دیں اور کفگیر سے ہلائیں اور اندازہ پانی کا کریں۔ ایسا کہ جب کفگیر چلائیں تو پانی اور چانول کا وزن ایک ہو یعنے دونوں برابر ہیں اگر چانول ہلکے ملیں تو خیال رہے کہ چانول زیادہ گل جائے گا چانول سے ایک انگل پانی زیادہ رہے نئے پرانے چانول کا خیال ہمیشہ رکھنا ضروری ہے اور لونگ الائچی باریک کوٹ کر چھوڑ دیں جب دال نصف گل جائے تب نمک دے دیں اور آہستہ ہلاتے رہیں کہ داغ نہ لگنے پائے۔ جب پانی خشک ہونے آوے تب کفگیر چلا کر دم پر چھوڑ دیں اور آگ کھینچ کر دہیمی آگ پر رکھیں اور تھوڑی سی آگ اوپر ڈالیں اور پندرہ منٹ کے بعد دم کھول کر کھی کو دیکھ کر اتار لیں بس کھچڑی تیار ہو گئی۔

چٹنی آلو بخارا

آلو بخارا دو سیر۔ عرق لیمو دو سیر۔ نمک چار چھٹانک۔ سیاہ مرچ دو چھٹانک۔ زیرہ سیاہ دو چھٹانک۔ کشمش ۲ چھٹانک۔ خشک چھوہارے ۲ چھٹانک۔ الائچی خورد ایک چھٹانک۔ پودینہ دو چھٹانک۔ ادرک ایک چھٹانک۔ شکر بقیہ اشیا کی نصف۔

عرق لیموں کی بجائے عرق سرکہ استعمال ہو سکتا ہے

آلو بخارا کو شب بھر عرق لیموں میں تر رکھا جائے اور اس کے بعد گٹھلیاں نکال کر حل کر لیا جائے۔ جملہ اشیا بھی ملا دی جائیں مصالحہ تمام پیس کر ڈالنا چاہیے۔ بادام چھوہارا کشمش۔ ادرک کو نہیں پیسنا چاہیے۔ بعض آلو بخارا بھی حل نہیں کرتے بلکہ ثابت رکھتے ہیں۔

بگھارے بیگن

بیگن آدھ سیر۔ پیاز پاؤ سیر۔ تیل چھٹانک گھی چھٹانک۔ املی چھٹانک۔ ۲/۱ تولہ ادرک آدھی چھٹانک۔ لہسن پاؤ چھٹانک۔ تل ۱ تولہ۔ کھوپرا ۱ تولہ۔ زیرہ ۶ ماشے۔ میتھی ایک ماشہ۔ دھنیا ۴ ماشے۔ ہلدی ۶ ماشے۔ نمک ۲ تولے۔ ہری مرچ کوتمیر حسب ضرورت

پہلے املی کو بھگو دیں اور بیگن کے کانٹے نکال کر ان کو چار شاخ کر کے پانی میں بھگو دیں اور ۶ ماشے نمک پانی میں ڈال دیں تاکہ بیگن کی کرواہٹ دفع ہو جائے اور ثابت پیاز کو آگ میں بھبلا کے باریک پیس لیں اور کھوپرا و تل اور پانچ ماشے زیرا اور دھنیا کو بھی بھون کر پیس لیں اور املی کا کھٹا صاف کر نکالیں اور بیگن کو خوب دو پانی سے دھو کر املی کے کھٹے میں ملا دیں اور باقی جتنے مصالحہ مذکور ہیں ان سب کو ملا کر ہانڈی میں رکھ چھوڑیں اور تیل کو ہانڈی میں ڈال کر اتنا پکائیں کہ تیل کی بو نکل جائے۔ پھر تھوڑا سا کھٹے کا چھینٹا دیدیں جب خوب بو نکل جائے تو اس وقت گھی اور زیرہ اور میتھی چار پانچ لہسن کے پوتیاں چھوڑ دیں جب بگھار تیار ہو جائے تو بیگن کو بگھار دیں اور پانی اتنا چھوڑیں کہ بیگن کا ڈیٹ گل جاوے۔ اور آنچ دہیمی کریں دو مرتبہ چمچے سے آہستہ ہلا کر

تاکہ بینگن نرم ہو جائے پھر دیکھ لیں کہ جب سالن گاڑھا ہو جائے تو دم
پہ چھوڑ دیں تو بینگن کا سالن تیار ہو گیا۔ اور بعض لوگ اس میں
دریائی جھینگے بھی ڈالتے ہیں جس سے اور لذیذ ہوتا ہے دریائی جھینگے
ایک چھٹانک بھون کر تل کر ڈال دیں اور نمک کو ٹھیک کر کے
حسب ذائقہ چھوڑ دیں۔

زردہ ایک سیر چاول۔ دو تولے گل ہار سنگھار دو سیر
پانی میں جوش دے کر چھان لو اور چاول اس میں
ڈال کر ایک کنی پر اتار کر پھر دو سیر شکر سفید کا سوایا دو پانی کا
خمیرا چاولوں میں ملا دو۔ کشمش۔ پستہ۔ بادام۔ الائچی۔ لونگ
حسب ضرورت ملا دو اور پاؤ بھر گھی کو لونگ سے داغ کر زردے
میں ڈال دو پھر قدرے کیوڑے میں زعفران چند رتی حل کر کے
اوپر سے چھڑک دو۔

کیک میدہ دو چھٹانک۔ شکر ۲ چھٹانک۔ دودھ چار
چھٹانک۔ مکھن ۲ تولے۔ کشمش ۲ تولے۔ پہلے میدا
شکر اور مکھن کو ملا دو پھر دودھ سے نرم کر لو اور چار انڈوں کی زردی
آمیز کر کے سوڈا ڈال کر چمچے سے خوب پھینٹ لو آدھے گھنٹے کے
بعد مغزیات ڈال کر ڈبوں میں قدرے مکھن لگا کر بھر دو اور
ڈھکنا بند کر کے اوپر نیچے انگارے رکھ دو ایک گھنٹے میں
تیار ہو جائے گا۔

پڈنگ بالائی بالائی پاؤ بھر۔ انڈے ۱۲ عدد
قند سفید حسب ضرورت کیوڑا
زعفران۔ بالائی میں اور انڈوں کی زردی سفیدی اور
قند ملا کر ۲ منٹ پھینٹو کہ ایک جان ہو جائیں۔ برتن میں
ڈال کر ہلکی آنچ کوئلہ پر پکا دیں۔ ذرا سرخ ہو جائے تو اتار
کر نوش جان کریں۔

چٹنی خرما خرما [illegible] سو عدد سرکہ یا عرق نعناع ایک سیر عرق لیموں
نصف سیر۔ نمک چار چھٹانک۔ الائچی خورد ایک چھٹانک
پپلی سیاہ ایک چھٹانک۔ پہلے سرکہ اور عرق لیموں کو ملا کر جوش دو پھر
چھوارے اور نمک ملا دو۔ جب خوب پک جائے باقی مسالہ ملا دو۔
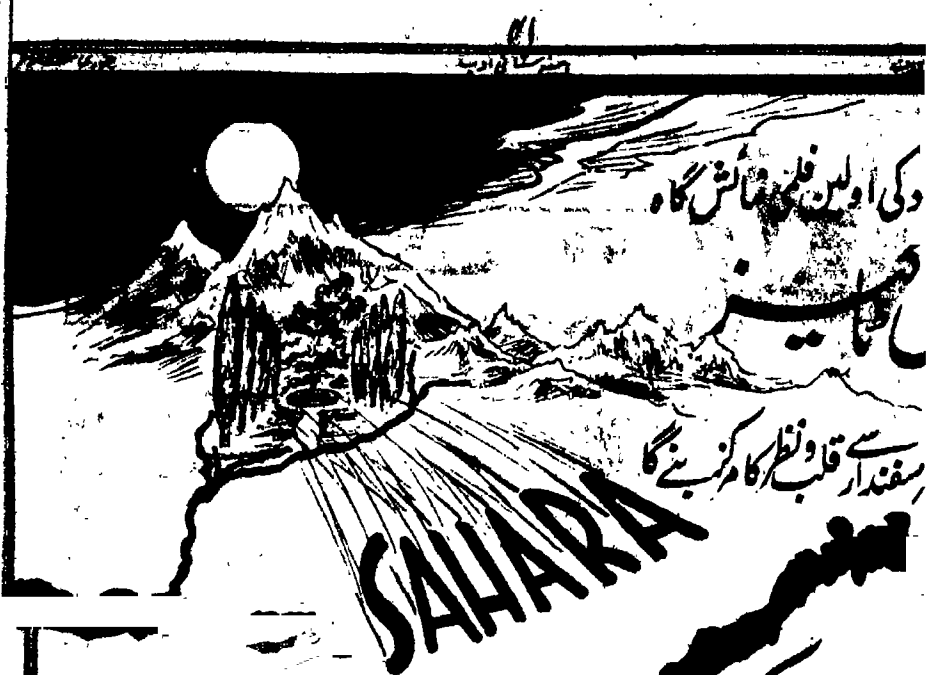
رسالے

نقاد بنگلور کے اس ہفتہ وار نے عید کے موقع پر اپنا ایک خاص نمبر نکالا تھا جو ہر حیثیت سے کامیاب رہا۔ بنگلور میں اب کی اس سے زیادہ کیا خدمت ہو سکتی ہے کہ ایک خاص نمبر شایع کیا جایے اور جس میں مضامین سوچ سمجھ کر لکھے گئے ہوں۔ اس نمبر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر شخص کے لیے دلچسپی کا سامان فراہم کرتا ہے۔ ظرافت کے چٹکلے، سینما کی معلومات، تفریحی نظموں کے علاوہ تنقیدی مضامین بھی ہیں بالخصوص تہذیب جدید اور عورت، فلمی گانے میرا بائی، اقبال کا نظریہ زندگی اور جوش پر مضامین خوب ہیں۔ افسانے بھی ہیں اور بعض افسانوں میں اصلاحی پہلو موجود ہے۔ جگہ جگہ تصویروں سے رسالے کو مزین کیا گیا ہے جس سے دلچسپی میں اضافہ تو ہوتا ہے لیکن یہ رسالہ کسی سینما کمپنی کا سا لنامہ معلوم ہوتا ہے۔ بعض مضامین میں کچھ بحث طلب باتیں ہیں مثلاً حاجی بغلول صاحب نے صفحہ (۳۱) پر لکھا ہے —

"اہل علم کی ناقدری حیدرآباد کا عام شیوہ ہے۔ اسکی وجہ شاید وہ پندار ہے کہ اردو زبان چونکہ ہمارے یہاں سرکاری زبان ہے اس لیے ہم کو اس میں مہارت بھی حاصل ہے۔ یہاں کے اخبار دقیانوسی زبان اور جناتی الفاظ استعمال کرنے پر فخر کرتے ہیں۔ دعوی اہل زبانی کا ہے، مگر زبان دانی سے بھی دور ہیں۔ غلطی کرتے ہیں اس لیے اس پر اصرار اس لیے کرتے ہیں کہ کیا ہم کہ چونکہ ہم ایسا بولتے ہیں اسی واسطے یہی صحیح ہے۔ یہاں اردو یونیورسٹی بھی ہے لیکن اردو زبان کی کوئی خدمت بھی کی گئی

یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے، انسان اگر جہالت میں مبتلا ہو تو اس کی حالت سدھر سکتی ہے لیکن جہل مرکب کا کوئی علاج نہیں کہ خود کو عالم سمجھنے"

اس طرح لکھنے سے حاجی بغلول صاحب کے خواکردہ الفاظ انہیں پر بخوبی صادق آ سکتے ہیں۔ نہ انہیں ظرافت سے لگاؤ معلوم ہوتا ہے اور نہ علم سے۔ چونکہ انہوں نے نقلی ظرافت کے پردے میں یہ پھبتیاں سی لی ہیں اس لیے ہم ان کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔ لیکن اگر وہ عالم ہوتے تو ان کی نظر ان خرافات اور بدعتوں پر بھی ہوتی جو نہدا پار کا ہر شخص بزعم زباندانی آئے دن کرتا رہتا ہے۔ رہی حیدرآباد کی ناقدری۔ اگر بغلول صاحب عالم بن کر حیدرآباد آئیں تو انہیں معلوم ہو۔ کیا ہم بغلول صاحب غور فرمائیں تو اچھا ہو کہ علمی خدمات اور زباندانی نہ ڈھول پیٹنے کی چیز ہوتی ہے اور نہ منہ چڑانے کی۔

جوش کے مضمون میں سہیل صاحب نے جوش کو سراہا تو ہے لیکن کہیں کہیں حد اعتدال سے آگے نکل گئے ہیں۔ بعض جگہ وہ کچھ عجیب طرح سے لکھ گئے ہیں۔ مثلاً صفحہ ۴۵ پر لکھا ہے۔

"جوش آج کے ہندستان کا شاعر ہے ماضی سے بے پروا بلکہ متنفر، حال سے متعلق غیر مطمئن اور بد دل اور مستقبل کے بارے میں متشکی"

بڑے شاعر کی عجیب وغریب تعریف ہے اس سے تو دنا شاعر کی بھی توصیف نہیں ہو سکتی! دنیا میں آج تک کوئی بڑا شاعر ایسا نہیں گذرا۔ ماضی اور حال سے غیر مطمئن اور بد دل ہو تا ممکن ہے مگر بڑا شاعر وہی ہے

نیو تھیٹرز

پتنگے

از محمد امین شرق پوری۔ کتابی سائز مجلد ضخیم (۲۴۰ صفحے) لکھائی چھپائی اوسط کاغذ چکنا۔ قیمت (دو روپے) ملنے کا پتا شمع بک ڈپو، پھاٹک حبش خان دہلی

زیر نظر کتاب محمد امین صاحب شرق پوری کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے افسانوں کے پلاٹ ہماری روزانہ کی زندگی کے حقایق سے متعلق ہیں۔ ایک شاعر یا افسانہ نگار جب کبھی دیکھی بھالی اور جانی بوجھی حقیقت کو ایک خاص انداز میں تلمیح اور اشارے کے طور پر بیان کرتا ہے تو پڑھنے والا یا سننے والا ایسا محسوس کرتا ہے کہ اس حقیقت کو وہ بھی دیکھتا ہے لیکن کبھی دھیان نہ کیا۔ اس طرح اسکی آنکھیں کھل جاتی ہیں امین صاحب فطرتاً بہت حساس واقع ہوے ہیں۔ اور انہوں نے غریبوں کی مصیبتوں کو اپنے دردمند دل کی گہرائیوں میں جگہ دی ہے "دولت اپنے دامن میں بڑے سے بڑے گناہ کو چھپالیتی ہے اور غربت خودداری اور عزت نفس رکھنے کے باوجود کس طرح عزت و ابرو کی بربادی کا سبب بنتی ہے" بقول اقبال "کس درجہ ہیں تنگ بندہ مزدور کے اوقات" یہ مختصر لب لباب ہے آپ کے افسانوں کا"

خاص چیز جو ہم نے ان افسانوں میں دیکھی وہ یہ ہے کہ باوجودیکہ امین صاحب کے افسانوں کے پلاٹ میں ادب جدید کے رجحانات پائے جاتے ہیں لیکن ادب جدید کے بعض علمبرداروں کے ادب میں جو کثافت اور تعفن پائی جاتی ہے اس کی شمہ برابر بدبو نہیں پائی جاتی یقین ہم اس کے بہ دل موید ہیں کہ ہمارے اہل قلم ہماری زندگی کے حقایق کو پیش کرکے سماج کی آنکھیں کھولیں۔ اس لیے کہ ادب نہ صرف برائے ادب بلکہ ادب ہماری زندگی کے ہر شعبے کا آئینہ دار ہے۔ جس میں آدم کے نالہ واہ اور نوحہ زار دو غم کے ساتھ نغمہ شادی بھی شامل ہے۔ امین صاحب بہت خوب لکھتے ہیں۔ زبان بہت سادہ سلیس اور بے تکلف روزمرہ استعمال کی گئی ہے۔ بالعموم افسانے بہت مختصر ہیں لیکن اختصار کے باوجود تشنگی محسوس نہیں ہوتی ہم ادبی دنیا میں امین صاحب سے بہت سی امیدیں وابستہ رکھتے ہیں۔

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

جاپان کی صنعتی ترقی

از محمد ناصر علی ایم اے لکچرار معاشیات جامعہ عثمانیہ تقطیع $\frac{1}{16}$ رائل ضخیم ۵۰ صفحے کاغذ کچھ کھرا اور کچھ سفید قسم کا استعمال کیا گیا ہے۔ ٹائیٹل معمولی قیمت (۸؍) ملنے کا پتا تلاش کے باوجود نظر نہ آیا مگر مصنف کے پتے حمایت نگر حیدرآباد دکن سے طلب کیجیے۔

انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر ہی سے ہندستان میں تعلیمی رجحان عام ہوگیا تھا چنانچہ تعلیم کی بڑھتی ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہر صوبے میں ایک جامعہ قیام عمل میں آنے لگا۔ اس وقت حیدرآباد علمی اعتبار سے بہت پیچھے تھا۔ یہاں ایک بورڈ کے تحت فوقانی تعلیم دیجاتی تھی اور کالج کا تعلق جامعہ مدراس سے تھا لیکن ملک کے بعض حساس مدبروں نے ایک جامعہ کی ضرورت محسوس کی چنانچہ جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد سے حیدرآباد کے تعلیم پانے والوں کا اوسط نمایاں طور پر بڑھ گیا۔ چونکہ ذریعہ تعلیم ملک کی عام فہم زبان کو قرار دیا گیا تھا اس لیے ہر مضمون اور ہر فن پر طالب علم کافی عبور حاصل کرنے لگا اور یہی ایک چیز جامعہ عثمانیہ کی امتیازی خصوصیت اور کامیابی کی بڑی دلیل ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے وجود میں آنے سے ایک [illegible]

ہی طالب علم مختلف مضمونوں میں وہ نمایاں کامیابی حاصل کر چکے ہیں کہ اپنوں اور غیروں سے بھی خراج تحسین حاصل کیے ہیں۔ انہیں میں سے ناصر علی صاحب بھی ایک ہیں جنہیں اپنے خاص موضوع معاشیات پر کافی عبور حاصل ہے ان کے متعلق ہم ان کے محترم استاد ڈاکٹر انور اقبال قریشی صدر شعبہ معاشیات کے "پیش لفظ" سے چند جملے نقل کیے دیتے ہیں جس سے آپ کو مصنف کی قابلیت کا اندازا ہو جائے گا۔ "ناصر علی صاحب کو معاشی تاریخ سے خاص دلچسپی ہے اور اس مضمون کا انہوں نے نہایت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ام۔ اے کی طالب علمی کے زمانے میں انہوں نے جرمن، جاپان اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی معاشی تاریخ کا مطالعہ کیا۔ آج کل یہ بی۔ اے کی جماعتوں کو ہندستان کی معاشی تاریخ پڑھا رہے ہیں اور میری نگرانی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے حیدرآباد کی معاشی تاریخ پر مقالہ لکھ رہے ہیں۔..............."

"انہوں نے نہایت محنت سے جاپان کی سیاسی تاریخ کا مواد درج کر کے جاپان کی اہم صنعتوں کی ترقی کا حال بتایا ہے اور ایسا مواد جمع کیا ہے جو دوسری جگہ آسانی سے دستیاب نہیں ہو سکتا۔ ان کا طرز بیان اس قدر صاف اور واضح ہے کہ معمولی قابلیت کے لوگ بھی اس سے کماحقہ استفادہ کر سکتے ہیں۔ ... میں اس کتاب کے مطالعے کی پرزور سفارش کرتا ہوں"

کتاب زیر بحث کی اہمیت کے بارے میں ڈاکٹر انور اقبال قریشی جیسے ماہر فن کی رائے کی موجودگی میں اپنی رائے کا قائم کرنا ایک غیر ضروری اضافہ ہوگا۔ مصنف نے اس مختصر سی تصنیف کو ذیل کے گیارہ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) تاریخی پس منظر۔ (۲) دور جدید اور [illegible]

[illegible] کے اسباب (۱۱) [illegible] کی شکایتیں۔

اوپر کی فہرست سے ظاہر ہے کہ مصنف نے جاپان کی صنعتی ترقی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی۔ اگرچہ اس مختصر سے رسالے میں ہر موضوع پر سیر بحث نہیں کی گئی ہے تاہم نچوڑ کی شکل میں وہ سب بیان کر دیا ہے جس کی وضاحت کی ضرورت تھی۔ ہماری رائے میں یہ کتاب صرف معاشیات کے طالب علم کے لیے ہی مفید نہیں بلکہ عام لوگ بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں اس لیے بقول ڈاکٹر قریشی: اس کتاب کے مطالعے کی ہر ایک سے سفارش کرتے ہیں۔

"آوارا"

پنکھڑیاں

از محمد رحیم صبا چمن دہلوی حجم (۱۶۸ صفحے) کتابی۔ کاغذ اچھا۔ لکھائی چھپائی اوسط مجلد قیمت (۲ روپے) ملنے کا پتا [illegible]

زیر نظر کتاب محمد رحیم صبا چمن دہلوی کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے پڑھ کر سماج کی خرابیوں کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ پلاٹ روزانہ کی زندگی سے متعلق ہے انداز تحریر دلچسپ ضرور ہے لیکن [illegible] کے مقابلے میں [illegible] زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ ہر افسانے کو نبھانے میں ایک حد تک کامیابی حاصل ہے۔ چمن صبا کے اس زیر نظر مجموعے کو دیکھ کر ہم امید کر سکتے ہیں کہ آیندہ ان کے افسانے مزید پختگی اور بلندی معیار کے ساتھ ہمارے سامنے آئیں گے۔ جاننا ہے کہ ہمارے حالیہ افسانہ نگار ادب جدید میں سوائے افلاس اور غریبی کی کہانیوں کے اور کوئی چیز پیش کرنا ہی ادب جدید کے مفہوم کے خلاف اور ہر افسانے کا پلاٹ صرف "داستان غم" ہی کے محور پر گھوم رہا ہے چنانچہ چمن صبا کے افسانے بھی زیادہ تر اسی سے ملتے ہیں [illegible] نادار روح [illegible] سماج کا [illegible] اور سماج کی ان [illegible] کی طرف توجہ دلانا ہمارا اہل قلم کا فرض ہے مگر یہ مطلب صرف [illegible] کہ وہ زندگی کے [illegible] پہلوؤں [illegible] ہمارے اہل قلم کو [illegible] ہر حال [illegible] رہنا ہے۔ [illegible] مجموعہ [illegible]

نیو تھیٹرز

واپس

بھارتی، اشت برن، نیمو، نواب

اور ایک نیا چہرہ

لاتیکا

موسیقی ۔ آر سی بورال

ڈایریکٹر ۔ ہیم چندرا

آنے والے فلم
سرکس گرل
بھارت پکچرز
بھیدی برقعہ
طوفان میل
کرشنا ٹاکیز - گلزار حوض

ہندستانی
ادب

ہندستانی ادب

ایڈیٹر غلام محمد خاں ایم اے (عثمانیہ)

تار کا پتا ادب حیدرآباد دکن
قیمت ایک پرچہ ۸

رجسٹرڈ آصفیہ (۱۸۴)
رجسٹرڈ برطانیہ ام (۳۴۳۴)
چندہ سالانہ (صہ)

جلد ۲ | فروردی ۱۳۵۳ف | فروری ۱۹۴۴ء | نمبر (۵)

فہرست مضامین

سنہ ہجری

قدیم عرب مورخین بیان کرتے ہیں کہ ظہور اسلام سے قبل ملک عرب میں مختلف جنس و اقعات تاریخیں رائج تھیں۔ مثلاً تاریخ بنائے کعبہ (بعہد حضرت ابراہیم علیہ السلام) یا زمانہ فرماں روائی عمرو بن ربیعہ کہ جس نے حجاز میں بت پرستی کی ابتدا کی۔ اس کے بعد کعب بن لوی کی موت، عام غدر، یوم الفجار و حلف الفضول کے واقعات، ماخذ سنین ٹھہرے رہے۔ پھر واقعہ اصحاب فیل کے بعد تاریخ بدلی اور عام الفیل کا رواج ہوا۔ نیز خانہ کعبہ کی جو تعمیر قبل نبوت حضرت ختم المرسلین صلعم عمل میں آئی۔ اور جس میں حجر اسود کو حضور انور علیہ السلام نے تمام قبیلہ والوں کے ساتھ نصب فرمایا۔ تو یہ واقعہ بھی زمانے جاہلیت میں مرسلہ شہود و ایام رہا۔ اس کے سوا عرب میں ایک عام دستور یہ رائج تھا کہ ہر قبیلہ کسی مشہور واقعے کو اپنے سنہ کی ابتدا مقرر کر لیتا تھا۔

آں حضرت صلعم کے نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد بھی آپ کے عہد مبارک میں بزمانہ قیام مکہ معظمہ تیرہ سال تک کوئی سنہ و تاریخ رائج نہ رہی۔ اور بعد ہجرت تا وفات مقدس دس برس کے عرصے میں مدینہ طیبہ میں بھی اس کا کوئی باضابطہ آغاز نہ ہوا بلکہ حجۃ الوداع تک ہر سال حسب ذیل جدا جدا ناموں سے منسوب رہا۔

(۱) سنۃ الاذن (یعنی کہ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ جانے کی اجازت کا سال)

(۲) سنۃ الامر (یعنی حکم مسلمین سے جہاد کرنے کا حکم جس سال دیا گیا)

(۳) سنۃ التمحیص

(۴) سنۃ الترفئۃ

(۵) سنۃ الزلزال

(۶) سنۃ الاستیناس

(۷) سنۃ الاستغلاب

(۸) سنۃ الاستوا

(۹) سنۃ البراءۃ

(۱۰) سنۃ الوداع [1]

سنۃ الوداع (کہ اس کے بعد رسول مقبول صلعم نے سلسلہ میں اس دنیا سے پردہ فرمایا) سے سنہ ہجری کے وضع ہونے تک کا (۷) سالہ زمانہ کن کن ناموں سے موسوم رہا فی الحال اس کی تحقیق نہ ہو سکی۔ (واضح رہے کہ سنہ ہجری واقعہ ہجرت مدینہ سے ۱۷ سال بعد وضع ہوا ہے)

غالباً سنۃ الوداع ہی سنین کا شمار جاری تھا تا آں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے خلافت میں کسی سنہ کو اصولی طور پر وضع کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ جس کا سبب یہ ہوا کہ یمن کے حاکم حضرت ابوموسیٰ اشعری نے دربار گاہ خلافت کو لکھا کہ آپ کے پاس سے جو خطوط میرے پاس آتے ہیں ان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کس تاریخ اور کس وقت لکھے گئے ہیں اس لیے آپ جب آیندہ خط تحریر فرمائیں تو تاریخ درج فرمایا کریں۔ پس اس اتفاقی واقعے نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس اہم ضرورت کی جانب متوجہ کیا۔ امیر المومنین نے صحابہ کرام اس بارے میں مشورہ کیا تو بعضوں نے کہا کہ اسلامی تاریخ کی ابتدا ولادت نبویہ سے کرنی چاہیے یا بعثت سے۔ اس رائے کو حضرت خلیفۃ المسلمین و دیگر اصحاب نے پسند نہیں فرمایا کیوں کہ اس وقت ان کی اکثریت مشرف بہ اسلام نہیں ہوئی تھی۔ بعض کچھ حاضرین نے حضرت رحمت العالمین کی وفات سے شروع کرنے کی نسبت تحریک کی۔ حضرت عمر نے

---

[1] آثار الباقیہ عن قرون الخالیہ ابو ریحان بیرونی مترجمہ اردو مطبوعہ لیپزگ

اس کو کچھ پسند نہیں فرمایا۔ اور کہا کہ اس واقعہ کے شروع سے مخالفت
نبوی کا رنج و الم ہے سے پہلے سخت تکلیف و حزن کا باعث ہوگا
اس لیے وہ واقعہ ہم کو مناسب نہیں۔

اس کے بعد حضرت عمر نے ان مشوروں کو لکھ کر حضرت
علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا۔ اور ان سے رائے طلب کی تو
جناب امیر نے "ہجرت نبوی" کو سال ہجری قرار دینے کی نسبت
ایما فرمایا۔

راقم الحروف کو فی الحال کہیں اور تحقیق نہ ہو سکا۔ مگر
مولانا قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری نے لکھا ہے کہ حضرت
عثمان کے مشورے سے محرم کو اولین شہر قرار دیا۔[1]

ابو الفضل آئین اکبری میں کہتا ہے کہ ابو موسیٰ اشعری نے
حضرت عمر کے جس خط کی نسبت تاریخ دریافت کی تھی۔ وہ ماہ
شعبان کا لکھا ہوا تھا۔ اور بارگاہ خلافت سے یہ دریافت کیا
تھا کہ یہ خط جو مجھے ملا ہے۔ اس سے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ماہ
شعبان سے مراد کس سال کا شعبان ہے؟ نیز ابو الفضل نے
یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت فاروق کو بعضوں نے سنہ یزدجرد
کے جاری کرنے کی رائے دی تھی۔ اور اسی سلسلے میں حکیم ہرمزان
نے بھی اہل فارس کے ماہ و سال کی نسبت تفصیلی طور پر معروضہ
کر کے اس کے اجرا کے متعلق توجہ دلائی تھی۔ لیکن حضرت عمر بن
خطاب نے پسند نہیں فرمایا۔

اس واقعے کو بیرونی نے "آثار" میں کچھ اختلاف اور
زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جس کو ہم آئندہ اپنے
مقالے میں درج کریں گے۔

رسول مقبول صلعم کی مکہ معظمہ سے ہجرت اور مدینہ منورہ
میں تشریف آوری کی تاریخ میں کافی اختلافات ہیں۔ [illegible]
میں لکھا ہے کہ حضور اکرم ۸ [illegible] میں پہنچے
اور ۱۲ ربیع الاول کو مدینہ میں داخل ہوئے۔ اسی طرح
بعضوں نے تاریخ ورود [illegible] بیان کی ہے۔ ان میں سے صرف دو ہی تاریخیں ۸ یا ۱۲
ربیع الاول معتبر ہیں کہ از روئے حساب صرف ان تاریخوں
میں دوشنبہ واقع ہوتا ہے یہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے ہم
آئندہ تمام اختلافی مسائل اور روایتوں کو درج کر کے صحیح تاریخ
پیش کرنے کی سعی کریں گے۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے
رسالہ معارف جولائی ۱۹۴۲ء میں ان کا جو مضمون "عہد
نبوی کے عربی ایرانی تعلقات" پر چھپا ہے۔ اس میں موصوف
نے ۱۲۔ ربیع الاول سے اتفاق کیا ہے۔ لیکن اس روز جمعہ
واقع ہوتا ہے۔ امام بخاری نے باب الہجرۃ کے تحت اپنی
جامع میں (جو مسلمانوں کے نزدیک قرآن کے بعد دنیا کی سب سے
زیادہ صحیح و معتبر کتاب ہے) جو حدیثیں بیان کی ہیں۔ ان سے
نہایت وضاحت کے ساتھ یوم دوشنبہ ثابت ہوتا ہے
لہٰذا ۱۲۔ ربیع الاول یوم جمعہ کی تاریخ احادیث صحیحہ سے
درست ثابت نہیں ہوتی۔

الغرض سنہ ہجری ہجرت کے مہینہ ربیع الاول
کی بجائے اس سے کوئی ۶۷ یا ۶۸ یا ۸۱ یا ۸۲ دن قبل
یکم محرم سے شروع کیا گیا۔ اور اسی تفاوت کے مد نظر اس
وقت کے عرب مورخین نے (چونکہ تاریخ ہجری کی تجویز ۱۷ سال
بعد ہجری) اس دور کا جو کوئی واقعہ بیان کیا ہے۔ تو اس
فرق کو "من مقدم الہجرۃ" (ہجرت کے وقت سے)
اور "التاریخ" (ہجری سنہ) سے واضح کیا ہے۔

ہجری حساب نہایت صحیح اساس پر قائم ہے
کیوں کہ حضرت ختمی مرتبت نے حجۃ الوداع (۹۔ ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ
مطابق ۶۔ مارچ سنہ ۶۳۲ء) کے موقع پر میدان عرفات میں
فرمایا کہ

الا ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق السموات والارض

[1] رحمۃ للعالمین جلد دوم صفحہ ۸۱ مطبوعہ سنہ ۱۹۳۱ء

اور ان میں ہر ایک کے پاس ایک دوسرے سے نحوست و برکت میں اختلاف ہے۔ اگر کوئی ایک کسی ایک دن کو مبارک سمجھتا ہے تو وہ دوسرے کے نزدیک نحس ہوتا ہے۔ ایسے شگون اور توہمات کی ساری قومیں شکار رہی ہیں۔ اسلام نے ان کو بڑی حد تک زائل کر دیا۔

لیکن اس نے بھی انکار نہیں کیا ہے۔ اور جو اقرار کیا ہے۔ تو وہ قبل اسلام زمانے کے متعلق ہے۔ چنانچہ نافرمان قوموں میں سے جو قوم آندھی کے ذریعے ہلاک کی گئی۔ ان کی نسبت کتاب حکیم میں خداوند عالم نے اس طرح مطلع کیا ہے کہ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ (پس بھیجی ہم نے ان پر تیز ہوا نحس دنوں میں)

مہینوں کی تعداد جو بارہ قرار پائی وہ آسمان کے برجوں کی تعداد بارہ ہونے کے سبب سے ہے۔ اور غالباً ماہ و سال کا حساب ایک قوم نے دوسری قوم سے سیکھا۔ اسی لیے دنیا کی کسی قوم میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بروج سماوی کے وجود پر تو قرآن حکیم بھی گواہ ہے۔ خدائے قدیر نے ان کی تخلیق کو اپنی بزرگی و عظمت میں شمار کیا ہے۔ فرماتا ہے۔ تَبَارَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرَاجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا۔ (بزرگ ہے وہ ذات جس نے آسمان میں بروج بنائے اور اس میں آفتاب و منور ماہتاب بنایا) اب یہ دوسرا امر ہے کہ یہ بروج ایسے ہی اور ولتے ہی ہیں جیسے کہ ہیئت دان بیان کرتے ہیں۔ تحقیقات سے اب تک ان کی تعداد میں تخفیف یا اضافہ عمل میں نہیں آیا۔

سال کے بارہ مہینے ہونے کی تصدیق قرآن مجید بھی خود فرماتا ہے۔ چنانچہ اس آیت کریمہ میں وضاحت ہے کہ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے وقت کتاب الٰہی میں اللہ کے نزدیک مہینوں کی تعداد بارہ قرار پا چکی ہے۔

مہینوں کے موجودہ نام عہد جاہلیت کے ہیں۔ جو جنگ و جدال اور مذہبی مراسم کی بنا پر رکھے گئے ہیں۔ اور موسم و فصول سے غیر صحیح تعلق رکھتے ہیں۔

بیرونی نے علامہ مسعودی کی کتاب مروج الذہب کے حوالے سے لکھا ہے کہ جاہلیت کے عہد قدیم میں ان کے حسب ذیل نام تھے جن کا سلسلہ موجودہ شہور کے متقابل درج کیا ہے۔

(۱) ناتق
(۲) ثقیل
(۳) طلیق
(۴) ناجر
(۵) اسلح (یا اسنخ یا اسلخ یا اسلح)
(۶) انخ
(۷) احلک
(۸) کسع
(۹) زاہر
(۱۰) برط (یا مرط)
(۱۱) حرف (یا نعیس)
(۱۲) نعس (یا مرس)

ان اسامی کافی اختلافات ہیں۔ جن کو بیرونی نے آثار الباقیہ میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اور سند صاحب اسماعیل بن ہبۃ کے یہ اشعار بھی پیش کیے ہیں۔

اَرَدْتَ شُهُوْدَ الْعَرَبِ فِي الْجَاهِلِيَّةِ
فَخُذْهَا عَلَى سَرْدِ الْمُحَرَّمِ تَشْتَرِكُ
فَمُؤْتَمِرٌ يَأْتِيْ وَمِنْ بَعْدِهِ نَاجِرٌ
وَخَوَّانٌ مَعْ صُوَّانٍ يُجْمَعُ فِيْ شَرْكِ
حَنِيْنٌ وَرُبَّا وَالْاَصَمُّ وَعَادِلٌ
وَنَافِقٌ مَعْ وَغْلٍ وَرَنَّةُ مَعْ بُرَكِ

یعنی اگر تم جاہلیت کے مہینوں کے نام سے مطلع ہونا چاہتے ہو تو محرم کے مقابل سے شروع کرو تو پس موتمر ہے۔ اس کے بعد ناجر اور خوان پھر صوان ہے حنین۔ زبا۔ اصم۔ عادل نق۔ وعل۔ ہُواع اور رنہ و برک ہے [1]

محمود پاشا فلکی نے اپنے مقالے نتائج الافہام میں [2] کسی حوالے کے بغیر ایک جگہ یہ لکھا ہے کہ ہمارے عہد کے مروجہ و مستعملہ سن ہجری مہینوں کے نام کلاب بن مرہ کے زمانے میں وضع کیے گئے ہیں۔ جو حضرت رسول الثقلین (فداہ امی و ابی) کے اجداد میں تھے۔ اور یہ واقعہ اسلام سے تقریباً دو قرن پیشتر وقوع میں آیا ہے۔

مناسب ہوگا کہ موجودہ اسمائے شہور کے اسباب تسمیہ پر بھی مختصر روشنی ڈالی جائے۔

(۱) **محرم**۔ جیسا کہ اکثروں کو معلوم ہے۔ یہ مہینہ قبل اسلام بھی عربوں کے نزدیک چار حرام (بزرگ) مہینوں میں سے ایک تھا۔ جس میں جدال و قتال حرام سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے اس کا نام محرم رکھا۔ یعنی وہ ایام جن میں جنگ نہیں کی جا سکتی۔ یا بزرگی والا مہینہ۔

(۲) **صفر**۔ بعض اہل تحقیق کی رائے ہے کہ یہ نام لفظ "صفر" سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی "خالی" کے ہیں۔ یعنی ایسا مہینہ جس میں کوئی ممانعت (حرب و ضرب) نہیں۔ اور بعضوں کا بیان ہے کہ اس مہینے کو اس نام سے موسوم کرنے کے وقت خزاں کا موسم تھا۔ درختوں کے پتے زرد پڑ رہے تھے لہٰذا یہ نام رکھا۔ تو ایسی صورت میں اس لفظ کو "صفرۃ" سے ماخوذ سمجھا جانا چاہیے۔ اور صفرۃ کے معنی زردی کے ہیں۔ اور اس سے مراد پتوں اور درختوں کی زردی (یعنی موسم خزاں)

(۳) **ربیع الاول**۔ ربیع عربی زبان میں موسم بہار کو کہتے ہیں۔ جس وقت اس مہینے کا نام رکھا گیا۔ اس وقت موسم بہار تھا۔ اور انہوں نے اس موسم کو دو ماہ تک پایا۔ اس لیے اس کو بہار کا پہلا مہینہ قرار دیا۔ اور دوسرے کو

(۴) **ربیع الآخر**۔ سے موسوم کیا۔ اس مہینے کو "ربیع الثانی" کہنا یا لکھنا اکثر فصحا اور اہل علم ناپسند کرتے ہیں اس لیے کہ عربی زبان میں "ثانی" کا لفظ اس موقع پر استعمال کرتے ہیں۔ جب کہ اس کے بعد "ثالث" بھی ہو۔ جب ایسا نہیں ہے تو ثانی کہنا خطا ہے اس کی بجائے آخر کہیں گے جس کے معنی دوسرے کے ہیں۔

(۵) **جمادی الاولیٰ**۔ بہار کے گذرنے کے بعد عربوں نے دیکھا کہ دو مہینے تک پانی سخت سردیوں کے باعث جم جایا کرتا ہے۔ اس لیے مہینے کا نام موسمی کیفیت کا حامل رکھا۔ عربی میں "جمادیٰ" کے معنی یخ بستہ اور سخت سردی کے ہیں چونکہ اس لفظ کے آخر میں الف مقصورہ علامت تانیث کا ہے۔ اس لیے اس کا دوسرا وصفی لفظ بھی مونث استعمال ہوگا۔ اور "اول" کی تانیث "اولیٰ" ہے۔ پس جمادی الاول کہنا جیسا کہ مشہور ہے فاش غلطی ہے۔

(۶) **جمادی الآخریٰ**۔ جیسا کہ ہم نے اوپر تصریح کی ہے۔ یہ سرما کا دوسرا مہینہ ہے۔ دوسرے کے لیے عربی میں لفظ آخر آیا کرتا ہے۔ اس کی تانیث اخریٰ یا آخرہ آتی ہے۔ اس لیے جمادی الثانی لکھنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

(۷) **رجب**۔ ترجیب سے ماخوذ ہے جس کے معنی تعظیم کے ہیں۔ اور اہل عرب اس مہینے کو "شہر اللہ" بھی کہتے تھے۔ چونکہ اس کی عظمت کرتے اور اس ماہ میں

---

[1] کتاب الآثار بیرونی صفحہ ۶۱۔ [2] ہم اس رسالے کے لیے اپنے مہربان و صاحب ذوق دوست مولوی محمد ظہور میاں صاحب کے منت پذیر ہیں۔

م کہتے تھے۔ لہذا نام ہی ایسا رکھا جس کو سن کر لوگ سمجھ
اور نیک اعمال کی طرف متوجہ ہوں۔ یہ بھی چار حرام مہینوں
سے ایک ہے۔ نیز سرورِ عالم صلعم سے مروی ہے کہ
نامی ایک نہر بہشت میں ہے۔ جس کا پانی نہایت شیریں
دودھ سے زیادہ سفید ہے اور جو کوئی اس ماہ میں روزہ
گا اس کو اس نہر کا پانی پلایا جائے گا۔
جیم کو مشدد کر کے رجب کہنا بڑے درجے کی
سمجھا کیا جاتا ہے۔

(۸) **شعبان**۔ قبائلِ عرب اس مہینے میں لوٹ و
ت گری کے لیے اور پانی اور چارہ حاصل کرنے کی
سے منتشر و متفرق و "منشعب" ہو جایا کرتے تھے۔ اس لیے
مہینے کا نام رکھا۔

(۹) **رمضان**۔ "رمض" سے مشتق ہے۔ جس کے معنی
ن یا سے از گرمی زمین" کے ہیں۔ یا سنگ ریزہ گرم کے
یہ مہینہ اس کو موسوم کرتے وقت گرما میں واقع
تھا۔ جب کہ ریگستانِ عرب تپتا تھا۔ اس لیے اس کا
رکھا گیا۔

(۱۰) **شوال**۔ شوال سے مشتق ہے۔ جس کے معنی
شتہ شدن" کے ہیں۔ چونکہ اہلِ عرب اس مہینے میں
کو چھوڑ کر سیر و شکار کے لیے نکل جایا کرتے تھے۔ لہذا
شوال سے موسوم کیا۔ اور "شولا" لغت میں کوچ کرنے
کہتے ہیں۔

(۱۱) **ذی القعدۃ الحرام**۔ اس کے معنی "صاحبِ نشستن"
ہیں۔ چونکہ یہ مہینہ بھی بزرگ و حرام مہینوں سے ہے جس میں
عرب جدال و قتال ممنوع سمجھتے۔ اور گھروں میں بیٹھ
رہتے تھے۔ اس لیے اس کا یہ نام ہوا۔

(۱۲) **ذی الحجۃ الحرام**۔ حج والا مہینہ یا جیسا کہ بعض
اہلِ لغت نے لکھا ہے کہ "حج" کے معنی سال کے
بدنگر ۱۲ ماہ قمری، سال اختتام پاتا ہے۔ لہذا مہینے کا

نام سال والا یا سال کا مالک مہینہ ہوتا ہے۔ یہ بھی چار حرام
مہینوں میں سے ہے۔

قرآن مجید میں جن شہور اربعہ کو "اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ"
فرمایا گیا ہے۔ وہ یہی چار مہینے رجب، ذی قعدہ، ذی حجہ
اور محرم ہیں۔

اس سلسلے میں زمانۂ جاہلیت کی ایک رسم کے متعلق
بھی مختصر طور پر کچھ لکھنا ضروری ہے جو ان ہی چار مہینوں کے
رد و بدل اور ان کے کم و زیادہ کرنے کی نسبت ہے۔ اس
رسم کا نام "نَسِیّ" تھا یعنے مہینوں کو مقدم و موخر کرنے کی رسم
اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے
خدائے تعالیٰ کے حکم سے وہی مہینے جن کا ہم نے اوپر تذکرہ
کیا ہے۔ حرمت والے قرار دیے تھے۔ اور حکمِ الٰہی پہنچایا
تھا کہ وہ ان میں محاربہ مقاتلہ سے باز رہیں۔ جس کی اہلِ عرب پابندی
کیا کرتے تھے لیکن کچھ عرصے بعد انہوں نے اس میں یہ بدعت
پیدا کی تھی کہ ان مقررہ مہینوں کو اپنی نفسانی خواہشوں اور ضرورتوں
کے تحت جب جنگ کرنے کو جی چاہتا غیر محرم مہینوں سے
بدل لیتے تھے۔ مثلاً محرم میں ایسی ضرورت پیش آتی تو اس
مہینے کا نام صفر رکھ دیتے۔ اور کہتے کہ اس سال محرم کا مہینہ
صفر کے بعد آئے گا۔ اور اگر صفر میں بھی ان کا جی چاہتا اور
لڑائی طول پکڑتی تو ربیع الاول کو حرام مہینہ قرار دے لیتے تھے
اسی طرح دوسرے حرام مہینوں کی نسبت بھی یہی عمل کرتے تھے
جس کا نتیجہ یہ تھا کہ "اربعہ حرم" سال کے سب مہینوں میں چکر کھاتے
تھے۔ بعض دفعہ تو تجاوز منتہا کو پہنچا کر کہتے کہ یہ سال تیرہ یا چودہ
مہینوں کا ہوگا۔

"نتائج الافہام" میں محمود پاشا نے حسبِ ذیل مختلف
اقوال نقل کیے ہیں۔

(۱) عرب سال قمری کو شمسی بنانے کے لیے کبھی اپنے
کبھی اپنے سنہ میں ایک ہفتے کا اضافہ کرتے تھے۔
(۲) ۲۴ سال کی مدت گزرنے کے بعد نو مہینے ...

ختم کیا کرتے تھے۔

(۳) ۱۹ سال کے بعد (۷) مہینے بڑھاتے تھے۔

(۴) ہر تیسرے سال ایک مہینہ بڑھایا جاتا تھا۔

(۵) ہر دوسرے سال ایک ماہ کے اضافے کا دستور تھا

اسی قبیل کے تفصیلات شیخ ابن حجر عسقلانی نے صحیح بخاری کی شرح فتح الباری میں درج کیے ہیں۔

الغرض سب سے پہلے جس شخص نے اس "نسی" کو جاری کیا وہ حذیفہ ابن عبید تھا۔ جس کا مشہور نام "قلمس" ہے اور جو بنی مالک بن کنانہ کی نسل سے تھا۔ علامہ مسعودی نے احوال مکہ میں لکھا ہے کہ اس کے بعد اس کا بیٹا قلع بن حذیفہ جانشین ہوا اسی کے زمانے میں اسلام کا ظہور ہوا۔ اس خاندان کا اس رسم کو انجام دینے والا سب سے آخری شخص ابو ثمامہ تھا۔ بنی کی رسم پر عرب فخر کرتے تھے۔ چنانچہ عہد جاہلیت کا ایک شاعر عمرو بن قیس فراسی کہتا ہے۔

وَنَحْنُ النَّاسِئُونَ عَلَى مَعَدٍّ
شُهُورَ الْحِلِّ نَجْعَلُهَا حَرَامًا

یعنی معد (بن عدنان) کی اولاد میں مہینوں کو مقدم و موخر کرنے کی رسم ہم ہی نے جاری کی ہے۔ ہم وہ ہیں جو حلال مہینوں کو حرام کر دیتے ہیں۔

اور ایک شاعر کا یہ مصرعہ مشہور ہے۔ ع

وَمِنَّا مُنْسِئُ الشُّهُورِ الْقَلَمَّسُ

یعنی مہینوں کو ادل بدل کرنے والا قلمس ہمارے ہی خاندان سے تھا یا ایک اور شاعر کہتا ہے۔

لَنَا نَاسِئٌ تَمْشُونَ تَحْتَ لِوَائِهِ
يُحِلُّ إِذَا شَاءَ الشُّهُورَ وَيُحَرِّمُ[1]

ہمارے لیے مہینوں کو تبدیل کرنے والا ایک سردار ہے جس کے جھنڈے تلے ہم لڑائی کے لیے چلتے ہیں۔ اور وہ سردار جب چاہتا ہے مہینوں کو حلال کر لیتا ہے اور جب چاہتا ہے حرام کر دیتا ہے۔

مسعودی بیان کرتے ہیں کہ جب کفار عرب حج سے فارغ ہوتے ہو ابو ثمامہ کے پاس منیٰ میں آکر جمع ہوتے تب وہ ایک خاص رسم کی تکمیل کے بعد کھڑے ہو کر یہ مضمون بیان کرتا تھا کہ "اے اللہ میں نے دو صفروں سے ایک پہلے صفر کو حلال کر دیا اور دوسرے کو آیندہ سال کے لیے نسی کر دیا۔

جب اسلام آیا تو حضرت رسالت پناہی صلعم نے ان تمام باتوں کو کفر اور گمراہی قرار دیا۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ حکم سنایا کہ:—

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۚ فَلَا تَظْلِمُوا فِيهِنَّ أَنْفُسَكُمْ ۚ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ۝

إِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ ۖ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِلُّونَهُ عَامًا وَيُحَرِّمُونَهُ عَامًا لِيُوَاطِئُوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ فَيُحِلُّوا مَا حَرَّمَ اللَّهُ ۚ زُيِّنَ لَهُمْ سُوءُ أَعْمَالِهِمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ

تحقیق کہ مہینوں کی تعداد خدا کے نزدیک جس روز کہ اس نے آسمان و زمین کو خلق کیا اس کی کتاب میں بارہ مہینے قرار پاچکے ہیں۔ جن میں سے چار مہینے حرام ہیں۔ دین کا یہی سیدھا راستہ ہے سو تم ان مہینوں میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو اور سب مل کر مشرکین

[1] آثار ص ۶۲

لڑو۔ جس طرح کہ وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں۔ اور یہ جان رکھو کہ خدا متقیوں کے ساتھ ہے۔

بے شک "نسی" کا طریقہ کفر کی زیادتیوں سے ہے۔ جس سے کافر گمراہ ہوتے ہیں کہ ایک سال (ایک مہینہ) کو حلال کر لیتے ہیں۔ اور ایک سال حرام تاکہ جو تعداد خدا نے حرام کی ہے اس کو پورا کریں۔ ان کے برے عمل ان کو اچھے دکھائی دیتے ہیں۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ کافروں کو ہدایت نہیں کرتا۔

ہمارے محترم فاضل دوست ڈاکٹر حمید اللہ صاحب استاد جامعہ عثمانیہ نے رسالہ معارف اعظم گڑھ بابت جولائی سنہ ۱۹۴۲ء میں لکھا ہے کہ نسی کے متعلق سویڈن کے پروفیسر سوبرگ نے جرمن زبان میں سنہ ۱۹۳۱ء میں جو مقالہ لکھا ہے۔ وہ چاہے نتائج کے لحاظ سے غیر تشفی بخش ہو۔ لیکن مواد اور حوالوں کے اعتبار سے بہت مفید ہے اسی کا خلاصہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں بھی دیا گیا ہے۔

آخر پر یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ ہجری سال (۳۵۴) دن سے کم اور (۳۵۵) دن سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اور شمسی سال سے دس یا گیارہ دن ۵ گھنٹہ ۴۸ منٹ۔ ۴۷ ۶۲۲ ۴ سکنڈ چھوٹا ہوتا ہے۔ اس فرق کی نسبت ایک واقعہ قابل ذکر ہے وہ یہ کہ:۔

اہل کتاب میں سے ایک شخص نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ سوال کیا کہ آپ کی کتاب الٰہی میں اصحاب کہف کے متعلق یہ جو کہا گیا ہے کہ وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا (یعنی وہ اپنے غار میں ۳۰۹ برس تک رہے) تو یہ بات ہماری آسمانی کتاب کے بالکل مغایر ہے۔ کیونکہ اس میں ۳۰۰ برس سے زیادہ مدت نہیں لکھی ہے جب آپ اپنی کتاب کو کتاب اللہ کہتے ہیں تو پھر یہ فرق دو آسمانی کتابوں میں کس طرح پیدا ہو سکتا ہے تو اس پر جناب امیر علیہ السلام نے یہ ارشاد فرمایا کہ تمہاری کتاب میں جو (۳۰۰) سال مدت لکھی ہے وہ یونانیوں کے حساب سے ہے اور ہماری کتاب میں حساب عرب سے لکھتے ہیں کہ معترض یہ جواب سن کر فوراً حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔

باب العلم رضی اللہ عنہ کے اس قول مبارک سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یونانیوں کا سال چونکہ شمسی ہوتا ہے اور عربوں کا قمری اس لیے ان ہر دو سنین کی ایک ایک صدی میں تین سال کا فرق پیدا ہو جاتا ہے اسی لیے یونانی (۳۰۰) سال کے حساب سے قمری (۳۰۹) سال ہوئے۔

اہل ہیئت نے سنین قمری کو دور صغیر و دور کبیر پر منقسم کیا ہے جن کی مدت حسب ذیل سمجھی جاتی ہے۔

۳۰ سال قمری کا ایک دور صغیر کہلاتا ہے۔

اور (۷) دور صغیر (یعنی (۲۱۰) سال کا ایک دور کبیر ہوتا ہے سنہ ہجری کا پہلا دور کبیر (۲۱۰) ہجری پر ختم ہو گیا۔ اس میں دس سال عہد نبوت کے ہیں۔ باقی (۲۰۰) سال وہ ہیں جن کی نسبت یہ حدیث وارد ہے کہ

"الآیات بعد المائتین"

مہندسین ہیئت نے یہ کلیہ قرار دیا ہے کہ مدت دور صغیر میں (۱۹) سال تو (۳۵۴) دن کے ہوتے ہیں۔ اور (۱۱) سال (۳۵۵) دن کے۔

ہر دور صغیر دوسرے دور صغیر کے ساتھ یہ مماثلت رکھتا ہے کہ جس ترتیب کے ساتھ پہلے دور صغیر میں قمری مہینے ۲۹-۲۹ یا ۳۰-۳۰ دن کے آئے تھے اس طرح دوسرے دور میں بھی وہ سب قمری مہینے اسی ترتیب کے ساتھ ۲۹-۲۹ یا ۳۰-۳۰ دن کے آئیں گے اور پچھلے دور صغیر کے تمام سال اور مہینے اپنے سے پہلے دور کے سالوں سے بالترتیب ۱۵ روز بعد شروع ہوا کرتے ہیں۔

دور کبیر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے سے پہلے دور کے سالوں اور مہینوں کے مطابق ہوتا ہے۔ یعنی سالوں اور مہینوں کے شروع ہونے کے دن" اور ان کے دنوں کی تعداد بالترتیب بالکل وہی ہوتی ہے جو اس سے ماقبل دور کی

آخری تصویر

آکاش کا دیوتا اپنے خون آلودہ چہرے کو دکھا کر کہہ رہا تھا "اے دھرتی والو! ہر عروج کے بعد زوال لازمی ہے" گاؤں کی معصوم دل رکھنے والی دیویاں سروں پر خالی ٹوکریاں لیے شہر سے واپس ہو رہی تھیں یقیناً انکے معصوم دل اس آواز کو سن رہے ہونگے۔ لیکن آہ! شہر کے درندہ خصلت رئیس — نہیں اس صدا سے نفرت ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس صدا کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دیں اس لئے وہ رات کے ہی گھر کے دیے روشن کر دیتے ہیں۔ شاید خوشی میں۔ کتنے خود غرض ہیں یہ دنیا والے! اپنے دیوتا کے خون پر ایک آنسو کی بھینٹ نہیں! — کہیں دور الو بول رہا تھا — نہیں رو رہا تھا — کسی کے رکھے دل کے ساتھ — شاعر کے دکھے دل کے ساتھ — میرے بھیا کے دل کے ساتھ — شاید اس سمے بھیا کا دل بھی "اے دھرتی والو! ہر عروج کے بعد زوال لازمی ہے" کہہ رہا ہوگا۔ سن رہا ہوگا عالم کی ہر صدائے ارتعاش سے — دیکھ رہا ہوگا لٹر کی آخری حد تک — ہر عروج کے بعد زوال — لازمی۔ ہاں یقیناً — اجالے کے بعد اندھیرا — زندگی کے بعد موت — خوشی کے بعد رنج — ہنسنے کے بعد رونا — بے شک — اے دولت کے متوالے تو کس خیال میں ہے۔ تیرا بھی یہی حال ہوگا — آج امیر ہے کل؟ — برا خیال سمجھ لیجئے اڑا جا رہا۔ دور بہت دور — چلتی ہوئی ریل کے ساتھ — تاریک کے جنگلوں میں — پہاڑوں کی لمبی لمبی قطاروں میں۔ سبزہ زار۔ ہول کھیل — مغرب کا وقت۔ بادلوں کے سائے سرخ ٹکڑے کائنات کے ذرے ذرے کو اجاگر بناتے ہوئے — پہاڑوں سے گرتے ہوئے آبشار

کہیں بل کھایا ہوا سرخ دریا — نہ جانے اس میں کتنی آرزوؤں کا خون ہے — کتنی خودداریوں کا خون — کتنی قابلیتوں کا خون — کتنے دستکاروں کا خون — ایک دولت کے ہاتھوں —

ریل کے ایک ڈبے میں کوئی بیٹھا چلا جا رہا ہوگا — نہ معلوم کہاں — وہ شاعر بھی تھے مصور بھی — میں ان سے مصوری سیکھتی تھی۔ آخری تصویر انہوں نے چتا کی بنائی تھی — اپنے پتی کے ساتھ ایک پتنی کا جلنا۔ اپنے گرو کے ساتھ ایک چیلی کا جلنا۔ جوش محبت میں — جوش عقیدت میں — ہاں انہیں مجھ سے محبت تھی اور مجھے ان سے — لیکن کیسی؟ جیسے ایک بھائی بہن میں ہوتی ہے — بے لوث — بے غرض — میں انہیں بھیا کہتی تھی — موہن بھیا اور وہ مجھے پریت کہا کرتے تھے۔ میرا نام پرتیا تھی لیکن انہوں نے مجھے پریت بنایا تھا — قسمت سراپا محبت — "کیوں پریت۔ دنیا ہمیں اچھی نظر سے نہیں دیکھ رہی ہے نا؟" یہ تھے انکے الفاظ جن کے جواب میں میں نے کہا تھا "نہ دیکھا کرے بھیا۔ بھلا دنیا ہمارا کیا بگاڑ لیگی" میں اب تک نہیں سمجھ سکی تھی کہ دنیا ہمارا کچھ بگاڑ سکتی ہے — میں سمجھ رہی تھی کہ موہن بھیا ہمیشہ ہمیشہ میرے ساتھ رہیں گے۔ ہمیشہ۔ ہمیشہ "چاچا جی میرے سر کی قسم لے لیجئے — میری اپنی پرتیا کی قسم لے لیجئے۔ یہ موہن اس کی چوٹی میں پھول لگاتا ہے۔ روز آنہ اس کی تصویریں اتارتا ہے" رادھا نے ایسی ہی باتوں سے چاچا جی کو بھڑکایا۔ وہ ایک باپ تھے۔ ہندستانی باپ۔ بیٹی کا اس قدر رکھنا کیسے گوارا کرتے۔ مگر افسوس یہ تہمت تھی سراسر تہمت۔ سچ کے پردے میں اکثر کی جانے والی تہمت — رادھا نے ایسا کیوں کیا ہوگا؟ — کاش! وہ ایسا نہ کرتی — دوسری

موہن سے پریم کرتی — کیا میں اسے روک رہی تھی — میں تو موہن کی بہن تھی — مجھے یاد ہے بھیا نے ایک بار پتا جی کے سامنے میری چوٹی میں ایک پھول ان کی اجازت سے لگا کر ایک تصویر اتاری تھی — مقابلہ تھا انکا — بڑے بڑے مشاقوں کے ساتھ — لیکن میرے بھیا نے پہلا انعام لیا تھا — اسکے بعد شاید انھوں نے میرے بالوں کو کبھی چھوا تک نہیں — مگر پتا جی کو رادھا کی بات پر یقین آگیا — افسوس — دوسرے ہی دن انھوں نے کہا "پرتیا و موہن کل یہاں سے چلا جائے گا" "کل — موہن چلا جائے گا — کیوں پتا جی ؟" نہ پوچھیے اسوقت میرا کیا حال تھا — میں نے بے کھٹکے پتا سے یہ سوال کر دیا اور اسکے جواب میں زہر بھری نظروں کی ایک گھور تھی — موہن چلا گیا — دوسرے ہی دن — آج دس مہینے ہو گئے تھے اسے جاکر — وہ آج پھر آیا تھا ہمارے گھر — اس شہر میں شاید وہ سیر کو آیا تھا — کاش وہ میرے مکان پر نہ آتا — خیر وہ آگیا — اب میں اس سے پردا کرتی تھی — اپنے بھیا سے — پتا جی کا یہ حکم تھا — موہن نے نوکر سے کہلا بھیجا کہ وہ آیا ہے۔ بھلا موہن اور مسٹر چندن لال سیٹھ کا کیا جوڑ — سماج — آہ سماج — ظالم "اس سے کہدو کہ صاحب سو رہے ہیں" پتا جی نے حقہ پیتے ہوئے کہا — نوکر نے یہی کہدیا لیکن میری چھوٹی بہن شیلا ان سے کہہ بیٹھی کہ "پتا جی کہہ رہے تھے کہ نہ جانے یہ لونڈا کیوں آتا ہے۔ اس سے ملکر ہمیں کیا فائدہ — ایسے لوگ آیندہ سے نہ آیا کریں۔ ہماری قوم میں فرق آنے کا اندیشہ ہے" — میں دریچے سے دیکھ رہی تھی — اسوقت انکی آنکھوں میں آنسو تھے — رو رہے تھے میرے موہن بھیا — انھوں نے شیلا سے کہا "پرتیا بہن کو میرا پرنام کہنا — وہ ہمیں خط کیوں نہیں لکھتیں ؟" اور بغیر جواب لیے تانگے والے کو کہدیا کہ تانگہ بڑھا — بھیا چلے گئے — آج شام کی ریل سے — جنگلوں — پہاڑوں اور آبشاروں کے درمیان سے گذر رہی ہوگی ان کی ریل — ان جنگلوں سے جہاں ان رسموں کی انسانیت کسی ناکام آرزو کی روح کی طرح بھٹک رہی ہوگی ان پہاڑوں پر انہیں ان قہری بھیڑیوں کی انسانیت سر پھوڑتی نظر آرہی ہوگی — آبشار کا قطرہ قطرہ انہیں انسانیت کا لہو معلوم ہوتا ہوگا — آفتاب انسانیت کی لاش پر خون کے آنسوں بہا رہا تھا — میں ہاتھ میں چتا کی تصویر لیے چھت پر بیٹھی اس پاپی جگ کی رنگینیوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی — بھیا قریب تھا — ہاں مصور قریب تھا — پتا جی اس سے ملنا نہیں چاہتے تھے — آہ شیلا نے ان سے یہ سب کچھ کیوں کہدیا وہ چلے گئے — یہ سب کچھ سن کر — اپنے من میں بھالے چبھوا کر — اپنے من کا خون کر دلکے اپنے من کا جنازہ لیے — چلے گئے اپنے دل کی لاش کے ساتھ میرے دل کی بھی لاش نکال کر — ایک چتا میں دو دل جل رہے تھے — یہی تھی ان کی بنائی ہوئی آخری تصویر۔

ایس ایس — رضویہ

رابرٹ بائل

سترھویں صدی کا آخری نصف یورپ کے ذہنی ارتقا کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس عہد میں علوم انسانی کے ہر شعبہ میں لاادریت، تجسس اور تجدید کی روح کارفرما تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لندن کی رائل سوسائٹی، فلورنس کی اکاڈیمیا، پیرس کی اکاڈیمی رائل اور برلن اکاڈیمی معرض وجود میں آئی۔ اس عہد سے پہلے کیمیا کا علم مذہبی پیشواؤں اور بازی گروں ہی کی حد تک مخصوص تھا لیکن اب عوام نے بھی اسے حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔ قدما کے خالص استنباطی طریقے کی جگہ تجربے و مشاہدے نے لے لی۔ قدیم سائنس پر سب سے پہلے رابرٹ بائل نے حرف گیری کی اور اسی نے جدید سائنس کی طرح ڈالی۔

رابرٹ بائل کی ولادت آئرستان کے قصبے لسمور میں سنہ ۱۶۲۷ء میں ہوئی۔ اس کا تعلق اپنے زمانے کے ایک معزز گھرانے سے تھا چنانچہ اس کا باپ رچرڈ بائل آئرستان کا لارڈ چانسلر تھا۔ اس کا بڑا بھائی ارل آف کارک تھا جو اپنے عہد کے مشاہیر میں سے تھا۔ اسی لیے انگریزی ادب میں بائل کے متعلق یہ فقرہ مشہور ہو گیا ہے "وہ ابوالبرکات (؟) بھی تھا، ارل آف کارک کا بھائی اور پدر علم کیمیا" تھا۔

رابرٹ بائل کی تعلیم انگلستان کی مشہور درسگاہ ایٹن میں مشہور انگریز مصنف سر ہنری ووٹن کے زیر نگرانی ہوئی۔ لیکن اس کی صحت ہمیشہ خراب رہا کرتی تھی اس لیے ایٹن کی تعلیم کی تکمیل کے بعد اس نے پانچ سال براعظم یورپ کی سیر و سیاحت میں صرف کیے۔ اس سیر و تفریح کے دوران میں اس نے کافی علمی تجربہ حاصل کر لیا۔

انگلستان کو واپسی پر اس کی عمر صرف (۱۷) سال کی تھی۔ اس کم عمری میں اس نے سائنس پر سنجیدہ کام شروع کر دیا اور "انویزیبل کالج" کا رکن بن گیا۔ یہ نئی سائنس اور نئے فلسفے سے دلچسپی رکھنے والوں کی ایک چھوٹی انجمن تھی۔ اس انجمن کے ارکین لندن میں ایک دوسرے کے مکان پر وقتاً فوقتاً جمع ہوتے اور "فلسفیانہ تحقیقات اور متعلقہ امور پر غور و فکر اور بحث مباحثے میں حصہ لیا کرتے"۔ بعد میں یہ جلسے آکسفورڈ میں ہونے لگے اور بائل نے سنہ ۱۶۵۴ء میں وہیں سکونت اختیار کر لی۔ یہاں ولکنس، جان والس، سیتھ وارڈ، ولیم پٹی، تھامس ولس، کرسٹوفر رن جیسے مشاہیر بھی ان جلسوں میں شریک ہونے لگے۔ یہ سب حضرات جدید فلسفے کی ترقی میں کوشاں تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ادنیاے فطرت کے مشاہدے اور ان پر تجربوں کے بغیر قابل وثوق علم تک رسائی ممکن نہیں۔ انھوں نے قدرت کے کلیات کی دریافت کے لیے اس طریقے کو بڑی محنت سے استعمال کیا۔ وہ اپنی تحقیقات کے نتائج سے ایک دوسرے کو آگاہ کرتے رہتے تھے۔ ان کی کوششوں کی بدولت تھوڑے ہی عرصے میں "انویزیبل کالج" کو ملک کی سربرآوردہ انجمن کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ انگلستان کے بادشاہ چارلس ثانی نے اس کی سرپرستی قبول کر لی اور اس مناسبت سے "رائل سوسائٹی آف لندن" سے موسوم کیا گیا۔ رابرٹ بائل رائل سوسائٹی کے بانیوں میں سے تھا۔ اس نے سنہ ۱۶۶۸ء میں لندن میں سکونت اختیار کر لی اور وہیں سنہ ۱۶۹۱ء میں اس کی وفات واقع ہوئی۔

بائل ایک محنتی آدمی تھا۔ اس کی طبیعت میں علم
سادگی اور راست بازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اسے
سائنس سے حقیقی انس تھا اور اس نے اپنی تمام عمر اسی
شغف میں صرف کر دی۔ معاشری اعتبار سے وہ اعلا رتبہ
رکھتا تھا اور اکثر لوگ اس کی ہم نوائی و پیروی کو باعث
فخر سمجھتے تھے جس سے سائنس کے شائقین اور کارکنوں کی تعداد
بہت بڑھ گئی۔ اسے علمی دنیا میں جو شہرت حاصل تھی اس سے
نہ صرف اس کا ذاتی اثر بڑھ گیا بلکہ سائنس کے وقار میں بھی
بہت اضافہ ہوا اور عوام بھی اس علم کے حصول کی طرف
مائل ہو گئے۔

تاریخ سائنس میں بائل کا تحقیقی و تجرباتی کام بڑا رتبہ رکھتا
ہے اس نے ہوا پمپ کی ایجاد کی اور ہوا انجن کی مدد سے گیسوں
کے بنیادی خواص دریافت کیے جن میں سب سے اہم وہ رشتہ
ہے جو گیسوں کے حجم اور دباؤ میں پایا جاتا ہے اور جسے علمی زبان
میں "کلیہ بائل" کہا جاتا ہے۔ بائل نے تجربوں سے یہ بھی بتایا کہ
مائع کا نقطۂ جوش کرۂ ہوا کے دباؤ پر منحصر ہوتا ہے سانس
کے عمل کی بھی اس نے توضیح کی نیز ٹھوس کے اہتزاز اور آواز
کی اشاعت پر ہوا کے اثر کو واضح کیا۔ شعلے کی ماہیت اور
تنفس و احتراق کے ساتھ ہوا کے تعلق پر بھی اس نے تجربے
کیے۔ بائل نے سب سے پہلے سیسے اور جوئے کے اسلیٹ
کی کشید سے ریسٹون تیار کیا۔ اسی نے لکڑی کی کشید فارق
کے ماحصل سے میتھائیل الکوحل تیار کیا۔ اس نے قلموں کی
اشکال کے مطالعے کی اہمیت پر بھی زور دیا۔ اس کا خیال
تھا کہ ذرات کی اندرونی حرکت ان کی ظاہری شکل سے
گہرا تعلق رکھتی ہے۔ بائل نے بگھر روم کے بعض تعلیمی آلات
ایجاد کیے جو آج تک استعمال ہوتے ہیں۔ اسی نے سب
سے پہلے نیج اور رنگ کا تبدیلی آمیزہ تیار کیا تھا۔

بائل کی سب سے بڑی علمی خدمت یہ تھی کہ اس نے
کیمیا میں تجسس و تفحص کی نئی روح داخل کر دی۔ اس وقت
کیمیا کو علم طب کا ایک ذیلی شعبہ سمجھا جاتا تھا لیکن بائل اور اس کے
پیروؤں نے اسے جداگانہ علم کی حیثیت عطا کی یعنی ایسا علم
جس کے اصول محض تجربے سے معلوم کیے جا سکتے تھے اور جس کی غایت
اپنے متعلقہ مظاہر کے کلیات کی دریافت تھی۔ یہاں بائل کی
معرکہ آرا تصنیف "اسکیپٹکل کیمسٹ" (لاادری کیمیاداں) کا ذکر
ضروری ہے جو تاریخ کیمیا میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے اسے ہم علم کیمیا
کا ایک ابتدائی نقطہ سمجھ سکتے ہیں۔ اس کتاب میں ان شبہات و
تشکک کا ذکر ہے جو طبیعی و کیمیائی مسائل کے بارے میں مروجہ خیالات
و نظریات کی بابت بائل کے دل میں پیدا ہوئے اور انھیں تشکک کی
بنا پر اس نے سابق تصورات تنسیخ کی۔ بائل ہی نے سب سے پہلے
عنصر کے جدید خیال کو پیش کیا جو یونانی حکیموں اور قرون وسطا
کے کیمیاگروں اور طبیبوں کے خیالات سے بالکل مختلف ہے۔
اس کے نزدیک ارسطوئی عناصر۔ آگ، مٹی، پانی، اور ہوا حقیقی
عناصر نہیں اور نیز بنیادی اساس کے عناصر۔ نمک، گندھک و پارا
اس نام کے مستحق نہیں۔ بائل کے نقطۂ نظر سے عنصر مادے کی سادہ
شکل ہے جسے سادہ تر اشکال میں تحلیل نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے
یہ بھی بتایا کہ مرکب وہ شئے ہے جو دو یا زیادہ عناصر کے اتحاد
سے بنتا ہے اور مرکب کی تحلیل سے عناصر حاصل ہوتے ہیں۔ بائل
نظریۂ جوہر کا بھی حامی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تمام اشیا کا مادہ
چھوٹے چھوٹے ذرات میں منقسم ہو سکتا ہے۔ بائل نے کیمیائی ترکیب
کی توجیہ کے لیے الف کا نظریہ پیش کیا۔ جب ایک عنصر دوسرے
عنصر سے ترکیب کھاتا ہے تو اس نظریے کی رو سے اس کا سبب یہ
ہے کہ ان دونوں عناصر میں ایک رغبت پائی جاتی ہے جسے
اصطلاح کیمیائی الف کہا جاتا ہے۔ آگے چل کر سویڈن کے
مشہور کیمیاداں برزیلیس نے الف کے نظریے کو زیادہ
واضح و جامع بنا دیا۔

بائل کی توجہ کیمیا کے نظری پہلو تک محدود نہ تھی
اس کے نزدیک کیمیاداں کا اہم فریضہ اشیا کی ماہیت و
ترکیب کی دریافت تھی جس کے باعث تشریحی کیمیا کی [illegible]

جتنے منہ اتنی باتیں

شاہدہ۔ اختر! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ رشک مردوں کی طبیعت میں اتنا زیادہ کیوں ہوتا ہے؟ آخر عورتیں بھی تو انسان ہیں اور رشک اگر انسانی جذبہ ہے تو عورتوں میں بھی اتنا ہی ہونا چاہیے لیکن واقعات اس کے خلاف ہیں اس لیے میں یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوں کہ رشک حیوانی جذبہ ہے اور اس کو انسانیت سے دور کا بھی تعلق نہیں ——— کیوں ہے نا؟

اختر۔ بلکل ٹھیک

شاہدہ۔ جب یہ نتیجہ نکلا کہ رشک حیوانی جذبہ ہے اور مشاہدہ عام ہے کہ مردوں میں زیادہ ہوتا ہے تو آپکو ماننا پڑے گا کہ مردوں میں حیوانی جذبات زیادہ ہوتے ہیں اور انسانی جذبات کم ——— (ایک لمحہ اختر کے جواب کا انتظار کرتی ہے) ——— بولتے کیوں نہیں

اختر۔ بلکل ٹھیک ہے۔

شاہدہ۔ (ایک دم خوشی سے) یعنی یہ کہ تم مانتے ہو کہ مردوں کی طبیعت میں لامحالہ رشک ہوتا ہے۔

اختر۔ بلکل ٹھیک

شاہدہ۔ (اختر کے انداز گفتگو سے غیر مطمئن ہوتی ہے اور شبہ کرنے لگتی ہے) تم سمجھتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو

اختر۔ (بات کاٹ کر) بلکل ٹھیک ہے۔

شاہدہ۔ کیا بلکل ٹھیک ہے؟

اختر۔ وہی جو آپ کہہ رہی ہیں۔

شاہدہ۔ کیا کہہ رہی ہوں میں؟

اختر۔ تو آپ کو بہتر جاننا چاہیے۔

شاہدہ۔ (غصے سے) اس کے معنی یہ ہیں کہ میں گھنٹہ بھر جھک مار رہی ہوں۔

اختر۔ بلکل ٹھیک ہے

شاہدہ۔ (اور زیادہ غصے سے) لاحول ولا، عجیب آدمی ہو آخر بلکل ٹھیک ہے کی رٹ کیا لگا رہی ہو۔ کب سے سر مار رہی ہوں اور تمہارے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ میں پوچھتی ہوں تم کہاں گیا تمہارا فلسفہ اخلاق۔

اختر۔ جی ——— فلسفہ اخلاق؟

شاہدہ۔ خدا کا شکر کہ اس دفعہ تم نے بلکل ٹھیک ہے کہہ

اختر۔ معاف کیجیے میں ذرا ———

شاہدہ۔ (بات کاٹ کر) میں ذرا ڈرامے کا پلاٹ سوچ رہا تھا ——— کیوں یہی کہہ رہے تھے نا آپ؟

اختر۔ ہاں ہاں بلکل ——— (یکدم رک کر) معاف کیجیے اگر آپ خفا نہ ہوں تو کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کا قیاس بلکل ٹھیک

شاہدہ۔ خدا کے لیے بلکل ٹھیک ہے کو بالکل چھوڑ دو اور ہوش کے ناخن لو۔

اختر۔ جی، جی ———

شاہدہ۔ اور یہ جی جی بس چھوڑ دو

اختر۔ تو پھر کیا کہوں؟

شاہدہ۔ میں یہ پوچھتی ہوں کہ ابھی تم جو اقرار کر رہے تھے کہ مردوں کی طبیعت میں بلا کا رشک ہوتا ہے کیا اس پر قائم ہو؟

اختر۔ ذرا ٹھہریے بھابی صاحب! میں پلاٹ مکمل کر کے خیالات منتشر ہو رہے ہیں دراصل میں اس ڈرامے میں دکھانا چاہتا ہوں کہ انسانی طبیعتوں میں کتنا اختلاف ہے۔ آپ سمجھتی ہیں کہ مردوں کی طبیعت میں رشک ہوتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ رشک بلکل ہی نسوانی جذبہ ہے۔ عورتیں چونکہ رشک کا شکار رہتی ہیں اس لیے وہ اپنے جذبات کا عکس مردوں کے آئینے میں دیکھتی ہیں۔

شاہدہ۔ کیا وہ بات بہت ہی پیچیدہ گفتگو سے سمجھ میں آ سکتی تھی ہو اگر تم ابھی تھوڑی دیر پہلے تو تم اس بات کو تسلیم کر رہے تھے کہ مردوں کی طبیعت میں بلا کا رشک ہوتا ہے

اب خواہ مخواہ الٹی سیدھی حجت کر رہے ہو۔ میں کہتی ہوں مردوں کی فطرت کا یہ خاصہ ہے کہ جب کچھ بنتی نظر نہیں آتی تو کج بحثی کرنے لگتے ہیں۔

اختر۔ (میز پر مکا رسید کر کے) بالکل ٹھیک ہے بھابی جان بالکل ٹھیک ہے ——— میری ہیروئن بھی اسی طرح استدلال کا رخ بدلتی ہے، دیکھا آپ نے عورتوں کی نفسیات کا میں نے کتنا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ آپ کی باتیں بتا رہی ہیں کہ مجھے مکالمے کے اسی پہلو پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے "تلون عورت کی فطرت ہے"!

شاہدہ۔ جھوٹ بالکل جھوٹ۔ مرد ہمیشہ عورت پر یہ جھوٹا الزام لگاتے ہیں۔

اختر۔ ہاہاہا ——— (ایک طنزیہ قہقہہ لگا کر) تلون کا ایک اور ثبوت۔

شاہدہ۔ (منہ چڑا کر) تلون کا ایک اور ثبوت۔

اختر۔ ارے رے رے! یہ آپ منہ کیوں بگاڑ رہی ہیں، استاد داغ نے کہا ہے ———

شاہدہ (بات کاٹ کر) بس بس رہنے دیجئے میں جانتی ہوں کیا کہا ہے اس کلموے نے۔

اختر۔ آہستہ کہیے آہستہ بھابی جان! کوئی سن پائے گا تو غضب ہی ہو جائے گا، جانتی ہیں آپ کہ استاد مرحوم کے جانشین خدا جھوٹ نہ بلوائے تو سارے ملک میں دس ہزار سے کسی طرح کم نہیں ہیں اور خاص شاگردوں کی تعداد تو آپ کچھ نہ پوچھیے۔ بعض تو ایسے ہیں کہ استاد کی موت کے بعد بھی عقیدت شاگرد ہوئے ہیں ———

شاہدہ۔ (بات کاٹ کر) بس رہنے دیجئے بھونڈا مذاق آپ کا۔

اختر۔ تو وا یہ عرض ہے۔ لیجیے یہ رہی عورت کے تلون کی ایک اور دلچسپ مثال۔

شاہدہ۔ توبہ توبہ (دونوں ہاتھ زمیں پر) خدا کے لیے اختر مجھے اس طرح دق نہ کرو۔

اختر۔ ارے یہ کیا؟ آپ تو رو رہی ہیں یا کم سے کم رونے والی کی صورت بنا رہی ہیں ——— یہ ہے عورت کا آخری حربہ مگر ——— خیر جانے دیجیے اس بحث کو۔ اچھا اب کام کی بات کیجیے۔

شاہدہ۔ تو پھر بتاؤ اس واقعہ کا کیا ہوگا؟

اختر۔ کس واقعے کا؟

شاہدہ۔ پرسوں شام کے واقعہ کا۔

اختر۔ پرسوں شام کا کیا واقعہ؟

شاہدہ۔ ارے تو یہ تمہارے بھائی نے نوجوان کا جو سر توڑ دیا تھا اسی کو پوچھتی ہوں۔

اختر۔ معاف کیجیے میں کچھ نہ سمجھا۔ کیا بھائی جان نے کسی کا سر توڑ دیا۔ کب؟ کیونکر؟ نہ آپ نے کچھ بتایا اور نہ انہوں نے کچھ سنایا۔

شاہدہ۔ تھوڑی دیر پہلے جو کہہ رہی تھی وہی تو تھا واقعہ۔

اختر۔ اچھا اچھا معاف کیجیے، میں نے کچھ نہیں سنا تھا براہ کرم دہرا دیجیے۔

شاہدہ۔ اب کی دفعہ کان کھول کر سنو۔ ہوا یہ کہ پرسوں رات کو میں اور تمہارے بھائی پارک سے گزر رہے تھے۔ انہیں گھر لوٹنے کی جلدی تھی اور میں کچھ دیر اور ٹھہرنا چاہتی تھی مگر وہ اپنی عادت کے مطابق مجھے تیز تیز لیے جا رہے تھے کہ باہر سواری ملنے میں دقت نہ ہو میں ٹھنڈی ہوا سے متاثر تھی اور میرا جی سچ پوچھو تو یہ چاہتا تھا کہ خدا کرے پارک ختم ہی نہ ہو اور ہم دونوں یونہی سبز سبز بھیگی بھیگی گھاس روندتے ہوئے چلتے رہیں اور بس چلتے ہی رہیں۔

اختر۔ بہت خوب، مکرر ارشاد ہو۔ ترقی پسند شاعری کا عمدہ نمونہ ہے۔ سبحان اللہ ذرا لے سے پڑھیے۔ (کچھ اس طرح پڑھتا ہے)

سبز سبز بھیگی بھیگی گھاس
کو روندتے ہو چلتے رہیں
اور بس چلتے ہی رہیں

شاہدہ۔ پھر تم نے بیچ میں مذاق شروع کر دیا۔
اختر۔ معاف کیجیے میں سمجھا تھا کہ ریہرسل کروا رہا ہوں۔
شاہدہ۔ تو میں کیا کہہ رہی تھی
اختر۔ اوہ! آپ کو تو اپنا پارٹ یاد نہیں پرامپٹنگ کی ضرورت ہے۔
شاہدہ۔ میں کہتی ہوں کہ مذاق کا بھی ایک وقت ہوتا ہے
اختر۔ خفا نہ ہوں آپ کہہ رہی تھیں کہ میرا جی تو یہ چاہتا تھا کہ خدا کرے یہ پارک ختم ہی نہ ہو اور ہم دونوں یوں ہی سبز سبز بھیگی بھیگی گھاس کو روندتے ہوئے چلتے رہیں اور بس چلتے ہی جائیں۔
شاہدہ۔ ہاں تو ایسے ہی میں نے دیکھا کہ ایک بنچ پر ایک نوجوان بیٹھا ہماری طرف گھور رہا ہے۔
اختر۔ اوہ! کیا رومانس۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ نوجوان دل میں شعلہ بنی ہوئی آرزو میں گنگنا رہا ہو گا (گانے کی بھونڈی سی نقل کر کے) لگت کلیجوا میں چوٹ۔
شاہدہ۔ (غصہ میں) کیا بیہودہ مذاق ہے اختر۔
اختر۔ معاف کیجیے۔ میں۔ میں سمجھا۔ خیر تو پھر آپ ہی بتائیے تاکہ کیا ہوا۔
شاہدہ۔ جونہی ہم اس نوجوان کے قریب سے گزرے وہ لپک کر اٹھا اور تمہارے بھائی کا بازو تھام کر کہنے لگا۔ جناب! کیا آپ مجھے دیا سلائی دے سکیں گے؟
اختر۔ عجیب کس قدر غیر شاعرانہ سوال؟
شاہدہ۔ اس کی نظریں صاف بتا رہی تھیں کہ میرے قریب آنے کا وہ ایک بہانہ تلاش کر رہا تھا —— مگر سنا تم نے تمہارے بھائی نے کیا جواب دیا؟
اختر۔ کیا؟
شاہدہ۔ فوراً ہاتھ چھڑا کر انھوں نے پاس سے ایک پتھر اٹھایا اور اس بیچارے کے سر پر دے مارا
اختر۔ اوہ! انصاف شعری کے کس قدر خلاف جواب —— سنا تھا کہ کسی شاعر نے روٹی مانگی تھی تو جواب میں پتھر ملا تھا لیکن دیا سلائی مانگنے پر پتھر ملنا تو بالکل ہی نئی بات ہے
شاہدہ۔ تو دیکھا آپ نے مردوں کا رشک۔
اختر۔ اچھا تو یہیں سے رشک کا قصہ شروع ہوا تھا مگر میں
شاہدہ۔ (بات کاٹ کر) رہنے دو اس بحث کو مجھے پوچھنا یہ تھا کہ کہیں وہ شخص مقدمہ وقدمہ تو نہیں ٹھونک دیگا آپ کے بھائی صاحب تو بڑے بے فکری سے پڑے پھر رہے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے۔
اختر۔ آپ کہیں تو کسی وکیل سے مشورہ کر لوں۔
شاہدہ۔ ہاں ہاں ضرور۔ یہی تو کہنے آئی تھی —— اچھا تو اب جاتی ہوں۔
اختر۔ خدا حافظ، آداب عرض ——
(شاہدہ جاتی ہے اور اختر سامنے رکھے ہوئے کاغذوں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ کاغذ الٹنے پلٹنے کی آواز۔ کچھ سیٹی بجانے اور کچھ گنگنانے کی آواز بیس سکنڈ تک جاری رہتی ہے پھر وہ زیر لب بڑبڑاتا ہے) —— پلاٹ کی ترتیب ہی سمجھ میں نہیں آتی مگر یہ بھی تو ایک واقعہ ہے کہ عورت کی فطرت بھی تو سمجھ میں نہیں آتی اور اس میں کسی قسم کی ترتیب نہیں ہوتی۔
(باقر دفعتہً کمرے میں داخل ہوتا ہے)
باقر۔ ہلو اختر کیا ہو رہا ہے۔
اختر۔ باقر بھائی ہیں آداب عرض آیئے آیئے خیریت تو ہے۔
باقر۔ الحمد للہ ہر طرح خیریت ہے۔
اختر۔ میں نے آپ کی خیریت نہیں پوچھی بلکہ اس شخص کی خیریت پوچھی جس کا آپ نے سر توڑ دیا۔
باقر۔ ہا ہا ہا (قہقہہ لگا کر) یہ قصہ تم کو شاہدہ نے سنایا ہو گا۔
اختر۔ جی ہاں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک بھابی یہیں تھیں
باقر۔ وہ خواہ مخواہ پریشان ہیں [illegible] کیا خیال

اختر۔ پریشانی کی تو کوئی بات نہیں بشرطیکہ مجروح کو دواخانے سے ضرر شدید کا سرٹیفکیٹ نہ ملے۔

باقر۔ تم سمجھے نہیں میں نے جو کچھ کیا وہ اپنی حفاظت کے سلسلے میں تھا اور یہ تو تم کو معلوم ہی ہے کہ ملک کا قانون حفاظتی تدابیر کی اجازت دیتا ہے۔

اختر۔ حفاظت کے سلسلے میں؟ کیا مطلب آپ کا اس سے؟

باقر۔ مطلب کیا بات تو صاف ہے نا بھئی! رات کے دس بجے پارک کے ایک سنسان گوشے میں ایک غنڈا مجھے ملتا ہے اور دفعتاً دیا سلائی کا بہانا بنا کر میرا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ میری جیب میں ایک ہزار کے نوٹ ہوتے ہیں اور میری بیوی کے کانوں میں ہیرے کے بیش قیمت بندے۔ ایسے میں میں لوٹ سے بچنے کے لیے پاس سے ایک پتھر اٹھا کر آہستہ سے اس کے سر پر دے مارتا ہوں معمولی سا زخم لگتا ہے اور وہ گر پڑتا ہے۔

بتاؤ اس میں کونسی قانونی گرفت ہے؟

اختر۔ اوہ! میں سمجھا آپ اس نوجوان کو لٹیرا سمجھتے ہیں۔

باقر۔ ہاہاہا (ایک طنز آمیز قہقہہ لگا کر) سمجھتا ہوں کی خوب رہی! ارے بھئی تم سے تو بڑی مشکل ہے کیونکہ تم ہمیشہ خیالی دنیا میں رہتے ہو۔ یہ ہماری مادی دنیا میں اگر ایسا واقعہ پیش آئے تو میں کیا ساری دنیا ایسا ہی سمجھتی ہے وہ غنڈا لٹیرا تھا اور ضرور لٹیرا تھا۔ بھئی مطلق نہیں کا وہ تو حسن اتفاق کہ مجھے فوراً ہی پتھر ہاتھ آ گیا ورنہ گئے تھے ہزار روپے اور ہیرے کے بندے۔

اختر۔ مگر آپ عدالت میں کیسے ثابت کریں گے کہ اس نوجوان کی نیت لوٹنے کی تھی۔

باقر۔ لوٹنے کی نہیں تو پھر ہاتھ پکڑنے کی نیت ہو سکتی ہے۔

اختر۔ مگر اس نے تو صرف دیا سلائی مانگی تھی۔

باقر۔ ہاہا (قہقہہ لگا کر) دیا سلائی نہیں تو کیا روپے مانگتا؟ میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں دنیا کا بالکل تجربہ نہیں ——

کیا تم بھول گئے میرے دوست اشرف کے واقعے کو کہ کس طرح ایک لٹیرے نے ایک پیسہ مانگا تھا لیکن جوں ہی اشرف نے جیب سے قمیص نکالی وہ غنڈا فوراً ہی پوری تھیلی چھین کر رفوچکر ہو گیا۔

اختر۔ مگر وہ تو دوسری بات تھی۔

باقر۔ دوسری وہ دوسری کچھ نہیں۔ چور یہ تھوڑا ہی کہتا ہے کہ میں تمہیں لوٹنے آیا ہوں۔ اتنا تو سوچو کہ اس نے میرا ایک ہاتھ تو پکڑ ہی لیا تھا اور اگر دوسرے سے میں دیا سلائی نکالتا تو وہ موقع پا کر فوراً ہی مجھے زمین پر پچھاڑ دیتا ——

بہرحال تم فکر مت کرو اگر وہ پولیس میں رجوع ہوا تو چوری کی نیت میں سزا بھگتے گا۔ میں نے اس بارے میں وکیل سے مشورہ کر لیا ہے —— اچھا تو میں تم سے اس وقت یہ کہنے آیا تھا کہ تم جو ڈراما کرنے والے ہو اس کے ایک شو کی آمدنی عورتوں کے کلب کو دے دو۔ اس کی معتمد بیچاری دو تین دن سے مجھے تنگ کر رہی ہے۔

اختر۔ ابھی تو ڈراما لکھا ہی نہیں گیا۔

باقر۔ تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ وعدہ کر لو ابھی سے نیک کام ہے بھی۔

اختر۔ مگر میں نے پہلے شو کی آمدنی مردوں کی کلب کو دینے کا وعدہ کیا ہے۔ دراصل کلب کے بعض سرگرم اراکین ہی کے اصرار پر لکھ بھی رہا ہوں۔

باقر۔ پہلا شو نہ سہی دوسرا شو دے دینا۔ عورتیں بھی تو بیچاری امداد کی مستحق ہیں۔

اختر۔ مگر ——

باقر۔ (بات کاٹ کر) اگر مگر کچھ نہیں —— معتمد تم سے کل یا پرسوں ملیں گی۔ انکار مت کرنا کیونکہ میں نے تمہاری طرف سے زبان دے دی ہے —— اچھا اب چلتا ہوں، خدا حافظ۔

(باقر جاتا ہے۔ اختر سگریٹ سلگانے لگتا ہے پھر [illegible] میں نوکر کو پکارتا ہے۔)

اختر۔ عبدل ——— او عبدل ———

(مزے میں آکر گانے لگتا ہے) او عبدل کے بچے ———

او عبدل کے بچے ——— مر گیا کمبخت کہیں، سگریٹ کا ڈبہ کہاں رکھا نہیں معلوم۔ اب تک سنتا تھا کہ بغیر سگریٹ کے سگریٹ جلائے پلاٹ مکمل نہیں ہوتا مگر آج اس کی حقیقت آشکارا ہوئی۔ خیر ہم ہی ڈھونڈ لیں (کرسی سے اٹھتا ہے اور ادھر ادھر کاغذات ہٹا کر ڈھونڈتا پھرتا ہے) ——— اچھا تو یہ رہا (ڈبہ کھولتا ہے اور سگریٹ جلاتا ہے)

(دروازہ پھر کھٹکا ہوتا ہے اور ناصر کمرے میں داخل ہوتا ہے)

اختر۔ اوہو۔ ناصر کہاں رہے بھئی ———

اوہ! یہ کیا ہے، سر پر کیا پلیسٹ رکھا ہے؟

ناصر۔ دواخانے سے چھوٹ کر ابھی چلا آ رہا ہوں گھر جاتے جاتے خیال کیا کہ تمہیں ایک ڈرامے کا پلاٹ سناتا جاؤں۔

اختر۔ شکریہ۔ مگر پہلے یہ تو بتاؤ کہ سر میں زخم تو نہیں۔

ناصر۔ زخم تو ہے لیکن

اختر۔ گہرا نہیں

ناصر۔ ہاں اور اس وقت تو کوئی تکلیف بھی نہیں تم اس کی طرف سے مطمئن رہو۔

اختر۔ تم جو دو روز سے ڈراما کے تقاضے کے لیے نہیں آئے تو میں سمجھا کہ کوئی خاص بات ہوگی۔

ناصر۔ اور اب بھی تقاضے کے لیے ہی آیا ہوں مجھے خیال تھا کہ تم حسبِ عادت یہ کہہ کر ٹال دو گے کہ پلاٹ سوچ رہا ہوں۔ تفصیلات کا خاکہ تیار کر لوں تو لکھ ڈالوں گا بے فکر رہو۔

اختر۔ ہا ہا ہا (ایک قہقہہ لگا کر) واقعہ ہے بھئی یہی پلاٹ سوچنا ہی اصل چیز ہے لکھنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔

ناصر۔ میں ایک عجیب واقعہ سنانے آیا ہوں ممکن ہے کہ وہی آپ کے ڈرامے کا پلاٹ بن سکے۔

اختر۔ اچھا تو سناؤ واقعہ مجھے بے چینی سی ہو رہی ہے۔

ناصر۔ پہلے یہ بتاؤ کہ کیا تم کسی ایسے پاگل کو جانتے ہو جو پرسوں اپنے وقت سے پہلے پاگل خانے سے چھوٹ آیا یا بھاگ آیا ہے۔

اختر۔ نہیں میں کیا جانوں۔ کیا میرے یہاں پاگلوں کا کوئی رجسٹر رہتا ہے؟ پہلے واقعہ تو سناؤ۔

ناصر۔ بڑا ہی مزے دار واقعہ ہے، لطف آ جائے گا تمہیں۔

اختر۔ اب سناؤ گے بھی یا یوں ہی نمک مرچ لگاتے جاؤ گے۔

ناصر۔ تم تو انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ کرتے ہو بھلا بتانا تو سہی وہ کس قسم کا پاگل تھا۔

اختر۔ واقعہ تو بتاؤ پہلے۔

ناصر۔ ابھی بتاتا ہوں ابھی۔ میں یہ سب کچھ اس لیے کہہ رہا تھا کہ واقعہ گو کہ بہت ہی مختصر ہے لیکن

اختر۔ (بات کاٹ کر) توبہ! میں تمہاری اس تمہید سے تنگ آ گیا خدا کے لیے جو کچھ کہنا ہو جلد کہہ چکو

ناصر۔ کہہ ہی تو رہا ہوں ذرا صبر سے کام لو ——— ہوا یہ کہ پرسوں رات کو میں پارک میں ذرا دیر تک بیٹھا۔ دیا سلائی ختم ہو چکی تھی اور سگریٹ پینے کو بار بار جی چاہتا تھا لوگوں کی آمد و رفت کم بلکہ بہت کم ہو چکی تھی اس لیے دیا سلائی مانگنے کے لیے بڑی دیر سے انتظار کر رہا تھا ایسے میں میں نے یکایک دیکھا کہ ایک شخص ایک چڑیل کو لیے گوشۂ تنہائی کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے اس کے منہ میں ایک جلتا سگریٹ تھا بے اختیار جی چاہا کہ اس سے دیا سلائی مانگ لوں میں فوراً اس کی طرف لپکا اور نہایت شائستگی کے ساتھ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا، جناب کیا آپ مجھے دیا سلائی دے سکیں گے؟ ——— [illegible]

اندازا کر سکتے ہو؟

اختر۔ کیوں نہیں

ناصر۔ ارے میں سچ کہتا ہوں کہ تمھارے فرشتے بھی اندازا نہیں کر سکتے۔

اختر۔ فرشتے نہ کر سکیں تو کیا اشرف المخلوقات بھی اندازا نہیں کر سکتا۔

ناصر۔ دس روپے شرط بدنے کو تیار ہوں بھلا بتاؤ تو سہی کیا جواب دیا ہوگا۔ وہ پاگل۔

اختر۔ کیوں دس روپے مفت گنواتے ہو؟

ناصر۔ اگر اندازا غلط ہوا تو تمہیں دس روپے دینے ہونگے شاید تم نے اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا۔

اختر۔ بے شک نہیں کیا اور نہ کرنے کی ضرورت ہے اس لیے کہ مجھے کامیابی کی پوری توقع ہے

ناصر۔ بھلا بتاؤ تو سہی

اختر۔ پاس سے پتھر اٹھا کر تمھارے سر پر دے مارا ہوگا اور کیا؟

ناصر۔ (متحیر ہوکر) آں آں ـــــ مگر ـــــ مگر ـــــ مگر

اختر۔ (بات کاٹ کر) اگر مگر کچھ نہیں۔ پہلے بائیں ہاتھ سے دس روپے رکھ دو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ خدا ماننے والوں سے لوگ شرط نہیں بدا کرتے۔ سچ کہتا ہوں انسانی نفسیات کا اتنا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ [illegible] کیا ہے کہ ـــــ

ناصر۔ بس بس رہنے دو میں سمجھ گیا۔ سر پر پٹی بندھی دیکھ کر اندازا لگا لیا۔

اختر۔ خیر جانے دو۔ اچھا تو تمہارا اندازا ہے کہ وہ شخص پاگل ہے۔

ناصر۔ اندازا کیا یعنی صاحب۔ واقعہ ہے واقعہ۔

اختر۔ تمھارے اندازے اور میرے اندازے میں بس یہی فرق ہے کہ میرا اس صحیح اور تمہارا اندازا غلط۔

ناصر۔ پاگل نہیں تو کون ہو سکتا ہے؟ دنیا بھلائی نا سمجھے کے سوال پر پتھر سے جواب دے تو تم اسے پاگل نہیں کہو گے۔

اختر۔ اس میں میرے اور تمہارے کہنے کا سوال اتنا اہم نہیں جتنا کہ دنیا کے کہنے کا۔

ناصر۔ تو کیا اسے دنیا پاگل نہیں کہتی۔

اختر۔ نہیں بالکل نہیں وہ ایسا ہی صحیح دماغ ہے جیسے ہم تم یا میں۔

ناصر۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو اختر میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا

اختر۔ ٹھہرو ٹھہرو۔ سب کچھ بتاتا ہوں ـــــ ایک منٹ ٹھہرو۔ ذرا پرسوں کا اخبار تلاش کر لوں (اختر اٹھ کر اخبار تلاش کرنے لگتا ہے۔ فائل میں ٹٹول ٹٹول کر ایک اخبار نکالتا ہے)

ناصر۔ اخبار کیا دیکھ رہے ہو

اختر۔ تمھارے حادثے کی خبر دیکھ رہا ہوں کہ آیا نیوز ایجنسی نے اس شخص کے متعلق کیا خیال قائم کیا جس کو تم پاگل کہہ رہے ہو اور میں جانتا ہوں کہ وہ بالکل صحیح دماغ ہے (تھوڑی دیر تک وہ خاموشی سے اخبار کی سرخیاں پڑھتا رہتا ہے پھر یکایک بے تحاشا چلاتا ہے) لو دیکھو طرفہ تماشا!

ناصر۔ (پڑھتا ہے) شراب کے نشہ میں چور ایک شخص جو وضع قطع سے بظاہر شریف خاندان کا معلوم ہوتا تھا اور جس کی جیب سے نکلے ہوئے کاغذوں سے بھی اس کی تائید ہوتی تھی۔ پارک کے ایک گوشے میں زخمی پایا گیا معلوم ہوتا ہے کہ نشے میں چور ہوکر اس نے پاس کے ایک پتھر سے اپنا سر دے مارا ـــــ

اختر۔ دیکھا تم نے انسانی طبیعتوں کا اختلاف جس طرح دو گھڑیاں ایک وقت نہیں بتاتیں اسی طرح دو انسانوں کی طبیعت یکساں نہیں ہوتی ـــــ ناصر! تم کو یہ سن کر اور زیادہ حیرت ہوگی کہ عورت نے سمجھا کہ اس کے شوہر نے تمہیں کسی رنجش کی وجہ سے زخمی کیا اور شوہر کو پتا یقین ہے کہ تم

لوٹنے کی نیت رکھتے تھے کیونکہ ——

ناصر (بات کاٹ کر) بس بس میں اب آ گئے نہیں
سکتا۔ ڈرامے کا پلاٹ مکمل ہو گیا —— جتنے منہ اتنی باتیں

بادشاہ حسین (حیدرآبادی)

غزل

امید کی شعاع میں طلوع سحر میں دیکھ
کیا رنگ ہے دعائے دل کا باثر میں دیکھ

دام توہمات سے بچ حق نواز بن
رنگینیاں جہان کی ذوق نظر میں دیکھ

منزل کے راستے کی تجھے ہے اگر تلاش
جس رہگذر میں گم ہے اسی رہگذر میں دیکھ

کیا اب بھی ضبط گریہ پہ کچھ اعتراض ہے
قطرہ بھی اک لہو کا نہیں چشم تر میں دیکھ

اے برق حسن اپنے تصور کا واسطہ
آئے کمی نہ لذت سوز جگر میں دیکھ

کہتے نہ تھے کہ آہوں سے صابر بچو [illegible]
آخر کو آگ لگ ہی گئی اپنے گھر میں دیکھ

صابر القادری

غزل

خندہ زن تھے جن گلوں کو نوجواں سمجھا تھا میں
خوش نوا طائر کو سرگرم فغاں سمجھا تھا میں

رنگ و بو میں چاند تاروں میں الجھ کر رہ گئیں
جن نگاہوں کو وداع دو جہاں سمجھا تھا میں

دیکھتے ہی دیکھتے سب محفلیں برہم ہوئیں
گردش جام جہاں کو جاوداں سمجھا تھا میں

سنتے سنتے پھول پر منہ رکھ کے ظالم سو گئی
عندلیب نالہ زن کو ہمزباں سمجھا تھا میں

کچھ نہ نکلے اس جہاں کی وسعتوں کے سامنے
اہل حق کو کارواں در کارواں سمجھا تھا میں

زندگی کیا ہے مسلسل ارتقا کا نام ہے
ہر قدم کو حاصل عمر رواں سمجھا تھا میں

ہر مصیبت لا رہی ہے تازہ پیغام حیات
رنج و غم کو اک بلائے آسماں سمجھا تھا میں

عشق کی دیوانگی پر ہنس رہے تھے غمگسار
ہائے کس کو سوز دل کا رازداں سمجھا تھا میں

یہ تو سمجھا کچھ تو ہے جاوید کے اشعار میں
یہ تڑپ یہ زندگی ہوگی کہاں سمجھا تھا میں

معین الدین صدیقی جاوید ([illegible])

غزل

پھر سکوت شب میں ہم یاد آتے جائیے
اس تصور کو مرے رنگیں بناتے جائیے

اک سرور کیف بن کر دل پہ چھاتے جائیے
یاد ایام جنوں مجھ کو دلاتے جائیے

دل کی بستی بھی ہے کیا بستی جو بس سکتی نہیں
آپ اس ویران بستی کو بساتے جائیے

پھر الجھنا چاہتے ہیں خار صحرائے جنوں
کیجیے مجھ پر کرم مجھ کو بچاتے جائیے

آپ جب مجھ میں سکوں بن کر سما سکتے نہیں
درد بن کر پھر رگ و پے میں سماتے جائیے

ہر نظر اک تیر ہے ہر تیر پیوست جگر
[illegible] پیکاں بناتے جائیے

نور الحق [illegible]

کتاب غلطی سے یا بھولے سے پڑھ ڈالے کیونکہ ایسے تبصرے
لکھنے کے لیے کتاب کا پڑھنا کیا ضرور ہے۔

"یہ کتاب فلاں صاحب کی لکھی ہوئی ہے فلاں جگہ طبع
ہوئی ہے کاغذ کتابت اور طباعت ایسی ہے قیمت یہ ہے فلاں پتے
سے مل سکتی ہے کتاب کی ضخامت یہ ہے اور یہ اتنے حصوں میں منقسم ہے
مصنف کا نام تعارف کا محتاج نہیں یا مصنف کی یہ پہلی کامیاب
کوشش ہے یا مصنف کا نام ہی اس کتاب کی خوبی کا ضامن ہے"
اور کون بے وقوف اس کے لیے اپنا وقت خراب کرے گا
لیکن اگر تبصرہ لکھنے والا کتاب کی برائی کرے تو ہمارے لیے یہ خیال ہی تو کم سے کم
باعث مسرت ہوگا کہ اس نے ہماری کتاب پڑھ تو لی گو برائی کرنے
کے لیے بھی کتاب کا پڑھنا ضروری نہیں مثلاً محفوظ ترین تبصرہ یہ
ہو سکتا ہے کہ

"یہ کتاب فلاں صاحب نے غالباً مصنف بننے
کے شوق میں یا محض اپنی شہرت کی بنیاد ڈالنے کا
کرنے کے لیے لکھی ہے کتابت، کاغذ اور طباعت معمولی بلکہ
کسی قدر ناقص ہے۔ غلطیوں کا دریا ہے کہ لہریں
مار رہا ہے کتاب کی ترتیب و تقسیم میں بھی سلیقے سے کام
نہیں لیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ"

آپ اس کا بھی کامل اطمینان رکھیں کہ تبصرہ لکھنے والے خواہ
تحسین کریں خواہ تنقیص کوئی ان کے تبصرے کو پڑھتا نہیں
لیکن مصنف کے لیے طباعت سے اہم تر بھی ایک مسئلہ ہے
طبع نہ ہونا! یہ کس قدر تکلیف دہ ہے کہ وہ غریب بڑی
محنتوں سے لکھے اور ناشرین یا مطبع والے اسے چھاپنے سے
انکار کر دیں۔ ہائے زمانے کی ستم ظریفیاں! ایک وہ بھی
ہیں جنھیں لکھنے کا شعور تک نہیں لیکن بے دھڑک مصنف کہلاتے
ہیں اور ایک وہ بھی ہیں جن کی بلند پایہ تصنیفیں اس لیے طبع
نہیں ہو سکتیں کہ زیادہ فروخت نہیں ہو سکتیں عوام کالانعام کو
بلند پایہ اور معمولی کتابوں میں تمیز ہی نہیں کس قدر ظلم ہے
یہ ایک اچھے مصنف کے حق میں کہ اس کی کتابیں اس لیے
شائع ہونے سے رہ جائیں کہ وہ فروخت نہیں ہو سکتیں
اور دوسرے احمقوں کی کتابیں جن میں بجز خرافات لغویات
جنسیات و عریانیات و ہزلیات کے سوا اور کچھ نہیں مقبول عام
ہوں اور دھڑلے سے شائع ہوتی ہیں اور ان کے نامعقول
لکھنے والے لائق مصنفین کہلائیں۔ افسوس صد ہزار افسوس

زمیں چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا!

کاش وہ لکھتا ہی نہیں! لکھنا اور طبع نہ ہونا
اف کس قدر کوفت کی بات ہے!! کیا اس نے بڑی لمبی
اور دماغ سوزی کے بعد اپنا وقت اپنا کاغذ اور اپنی روشنائی
اسی لیے صرف کی تھی کہ اس کی تصنیف طبع نہ ہو؟ پڑھی نہ جائے
اور اس کے میز کے ایک خانے ہی میں بند پڑی رہے؟ اس سے تو کئی
درجے بہتر یہی تھا کہ وہ چھپ جاتی۔ بلا سے لوگ اسے احمق
کہتے، جو کہتے یا نامعقول کہتے لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے
وہ ایک چھپی ہوئی کتاب کا مصنف تو رہتا۔ نہ سہی اگر اس کی
کتاب گھر گھر نہ پہنچ جاتی نہ سہی اگر وہ مقبول عام اور مشہور
مصنف نہ کہلاتا۔ نہ سہی اگر تبصرہ کرنے والے اسے کامیاب
مصنف نہ جانتے لیکن یہ اس کی دلی خواہش تھی کہ اس کی
تصنیف چھپ جائے۔ اور جو لوگ اسے پڑھنا چاہیں پڑھ
سکیں چاہے ان کی تعداد دس پندرہ ہی کیوں نہ ہو وہ مصنف تو
ہو جاتا اور ڈنکے کی چوٹ کہہ سکتا کہ میں نے بھی ایک کتاب
لکھی ہے۔ اور اگر کسی کو اس میں شک و شبہ ہوتا تو فوراً ہی
اپنی بغل سے اپنی کتاب نکال کر دکھلا دیتا آہ چھپی کتاب۔
مصنف کی تقدیر! اس کی اس قیامت خیز مایوسی کا اثر اس کے
اعصاب پر کیا پڑتا ہوگا اس کا اندازہ سوائے تحلیل نفسی
کے ماہروں کے اور کون کر سکتا ہے۔ کون جانے ہندستان میں
جرائم کی تعداد میں اضافہ کہیں نامصنفین یا زیادہ صحیح لفظوں
میں چھپی کتاب کے مصنفوں کی مایوسی ہی کا نتیجہ ہو! کاش ہمارے
ہندستان میں بھی چند تحلیل نفسی کے ماہر ہوتے جو چھپی کتاب کے مصنفوں
کے [illegible] اعصاب کی [illegible]

سی توجہ کرتے اور اس کے منشا کی کوئی اچھی تدبیر بتلاتے!

دیکھا آپ نے؟ مصنف بننا کس قدر دشوار ہے۔
لیکن وہ جو کہا ہے نا کسی نے ع "مشکلے نیست کہ آسان نشود" ہم
آپ کو ان تمام مصیبتوں کے حل بتاتے ہیں۔

طباعت اور تشہیر تو خیر بعد کے مسائل ہیں۔ سب سے
پہلی مصیبت جس سے مصنف کو دوچار ہونا اور مغلوب کرنا ہے
"تصنیف" ہی ہے۔ یہی مرحلہ پہلے طے ہونا ہے کہ وہ کیا لکھے اور کیونکر
لکھے کیوں کہ لکھنا تو سبھی ہے۔ افسانے لکھے۔ ڈرامے لکھے ناول
لکھے نظمیں لکھے کیا لکھے؟ اور لکھے تو کس موضوع پر اور کیسے؟ یہ مسئلہ
اس صورت میں نہایت ہی آسان ہو جاتا ہے جب مصنف
اس سے بے پروا ہو جائے کہ وہ کیا لکھ رہا ہے آیا جو کچھ وہ لکھ رہا
ہے لکھنے کے لائق بھی ہے کہ نہیں۔ اس قسم کے سوالات اس کو اپنے
ذہن میں پیدا ہی نہیں ہونے دینے چاہئیں کیوں کہ اس سے تصنیف
میں بہت دیر لگا کرتی ہے جس سے قطعی کوئی فائدہ نہیں
اس مسئلہ تصنیف کا آسان ترین حل یہی ہے کہ بغیر غور کیے
لکھنا ہی شروع کر دیا جائے۔ کیوں کہ ہمارے مشہور مصنفین کا
طریقہ تصنیف بالکل یہی ہے۔ مثلاً ناول لکھنا نہایت سہل
ہے وہ ناول ہی لکھنا شروع کر دے۔

ناول ہے کیا؟ چند خیالی افراد کی خیالی زندگیوں کے
کچھ اجزا کا ایک مجموعہ آپ نے اپنے بچپن میں ہزاروں کہانیاں سنی
ہوں گی اور اگر کوئی کہانی پوری پوری آپ کو یاد نہ ہو تو کوئی ہرج
کی بات نہیں مختلف کہانیوں کے مختلف اجزا بھی ناول بنانے کے
لیے کافی ہیں کیوں کہ آج کل کردار نگاری، واقعیت اور پلاٹ کے
ربط و تسلسل وغیرہ پر توجہ دینے کی کوئی خاص ضرورت نہیں سمجھی جاتی
اور ان سب چیزوں کے مد نظر حقیقی ناول شاید ہی لکھے جاتے ہیں
عام طور پر جس قسم کے ناول لکھے اور پڑھے جاتے ہیں ویسے ناول
لکھنا کچھ دشوار نہیں ہر شخص لکھ سکتا ہے۔ سبھی ناول ایک دوسرے
کے مشابہ ہوتے ہیں اس لیے آپ کو غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ
کس قسم کا ناول لکھا جائے۔ قلم اٹھائیے اور جتنی کہانیاں
آپ کو یاد ہیں انہیں لکھنا شروع کر دیجیے۔ ناول لکھنے کی
سب سے آسان ترکیب یہی ہے۔ ناول لکھنے کا سب سے بڑا
فائدہ یہی ہے کہ اکثر لوگ اسے شوق سے پڑھتے ہیں اور یہ لوگ
کوئی ہشیار عاقل و دانا تو ہوتے نہیں اس لیے آپ کے
ناول بھی ایسے نہیں ہونے چاہئیں۔ اس کے بارے میں آپ
بالکل مطمئن رہیں کہ تبصرہ لکھنے والے کی ہمیشہ تعریف ہی کریں گے
سوا اس صورت کے کہ ان کو آپ سے کوئی شخصی یا ذاتی کد ہو لیکن یہ
بھی یاد رکھیے کہ آپ کے ناول میں کسی نہ کسی قسم کا معاشقہ ضرور ہو
کیونکہ بغیر معاشقے کے ناول ناول ہی نہیں ہوتا اور کوئی اسے
نہیں پڑھتا۔

ناول سے زیادہ آسان صورت معرا
شاعری کی ہے جس میں ردیف، قافیہ، اور وزن تینوں
چیزوں کی ضرورت نہیں ایک مجموعہ معرا شاعری ہی کا لکھ ڈالیے
معرا شاعری کرنے کا سوائے اس کے اور کوئی تدبیر نہیں کہ
کاغذ اور قلم لیکر بیٹھ جائیے اور دماغ پر قطعی کسی قسم کا بار
ڈالے بغیر اور کچھ سوچے سمجھے بغیر اپنا قلم کاغذ پر چلانا
شروع کر دیجیے کچھ نہ کچھ تو لکھا ہی جائیگا لیکن صرف
اتنا خیال رکھیے کہ آپ کی تحریر چاہے وہ کچھ ہی ہو نثر میں
لکھی ہوئی نہ معلوم ہو اور جابجا ٹکڑے ٹوٹے ہوئے اور نئی
سطر سے شروع ہوں۔ اس کے بعد ہر مجموعہ پر جو جی میں آئے
ایک عجیب و غریب عنوان رکھ دیجیے۔ عنوان سوچنے کی بھی
کوئی ضرورت نہیں، جو عنوان آپ کے قلم سے ٹپک پڑے درست
اور روا ہے۔ لیجیے تیار ہو گئی آپ کی تصنیف اب اسے طبع
کرا دیجیے اور پھر دیکھیے کیا کیا دھومیں مچتی ہیں آپ کے اشعار
میں اشاریت، رمزیت، ایمائیت اور گہرائی کا کس طرح پتا
لگایا جاتا ہے، آپ کی نظموں میں بے وزنی کے باوجود ترنم
اور موسیقیت کس طرح دریافت کی جاتی ہے، آپ کے اشعار
زندگی کی نئی قدروں اور نئے مسائل کو کس بلند پایگی سے
تلاش کیا جاتا ہے اور آپ کو کس طرح معرا شاعری کا ایک

بہت بڑا ستون سمجھا جاتا ہے اور نقیب العقلاب یا شاعر زندگی
وغیرہ اسی قسم کے القاب دیے جاتے ہیں لیکن یہ سب اسی صورت میں
ممکن ہے کہ آپ دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی تعریف میں خود بھی کچھ اپنی
کتاب کے پیش لفظ میں ضرور لکھیں کیونکہ ادبی دنیا میں لین دین
اور مدحیں کیوں جاتی سمجھے اور کہے جاتے سمجھے یہ بڑے زور و شور
سے عمل ہوتا ہے اور ہر ادیب کے کانوں میں وہ مشہور مصرع گونجتا
رہتا ہے۔

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہات دے اس ہات لے

اسی طرح افسانے یا مضامین لکھنا بھی کچھ مشکل نہیں ہے
اور تصنیف کا مسئلہ یوں حل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد جیسا کہ
پہلے ذکر ہو چکا طباعت کا مرحلہ ہے۔ طباعت کا مسئلہ اس صورت
میں مشکل ہو جاتا ہے جب مصنف خود ہی ناشر بننے کی کوشش کرے
کیونکہ اسے طبع کرانے کے علاوہ **بیچنے کا ایک** سخت مرحلہ
اور بھی طے کرنا پڑیگا اس لیے اس مسئلے کا آسان حل یہی ہے کہ کسی
ناشر کو اولے پولے داموں پر اپنی تصنیف **بیچ** ڈالیے
اس کے بعد وہ سب کچھ کر لیگا لیکن اس کا بھی قوی امکان ہے کہ ناشر
آپ کی تصنیف کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھائے اور شائع کرنے میں
عذر کرے اس لیے اپنے ساتھ کچھ رقم اس کا منہ بند کرنے کی خاطر
ضرور رکھیے ورنہ پھر آپ مصنف نہیں بن سکینگے۔ روپیے کی قطعاً آپ کو
کوئی پروا نہیں ہونی چاہیے کیونکہ کتاب چھپوانے سے آپ کا مقصد
روپیہ کمانا نہیں بلکہ مصنف بننا ہے۔

لیجیے مصنف کے دو مسئلے تصنیف اور طباعت یوں
حل ہوئے۔ اب تیسرا سوال یہ ہے کہ کتاب کو عوام میں مقبول اور
مشہور کس طرح کیا جائے۔ اس کے لیے بھی آپ کو اپنا بٹوا کھولنا پڑیگا
اور طرح طرح کے اشتہارات تمام روزانہ اور ہفتہ وار اخباروں
میں اور ماہانہ رسالوں میں شائع کرانے پڑیں گے جس سے
لوگوں کو خواہ مخواہ تجسس اور تشویش ہو مثلاً آپ کچھ اس قسم کا
اشتہار دے سکتے ہیں۔

وہ کتاب، جو پڑھی نہیں جاتی!

فلاں صاحب کی فلاں تصنیف اس قدر بلند پایہ
بلحاظ طرز و ادا ہونے کے باوجود مقبول اور مشہور
کیوں نہیں ہے اور عام طور پر پڑھی کیوں نہیں جاتی؟
اس سوال کا جواب بھیجیے کے پتے پر روانہ فرمائیے
بہترین معقول اور مدلل جواب دینے والے کو پچاس
روپے بطور انعام پیش کیے جائیں گے۔ مضامین کی
وصولی کی آخری تاریخ فلاں ہے وغیرہ وغیرہ"

یہ ضروری نہیں کہ آپ انعام حقیقت میں دیں بھی
صرف اعلان کافی ہے یا کسی اور قسم کا اشتہار بھی دیا جا سکتا ہے
ایک اور تدبیر کرنے کی بھی ضرورت ہے کہ اپنے دوسرے مشہور
مصنفین کے نام سے خود ہی رائیں لکھ کر چھپوا دیجیے۔ اطمینان
رکھیے کوئی آپ پر دعوا نہیں کرے گا۔ ایک اور ترکیب یہ
ہے کہ اپنی کتاب پر خود ہی ایک طویل تنقید لکھیے جس میں
اسے بدترین بتلایا گیا ہو اور پھر خود ہی کسی اور نام سے
اس کا جواب لکھیے جس میں کتاب کو بہترین ثابت کیا گیا ہو
اس خود ساختہ نزاعی بحث کا نتیجہ کتاب کی مقبولیت کے
حق میں بہت اچھا ہوگا اور لوگ خواہ مخواہ کتاب کو
پڑھنا چاہیں گے۔

چلیے، مصنف کے اہم ترین مسائل حل ہو گئے
بس آج ہی سے آپ بھی مصنف بننا شروع کر دیجیے۔ طریقے تو
ہم نے آپ کو بتلا دیے ہیں عمل کرنا آپ کا کام ہے۔

شمس الدین صدیقی (عثمانیہ)

آپ نے اب تک صرف محاورہ ہی سنا ہوگا لیکن

مزدا مووی ٹون

نے عملی طور پر بھی کر دیا ہے۔ کئی شہروں میں اس کا مظاہرہ ہو چکا ہے اور یہاں بھی

[illegible]

جو آپ کو یقین نہ ہو تو اپنی آنکھوں سے کچھ دنوں بعد دیکھ لینا

اداکار

رمیلا۔ صادق علی۔ گلاب۔ بنرجی۔ سعادت وغیرہ

نشاط سینما جامباغ روڈ حیدرآباد دکن

زندگی میں ہر حادثہ اپنی جگہ حقیقت ہے اور ہر حقیقت ڈرامہ
حقیقت کے دامن میں لطیف رومان اور موسیقی کے بیش بہا شگوفے

بڑے نواب صاحب

اپنی وضع کی نرالی کاسٹیوم پیشکش

پروڈیوسر ——— ڈائرکٹر ——— سپروژن
پرمیلا ——— بیدی ——— ایم کمار

اداکاران:- چندر موہن۔ کمار۔ پہاڑی سانیال۔ سوشیل کمار۔ ببو۔ پرمیلا۔ نور۔ شانتا پٹیل۔ کملا۔ غوری وغیرہ

برائے حقوق تقسیم صوبہ بمبئی اور سندھ لکھیئے
سلور فلمز کیتھک لاج دادر مین روڈ بمبئی

برائے سی پی سی آئی:- نیو سنٹرل ٹاکی سرکٹ بھساول
" بنگال:- ویسٹرن فلم کارپوریشن کلکتہ
" شمالی ہند:- سکسینہ اینڈ کمپنی لمیٹڈ دہلی
" جنوبی ہند:- سریش پکچرز بنگلور

سکے سرانجام دیں گے۔

جامعہ عثمانیہ تمام ہندستان میں اس لحاظ سے عدیم المثال ہے کہ اس میں سائنس اور علوم ادبیہ کی اعلیٰ تعلیم ایک ہندستانی زبان کے ذریعے دی جاتی ہے جو مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی ارتباط کا مشترکہ نتیجہ ہے اور جس میں الفاظ کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ یہ اس لیے بھی عدیم المثال ہے کہ تمام ہندستان میں دیگر جامعات میں ذریعہ تعلیم انگریزی زبان ہے اور بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان جامعات میں مستقبل میں کسی مدت معینہ کے اندر کسی دوسرے ذریعہ تعلیم کے اختیار کرنے کا کسی کا کوئی ارادہ بھی نہیں ہے۔ ان جامعات کے اساتذہ اور ان کے مروجہ نصاب قدامت پسندی کا ایک نہایت ہی مضبوط قلعہ ہیں۔ حکومت ہند کے انتظامی محکمہ جات میں اور تقریباً ہر ریاست اور ہندستان کے ہر حصے میں بھی انگریزی زبان کو جو رتبہ حاصل ہے اس سے یہ قلعہ بظاہر اور بھی ناقابل تسخیر معلوم ہوتا ہے۔ آپ کا کارنامہ ایسا ہے کہ اس پر نہ صرف آپ کو بلکہ تمام ہندستان کو فخر کرنا چاہیے۔ ہندستان میں صرف ایک ہی زبان ہے جس کے کل ہند زبان ہونے کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے اور یہی زبان اس جامعہ میں ذریعہ تعلیم ہے۔ پس حقیقی "ودیاپیٹھ" آپ ہی کی جامعہ ہے۔

جامعہ بنارس نے بھی ابھی تک اعلیٰ جامعاتی نصاب کے لیے کل ہند زبان کو ذریعہ تعلیم اختیار کرنے کے متعلق کسی اقدام کا ارادہ نہیں کیا۔ میں نے ان خیالات کا اظہار صرف نکتہ چینی ہی کی غرض سے نہیں کیا بلکہ مجھے دشواریوں کا بھی پورا پورا احساس ہے۔ چونکہ میں ان دشواریوں سے بخوبی آگاہ ہوں، اس لیے میں جامعہ عثمانیہ کی جرأت و ہمت اس کے صبر و استقلال اور اس کی اس کامیابی کی داد دیتا ہوں جو تمام ہندستان کے لیے ایک درخشاں مثال کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے اس کامیاب تجربہ کی بدولت ہم تمام ہندستان میں اپنی مشکلات کو دور کر سکیں گے۔ ہندستانی زبان جامعہ میں تمام تعلیم کا ذریعہ قرار دی گئی اور انگریزی کو بحیثیت زبان لازمی مضمون قرار دے کر اسے اس کی مناسب جگہ دی گئی۔ ہندستان کے مورخ مسٹر ونسنٹ اسمتھ [illegible] کا اقتباس کرتے ہوئے سر اکبر حیدری نے ہندستانی زبان کے متعلق اپنی یادداشت میں یہ بتایا تھا کہ اس کی نحوی ترکیب اتنی ہی سادہ اور لچکدار ہے جتنی کہ انگریزی کی۔ ہندستانی میں الفاظ کا ایک وسیع ذخیرہ موجود ہے جو مغربی ہندی، سنسکرت، فارسی، عربی، انگریزی اور دوسرے ماخذ سے لیے گئے ہیں اور اس میں ہر ادبی، فلسفیانہ اور علمی موضوع پر اظہار خیالات کی قابلیت ہے۔

میں نے اس جامعہ کے ذریعہ تعلیم کو ہندستانی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ حالانکہ اس کا سرکاری نام اردو ہے۔ یہ ایک معما ہے مگر اس کی صداقت میں کلام نہیں اور جس دنیا میں تعصبات کو غلبہ ہوتا ہے۔ وہاں بڑے اختلافات کے مقابلے میں چھوٹے چھوٹے اختلافات ہی سے وسیع تر خلیجیں پیدا ہو جاتی ہیں جو وسیع اختلاف کسی ہندستانی زبان اور انگریزی میں پایا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اردو اور ہندی کا فرق بالکل معمولی اور تقریباً ناقابل اعتنا ہے لیکن ہم اعلیٰ تعلیم تو کجا بلکہ ادنیٰ تعلیم تک بھی انگریزی زبان میں حاصل کرنے پر آسانی سے رضامندی کا اظہار کر دیتے ہیں مگر ہندی اور اردو کے خلاف جو تعصب ہے اسے دور نہیں کر سکتے۔

حالانکہ [illegible] ان دونوں ناموں سے پکارا یا سمجھا جاتا ہے اگر اسے ایک ہی رسم خط میں لکھا جائے تو فرق اس سے زیادہ نہ ہوگا جتنا کہ جانسن کی راسیلاس اور گولڈ اسمتھ کے وکار آف ویکفیلڈ یا چارلس ڈکنس کے مضامین میں پایا جاتا ہے ہم ان میں سے ایک کتاب کو انگریزی اور دوسری کو کسی دوسری زبان سے منسوب نہیں کرتے۔ ہم انگریزی کا املا نہیں بدل سکتے ہیں، یعنی زبان و رسم خط" محاورے اور صرف و نحو وغیرہ انہیں سب کو [illegible] اگر ہم ہندی یا اردو کی کوئی کتاب پڑھ جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے الفاظ میں کسی حد تک فرق پایا جاتا ہے۔ [illegible]

رسم خط یعنی ہندی کو اختیار کیا جا سکتا ہے اور اس سے زبان کی
اصلی وضع میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں آسکتا۔ اس میں شک نہیں
ہے کہ سول اور ملٹری ملازمت کے اکثر اشخاص ابھی تک [illegible] رومن
رسم خط کے ذریعہ [illegible] تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ جسے ہم
سب ہندوستان کی مشترکہ زبان کہتے ہیں ایک طرف سنسکرت اور
دوسری طرف عربی اور فارسی سے ماخوذ الفاظ کی تعداد کے تناسب
تغیر بھی حقیقت میں کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا جب زبان
میں ساخت، محاورات، صرف و نحو اور اصل ذخیرہ الفاظ کے لحاظ سے
کوئی فرق نہیں ہے تو اس جھگڑے کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔
ہمارا منشا یہ ہو کہ ہندوستانی زبان کے ذخیرہ
الفاظ کو ترقی دی جائے اور ہر قسم کی اعلیٰ تعلیم دینے کے
لیے اسے واسطے کے طور پر استعمال کیا جائے تو اس اختلاف
کا بہت جلد مٹ جانا لازمی ہے جو اردو اور ہندی کے
درمیان موجودہ الفاظ کی بنا پر پایا جاتا ہے۔ جدید علوم کی
تعلیم دینے سے زبان کی لغت میں آئندہ کثیر اضافہ ہونے والا ہے۔ اس
سے الفاظ کے متعلق موجودہ اختلافات تقریباً ختم ہو کر رہ جائیں گے۔
الفاظ کی کثرت تعداد اور ان کا تنوع زبان کے محاسن میں سے ہیں
اور یہ موجب نزاع نہیں ہو سکتے۔ ہندوستانی کا مشترکہ زبان
کے طور پر موزوں ہونے کا راز یہی ہے کہ ہندو اور مسلمان
دونوں زبان کو اپنی ضروریات کے لیے استعمال کرتے اور
اس میں تبدیلیاں کرتے رہے ہیں۔ اور ہر عہد والے
اس کو اردو اور ناگری رسم خط میں لکھتے رہے ہیں۔
ہندو نیز اسلامی ماخذوں سے اس کا ذخیرہ الفاظ بڑھا
ہے اور یہ واقعہ بجائے مشکل پیدا کرنے یا نزاع کا باعث
ہونے کے اس زبان کے مشترکہ استعمال کے قابل ہونے کا
ثبوت ہے۔ الفاظ کا انتخاب ہی نہ کوئی جبر ہے اور
نہ ہو سکتا ہے۔

[illegible] ہندی ذریعہ
تعلیم [illegible] اعتماد عطا کرتی ہو۔

حیدرآباد نے اردو میں اپنے اس کامیاب تجربے سے جو عزم
اور ہمت کا ایک کارنامہ ہے ہندوستان کی مشترکہ زبان کی
نہایت ہی اہم خدمت انجام دی ہے۔ اس کارنامے کی
اہمیت کو اردو کے نام کی وجہ سے کسی صورت میں بھی کم
نہ سمجھنا چاہیے۔

ابھی تک میں ہندوستان کی مشترکہ زبان کے سلسلے میں جامعہ
عثمانیہ کی کامیابی کا ذکر کر رہا تھا۔ لیکن میں اس مسئلے سے بھی ناواقف
نہیں ہوں۔ جس کے ذکر کو اس موقع پر اگر بے وقت کی راگنی کہا
جائے تو بیجا نہ ہوگا اور یہ ثانوی تعلیم کے ذریعے کا مسئلہ ہے۔ اس
دعوت کے اعلان کے ساتھ ہی جو مجھے عطائے اسناد کے موقع پر خطبہ
پڑھنے کے لیے دی گئی تھی۔ بہت سے قومی کارکنوں کی طرف سے مجھے
ایسے خطوط وصول ہوئے جن میں ثانوی تعلیم کے ذریعے کی نسبت ریاست
کی پالیسی کا ذکر تھا۔ ان خطوط کے جواب میں ان کے بھیجنے والوں پر میں نے
یہ بات واضح کر دی کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں حیدرآباد کی
پالیسی کو معرض بحث میں نہیں لانا چاہتا مجھے ان انتظامی دشواریوں کا
بخوبی احساس ہے۔ جو اتنے وسیع رقبے کی تعلیمی پالیسی کی تدوین و تکمیل
میں پیش آتی ہیں۔ جتنا وسیع کہ حیدرآباد ہے۔

یہ حقیقت کہ جامعہ عثمانیہ میں ہندوستانی زبان میں علوم و فنون
کی تعلیم دی جاتی ہے ثانوی تعلیم کے ذریعے کو براہ راست متاثر کرتی
ہے۔ اگر ثانوی مدارس میں آخر تک ہندوستانی کے علاوہ کسی اور مادری زبان
کے ذریعے تعلیم دی جائے تو اس کا اندیشہ ہے کہ طلبا کی ایک بڑی
تعداد جامعہ میں تعلیم پانے کے لیے جس کا جائز طور پر حق [illegible] کر سکتے ہیں
بخوبی تیار نہ ہو سکے گی۔ اگر حکومت سرکار عالی اس اصول پر جو بظاہر
بہت اچھا معلوم ہوتا ہے عمل پیرا ہو کہ کنڑی، تلنگی اور مرہٹی [illegible]
میں ثانوی تعلیم انہیں زبانوں کے ذریعے دے تو اس کا جو
لازمی نتیجہ ہوگا اس کے متعلق بہترین لڑکوں اور لڑکیوں کے والدین
کیا کہیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسے مدارس سے فارغ شدہ طلبا جامعہ
عثمانیہ کی اعلیٰ تعلیم اور ان مواقع زندگی سے محروم ہو جائیں گے جو
[illegible] کے لیے [illegible]۔ یہ مسئلہ ہر جگہ پیچیدہ ہے

سیاست، تمدن، معاشرت ہر چیز ترقی کرتی رہتی ہے اسی طرح شاعر
کے احساسات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ جناب علی کرم اللہ وجہہ کا ایک
مقولہ ہے کہ "تم اپنی اولاد کو اپنے اخلاق سیکھنے پر مجبور نہ کرو اس لیے کہ
وہ ایسے زمانے میں پیدا ہوئی ہے جو تمہارے زمانے سے بالکل مختلف اور
جدا ہے" اسی طرح زمانے کی تبدیلی کے ساتھ شاعر کا موضوع سخن بھی
بدلتا رہتا ہے۔ چنانچہ اقبال نے بھی غالب، حالی اور اکبر الہ آبادی
کی طرح اپنا موضوع تجربات و احساسات قلبی کو ٹھہرا لیا۔

ان تینوں رہنماؤں نے ایک ہی بصیرت اور نقطہ نگاہ سے
غور کیا اور تشخیص مرض، وسعت نگاہ، وحدت خیال میں ایک دوسرے
سے متفق اور موید رہے۔ حالی نے قوم کی عظمت رفتہ کو یاد دلاتے
ہوئے موجودہ زبوں حالی کا ماتم کیا اور بام ترقی پر چڑھنے کے لیے
میدان عمل کی طرف رہبری کی۔ اکبر نے اسی مقصد کو پیش نظر رکھتے
ہوئے مغرب کے سیلاب دہریت و الحاد کو روکا اور ظریفانہ انداز
میں مغرب کی تہذیب و تمدن کا مضحکہ اڑایا۔ اور مشرق کی روحانیت،
تہذیب و معاشرت، اخلاق و تمدن کو سراہتے ہوئے توجہ دلائی۔
اس چیز کو اقبال نے اپنے حکیمانہ اور فلسفیانہ زاویہ نظر سے سیاست
حاضرہ اور حالات زمانہ کو دیکھا۔ اور مغرب کی روحانیت سوز تعلیم کے
خلاف جہاد کرتے ہوئے اقوام مشرق کی روحانی بیداری کے لیے
خون پسینہ ایک کر دیا۔ فرماتے ہیں کہ میں نے مغرب کو بہت امعان
نظر سے دیکھا آخر کار اس کا کچا چٹھا معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا
اور اپنی روحانیت کے مقابلے میں اس کے پرخچے اڑا دیے۔

محرم ہر عالم افکار او   بر درم ہم پردۂ اسرار او
درمیان سینہ دل خوں کردہ ام   تا جہانش را دگرگوں کردہ ام

اقبال نے اسلامی تعلیمات، خدا اور رسول، سیاست اسلامیہ،
شریعت حقہ، تہذیب و تمدن کے رموز و حکم کو عقل و دل کی روشنی
سے منور کیا۔

تاریخ اسلام میں امام فخر الدین رازی، علامہ ابن تیمیہ،
امام غزالی، شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کی [illegible]
ہستیاں گزری ہیں کہ جن کے کارنامے رہتی دنیا تک تاباں و درخشاں
رہیں گے۔ ان علمائے کرام نے شریعت اسلامیہ کے رموز و حکم کو
عقل و بصیرت کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔ احیاء العلوم، حجۃ اللہ
البالغہ جیسی کتابیں جن کا موضوع شرح اسرار دین ہے مسلمانان
عالم کے لیے مایہ ناز ہیں۔ صوفیا میں حضرت مولانا جلال الدین رومی
کی بصیرت افروز مثنوی سرمایہ فخر و مباہات ہے۔ اقبال نے بقول
خود۔

خرد افزود مرا درس حکیمان فرنگ   سینہ افروخت مرا صحبت صاحب نظراں

انہیں "صاحب نظراں" کے فیوض و برکات روحانی سے مستفیض
ہو کر اپنی بصیرت اور روشنی ضمیر کی رہنمائی میں اس عظیم الشان
اسرار دین کو اجاگر کرنے اور الہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید کرنے
کا بیڑا اٹھایا۔

اقبال کے ابتدائی کلام میں اقوام ہندستان کے اتحاد،
باہمی رواداری اور صلح و آشتی کی تعلیم نظر آتی ہے۔ نیا شوالہ،
ہندستانی بچوں کا قومی گیت، ترانہ، سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا، ہمالہ
اسی قسم کی نظمیں ہیں، لیکن رفتہ رفتہ ان کی نظر وسیع سے وسیع
ہوتی گئی اور ان کے خیالات میں گہرائی پیدا ہوتی گئی۔ انھوں نے
صرف ہندستان بلکہ تمام اقوام عالم کے عقلی اور روحانی کرب و اضطراب
کا نفسیاتی اور فلسفیانہ تجزیہ اور اس پر تنقید و تبصرہ کیا۔ اور اس
روحانی بے چینی کا علاج اور سیاست و معاشرت عالم کی گتھیوں کا
دریافت کرنے کی کوشش کی۔ اس منزل پر عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت
اقبال نے اس حل کے دریافت کرنے کے لیے تعلیمات اسلامی کا تجزیہ
کیا۔ اور اس میں اتنے ڈوب گئے کہ اپنی آخری شاعری میں ہر چیز
کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں دیکھنے لگے۔ اس طرح سے ان
کی حیثیت ایک پان اسلامی شاعر کی قرار دی گئی ہے۔ لیکن یہ بات
قطعی اور یکطرفہ نہیں۔ اقبال کا شاعرانہ تبصرہ اور پیغام آفاقی اور
عالمگیر ہے۔ اسی لیے ان کے کلام کے بعض حصوں میں خود ان کے
ساتھ شاعرانہ شوخیاں نظر آتی ہیں۔ بعض نقاد اس [illegible]
[illegible] اور اقبال کو پان اسلامی شاعر فرض کرتے [illegible]

شوخیوں کو اسلامی اسپرٹ کے خلاف قرار دیتے ہیں۔ یہاں پھر یہ
وہ مغالطہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کی فکر ایک آزاد مفکر کی فکر ہے اور نہ ہی
بنیاد سے غیر متعلق جیسا کہ خود حضرت اقبال نے خود اپنے مضمون
"اسرار خودی پر بعض اعتراضات کے جواب" میں پروفیسر نکلسن
کے نام لکھا ہے ارشاد فرماتے ہیں کہ ان کا پیغام اسلام تک محدود
نہیں اور نہ مذہبی بنیادوں پر قائم ہے۔ اصل یہ ہے کہ عالمگیر
کرب و اضطراب کا حل انھوں نے عالمگیر مذہب اور عالمگیر علم
کلام اور عالمگیر فلسفے ہی میں تلاش کرنے کی کوشش کی اور اس آزاد
تلاش میں انھیں سب سے زیادہ تشفی اسلامی تعلیمات سے حاصل
ہوئی۔ اس لیے اقبال نے نیٹشے کے فلسفہ جنون یا افلاطون کے
فلسفہ تخیل کی طرح اپنے نظام فکر کو فلسفہ اسلام کی سرحدوں میں
متعین فرمایا۔ اس لیے ہم قطعی طور پر اقبال کو صرف مسلمانوں کا شاعر
قرار نہیں دے سکتے بلکہ ایک عالمگیر شاعر قرار دے سکتے ہیں جس کا پیغام
ہر قوم و ملت کے لیے عام ہے۔ اس سلسلے میں عقل و خرد کی بھول
بھلیوں کی تاریکی میں حضرت اقبال نے قلب پیغمبری کی روشنی کو
رہنما تصور کیا اور یہی وہ روشنی ہے جو اقوام عالم کی اس گمراہی اور بے
راہروی میں رہنمائی کر سکتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اقبال کا کلام شعرائے
متقدمین سے بالکل ممتاز نظر آتا ہے۔

عوام کے نزدیک تو شاعری کا مفہوم ابھی تک وہی ہے کہ
معشوق سے کچھ چھیڑ چھاڑ کی باتیں ہوں یا قفس میں، گل سے بلبل
کے پر باندھے جائیں۔ وہی پرانی تشبیہات زلف کو سنبل یا شب دیجور
قد کو سرو، پیشانی کو غنچہ، لب لعلیں کو جام شراب، دانتوں کو انار دانہ
آنکھوں کو چشم نرگس یا ... تو پنجہ مرجاں سے تشبیہ دی جائے
عوام تو عوام یہاں اس امر کا اظہار بیجا نہ ہوگا کہ فانی جیسے باکمال
شاعر نے بھی کالج میں میرے سامنے یہ فرمایا کہ اقبال سوائے پند و
نصیحت اور [illegible] منظوم کے [illegible] کیا ہے [illegible]
یہی غلط [illegible] ہے جس سے حضرت جگر بھی اقبال کو شاعر نہیں مانتے۔ ان
سے [illegible] یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر جذبات اور جنون
کی [illegible] میں [illegible] ہے اور حسن و لطافت ہی کے گن گاتا رہے۔

تخیل اور جذبہ کے کامل امتزاج کو جو ادب کی جان ہے وہ شاعری
قرار نہیں دیتے۔ عام طور پر یہ خیال عام طور پر پھیلا ہوا ہے جو غلط ہے
اس کی تشریح آگے کی جائے گی۔

اس ایک طرفہ فیصلے کے متعلق جہاں تک میں نے غور
کیا ہے وہ صریحاً غلط ہے۔ دوسری بات قابل ذکر مسئلہ زبان کا ہے
عام طور پر شمالی ہند کے رہنے والے اور خصوصاً دلی اور لکھنؤ والوں کو
اپنی زباندانی اور صرف اپنی ہی زبان بولی ٹھولی اور روزمرہ و
محاورہ بندی پر ناز ہے۔ جس طرح کہ اہل عرب اپنے سوا دوسروں
کو عجم یعنی گونگا کہا کرتے تھے۔ اسی طرح ان اہل زبان حضرات
کے نزدیک اب تک ان خطوں کے باشندوں کے سوا سب غیر مستند
تھا۔ گویا زبان کی اجارہ داری ان کے سوا کسی دوسرے کو مل سکتی
ہی نہیں۔ لیکن ان کی حالت بالکل اس شعر کے مصداق ہے کہ
یاران تیز گام نے منزل کو جالیا۔ ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے
انہیں اس سلسلے سے قطعی ہمدردی نہیں ہے کہ
السنۂ عالم کس طرح بنتی ہیں۔ اور زباندانی کسی کی میراث نہیں ہے۔
خیر یہ ایک جداگانہ بحث ہے جس کا یہاں موقع نہیں۔ انہیں اجارہ
دار حضرات نے اقبال مرحوم کی زندگی میں بھی ان کی زبان اور محاورہ پر
اعتراضات کیے تھے۔ چنانچہ ایک صاحب نے "تنقید ہمدرد" کے
فرضی نام کے پردے میں جو اعتراضات کیے تھے۔ مرحوم نے خود
اس کا بہ نفس نفیس نہایت فاضلانہ اور عالمانہ اساتذہ کے کلام
سے اسناد پیش کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔ مجھے یہاں یہ ثابت کرنا
نہیں ہے کہ اقبال کی زبان اہل زبان حضرات کے دعوے کے مطابق
ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں اقبال کے ہاں
لطف زبان محاورہ بندی اور روزمرہ کے چٹخارے نہیں ہیں۔ خود
مرحوم کا تلفظ بھی پنجابی تھا۔ وہ اقبال کو "[illegible]" اور [illegible] کو
"[illegible]" کہا کرتے تھے۔ اور ان کو اعتراف بھی تھا کہ وہ اہل زبان نہیں
ہیں لیکن ایسے شاعر ضرور تھے جنھیں [illegible] اور حسن بیان
سے اتنی [illegible] حاصل تھی کہ بہت سے اہل زبان کو ان کی
ہوا تک نہیں لگی اور اقبال کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکے۔ [illegible] بھی

پونجی
پنچولی آرٹ پکچرز کی نغمہ و موسیقی کا شاہکار عظیم
نشاط سینما

نور وطن
اور سیکڑوں دلچسپیاں
بھری گئی ہیں
پستول والی
NATIONAL MUSLIM
نرس گرل

ہندستانی ادب
حیدرآباد دکن

حیدرآباد اگر کہیں آپ عجایبات حیدرآباد دیکھنے سے محروم نہ جائیں

حیدرآباد کی مصنوعات عجایبات سے کچھ کم نہیں ہیں

جب کبھی آپ حیدرآباد تشریف لائیں تو

فروخت گاہ مصنوعات ملکی - توپ کا سانچہ حیدرآباد

کا ضرور معاینہ کیجیے - جہاں ذیل کی چیزیں نمائش کے لیے اور فروخت کے لیے بھی رکھی رہتی ہیں - قیمتیں بقدر کم کہ ہر شخص خوشی سے ان مصنوعات کو خرید کر تحفے تحائف دینے کے لیے اپنے وطن لیجا سکتا ہے -

(۱) بیدری سامان - سگریٹ کیس - دیا سلائی کی ڈبیاں، گلدان، انگوٹھیاں، گھنڈیاں - آویزے - اور بروچ وغیرہ -

(۲) پارچے - اورنگ آباد کا مشہور ہمرو اور مشرو - ریشمی اور سوتی ساڑیاں - زر کے کام اور چھاپے کے جارجٹ - اجنٹا نمونے کے سنہرے کور - میز پوش - بستر کی چادریں - نیاپکنس - تولیے - [illegible] زیبائشی کپڑے - فینسی سنہرے لیس اور پاتابے وغیرہ -

(۳) قالین - ورنگل کے مشہور قالین، دریاں اور بہترین نمونوں کے [illegible] - نہایت سستے مختلف نمونوں کے معمولی اور اعلی قسم -

(۴) مختلف قسم کا سامان - چرمی سامان - ٹیبل لیمپ - ٹفن باسکٹ - گلدان - چڑیاں [illegible] بچکانی جھولے - بوٹ شوز سینڈل اور سوٹ کیس - عطردان - پاندان - [illegible] مختلف نمونوں کا سامان - نرمل کے مشہور کھلونے جانور پرندے میوے [illegible] لاک کا سامان - اسٹیشنری - ہاتھ کا بنا ہوا کاغذ وغیرہ ہر وقت دستیاب [illegible]

ہر حال ہر شخص کے مذاق کی کوئی نہ کوئی چیز موجود رہتی ہے ایک مرتبہ تشریف لاکر [illegible]

فہرست کے لیے لکھیے

منیجر فروخت گاہ مصنوعات ملکی - متصل توپ کا سانچہ حیدرآباد دکن

تار کا پتہ
"ادب" حیدرآباد دکن
قیمت
ایک پرچہ ۸/ ۸

ہندستانی ادب

رجسٹرڈ آصفیہ ۱۸۴۴
رجسٹرڈ برطانیہ
ام ۶ ۳۴ ۴۴
چندہ سالانہ (عہ)

ایڈیٹر: غلام محمد خاں ام۔اے (عثمانیہ)

جلد (۴) | اردی بہشت سنہ ۱۳۵۳ف | مارچ سنہ ۱۹۴۴ء | نمبر (۶)

فہرست مضامین

ہمارے خیالات

سرپور پیپر ملز حیدرآباد دکن کا کچا چٹھا

نمبر (۲)

حکومت، صحافت، عوام، مینجنگ ڈائرکٹرز اور ڈائرکٹران کمپنی توجہ کریں

پچھلے نمبر میں ہم نے سرپور پیپر ملز حیدرآباد دکن کا سرسری طور پر تعارف کرایا تھا اور یہ ظاہر کیا تھا کہ اس کمپنی کی بدعنوانیوں کی طرف ہم سے پہلے بھی بعض ایڈیٹروں نے توجہ دلائی تھی۔ لیکن جیسا کہ عام طور پر رواج ہے کمپنی کے ہشیار اور چالاک کام کرنے والوں نے بدنامی سے بچنے کے لیے کسی نہ کسی طرح ان کا منہ بند کر دیا۔ اس خودغرضی کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی کے خادم شیر ہوگئے اور ہر کام من مانے کرنے لگے اس سے بدتمیزیوں میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ یہی وجہ تھی کہ ان ایڈیٹروں کے چپ ہونے کے بعد مجبور ہوکر ہمیں قلم اٹھانا پڑا اور ایک سے زیادہ مرتبہ ہم نے اس خصوص میں اپنی آواز بلند کی۔ جس کے نتیجے کے طور پر حالات میں تھوڑی بہت تبدیلی ہوئی جب ہم نے یہ دیکھا کہ اب اصلاح کی طرف رجحان ہے تو ہم نے کمپنی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا لیکن کمپنی نے ہماری اس خاموشی کو غلط سمجھا یعنی یہ کہ یک یک کرکے ہم تنگ آ گئے ہیں اس لیے وہی ناما بہش کر دیا ہے چنانچہ شاید اس غلط نظریے کے تحت کمپنی کے کام کرنے والوں نے پھر سے وہی غلطیاں شروع کر دیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ کمپنی کے ملازم عہدے دار خود مختارانہ طور پر کام انجام دیتے ہیں۔ کمپنی کے منیجنگ ڈائرکٹر کمپنی کے حالات سے بالکل ہی بے خبر معلوم ہوتے ہیں ورنہ یہ ضروری تھا کہ ایک مرتبہ حالت بگڑ لینے کے بعد جب ڈائرکٹروں کو علم ہو جاتا ہے تو وہ ہر وقت حالات کی درستی کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ لیکن حالات کے بدتر ہو جانے سے اس بات کا صاف پتا چلتا ہے کہ منیجنگ ڈائرکٹر اور کمپنی کے نیچے درجے کے عہدے داروں کی کارگذاری سے کمپنی کے ڈائرکٹر بالکل ہی بے علم ہیں۔ اس سے آگے جو کمپنی کو جو نقصان پہنچیگا اس کی ذمہ داری نہ صرف کمپنی کے ... پر بلکہ ڈائرکٹروں پر بھی ہوگی۔ آنے والے نمبر میں ہم ان حالات سے بحث کریں گے جو خرابی کا باعث ہوئے۔

آنے والے نمبر میں اداریے کے اس حصے کو آپ ضرور پڑھیے۔

ہندستانی جناب سدرشن صاحب ملک کے ان جیالوں میں ہیں جنہیں اپنے ملک اور اس کی ہر چیز کا درد ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہر حالت اور ہر صورت میں ملک اور ملک والوں کی بھلائی چاہتے ہیں اسی طرح یہ لوگ پورے ملک کے ایک ملی جلی زبان اور اس قسم کے ادب کے بھی حامی ہیں۔

اس مضمون میں سدرشن صاحب نے ملک کی ان دو مذہب پرست اور فرقہ وارانہ جذبات بھرے طبقوں کی منہ ہٹ دھرمی کے نمونے پیش کیے ہیں جن کے باعث زبان بن بلکہ بگڑ رہی ہے۔ سدرشن صاحب کا خیال ٹھیک ہے کہ ہندی میں سنسکرت کے موٹے اور بھدے لفظ ٹھونس رہے ہیں اور ادھر اردو میں عربی اور فارسی کے مشکل لفظ بھرتے چلے جا رہے ہیں حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہندی اور اردو دونوں زبانوں سے سخت اور غیر مانوس لفظ نکال دیے جاتے تاکہ آسانی کے سبب زبان ایسی بنے جس کو ہر شخص سمجھ اور بول سکے وہ زبان ہے جسکو سدرشن صاحب ان کے ہم خیال اور ہم ... کی ملی جلی زبان یعنی "ہندستانی" کہتے ہیں۔ یہی وہ زبان ہے جسکی پورے ملک کو سخت ضرورت ہے اور ...

شمال سے جنوب اور مغرب سے مشرق تک بولی اور سمجھی جاتی ہے ایک ایسی پورے ملک کی زبان کے راستے میں روڑے اٹکانا ملک کی ترقی کے حق میں ظلم کرتا ہے۔ ملک کا ہر سپوت چاہے وہ کسی مذہب اور فرقے سے تعلق رکھتا ہو جس کو اپنے وطن سے تھوڑی بھی محبت ہے ہرگز ایسے نازیبا کام میں ہاتھ نہ ڈالے گا جس سے ملک کو نقصان کا ڈر لگا ہوا ہو۔

مضمون لکھنے والے صاحب نے ہندی اور اردو کے پوجنے والوں کی وہ تمام ہٹ دھرمیاں ظاہر کر دی ہیں جو محض فرقہ وارانہ جذبات پر مبنی ہیں اپنی طبقوں کی صدتے زبان کو ترقی کرنے سے روک رکھا ہے۔

آج چار سال سے رسالہ "ہندستانی ادب" بھی اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ ضدی اور ہٹ دھرم حضرات کی ضد اور ہٹ دھرمی کو منظر عام پر لائے۔ ان کی غلطیوں کو گنوائے اور یہ ظاہر کرے کہ اس قسم کے اختلافوں سے زبان بنتی نہیں بلکہ بگڑتی ہے ایک ابھرتی ہوئی زبان کے راستے میں مخالفتوں کے کانٹے بچھانا عقلمندی کے خلاف ہے۔

ہم ملک کی ایک ایسی ملی جلی زبان کے حامی ہیں جس کو ہر شخص آسانی سے سمجھ سکے اور جو پورے ملک کے رہنے والوں کی بات چیت کا ذریعہ بن سکے۔ اس سلسلے میں ہم نے بہت کچھ لکھا ہے اور لکھتے رہیں گے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ اس وقت ہماری آواز کمزور ہے لیکن ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ آگے چل کر اس کے سننے والوں کی تعداد بڑھ جائے گی۔ ہماری آج کی کمزور آواز کل قوت اور طاقت حاصل کرے گی جو ہر شخص کے کانوں تک پہنچ کر اس کے کان کے پردے پھاڑ ڈالے گی اس وقت ہر شخص ہماری آواز کو سننے پر مجبور ہوگا۔ اس لیے ہمیں اس بات کا بھی پکا یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن "ہندستانی" کا بول بالا ہوگا اور ہر شخص کی زبان پر اپنے ملک کی ملی جلی زبان "ہندستانی" کا نعرہ ہوگا۔

ہم سدرشن صاحب کے خیالات سے بڑی حد تک متفق ہیں لیکن بعض جگہ ہمیں ان کے خیالات سے اختلاف ضرور ہے جو ممکن ہے آگے چل کر دور ہو جائے۔ بہر حال یہ کچھ کم غنیمت نہیں کہ ملک میں ایسے روشن خیال حضرات کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے جن میں اپنے ملک کا درد اور اس کی ملی جلی زبان کی ترقی کا احساس موجود ہے اگر یہی رفتار رہی تو وہ دن دور نہیں جب کہ ہر طرف سے "ہندستانی" کا راگ الاپا جائیگا۔

آخر میں ہم اپنے معاصروں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہمارے اس نوٹ اور جناب سدرشن صاحب کے مفید اور پند ونصیحتوں سے بھرے ہوئے مضمون پر غور کرتے ہوئے اپنی ضد اور ہٹ سے باز آئیں۔ ہندی اور اردو کے جھگڑوں کو مٹا دیں اور "ہندستانی" کے نظریے کو قبول کریں۔

ہندستانی یا اور کوئی زبان — ؟

حال ہی کا واقعہ ہے کہ یہاں ہمیں مصیبت زدہ بنگال کے اس امدادی جلسے میں جانے کا موقع ملا۔ جلسے میں ہندو مسلمان سب ہی شریک تھے۔ حیدرآباد سے باہر لوگوں کی واقفیت کے لیے یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ مملکت حیدرآباد طبعی اور جغرافی اعتبار سے چہار اختر اکرنا ٹک اور تلنگانہ تین حصوں میں تقسیم ہے چنانچہ اس جلسے میں ان تینوں علاقوں کے رہنے بسنے والوں کے علاوہ گجراتی، مارواڑی، سندھی، کچھی، بنگالی، پنجابی، یو۔پی اور سی۔پی کے رہنے والے بھی شریک تھے۔ ایسے ہی مجمع کے موقعے پر بڑی پیچیدگی پیدا ہوتی ہے اور لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جلسے کی زبان کونسی ہو۔ ظاہر ہے اگر ان میں سے کسی ایک زبان میں تقریریں کی جائیں تو دوسری زبانوں کے لوگ بہروں کی طرح منہ تکتے بیٹھے رہیں گے۔ اس لیے فطری طور پر ایک ایسی زبان کی تلاش ہوئی ہے جو سب کی سمجھ میں آسکے۔ چونکہ شریک جلسہ سب کے سب ہندستانی ہوتے ہیں اس لیے لازمی طور پر ہندستانی زبان کی طرف ہر ایک کا میلان ہوتا ہے۔ چنانچہ اس جلسے میں بھی [illegible] ہندو اور مسلمان تقریر کرنے والوں نے ہندستانی زبان [illegible] میں۔

جن کو عورت مرد دھیان دے کر سنتے رہے۔ یہاں تک کہ اس جلسے کے صدر آندھرا علاقے کے ایک ہندو تھے۔ اور تقریر کرنے والوں میں بھی ہر علاقے کے ہندو تھے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ آخر میں جناب صدر کی فصیح ہندستانی تقریر کے بعد ایک دس سال کی بہاری لڑکی نے صاف ہندستانی میں مختصر سی تقریر کرنے کے بعد بنگال کی امداد میں رقم پیش کی۔

ہم حیران تھے کہ آخر تقریریں تلنگی، مرہٹی، کنڑی، مارواڑی، گجراتی، بنگالی، سندھی، کچھی، پنجابی، ملیالم، آسامی، تامل اور پشتو وغیرہ میں کیوں نہیں کی گئیں۔ کیا کوئی مرہٹا مرہٹی میں نہیں بول سکتا تھا؟ کیا کوئی تلنگا تلنگی میں نہیں کہہ سکتا تھا؟ اور کیا کوئی کنڑا کنڑی میں تقریر نہیں کر سکتا تھا حالانکہ یہ لوگ دیکھ رہے تھے کہ اس مجمع میں ان کے ہم زبان بھی موجود ہیں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی مگر بے چارا ـــ! افسوس کہ اپنی زبان کی حد تک اس کی زبان گنگ ہو گئی، لڑکھڑا گئی شاید بند ہو گئی ـــ نہیں نہیں وہ مجبور ہو گیا تب ہی تو اس کو اپنی پیاری زبان کو خیر باد کہنا پڑا۔

ایسی ہی ایک بحث آج سے پہلے بھی ہم نے کی تھی کہ اگرچہ ہندستان جیسے بڑے ملک میں بہت سی صوبائی زبانیں ہیں لیکن ان کی اہمیت صرف اپنے خطے کی حد تک ہو سکتی ہے پورے ملک کے لیے ایک بین صوبائی یا ملک کی ملی جلی زبان کی سخت ضرورت ہے جو ہندستان کی ایک ہی زبان ہوگی اور جس کو ہندستانی کہنا چاہیے۔ یہی ایک ایسی زبان ہو سکتی ہے جس کو ہر صوبے کا آدمی بلا تکلف بول اور سمجھ سکتا ہے۔ چنانچے اوپر ہم نے جس جلسے کا ذکر کیا ہے اس میں مختلف علاقوں یا صوبوں کی عورتیں اور مرد بھی شریک تھے۔ وہ تقریریں سن رہے تھے اور سمجھ بھی رہے تھے۔ یہ ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ جب کبھی مقرر کی زبان سے اثر کرنے والے جملے نکلتے تھے تو لوگ اس پر زبان سے اظہار افسوس کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ بغیر سنے اور سمجھے تو کوئی ایسی حرکت نہیں کر بیٹھتا اسکے مزید ثبوت کے لیے ہم ان نظموں کا ذکر بھی ضروری سمجھتے ہیں جو طنزیہ یا مزاحیہ انداز میں لکھی گئی تھیں چونکہ نظموں میں طنز اور مزاح کا جز زیادہ تھا اس لیے ہر مصرع اور ہر شعر پر واہ واہ کے نعرے اور قہقہے لگائے جا رہے تھے۔ اس میں مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے، ہندو مسلمان سب ہی شریک تھے۔ اس لیے اس واقعے سے بھی ظاہر ہے کہ جس زبان میں تقریریں کی گئیں اور نظمیں پڑھی گئیں وہ ایک ایسی عام فہم، سلیس اور قابل قبول زبان تھی جو پورے ہندستان کے ہر صوبے کے رہنے والوں کی بول چال اور بات چیت کا بہتر ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس لیے ایسی صورت میں ایک سمجھنے بوجھنے والی زبان کی بے جا طور پر مخالفت کرنا گویا اپنے ہی ہاتھوں اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لینا ہے۔

اوپر کے واقعے کی روشنی میں ہم حیدرآباد کے تلنگوں، مرہٹوں اور کنڑوں یا ہندستان کے بعض علاقوں کے تفرقہ ڈالنے والوں سے پوچھتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے علاقے کی زبان میں جامعہ کھول کر کیا کریں گے ـــــ؟ جامعہ کی تعلیم تو ایسی زبان میں ہونی چاہیے تاکہ کسی ایک جامعہ کا طالب علم پورے ملک کے کسی حصے میں بھی جا کر کام کر سکے یا ملازمت کر سکے۔ ہندستان کی جامعات کا ذریعہ تعلیم جو انگریزی زبان میں ہے وہ بھی مناسب نہیں۔ ہر صوبے کو اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جامعہ عثمانیہ کی تقلید میں پنجاب، علی گڑھ، دلی، ناگپور، لکھنؤ، الہ آباد، پٹنہ اور بمبئی کی جامعات تو ہندستانی کو اپنا ذریعہ تعلیم نہایت آسانی سے اختیار کر سکتی ہیں۔ اس کے بعد ممکن ہے دوسری جامعات بھی اس طریقے کو اختیار کریں۔

بہرحال ہندستانی زبان کا مسئلہ ملک کا ایک اہم سے اہم مسئلہ ہے جس پر ہندستانیوں کو کافی غور و فکر سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمیں اس بات کا افسوس ہے کہ لکھائی کی غلطی کے سبب پچھلے نمبر میں صفحہ نمبری پر جو مضمون چھپا تھا اس سلسلے میں یہ لکھنا بھول گئے تھے کہ وہ مقالا جناب معین الدین صاحب رہبر فاروقی دکنی نے "بزم ادب" حیدرآباد کے ایک علمی جلسے میں پڑھا تھا۔

غزل

حسن کو دشمن وفا دیکھا — بارہا ہم نے دل لگا دیکھا

ایک دو پھول وہ بھی پژمردہ — قبر عاشق پہ اور کیا دیکھا

داغ ہو، اشک ہو، کہ زخم جگر — رنگ ہر پھول کا جدا دیکھا

مجھ پہ ہے دید حسن کا الزام — آپ نے آئینے میں کیا دیکھا

پھر نظر بجلیاں گرانے لگی — پھر دھواں اٹھتے جا بجا دیکھا

ارنی گو کی کھل گئیں آنکھیں — جو سنا اس سے کچھ سوا دیکھا

تھا جو ظاہر میں بادہ خوار جلیل
اس کو باطن میں پارسا دیکھا

فصاحت جنگ جلیل

ہندستانی
یعنی
ہماری ملکی زبان

کوئی مانے یا نہ مانے یہ بات اور ہے مگر اسمیں

ہماری زبان شک نہیں کہ ہماری ملکی زبان بننے کی جتنی خوبیاں ہندستانی زبان میں ہیں اتنی بھارت ورش کی کسی دوسری بھاشا میں نہیں ہیں۔ اس کے قواعد کیسے قدرتی، اس کا لکھنا کتنا سہل، اس کی بناوٹ کتنی سندر، اس کا بول کتنا میٹھا ہے کہ بے اختیار منھ سے واہ واہ نکل جاتی ہے۔ اور پھر اس کے خزانے میں ایسے ایسے انمول رتن بھرے پڑے ہیں کہ انکی چمک سے آنکھیں چندھیا جائیں۔ سورداس، اور تلسی داس، میرا بائی اور کبیر بھگت، ملک محمد جائسی اور رحمان خسرو اور نظیر، امیر اور انشا، اکبر اور اقبال جیسے کلاکار جس بھاشا کے پاس ہوں وہ اپنی قسمت پر پھولی نہ سمائے تو اور کیا کرے۔ یہ ایسے ویسے کلاکار نہ تھے۔ بھاو اور بھاشا یعنی زبان اور جذبات کے بادشاہ تھے۔ ان کے آئینے میں اپنا منھ دیکھکر آج بھی ہمارا سویا ہوا غرور جاگ اٹھتا ہے۔ اور کچلی ہوئی عزت زندہ ہوکر ہمارے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ میں نے سورداس کے پد اور میرا بائی کے گیت سنکر کشمیر اور مدراس کے ہندی نہ جاننے والے بھائیوں کو بھی پیار اور عقیدت کے آنسو بہاتے دیکھا ہے۔ میں نے کبیر کے بھجنوں کا انگریزی ترجمہ پڑھکر انگریزوں کے آنکھوں میں بھی پیار و محبت کے بادل دیکھے ہیں۔ میں نے رحمان کے ایک ایک دوہے پر بڑے بڑے شاعروں کو پاگل ہوتے دیکھا ہے۔ اکبر کا ایک ایک شعر اور بہاری لال کا ایک ایک دوہا ایسا ہے کہ اسے چھاتی کے ساتھ لگا کر رکھا جائے۔

پھر بھارت کی سب سے بڑی راج سبھا کانگریس نے بھی ہندستانی ہی کو ہماری ملکی بھاشا کے سنگھاسن پر بٹھا دیا ہے ان سب باتوں کی روشنی میں اگر سچائیاں سجھائی دے سکتی ہیں تو

آج اس زبان کے سب سے بڑے دشمن کو بھی ماننا پڑے گا کہ ہندستان میں ایک یہی ایسی زبان ہے جو سب کے منھ میں بیٹھ سکتی ہے اور یہی ایک ایسی بولی ہے جسے بول کر ہم ہندستان کے ہر شہر اور ہر شہر کے ہر بازار سے اپنی ضرورت کا سودا خرید سکتے ہیں۔ بنگال کی بولی ہندستانی سے اتنی ہی دور ہے جتنا پنجاب بنگال سے۔ مگر پھر بھی ہندستانی جاننے والے کو بنگال میں آکر ذرا تکلیف نہیں ہوتی۔ وہ یہاں کی سیر کر سکتا ہے۔ یہاں رہ سکتا ہے اور یہاں کے لوگوں سے اپنے مطلب کی چیزیں خرید سکتا ہے۔ مدراس کے لوگوں کے لیے یہ زبان اور بھی دور کی ہے۔ مگر آپ وہاں جایئے، ہندستانی زبان وہاں بھی آپ کی ہر مشکل کو آسان کر دے گی۔ یہ وہ صوبہ ہے جہاں آپ جاتے ہوے بھی ڈرتے ہیں۔ مگر آپ یہ دیکھکر دنگ رہ جائیں گے کہ وہ لوگ آپ کے ہندستانی فلموں کو بڑے شوق سے دیکھتے ہیں اور دیکھکر تعریف کی تالیاں بجاتے ہیں۔ باقی رہ گیا گجرات اور مہاراشٹر۔ اس پڑوسی کا لاثانی کلیر لے اب تو برسوں گذر چکے ہیں۔ مزے سے چلے جایئے کیا مجال جو آپ کے رستے میں کوئی کھڑا ہو جائے۔ ایسی حالت میں آپ ہی چھاتی پر ہاتھ رکھکر کہیے کہ اگر ہندستانی ہندستان کی ملکی زبان نہیں تو اور کون ہے۔ میں اپنے ان بھائیوں سے، جو ہندستانی کی مخالفت کرنے کے لیے ادھر ادھر کے بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں بڑی نرمی سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ اسکو نقصان پہنچانا ہندستان کی ایکتا کو نقصان پہنچانا ہے۔ اس ایکتا کو جو ہندستان کی آزادی کی چابی ہے اور جس کے بغیر ہم سوراجیہ مندر کے پاس پہنچکر بھی اس کے اندر پاؤں نہ رکھ سکیں گے۔

ہندی یا اردو

یہاں پہنچکر ایک اور سوال ہمارے سامنے منہ اٹھاتا ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ ہماری ملکی زبان کا نام کیا ہو۔ ہندو کہتے ہیں ہندی، مسلمان کہتے ہیں اردو۔ اگر ہٹ دھرمی کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو ہندی اور اردو ایک ہی زبان کے دو نام ہیں اور ایک ہی بھاشا کے دو روپ ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اگر اس میں عربی اور فارسی کے ادق الفاظ داخل کر دیے جائیں تو وہ اردو بن جاتی ہے اگر اس میں سنسکرت کے وشدھ اور جٹل شبد آ جائیں تو اسے لوگ ہندی کہہ دیتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آسان اور میٹھے شبد دونوں طرف سے لے لیے جائیں۔ کٹھن اور موٹے لفظ دونوں طرف کے ٹھکرا دیے جائیں۔ اور اس طرح ایک ایسی زبان تیار کر لی جائے جو ہندو مسلمان دونوں کی زبان ہو۔ اور جس کے اندر دونوں کی آنکھیں ایک جیسی خوبصورتی دیکھ سکیں۔ مگر نہیں دونوں طرف کے لوگ اپنی اپنی پسند کے موٹے موٹے لفظ لاتے ہیں اور انہیں ملکی زبان کی پیٹھ پر لادتے چلے جاتے ہیں۔

ہندی کے حامی کہتے ہیں "یہ آوشک ہے کہ ہندی شبد بھنڈار کی پورتی سنسکرت کی سہایتا سے کی جائے۔ ہملیتہ سنسکرت پر دھانتا اتر دار یہ ہے[1]۔ ہمارا آشے یہ کہ راشٹر بھاشا پورنتیا سنسکرت پر آشرت ہونی چاہیئے"[2] یہ وہ لوگ ہیں جن کی پسند بخار کو جور، ریت کو ستا اور ریل گاڑی کو واشپ بھومی یان کہہ کر خوشی ہوتی ہے۔ کلا اور لالیتہ ناراض ہو جائیں۔ انہیں اس کی کوئی پروا نہیں۔ ایسے آدمیوں کی رائے میں تھرمامیٹر اور لالٹین کے لیے ہندی میں ستھان نہیں ہے مگر تاپ دیکھتی کرن نیتر اور ہست کا بنگ دیپکا کے لیے ہندی کے دوار چوبیس گھنٹے کھلے رہنے چاہئیں۔ ان کے ہندی مندر میں جو مرپادرکا تو پہنچ جا سکتی ہے۔ مگر ادھر جوتا آیا۔ ادھر سارا کیا کرایا اشدھ ہو گیا عجب تماشا ہے۔

نومبر سنہ ۱۹۳۵ء کے ہنس میں سری جے شنکر پرشاد جی کا ایک لیکھ چھپا ہے۔ اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"وشو سوتر ومنترشی میں کثیراج نے کلا کے سمبندھ میں اپنا وچاریوں ویکت کیا ہے"۔

پرشاد جی نے ان لوگوں کی خاطر جو سنسکرت نہیں جانتے اس کا ہندی انوواد بھی کیا ہے۔ جس کو پڑھکر یہی لکھنا پڑتا ہے کہ کہیے کیا سمجھے؟ کچھ سمجھے خدا کرے کوئی۔ مگر اس میں پرشاد جی کا کیا دوش۔ انہیں بھاشا کی شدھی کی چنتا تھی مگر کیا یہ شدھی چل سکے گی؟ ہندی بھاشا میں تو باہر سے اتنے شبد آ کر مل گئے ہیں کہ اگر ان کو نکالنا چاہو تو ہندی کا کوشش دلنت؛ پرانے بخار کے روگی کے سمان دبلا پتلا رہ جائے۔ مثال لیجیے۔

"ارے بھیا کیا بتاؤں۔ آج کمرے میں بیٹھا تھا تمہاری پتریکا کے لیے عیسا کا جیون چرتر لکھ رہا تھا کہ ننھا اڑد کی دال کے بڑے مانگنے لگا۔ میں نے نوکر سے کہا۔ گدام سے دال نکال لو اور میرے لیے تھوڑا سا تماکو بھی لیتے آؤ۔ یہ تماشا ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا کہ اتنے میں ڈپٹی صاحب آ کر میز کے سامنے کھڑے ہو گئے اور بولے آج گرجا گھر کے پاس پادری صاحب ترقی کا مال نیلام کرائیں گے چلو گے۔ میں نے پوچھا کیا کیا نیلام ہوگا۔ اپنے تمگہ کی چابی کے ساتھ کھیلتے ہوئے بولے۔ آئینے، الماریاں، کنستر، گلاس وغیرہ"۔

اس پیرے میں کمرا اطالی ہے عیسا عبرانی۔ پادری لاطینی ننھا گجراتی اڑد وتامل ہے۔ بڑا جو کرناٹکی میں تلا جاتا ہے تلگو بھاشا سے آیا ہے۔ گدام ملایا کی زبان ہے۔ تماکو امریکہ کی پیداوار ہے۔ آئینہ فارسی ہے۔ تمغہ عربی ہے۔ گرجا الماری نیلام، چابی پرتگالی ہیں۔ جیتیں، ترقی، ترکی ہیں۔ ڈپٹی کنستر

---

[1] شری جیشن چندر تل دینک بھارت میں [2] ہندستانی نہیں ورن شدھ ہندی لیکھک شری ادم پرکاش جی کوہلو چیترپٹ ۱۰ فروری سنہ ۱۹۳۶ء

کلاس انگریزی ہیں۔ ان غیر ہندی شبدوں کو نکال ڈالیے تو ہمارے پاس نہ کھانے کو اُڑد کی دال رہے نہ تالہ بند کرنے کو چابی۔ کیونکہ یہ دونوں چیزیں بھی غیر ہندی ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ ذرا نیائے کی آنکھ سے دیکھو تو پتا لگے کہ ان میں ایک ایک شبد کو ورشدھ اور سنسکرت سے ہندی میں کہنا چاہو تو دو سطروں کی ضرورت پڑے۔ اس وقت ایک ایک لفظ سے کام چل رہا ہے۔ اور پھر آپ کی پاکیزہ زبان میں تو اتنی طاقت ہونی چاہیے کہ ادھر فارسی عربی کا شبد آیا۔ ادھر شدھ ہو گیا اگر ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہے اور دوسری زبانوں کے شبدوں کا ہم نے ہنستی ہوئی آنکھوں سے استقبال نہ کیا تو ہماری بھاشا اس تالاب کی طرح سڑنے لگے گی جس میں نئے پانی کی نالیاں بند کر دی گئی ہوں۔ کس قدر حیرانی کی بات ہے کہ انگریزی لغت کے پاس تین لاکھ لفظ ہیں۔ اور اس کے دوار نئے لفظوں کے لیے ابھی تک کھلے ہیں۔ ہمارے ہندی لغت کے پاس ساٹھ ستر ہزار لفظ ہیں اور اس پر بھی ہم کہتے ہیں باہر کے دوار بند کر دو۔ باپا جی جو جمع کر گئے ہیں وہی بہت ہے۔

مگر ہمارے بزرگ ایسے تنگ دل نہ تھے۔ انہیں لفظوں کی خوبصورتی سے سروکار تھا۔ ہندی اردو سے سروکار نہ تھا خوبصورت شبد دیکھ کر ان کا من ناچنے لگتا تھا۔ اور وہ جب تک اسے اپنا نہ بنا لیتے تھے انہیں چین نہ آتا تھا۔ انہوں نے باہر کے لفظوں کا ایسے سندر ڈھنگ سے استعمال کیا ہے کہ دیکھ دیکھ کر من کی کلی کھل اٹھتی ہے۔

سترہویں صدی عیسوی میں گوسائیں تلسی داس نے رامائن لکھی۔ یہ وہ دن تھے جب اردو زبان پالنے کے جھولے میں جھول رہی تھی۔ اور اس آنے والے زمانے کے سپوت تھے ہوتی تھی مگر اس کے باوجود گوسائیں جی کو اس ہونہار بالک کی توتلی بولی کے کئی بول اتنے پسند آئے کہ انہوں نے انہیں اپنی کویتا میں جگہ دے کر امر بنا دیا کچھ نمونے دیکھیے۔

رگھو برتم کو میری لاج

سدا سدا میں سرن تہارو | تم بڑے گریب نواج
پتت ادھارن وردتہارو | سروَن سنی اواج
ہوں تو پتت پراتن کہیے | پار اتارو جہاج

ماکو مایا لے کر کر لیسے ہاتھ | تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھت بات
گھر بسو اس بچن مٹا بولے | کتنی مجھ لنک کا بھی گھوسے
لو کہو وید مصاحب ریتی | وے سنت بچانت پر تھی

اب سورداس جی کا ایک بھجن لیجیے:۔

سا بچو سو لکھ دھار کہا وے
کا یا گرام مصاحت کرکے جما باندھ ٹھہراوے۔ سانچو سو
من متھ کرے کید اپنے میں گیان جہتیا لاوے
مانڈ مانڈ کھریان کر دودھ کو پوتا بھجن بھراوے
بٹا کاٹ قصور مرم کو فرد تلے لے ڈارے
نشچے ایک اصل پہ راکھے۔ ٹرے نہ کب ہوں ٹارے
کل جوڑے دھیان کلکا ہری سوں تماں راکھے
نربھے روپے کو بھر چیا نڈلے سوئی دار جدا کھے
جمع خرچ نکے کری راکھے لیکھا سوجھی بتاوے
سور آپ گجران محاسب لیے جواب پہنچاوے

برج بھاشا کے جانکار شری دیوگی ہری جی نے اپنی کتاب کیشٹ سورساگر کے دیباچے میں لکھا ہے۔

سورداس نے ٹھیٹھ برج بھاشا کے ساتھ ساتھ فارسی لفظوں کا بھی استعمال کیا ہے..... کچھ فارسی لفظ نیچے دیے جاتے ہیں۔ جن کا استعمال سورداس جی نے کیا ہے۔

مضافات، نقیب، اصل، سابق جمع سیاہ، صاحب سہی، جواب، برآمد، صاف، گزران، قید، واصل باقی، لایق، معاف، دامنگیر، نشاط، محرر، نوبت، دستک، غریب نواز، شور، فوج، بے حال، سلطان، دیوان، دیوانی

اس پر نوٹ دیتے ہوئے سری یوگیشور شرما جی نے لکھا ہے۔

"شری سورداس جی برج بھاشا کے اہل زبان تھے اپنے

سٹیٹھ اور شبدوں شبدوں کی ان کے پاس کمی نہ تھی وہ چاہتے تو ان دو دیشی شبدوں کو اپنی کویتا کی بگیا کے پاس نہ پھٹکنے دیتے مگر وہ تو فراخ دل ویشنو تھے سنسکرت کا تیاگ کیسے کرتے۔

چندر بردائی ان دونوں کویوں سے پہلے ہوئے ہیں ان کی کویتا میں محل، پروردگار، پیغام، کریم، سلطان، بادشاہ، عالم، حضرت، زبان، سلام، دیوان، قلق، ملک وغیرہ شبدوں کا استعمال ہوا ہے۔ (آب حیات صفحہ ١٦)

کبیر داس نے بھی اردو شبدوں سے پرہیز نہیں کیا۔

من ہے عشق مستانہ من کو ہوشیاری کیا
رہیں آزاد یا جگ میں ہمن دنیا سے یاری کیا
جو بچھڑے ہیں پیارے سے بھٹکتے در بدر پھرتے
ہمارا یار ہے ہم میں ہمن کو انتظاری کیا
کبیرا عشق کا ماتا دوئی کو دور کر دل سے
جو چلنا راہ نازک ہے ہمن سر بوجھ بھاری کیا

ان کے دوہوں اور بھجنوں میں غافل، ڈاکو، ظالم، سلطان، بیقراری عجب زمانہ، خزانہ، خوب، محبوب، آسمان، الست، خاطر مغروری وغیرہ لفظ اکثر پائے جاتے ہیں۔ (بھگت کبیر صفحہ ٢٠)

میراں بائی تو پوری پریم دیوانی تھی۔ اسے جو شبد پیارا معلوم ہوا اس نے اپنی زبان پر رکھ لیا اور اپنے بھجنوں میں چپکا دیا۔

تم سنو دیال مہاری ارجی

بھو ساگر میں بہی جات ہوں میں | کاڑھو تو تھاری مرضی
مات پتا اور کٹنب کبیلہ | سب مطلب کے الگرجی

چھوڑ مت جاجیو جی مہاراج | میں ابلہ بل نا میں گوسائیں
تم ہی میرے سرتاج

میرا بیڑا لگا دیجو پار | پربھو جی ارج کروں چھوں
اس جنم کرم کی علت لگی ہے | دور کرو دکھ پار

گرو نانک جی نے تو پنجابی لفظوں کو پرایا نہیں سمجھا جیسی ضرورت پڑی اٹھا لیا۔ جو سامنے آیا اپنا لیا۔

ساس ماس سب جیو تمارا۔ تو ہے کھرا پیارا
نانک شاعر یہو کہت ہے۔ سچے پروردگارا

اب اگر ہم کہیں کہ ان ادیبوں کو ہندی کے شبد نہ ملتے تھے۔ اس لیے اردو فارسی کے شبد لے لیتے تھے تو یہ ان کے آرٹ کا اپمان اور ہماری مورکھتا کا پرمان ہے اصل میں بات یہ ہے کہ ان لوگوں میں اتنی سمجھ تھی کہ جس شبد کو لیتے تھے۔ پانی کے قطرے سے موتی بنا دیتے تھے "تم سنو دیال مہاری ارجی" میں جو گہرائی اور گرمی ہے۔ وہ "پرارتھنا" میں کہاں؟ ارجی شبد میں میراں نے اپنا دل اور دل کی تڑپ کھول کر رکھ دی ہے۔

اردو کے حمایتی

مگر یہ ہٹ دھرمی ہندی والے ہی کر رہے ہیں۔ یہ کہنا بھول ہوگی۔ اردو کے حمایتی اس سے بھی دو قدم آگے چلتے ہیں۔ مولانا محمد علی نے ایک بار علی گڑھ یونیورسٹی میں بولتے ہوئے کہا تھا۔

"میں تو انتہا درجے کی بیقراری سے اس یوم سعید کا انتظار کر رہا ہوں جب کہ مادر وطن کا بچہ بچہ اپنی ماں سے عربی میں دودھ مانگا کرے گا۔"

خیر گنگا جمنا اور ہمالہ کے اس دیش میں عربی کے سپنے دیکھنے والے تو بہت کم ہوں گے۔ مگر ایسے آدمی بہت ہیں جن کے لیے ہنستے مسکراتے چہرے کے ساتھ ہندی کا نام سننا ایک سخت امتحان ہے۔ ایسا سخت امتحان جس میں وہ کبھی پاس نہیں ہو سکتے۔ وہ بھی جب سوتے ہیں تو فارسی آمیز اردو کے خواب دیکھتے ہیں۔ اور جب جاگتے ہیں تو ہندی دور کے نعرے لگاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں یہ ہندی کا نام ہی آریہ سماجیوں کی ایجاد ہے۔ اس سے پہلے ہندستان میں اردو کا دور دورہ تھا۔ مگر وہ استادوں کے ان شعروں کو ان کے دیوانوں سے کس طرح چھین سکیں گے :-

؎ کیا جانوں لوگ کہتے ہیں کس کو سرور قلب
آیا نہیں ہے لفظ یہ ہندی زبان کے بیچ میرؔ

مطلب کی میرے یار نہ سمجھے تو کیا عجب
سب جانتے ہیں ترک کی ہندی زبان نہیں آتشؔ

مرادشاہ ایک مشہور پنجابی شاعر جب یورپ کے سفر سے لوٹ کر دلی آتے ہیں تو بادشاہ انہیں یاد کرتا۔ اور ان کا کلام سنکر خوش ہوتا اور انہیں انعام و اکرام دیتا ہے۔ یہ وہی استاد مراد ہیں جنھوں نے چہار درویش فارسی کو اردو نظم کا جامہ پہنانا چاہا تھا۔ زندگی نے وفا نہ کی، قصہ ادھورا رہ گیا۔ ان کی صاف اور فصیح اردو بھی سن لو ؎

یہ قصہ جو ہے چار درویش کا — اگر نظم ہو تو بہت ہے بجا
ولیکن ہو اردو زبان میں بیاں — کہ سمجھاتی ہے ہر ایک کو یہ زباں
وہ اردو کیا ہے یہ ہندی زباں ہے — کہ جس کا قایل اب سارا جہاں ہے
کلام اب مجھ سے میں ہندی بنایا میں — کروں شہرت ہوتا سارے جہاں میں
لطافت یہ نکالی ہے اسی میں — کہ فرماتے نہیں کچھ فارسی میں
اسی کا شہرا اب ہو چکا سب تک — یہاں سے تا بہ ایران بل عرب تک
خصوصاً شعرا اب شاعر یہاں کے — نہیں کہتے بجز ہندی زباں کے
غرض ہندی کا یہ چرچا یہاں ہے — کہ شکر فرس مطعون جہاں ہے
یہ شہرت ہے اب اس مضمون پر کی — نہ کوئی فارسی پوچھے نہ ترکی
نہیں ہندی سخن میں نقص ممکن — لطافت ہے بہت سی ہیں ممکن

(مغل اور اردو صفحہ ۳۲:)

صاف ظاہر ہے کہ ان دنوں میں ہماری زبان کے لیے اردو کے ساتھ ساتھ ہندی شبد کا بھی استعمال ہوتا تھا۔ اور یہ استعمال کرنے والے ہندو ہی نہ تھے مسلمان بھی تھے۔ مگر اردو کا حامی کہتا ہے۔ چلو ہوگا۔ لیکن ہم اب اردو کو غیر فصیح نہ ہونے دیں گے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ فصیح اردو کونسی ہے دہلی اور لکھنؤ دونوں اس عزت کے دعویدار ہیں اور کسی دوسرے کو ہی کو فرد یک نہیں پھٹکنے دیتے۔ گویا پنجاب، حیدرآباد اور بہار کے ہندو مسلمان اردو ادیب تو فصیح اردو لکھنے سے رہے مگر لکھنؤ اور دلی کی ادبی لڑائی پھر جاری رہتی ہے۔ لکھنؤ کہتا ہے اردو زبان میں میرا سکہ چلے۔ دلی کہتی ہے جس فصاحت پر میری مہر نہ لگے وہ فصاحت فصاحت ہی نہیں ہے۔ لیکن یہ سوال یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا۔ انشاءاللہ خاں اپنے "دریائے لطافت" میں ارشاد فرماتے ہیں۔

"لیکن اصلش شرط است کہ نجیب باشد یعنی پدر و مادرش از دہلی باشند، داخل فصحا گشتہ"

یعنی شدہ اردو اس آدمی کی مانی جا سکتی ہے جو نجیب ہو یعنی جس کے ماں باپ دونوں دلی کے باسی ہوں۔ مگر ابھی پابندیاں اور باقی ہیں فرماتے ہیں،

"فصاحت در دہلی ہم نصیب ہر کس نیست منحصر است بر چند محدود"

یعنی دہلی میں بھی یہ فصاحت ہر کسی کو نصیب نہیں ہے۔ چند گنے چنے آدمی ہی "ایسے خوش نصیب ہیں (صفحہ ۱۲) گویا اس طرح انشا صاحب نے اردو کو دلی کے ایک آدھ محلے اور اس محلے کے پانچ دس گھروں کی جائیداد بنا دیا۔ باقی زمانہ جھک مارتا ہے۔

اب لکھنؤ کی سنیے میں نے ایک لکھنوی صاحب سے پوچھا کہ لفظ مونث ہے یا مذکر۔ کہنے لگے کبھی مونث کبھی مذکر۔ میں نے کہا لغت میں تو صرف مذکر ہے۔ بولے وہ لغت پنجاب کا ہوگا۔ میں نے کہا فرہنگ آصفیہ کا مصنف بھی اسے مذکر ہی کہتا ہے۔ جواب دیا وہ دہلوی ہے۔ ہمارے لیے سند نہیں۔ میں نے پھر کہا۔ نور اللغات تو کسی لکھنوی ہی کی تصنیف کردہ ہے۔ اس پر ان بزرگوار نے مسکرا کر کہا۔ اس کا مصنف دریا کے اس پار رہنے والا ہے۔ لکھنؤ کے لوگ اسے بھی نہیں مانتے۔ چلو چھٹی ہوئی۔ فصیح اور صحیح اردو لکھنؤ کے اس طرف ہے۔ اس طرف نہیں۔ اور وہ بھی لکھنؤ کی حدود کے اندر اندر۔ ادھر سرحد ختم ہوئی۔ ادھر اردو کی فصاحت میں فرق آگیا۔ یہاں تک کہ اناؤ میں آکر یہ گنوار دو زبان اور کانپور پہنچ کر گھیوں کی زبان بن گئی۔

اردو کا سب سے بڑا لغت اس وقت تک سید احمد دہلوی

کا فرہنگ آصفیہ ہے۔ اس کے آخر میں مولوی صاحب نے یہ نقشہ درج کیا ہے :-

ہندی جس کے ساتھ پنجابی اور پوربی زبان کے بعض خاص الفاظ بھی شامل ہیں ۲۱۶۴۴ – اردو یعنی وہ الفاظ جو غیر زبانوں سے ہندی کے ساتھ مل کر بنے ہیں ۷۰۰۵ – عربی ۷۵۸۴ – فارسی ۶۰۴۱ – سنسکرت ۵۵۴ – انگریزی ۵۰۰ – دوسرے الفاظ ۱۸۱ – کل میزان ۵۴۰۰۹ –

اس حساب سے اردو کی کل جائداد کا آدھا حصہ ہندی اور سنسکرت کی دین ہے اگر اسے نکال دیا جائے تو اردو قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے لگے اور اسے اخباروں اور بازاروں میں چلنا دوبھر ہو جائے۔

ہندی کی پرانی کویتا میں آپ اردو فارسی کے شبد دیکھ چکے۔ اب اردو کے اہل دل مسلمان شاعروں کی فراخدلی اور ہندی نوازی کے نمونے دیکھیے اور ان لوگوں کی عقل پر ماتم کیجیے جو ہندی باغ کے پھول شبدوں کو کانٹے کی طرح پرے ہٹاتے ہیں۔

امیر خسرو

سگری رین موسے سنگ جاگا۔ بھور بھئی تب بچھڑن لاگا
اس کے بچھڑے پھاٹت ہیا۔ اے سکھی ساجن نہ سکھی دیا

سرب سلونا سب گن نیکا – وا بن سب جگ لاگے پھیکا
واکے سر ہووے کون – اے سکھی ساجن نہ سکھی لون

وہ آوے تب شادی ہووے – اس بن دوجا اور نہ کوے
میٹھے لاگے واکے بول – اے سکھی ساجن نہ سکھی ڈھول

خدا جانے جس وقت اردو کے پہلے شاعر کے منہ سے نکلے ہوں گے تو سننے والوں کا کیا حال ہوا ہوگا۔ کتنی واہ واہ ہوئی ہوگی اور لوگوں نے کتنی بار یہ پیارے بول پڑھوا پڑھوا کر سنے ہوں گے۔

ولی

فصیحاں خلق کے سارے تجھے شیریں بچن کہتے
پیشانی روز روشن اور زلف کالی رین کہتے

نہ مل مہتاب میں بھی کس سوا سے چندر بدن ہرگز
تجلی میں تیرا یہ مکھ ہے خورشید محشر کا

سودا

غزال دشت کی ہر چند ہیں ابلا فریب آنکھیں
پر انکھیوں کا تیرے اے یار ان میں چھند کیونکر ہو

ناگن کا اس زلف کی مجھ سے رنگ نہ پوچھ کیا ملا
خواہ تھی کالی خواہ تھی پیلی بس نے اپنا کام کیا

محبت کے کروں بیچ بل کی میں تقریر کیا یارو
ستم پربت ہو تو اسکو اٹھا لیتا ہوں جوں رائی

ساون کے بادلوں کی طرح سے بھرے ہوئے
یہ نین وہ ہیں جن سے کہ جنگل ہرے ہوئے

نکل کے چوکھٹ سے گھر کی پیارے جو پٹ کی اوجھل ٹھٹھک رہا ہے
سمٹ کے گھونگٹ سے ترے درس کو نین میں جی آ اٹک رہا ہے
اگن نے جب سے برہ کی تیرے کلیجہ میرا جھلس دیا ہے
سینے کی دھڑکن میں کیا بتاؤں یہ کوئیلا سا چٹک رہا ہے
مجھے پسینہ جو تیرے مکھ پر دکھائی دے ہے تو سوچتا ہوں
یہ کیسے سورج کی جوت آگے ہر ایک تارہ جھلک رہا ہے
بلوری لبوں نے نہ اسکی بوند لگ کے پھولوں کی پنکھڑی سے
تمہارے کانوں میں جس طرح سے ہر ایک موتی لٹک رہا ہے
میں نے سودا سے جاکے پوچھا تجھے کچھ اپنے بھی من کی سدھ بدھ
یہ رو کے مجھ سے کہا کسی کی لٹک میں لٹ کی لٹک رہا ہے

میر تقی

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

دکھا کر ہاتھ دل پر آہ کرتے — نہیں رہتا چراغ ایسی پون میں

آتش عشق نے راون کو جلا کر مارا — گرچہ لنکا سا تھا اس دیو کا گھر پانی میں

کل پائے ہم سے اس سے ملاقات ہوگئی۔ دو دو بچن کے ہونے میں اک بات ہوگئی

انشا

جوگی صاحب جی آپ کی بھی واہ — دھرم مورت عجیب کو دھنگی ہے
ہیں زور حسن سے وہ نہایت گھمنڈ پر — نام خدا انکا دبڑے کیوں نہ ڈنڈ پر
یا رب سدا سہاگ کی ہندی رچا کرے — چپے بکنیں پہیں رہے آفت انڈ پر

یہ جو مہنت بیٹھے ہیں راجہ کے کنڈ پر۔ اوتار بن کے گرتے ہیں پریوں کی جھنڈ پر
شیو کے گلے سے پاربتی جب لپٹ گئیں۔ کیا ہی بہار آج ہے برہما کے ڈنڈ پر

ان شعروں کی روشنی میں صاف نظر آتا ہے کہ اگلے زمانے کے ہندو مسلمان کتنے ملنسار تھے۔ اور ان کی زبان کتنی صاف تھی جو شبد سندر لگتا تھا اسے اختیار کر لیتے تھے اور جو لفظ پیارا معلوم ہوتا تھا اسے بے دریغ استعمال کرنے لگتے تھے۔ ہندستان میں رہتے تھے ہندستان کی زبان بولتے تھے۔ اور چین کی بنسری بجاتے تھے۔ اگر کوئی ہندی کہتا تو برا نہ مانتے تھے اگر کوئی آسے اردو کے نام سے پکارتا تو منھ نہ بناتے تھے۔ آج ہندو کہتے ہیں ہماری زبان ہندی ہے اور اسے سنسکرت کی طرف کھینچتے ہیں مسلمان کہتے ہیں ہماری زبان اردو ہے۔ اور نئے لفظوں کے لیے عرب، ایران اور مصر کے اخباروں کی ورق گردانی کرتے ہیں اور ہندستان کے میٹھے اور پیارے شبدوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی گناہ سمجھتے ہیں۔

ہندستانی اگر نیائے اور انصاف کا فیصلہ مانگو تو ہماری ملکی زبان نہ سنسکرت آمیز ہندی ہونی چاہیے نہ فارسی آمیز اردو۔ بلکہ ہندستانی ہونی چاہیے۔ جسے اردو سے نفرت نہ ہو۔ ہندی سے گھن نہ ہو۔ وہ ہندی کے سندر شبد دیکھے تو ان کو گلے سے لگا لے۔ اور اردو میں حسین لفظ پائے تو ان کے لیے اپنے شوق کے بازو پھیلائے۔ پیار دونوں سے کرے۔ رعایت کسی کی بھی نہ کرے۔ میں نے ہندی کی ایک سبھا میں کہا تھا کہ اگر آپ ہندی کو ہندستان کی لوک بھاشا بنانا چاہتے ہیں تو آپ کو چاہیے کہ ہندی کو سنسکرت کی بیٹی بنانے کی بجائے اسے اردو کی بہن بنائیں۔ لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ چند دن بعد اردو کانفرنس کا اجلاس تھا وہاں میں نے کہا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ اردو کو ہندستان کی قومی زبان تسلیم کر کے آنکھوں کی پتلیوں میں بٹھالیں تو آپ کو چاہیے کہ اردو کو فارسی اور عربی کی بیٹی بنانے کی بجائے اسے ہندی کی بہن بنائیں۔ سننے والوں نے واہ واہ کے نعرے لگائے۔ بات معمولی ہے۔ مگر بات معمولی نہیں ہے۔ اس سے ہندستان کی ملکی زبان کا سوال حل ہو جاتا ہے اور ہندو مسلم ایکتا کے راستے میں جو ہمالہ کھڑا ہے وہ پرے ہٹ جاتا ہے۔

جب ہم یہاں تک بڑھ آتے ہیں تو ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ہندستانی بھاشا کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے نزدیک کیونکر لایا جائے؟ جہاں تک میں نے اس سوال کو سوچا ہے اردو ان لوگوں کے لیے جن سنسکرت لفظوں کی ادائگی مشکل ہے۔ جیسے سپشٹ، بنشٹ، مداشٹر، سواستھ۔ ایسے شبدوں کو ایکدم ٹکسال باہر سمجھ لینا چاہیے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سنسکرت اکثر سارے کے سارے قابل ترک ہیں۔ آنند اور سندرتا میں سنگیت تو ہے۔ مگر اس میں سختی نہیں ہے۔ نرمی ہے پیار اور پریم میں جو مٹھاس ہے وہ محبت میں نہیں۔ پریتم میں جو سندرتا ہے وہ عاشق میں کہاں؟ میرا مطلب صرف اتنا ہی ہے کہ جن سنگیت موزوں والے شبدوں کو بول کر زبان کو کشش

(کفخت کو بول کر بھی کشٹ ہوتا ہے۔ اس کے بدلے تکلیف بولنا آسان ہے) انہیں متروک سمجھا جائے اور جن کو آسانی سے آسان بنایا جاسکے۔ انہیں آسان بنایا جائے جیسے پورن کو پورن اور چندر کو چندر کہا جائے۔ اسی طرح اردو کے خ۔ ظ عین۔ غین۔ قاف وغیرہ کا کم سے کم استعمال کیا جائے۔ اور اگر کیا جائے تو آسان بنا کر۔ جیسے قسمت کو قسمت نہ کہا جائے بلکہ کسمت کہا جائے۔ فریب کو گریب کہا جائے۔ خط کو کھت، صندوق کو سندوک، عرضی کو ارضی لکھا جائے اس سے زبان آسان ہو جائے گی اور ایسے لفظوں کو بولنا مشکل نہ رہے گا میں نے ہندو تو ایک طرف ایسے مسلمان بھی بہت کم دیکھے ہیں جو غین۔ قاف۔ ط۔ صاد کا تلفظ صحیح کرتے ہوں۔ یہ حروف سولہوں آنے باہر کے پودے ہیں۔ ہندستانی ہوا پانی میں ان کا پنپنا کٹھن ہے۔ آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں ان کا مرجھانا ضروری ہے۔ اور ہم ہندستانیوں میں یہ شکتی نہیں کہ انہیں زیادہ دنوں تک جیتا جاگتا رکھ سکیں۔

مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ ایک ڈاکٹر صاحب نے بھی ستمبر کے "نئی زندگی" میں اس قسم کی انقلابی تجویز پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔ خدا کرے ڈاکٹر صاحب کا یہ نسخہ مرتی ہوئی اردو کی مردہ رگوں میں زندگی کا انجکشن ثابت ہو۔ اور مریض کے تیماردار خواہ مخواہ اس کو سبوتاژ نہ کریں۔

دوسری بات جو زبان کو خوبصورت اور اس کے شبد ساگر کو بھرا پرا کر سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ہندی اردو شبدوں کے میل ملاپ کو رواج دیا جائے۔ آج تک ہم گلبدن کہتے آئے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا اگر کل سے چندن بدن اور چندر بدن کہنے لگیں تو زبان کو کون سا نقصان پہنچ جائے گا۔ ولی نے اپنے کلام میں شیریں بچن استعمال کیا تھا۔ آج یہ چیز متروک ہے۔ مگر اس کا استعمال کیا جائے تو بھاشا کی سندرتا پر بوجھ نہیں پڑتا۔ اردو میں نظر فریب (نظر کو موہ لینے والا) دل فریب عام طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ سو اس کے ایلا فریب آنکھیں (ایلا یعنی صورت کو موہ لینے والی آنکھیں) کی ترکیب باندھی ہے۔ ہمیں ماننا پڑے گا کہ اس لفظ میں موہنی ہے۔ سالانہ کے مانند ورشانہ کانوں کو برا معلوم ہوتا ہے مگر سہ ماہی کی جگہ اگر تماہی اور ششماہی کی جگہ اگر چھ ماہی کہہ دیا جائے تو کان خوشی سے قبول کر لیتے ہیں۔ محبت آشنا اردو میں ایک خوبصورت ترکیب ہے۔ اگر ہندستان کی نئی زبان ہندستانی میں "پریم آشنا دل" اور "پریم آشنا آنکھیں" کہا جائے تو اس پر مذاق سلیم کیوں ناک سکوڑے۔ (نئی زندگی)

سدرشن

نظارہ سحر

جلوہ یار آشکار ہوا
گلشن دہر لالہ زار ہوا

کھل گئے پھول صحن گلشن میں
دل بلبل کو اب قرار ہوا

کالے بھونرے بھی گنگنانے لگے
تتلیوں سے چمن دوچار ہوا

گل و بلبل ملے ہیں یوں گویا
حسن اور عشق ہمکنار ہوا

عکس رنگ شفق سے ہر ذرہ
صبح کے وقت گل عذار ہوا

ہاٹ بازار کھل گئے سارے
گرم بازار کاروبار ہوا

دی موذن نے مسجدوں میں اذاں
کوئی مندر کا راز دار ہوا

بجتے ناقوس ہیں کلیسا میں
باغ دنیا کا پر بہار ہوا

کتنا دلکش ہے ساز الفت کا
جس کا ہر نغمہ دل کے پار ہوا

تو بھی خالق کا اپنے سجدہ کر
جو ترا اے پریم یار ہوا

چندرکا پرشاد پریم (لکھنوی)

غزل

یہ مآل کارِ وفا ہوا کہ بساطِ روح الٹ گئی
وہ نہ آسکے مگر زیست یاس انتظار میں کٹ گئی

کوئی راز راز دروں نہیں، وہ جنوں نہیں وہ سکوں نہیں
ترے حسن سے یہ نقاب اٹھی کہ مری نگاہ سے ہٹ گئی

یہ ترا کرشمۂ حسن تھا کہ فضا جو منزل ہوش تھی
وہ تحیرات میں چھپ گئی وہ تصورات سے پٹ گئی

تری التفات نگاہ نے مجھے دی حیات خود آشنا
نہ وہ میں رہا وہ زندگی جو تری نگاہ پلٹ گئی

جو تلاش رازِ حیات کی تو مآل کار نہ کچھ ملا
یہ خیال اور الجھ گیا یہ بساط اور سمٹ گئی

مری مست ساغر نے ابھی سر بزم یار بڑھا نہ تھا
جو ہوا چلی تو وہ تھم گئی جو گھٹا اٹھی تو وہ چھٹ گئی

مرا حرف حرف ہے دل نشیں تجھے کیا خبر مرے نکتہ چیں
ترے اہتمام سے سطح میں تری قدر اور بھی گھٹ گئی

علی اختر

(پیکو سلو اکیہ کا ادب حب وطن، رومان اور حسن و عشق کے لطیف جذبات سے بھرا ہوا ہے اس میں حسن کاری ہے جو ادب کی جان ہے۔ وہاں کے ادیب اور شاعروں کے ادیبوں کو "زندگی کے رپلیز" سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ ان کے ان تشریحات بہت زیادہ ہے اور تنقیحات کم ہے۔

زیر نظر ادبی افسانہ "جارسلا اور خیلشک" کے قلم کا نتیجہ ہے۔ اس کا اصلی مفہوم یہ ہے کہ کسی مصور کی عالی تصویر دیکھنے سے انسان میں یادہائی کی لطافتیں پیدا ہوتی ہیں۔ مشہور مصور گیوتو نے دانتے اور بیاترس کی ملاقات کا جو مرقع تیار کیا ہے وہ دنیا میں مشہور ہے۔ اسی تصویر کے پس منظر میں یہ افسانہ نظر آتا ہے۔)

گلاب

یہ سنہ ۱۳۰۳ء ماہ مئی کا واقعہ ہے۔

شہر فلورنس کے وسطی حصے میں فالکو پورٹی نری نابائی کے مکان کے سامنے ایک چھریرے بدن کا نوجوان کھڑا تھا جو سیاہ چست لباس میں ملبوس تھا۔ وہ وہاں بہت دیر سے کھڑا تھا۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی کا منتظر ہے۔

موسم بہار کا سنہری سورج گلی کو اپنی سنہری شعاعوں سے غسل دے رہا تھا۔ فضا میں غیر معمولی تازگی تھی۔ ہوا کی نازک موجوں میں ایک خواب کی سی کیفیت نمایاں تھی۔ یہ لطیف موجیں اس سحر آفریں شہر کے شاندار محلوں، عظیم الشان برجوں، اور حسین عمارتوں سے بار بار ٹکرا رہی تھیں۔ چڑیوں کے دلکش نغمے فضا میں گونج رہے تھے۔ درختوں کے ہلنے سے وقتاً فوقتاً ایک ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دیتی اور پھر وہی خواب آور سکوت، وہی موسم گل کے جادو اثر حسن سے مخمور خاموشی طاری ہو جاتی۔ البتہ کبھی کبھار گلی سے کوئی پادری اپنے بازو سینے پر صلیب کی شکل میں لپیٹے، کمر میں تسبیح لٹکائے آہستہ آہستہ جاتا نظر آتا اور پھر وہی خاموشی!

نوجوان اپنے سیاہ لبادے میں ملبوس ایک مجسمہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کی نگاہیں مکان کے مقابل ایک گلاب کے خوبصورت پودے پر جمی ہوئی تھیں، جس پر کئی بڑے بڑے ہلکے رنگ کے خوبصورت گلاب کھلے ہوئے تھے جن کی خوشبو سے آس پاس کی فضا مہک رہی تھی۔

اس موقع پر ایک اور شخص، ویسا ہی سیاہ لباس پہنے جس پر کارچوبی اور زری کا کام نہایت عمدگی سے کیا ہوا تھا، آیا اور نوجوان سے کچھ پیچھے رک گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لپٹا ہوا کاغذ تھا جسے وہ بار بار کھول کر دیکھتا، کچھ پڑھتا اور مسکراتا۔ وہ اسی طرح کچھ دیر تک کھڑا رہا۔ آخر کار نوجوان اپنے خیالات سے چونکا اور پلٹا۔

"اوہ گائیڈو" اس کی زبان سے نکلا اور اس نے بے اختیار گائیڈو کے ہاتھ سے لپٹے ہوئے کاغذ کو لینے کی کوشش کی۔

"نا، نا، اتنی جلدی نہ کرو" گائیڈو نے منع کرتے ہوئے کہا "ذرا ٹھہرو ڈیورنٹ" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ اونچا اٹھا لیا۔

"تم جانتے ہو کہ میں اس کی خواہش میں جل رہا ہوں۔ پھر مجھے روکتے کیوں ہو؟"

"یقیناً تم جل رہے ہوگے۔ مشتاق ہمیشہ حسرتوں، آرزوؤں اور خواہشوں کی آگ میں جلتے رہتے ہیں" گائیڈو نے اس انداز میں جواب دیا گویا کسی کا مقولہ دہرا رہا ہو۔

"تم مذاق کرنے لگے۔ ارے بندۂ خدا دے بھی دو"

"نہیں تو میں مذاق کب کر رہا ہوں۔ کیا یہ درست نہیں" گائیڈو نے سنجیدہ بن کر کہا۔ "ہاں البتہ میں یہ نہیں جانتا کہ میرے جواب سے جو میں نے تمہارے سانیٹ میں اٹھائے ہوئے سوالات کے سلسلے میں لکھے ہیں تمہاری تشفی ہوگی بھی کہ نہیں۔ محبت کے بارے میں میرے خیالات تمہارے یا کوئی کے خیالات سے ——"

"ہاں اور ڈاسیانو کے خیالات سے بھی مختلف ہیں۔ ہوں نا!" ڈیورنٹ قطع کلام کر کے کہنے لگا۔ "یہ تو مجھے معلوم ہی ہے۔ لیکن خدا کے لیے مجھے اپنا جواب دکھا تو سہی۔ میں تمہارے جواب کو زیادہ

وقیع سمجھتا ہوں۔ یہ دیکھو" اس نے جیب سے ایک کاغذ نکالا یہ ہے بُٹرامیاتو کا جواب۔ لیکن یہ مجھے پسند نہیں۔ مجھے تمہارا جواب چاہیے۔ لاؤ ادھر دو۔"

یہ کہہ کر اس نے پھر کاغذ چھیننے کی کوشش کی۔ لیکن گائیڈو نے پھر ہات اونچا اٹھا لیا اور ناراضگی کے لہجہ میں بولا۔

"ٹھہرو ڈیورنٹ ٹھہرو" میرے جواب سے تمہاری تشفی نہیں ہوگی۔ اچھا بتاؤ تو سہی ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو محبت میں ثابت قدم اور پاس وفا کرنے والے ہیں۔ اور ہر شخص محبت کو کیا سمجھتا ہے، کس طرح سمجھتا ہے۔ سینو اپنے تخیل کی جولانی کی روشنی میں، ڈا امیانو بے حسی و بے خودی کی روشنی میں، تم اشتیاق و بے صبری سے، اور میں عقل کی روشنی میں محبت پر غور کرتا ہوں۔ محبت کا سب سے اعلا مقصد میرے نزدیک ہے فلسفہ، یہی مجھ پر حکمرانی کرتا ہے۔ اچھا اب بتاؤ کہ کون سچا ہے؟"

"میں یہ سب سننا نہیں چاہتا۔ مجھے اپنا جواب دو، لاؤ اپنی نظم دکھاؤ" اس نے بے صبری ظاہر کرتے ہوئے ہات بڑھایا۔ جب گائیڈو اپنے دوست کو اس کے سانیٹ کا جواب دے رہا تھا تو فالکو پورٹی ناری[1] کے باغ کا دروازہ کھلا اور دو عورتیں باہر آئیں، جنکے بال بھورے اور چہروں پر سنجیدگی تھی۔ اور ان کے پیچھے ایک نازک سی چھریرے بدن کی دوشیزا، سپید رنگ کے کپڑے پہنے، سر کو خفیف سا نیچے جھکائے نہایت وقار اور متانت سے چلتی ہوئی نمودار ہوئی۔ اس کے سپیدی مائل گورے گورے چہرے پر ہلکی سی گلابی رنگ کی ایک جھلک تھی۔ وہ دونوں عورتوں کے درمیان آکر انکے ساتھ ساتھ راستہ طے کرنے لگی۔

اس حسین جوسٹ کے قریب آنے پر دونوں دوستوں نے ادب اور احترام سے جھک کر سلام کیا۔ دونوں عورتوں نے سلام کا جواب کسی قدر غرور اور سرد مہری سے گردن کی ایک خفیف سی جنبش کے ساتھ دیا۔ لیکن اس دوشیزا نے اپنا سر اسی طرح جھکایا گویا وہ بار حسن سے جھکا جا رہا ہے۔ اور اس کے رخساروں پر سرخی کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ صرف ایک لمحہ کے لیے کسی بھڑکی ہوئی ہرنی کے انداز میں؛ اس نے اپنی سیاہ لمبی لمبی پلکوں سے ڈھکی ہوئی آنکھیں اٹھائیں اور پھر دونوں عورتوں کے ساتھ چلنے لگی۔

"تم نے دیکھا میری محبوبہ کتنی شرمیلی، کتنی حجاب والی اور کتنی پیاری ہے" ڈیورنٹ نے اپنے دوست سے نہایت ہی جذباتی لہجے میں کہا۔ وہ اس وقت رعب حسن سے کسی قدر کانپ رہا تھا گائیڈو بھی اسے دیکھکر کافی متاثر ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا پھر پلٹ کر بازو کی ایک گلی میں چلا گیا۔

دانتے وہیں خاموش کھڑا رہا۔ وہ کسی پیکر خیال پر نگاہ جمائے کھڑا تھا۔ گلی کی موڑ پر اسے اپنی محبوبہ خراماں نظر آ رہی تھی، وہ ایک شعلہ جوالہ بنی ہوئی تھی اور اسے دیکھکر دانتے محسوس کر رہا تھا کہ موسم بہار کا تمام حسن، اسکی تمام رنگینی و لطافت، تمام درخشانی و تابانی، تمام خوشبو اور مہک ایک جھونکے کی مانند تھے جنمیں اسکی محبوبہ مسکراتی ہوئی آ رہی تھی۔

اس وقت سامنے کے گرجا کی ساری گھنٹیاں بجنے لگیں اور ساتھ ہی کبوتروں کی ایک قطار ادھر سے اڑتی نظر آئی اور دانتے نے سمجھا کہ بطرس کے سر پر سے سفید پھولوں کا ایک بادل گذر گیا۔ اور جب اس نے گرجا کی دہلیز پر اپنا نرم و نازک قدم رکھا تو دانتے نے دور سے دیکھا کہ تمام عمارت ایک لمحے کے لیے لرز گئی۔

"کیا سوچ رہے ہو ڈیورنٹ؟" پیچھے سے ایک آواز آئی۔ "کیا نظم کے لیے قافیے سوچ رہے ہو؟"

اس آواز کو سنکر وہ اس طرح چونک پڑا جیسے کسی خواب سے اچانک بیدار ہوا ہو، اس کے سامنے ایک خوش پوش نوجوان اپنے ہات میں کچھ پھول لیے بھڑکیلے کپڑے پہنے کھڑا تھا۔

"نہیں تو میں قافیے سوچتا ہی کب ہوں۔ وہ تو میرے [illegible]

---

[1] یہ بطرس تھی جو بعد میں [illegible] سے بیاہی گئی۔ دانتے نے اس سے اپنی محبت کا ذکر [illegible] [illegible]

سے پیشتر ہی نوکِ قلم سے خود بخود ٹپک پڑتے ہیں۔"
خیر تمہارا ایفرو دکر تو سب پر روشن ہے۔ لیکن مجھے اچھی طرح
معلوم ہے کہ تم ایک نظم کے لیے رات رات بھر فکر کرنے سے
بھی گریز نہیں کرتے۔"
"ہاں یہ تو ٹھیک ہے سمون۔ لیکن میں نظم لکھنے کی خاطر
غور و فکر نہیں کرتا بلکہ لکھی ہوئی نظم پر" دانتے نے جواب دیا
"واہ یہ تو عجیب بات ہے" سمون نے کہا"
"ہاں تمہیں تو عجیب ہی معلوم ہوگی، تمہارے میرے راستے
مختلف ہیں۔"
"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ لیکن مجھے دیر ہو رہی ہے
معاف کرنا۔ مجھے بطرس کو گرجا سے واپس لانا ہے۔ خود اسی نے
مجھ سے کہا تھا کہ واپسی میں اس کے ساتھ رہوں" سمون نے پر اتفاق
لہجے میں کہا۔
"تم بطرس کو گرجا سے واپس لانے جا رہے ہو؟" دانتے
نے حیرت سے پوچھا۔
"ہاں۔ میری شادی اس سے جلد ہی ہونے والی ہے۔ اچھا
اب خدا حافظ" سمون یہ کہہ کر چلا گیا۔
دانتے پر افسردگی طاری ہو گئی، اس کے اطراف ہوا اسی
طرح سرسرا رہی تھی، پھول اسی طرح مسکرا رہے تھے، پرند اسی
طرح چہچہا رہے تھے، فضا اسی طرح مہک رہی تھی۔ البتہ خود اپنے
آپ میں، اپنے باطن میں اس نے ایک خلا سا محسوس کیا، ایک
تاریکی، ایک سیاہی! وہ بھول گیا کہ وہاں کب سے کھڑا تھا۔
وہ بھول گیا کہ اس کے ہاتھ میں گائیڈو کا دیا ہوا جواب تھا جسے
اس نے ابھی نہیں پڑھا تھا۔ وہ بھول گیا کہ گائیڈو کے جواب کا
اسے کس قدر اشتیاق تھا۔ لیکن وہ اب اسے نہیں پڑھے گا
— اسے جواب مل چکا تھا۔
قدموں کی چاپ، ہنسنے اور باتیں کرنے کی آواز سنکر
اس نے نگاہ اٹھائی۔ اس کی محبوبہ ملنسنے فارغ ہو کر گرجا سے
لوٹ رہی تھی، سمون اس کے ساتھ ساتھ تھا اور دو عورتیں

اس کے پیچھے تھیں۔ وہی پھول جو کچھ دیر پہلے سمون کے ہاتھ
میں تھے اب بطرس انہیں سونگھ رہی تھی۔ وہ قریب آگئے تھے
اور دانتے ان کی گفتگو بآسانی سن سکتا تھا۔
"تمہارے ساتھ چلنا کتنی بڑی خوش قسمتی ہے۔ بطرس!"
سمون بطرس سے کہہ رہا تھا۔
"کیا واقعی؟" بطرس نے بھولے پن سے پوچھا۔
"ہاں۔ کیا تمہیں اس کا کچھ ثبوت چاہیے؟"
"جس وقت مسرت کی گھڑیاں آئیں اس وقت خوش ہونا
یہ تو ہر شخص کر سکتا ہے" وہ اپنی شیریں اور سہلی آواز میں کہہ رہی
تھی اور دانتے نے محسوس کیا کہ اسکی آواز میں رنج اور افسردگی
کی ایک جھلک تھی۔ "لیکن خوشی کے موقع پر ناشادوں کو یاد
رکھنا، یہ اس سے کہیں اعلا حسن کاری ہے" اس نے اپنا جملا
ختم کیا۔
"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ کسکو یاد رکھنا چاہیے؟"
سمون نے کسی قدر حیرت سے پوچھا۔
اس وقت وہ گلاب کے درخت کے پاس تھے، بطرس
دانتے سے بلکل قریب تھی۔
"ان کو جو رنجیدہ ہیں، غمگین ہیں، دل شکستہ ہیں" یہ کہتے
ہوے اس نے درخت کا سب سے زیادہ حسین اور دلکش پھول
توڑا اور قبل اس کے کہ سمون دیکھتا شاعر کے ہاتھ میں دیدیا۔ اسکی
نگاہیں نیچی تھیں۔ اور ان سے محبت اور ہمدردی کا طوفان ٹپکا
پڑتا تھا۔ دانتے نے اسکی پلکیں آنکھوں میں آنسوؤں کے دو قطرے
بھی ستاروں کی مانند چمکتے دیکھے۔
دانتے نے کچھ نہیں کہا، وہ کہہ ہی کیا سکتا تھا۔ اس پر
ایک مسحوریت طاری تھی وہ اپنے آپ ہی میں نہیں تھا۔
وہ باغ کے دروازے میں داخل ہو گئی۔ سمون اور دونوں
عورتیں بھی اس کے پیچھے چلی گئیں۔
لیکن دانتے وہیں کھڑا رہا۔ وہ پھول کو بڑے غور سے
دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک کر گرم گرم آنسو

اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ سرخ گلاب اس کے ہاتھ میں زندہ ہوگیا اسکی ساری رونق و دلکشی جاتی رہی۔ یکایک اس کا تصور ہی منظر بدل گیا، اس نے دیکھا کہ پھول بڑھنا شروع ہوا اور اتنا بڑا ہوا کہ ساری کائنات پر محیط ہوگیا۔ اسکی پتیاں عرش کے پھیل کی طرح ہوگئیں جس پر بڑے مشہور زاہد بیٹھے ہوئے تھے اور جس کے بیچ میں ایک مجنون پیدا ہوگیا تھا، یہ محبت کا مجنوں تھا۔ ایک پنکھڑی پر بلارس کھڑی تھی اس کے ہاتھ میں پھولوں کا ایک ہار تھا جسے شاعر کے گلے میں ڈالنے کے لیے وہ اسکی طرف آرہی تھی اور ایک سریلا نغمہ فضا میں گونج رہا تھا۔

دانتے نے یہ سب کچھ تصویر میں دیکھا اور بے اختیار ہوکر پھول کو لبوں سے لگالیا۔

اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس سے کچھ فاصلے پر ایک نوجوان شخص ایک شہرہ آفاق مصور گذر رہا تھا جس نے اسکو اس حالت میں دیکھکر قدم روک لے تاکہ اسکی اس کیفیت، اس جذباتی حالت کو اپنی روح پر منقوش کرلے اور آنے والی نسلوں کے لیے اس نقش کو چھوڑ جائے۔

اور یہ مصور گیوٹو تھا۔

شمس الدین صدیقی اصغر (عفی عنہ)

ہندستانی ادب اور جنسی عریانی

ترقی پسند نظریہ ادب کی روشنی میں

پچھلے چند دنوں سے ہمارے ادب میں ایک خطرناک میلان پیدا ہو گیا ہے جس نے بڑھتے بڑھتے ایک ادبی مرض کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یہ "عریاں نگاری" کا میلان ہے جسے بعض نقاد غلط فہمی سے "ترقی پسند ادب" کا مرادف قرار دے کر "ترقی پسند ادب" کو مطعون قرار دینے لگے ہیں۔ یہ نقاد نہ تو ترقی پسند ادب کے مفہوم و معنی سے واقف ہیں اور نہ صحیح ترقی پسند ادب کے حدود کو جانتے ہیں۔ اختر حسین رائے [illegible] پوری کے الفاظ [illegible] ترقی پسند [illegible] ہیں اور ہر قسم کی جدت پسندی [illegible] نہیں کہلائی جا سکتی ہے لیکن ہمارے نقاد ان دونوں کو ہمیشہ ایک ہی تصور کرتے ہیں۔

اس مختصر مضمون میں ہمیں ایک تو اس الزام کی واقعیت کا امتحان کرنا ہے اور دوسرے اس نئے میلان کے حقیقی اسباب و علل کا پتا چلانا اور یہ بتانا ہے کہ اس میلان کو ترقی پسند نظریہ ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں ۔۔۔ اس غرض سے ہمیں پہلے ترقی پسند نظریہ ادب کی تعریف کرنی ہوگی۔ اور اس کے حدود معین کرنے پڑیں گے۔

ترقی پسند ادب سے مراد وہ ادب ہے جو زندگی کی ارتقائی قوتوں کا ساتھ دے۔ نہ صرف یہ کہ ان قوتوں کی ترجمانی کرے۔ بلکہ زندگی کی رہنمائی بھی کرے۔ ادب صرف زندگی کا ترجمان نہیں بلکہ اس کا رہنما بھی ہے۔ وہ زندگی کی نقاشی ہی نہیں کرتا بلکہ وہ زندگی پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ وہ زندگی پر تنقید بھی کرتا ہے۔ اور زندگی کو بدلنے میں راستہ بھی دکھاتا ہے ادیب صرف مشاع نہیں بلکہ مصور بھی ہے۔

ادب ایک سماجی فرض ہے وہ زندگی کا ایک شعبہ ہے سماج اور سماجی قوتوں سے ہٹ کر اس کا کوئی مقام نہیں۔ ہر دور اور ہر زمانے کا ادب سماج اور سماجی قوتوں کا پیدا کیا ہوا

رہا ہے لیکن ادیب محض مجہول تماشائی نہیں اور نہ وہ فوٹوگرافر ہے بلکہ وہ حقیقت اور حقیقی زندگی میں تاثر کے عنصر کو سمو کر ایک نئی چیز پیش کرتا ہے جو حقیقت سے قریب تو ہوتی ہے لیکن معنوی حقیقت نہیں رہتی۔ یہیں سے ادیب اور سائنٹسٹ کا فرق شروع ہوتا ہے۔ سائنٹسٹ حقیقت کی عقلی معقولات میں تحلیل کرتا اور انہیں عقل اور تجربہ کی کسوٹی پر پرکھتا ہے سائنٹسٹ کو تاثر اور حسیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ادیب تاثر اور حسیت کی راہ اختیار کرتا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی تجربات کو تاثر کا رنگ دیتا، انہیں باہم سموتا اور حقیقت کی ایک نئی تصویر پیش کرتا ہے۔ حقیقت جتنی بوقلموں ہے صحیح ادب بھی اتنا ہی رنگا رنگ ہوگا۔ میری رائے میں ترقی پسند ادب کا یہی فریضہ ہے کہ وہ حقیقی مسلسل اور متحرک زندگی کو اپنے انفرادی تجربے، جذبات اور تاثر سے ترکیب دے کر حقیقت کی ایک نئی تصویر پیش کرے۔ زندگی مسلسل اور متحرک ہے۔ زندگی کا کارواں کسی منزل پر نہیں ٹھہرتا۔ اس میں کہیں جمود نہیں۔ تغیر ہی حقیقت ہے ہم اپنے ماحول کی ہر ایک تبدیلی میں حقیقت کے اس تغیر کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں مثلاً اس زمانے میں ہمارے اخلاقی، تعلیمی اور تمدنی اقدار بدل رہے ہیں۔ اس ہمہ گیر تبدیلی سے ہمارا ادب بھی بچ نہ سکا۔ اور بچتا کیسے جبکہ ادب بھی ایک سماجی پیداوار ہے۔ ادیب زندگی سے الگ تھلگ ایک گوشہ عافیت میں آرام نہیں کر سکتا وہ زندگی ہی سے اپنی ادبی تصویروں کے لیے سامان فراہم کرتا ہے۔ جب زندگی ہی متغیر ٹھہری تو ادب کیسے ایک ہی حال میں رہتا۔ جب "گردش ایام" کو پلٹایا نہیں جا سکتا اور جب زندگی کے کارواں کو کسی ایک منزل پر ٹھہرایا نہیں جا سکتا

تو یہ کیسے ممکن تھا کہ ہمارا ادیب اس تغیر پذیر دنیا میں ہمیشہ وہی راگ الاپتا رہتا۔ اگر کوئی بدنصیب نہ بدلنے ہی پر مصر ہو تو زندگی کی بدلتی ہوئی قوتیں اسے یا تو بدلنے پر مجبور کر دینگی یا اس کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دینگی۔ اس کے لیے کوئی راہ فرار نہیں۔ یا تو زندگی کی نئی اور ترقی پذیر قوتوں کا ساتھ دے یا قدیم سے چمٹ کر خود بھی نذر قدامت ہو جائے۔ وہی ادیب ترقی پسند ادیب کہلایا جا سکتا ہے جو سماج کی ترقی پذیر قوتوں سے اور سماجی ارتقا کے راستے سے باشعور طریقہ پر واقف ہو جو سماجی ترقی کی آیندہ منزل کو جانتا ہو جو راستہ کی رکاوٹوں، رجعت پسند قوتوں کی مزاحمتوں کا پورا پورا علم رکھتا ہو اور جس میں یہ قوت اور جرات ہو کہ وہ ان قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہو سکے جو تحریک کے راستے میں بیٹھ نہ جائے اور نہ گرد و پیش سے بے خبر ہو کر کسی تخیلی دنیا کی تعمیر میں مصروف ہو جائے اور نتیجے کے طور پر خطرناک داخلیت کا جان بوجھ کر بھی شکار نہ ہو جائے۔ ایسا ادیب جو ان خصوصیات سے معرا ہو ادیب ہی نہیں، اس کا ادب ادب نہیں داخلیت کا فریب ہے۔ اس کی تصویریں بے جان ہیں۔ اس کے کردار بے روح ہیں۔

ہندوستانی ادب میں ترقی پسند ادبی تحریک کی ابتدا ایک ایسے زمانے میں ہوئی جب فاشزم کا دیوتا تمام ترقی پذیر قوتوں، بلکہ بنی نوع انسان کے سامنے تمدن و مدنیت کو تباہ کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ گورکی اور رولاں نے ادیبوں کو اس خطرے سے آگاہ کیا۔ دنیا کے تمام ایماندار ادیبوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا۔ ٹیگور نے بھی جاپانی سامراج کے خلاف احتجاج کیا، چین پر جاپانی سامراج کے مظالم کے خلاف آواز بلند کی۔ اس کی فاشسٹ دشمن للکار سے ہند کی فضا معمور ہونے لگی۔ ہندستانی ادیبوں میں ٹیگور ہی سب سے پہلا ادیب تھا جس نے فاشزم کے خطرے سے ہندستان کے ادیبوں کو آگاہ کیا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب ہندستان کی قومی تحریک بڑی حد تک ناکام ہو چکی تھی۔ گاندھی جی کے عدم تشدد کا طلسم ٹوٹنے لگا تھا اور پڑھے لکھوں کی ایک کثیر تعداد یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ سیاسی اور سماجی مظالم کا ازالہ اس مجہول حربے سے نہیں کیا جا سکتا۔ عوام میں آزادی کے مفہوم اور معنی سے واقف ہونے کی خواہش پیدا ہونے لگی تھی، سوراج اور آزادی کے مبہم الفاظ اب انھیں تسلی نہیں دے سکتے تھے۔ معاشی کساد بازاری نے عوام کی حالت ابتر کر دی تھی۔ ان کی بے چینی میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ سرمایہ داری عالمی حیثیت سے اس کساد بازاری اور پیدا شدہ بے روزگاری کو حل کرنے سے قاصر تھی۔ اب اس کا طلسم ٹوٹنے لگا تھا نتیجے کے طور پر سرمایہ دارانہ جمہوریت کے پردے چاک ہونے لگے خود برطانیہ اور فرانس میں عوام کی آزادی تقریر و تحریر و اجتماع پر پابندیاں عاید کی جانے لگیں۔ اطالیہ، جرمنی اور جاپان کے فاشسٹ حکمرانوں نے جنگ کا نقارا بجانا شروع کیا۔ اسپین میں جمہوریت کو تباہ کرنے کے لیے وہاں کے سرمایہ داروں نے بیرونی سامراجیوں کی مدد سے خانہ جنگی شروع کر دی۔ ہندوستان کے پڑھے لکھے طبقے نے اپنے ملک کی قومی تحریک کو اس بین قومی پس منظر میں دیکھنا شروع کر دیا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ سامراجیوں سے رحم و کرم کی امید فضول ہے۔ قدیم سیاسی طرز کار اب کام نہیں دے سکتا۔ نئے حالات کا تقاضا تھا کہ نئے ذریعے اختیار کیے جائیں۔ ان حالات میں یہاں بھی اشتراکی نظریات فروغ پانے لگے اور کل تک اشتراکیت جسے محض ایک خیالی منظر یا تصور کیا جاتا تھا آج وہ اپنے مسائل کا ایک سیدھا حل معلوم ہونے لگی۔ ملک کے ایک بڑے طبقے نے یہ محسوس کیا کہ اسی طریقے سے ہمارے تمام سیاسی اور سماجی امراض کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ ہندستان میں اشتراکیت کی اس بڑھتی ہوئی تحریک کو سوویت روس میں اشتراکی نظام کی کامیابی نے اور تقویت پہنچائی۔ کسانوں اور مزدوروں کی سبھائیں بننے لگیں اور سارے ملک میں ان کا جال پھیل گیا

ان حالات میں ہمارے ادیب خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ ان تبدیلیوں سے ادب بھی براہ راست متاثر ہوا۔ نوجوان ادیبوں کی ایک جماعت نے اس بین قومی تحریک پر لبیک کہا۔ انہیں ٹیگور۔ پریم چند۔ اقبال اور جوش جیسے ادیبوں کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ ان ادیبوں نے سیاسی و سماجی مسایل کو اپنے دایرہ فکر و ادب میں شامل کیا اور جدید ترقی پسند ادب کا آغاز ہوا۔ اس ادب کے ذریعے سماجی مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی اور ان ذرایع کی بھی نشاندہی کی جانے لگی جن کے استعمال سے ان مظالم اور بے انصافیوں کا انسداد کیا جا سکتا ہے۔ ادیبوں کے لیے یہ ایک کٹھن منزل تھی۔ انہیں ادب کو پروپگنڈا بننے سے بچانا تھا۔ اچھے ادیب کی پہچان یہی ہے کہ وہ ایک طرف تو حقیقت کی پوری طرح ترجمانی کرے، زندگی کی رہبری کرے اور دوسری طرف اس میں ادبی شان اور اپیج بھی باقی رکھے۔ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے ادیبوں نے بڑی حد تک اس میں کامیابی حاصل کی گو کہ بعض ادیب اس رستے میں لڑکھڑا گئے لیکن دھیرے دھیرے یہ نقص دور ہونے لگا۔ اور ترقی پسند ادیبوں میں اختر رائے پوری۔ کرشن چندر۔ حیات اللہ اختر انصاری۔ بیدی۔ علی احمد۔ سجاد ظہیر جیسے اچھے ادیب پیدا ہو سکے۔ اس دور نے بعض اچھے نوجوان شاعر بھی پیدا کیے۔ جیسے فیض۔ مجاز۔ مخدوم وغیرہ۔

اس تحریک کے چلانے والوں میں ایک بنیادی نقص یہ بھی تھا کہ اکثر ادیب عوام کی حقیقی زندگی، ان کی مشکلات اور ان کے مسایل سے براہ راست واقف نہ تھے۔ ان کا علم محض کتابی تھا۔ انہوں نے عوام سے کوئی راست ربط قایم نہ رکھا اور ان کی مرکزی انجمن نے بھی اس کام میں ان کی زیادہ مدد نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے عوام کی جو تصویر پیش کی وہ ایک حد تک غیر حقیقی تھی۔ اس کے علاوہ یہ لوگ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے پورے رشتے ناتے اسی طبقے سے وابستہ تھے۔ اس لیے ان میں وہ حقیقی تڑپ پیدا نہ ہو سکی جو ایک اچھے ادب کی تخلیق کے لیے ضروری تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے نظام میں اوسط طبقہ بھی سماجی بے انصافیوں کا بری طرح شکار ہے لیکن جب تک اس طبقے میں یہ شعور نہ ہو کہ وہ ان بے انصافیوں کے خلاف اسی وقت جنگ کر سکتا ہے جب وہ اپنا ناتا رشتہ ان طبقوں سے جوڑ لے جن میں لڑنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ یہ طبقہ مزدوروں اور کسانوں ہی کا ہو سکتا تھا جس سے انہوں نے ابھی پوری طرح ناتا نہ جوڑا۔ اسی بنیادی کمزوری کی وجہ سے ان میں ادبی انحرافات پیدا ہونے لگے۔ میرا خیال ہے کہ ادب میں جنسی کجروی کا سبب بھی یہی کمزوری ہے۔ اوسط طبقے کے لیے جنسی تشفی کا سوال بہت زیادہ اہم ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں "جنس، محبت، اور شادی" کے مسایل بھی نزدیکی رشتے میں منسلک ہیں۔ مہاجنی تمدن میں کوئی ایسا شعبہ نہیں جو زر کے پیمانے پر ناپا یا تولا نہ جاتا ہو۔ "جنس اور محبت" کے مسایل بھی چونکہ سماجی مسایل ہیں۔ اس لیے ہمارے مہاجنی تمدن میں یہ بھی اسی پیمانے سے تولے جاتے ہیں۔ عورت کی محکومیت اس پر اضافہ ہے جس سماج میں عورت محکوم ہو، پردوں میں محبوس ہو اور جہاں جنسی مسایل کو انتہائی شرمناک تصور کیا جاتا ہو، جس سماج کے ارکان کو جنسی مسایل سے ایک اچھی خاصی عمر تک مطلق واقفیت نہ ہوتی ہو۔ اس سماج میں جنسی بھوک اور نتیجہ کے طور پر جنسی بے راہ روی کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے جنسی کجروی کی بنیاد یہی وہ رکاوٹیں ہوتی ہیں جو صحتمند جنسی تشفی میں پیش آتی ہیں۔ جنسی جبلت ــــ بلکہ ہر جبلت ــــ تکمیل چاہتی ہے اور جب کسی جبلت کی تکمیل کے تمام ذریعے مسدود کر دیے گئے ہوں تو ایسی صورت میں یہ تو ہو نہیں سکتا کہ یہ جبلت صبر و قناعت کے ساتھ خاموش رہے۔ دوسرے مختلف ذریعے سے یہ اپنی تکمیل کرنی چاہتی ہے اور یہیں سے "ذہنی امراض" کا آغاز ہوتا ہے اس پس منظر میں

مضمون [illegible]

ادب کی جنسی کجروی کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کجروی کے ذمہ دار بھی ہمارے غلط سماجی رشتے ہیں لیکن محض اس عذر پر ہم ان نام نہاد ادیبوں کو معاف نہیں کر سکتے جنہوں نے جنسی کجروی کو ہی اپنے ادبی مضامین کا مرکز بنا دیا ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے حقیقی معنی میں ادیب وہی ہے جس میں اجتماعی شعور سب سے زیادہ ہے اور جو موجودہ اجتماعی رشتوں سے گذر کر مستقبل کی نشاندہی کرے جو زندگی کے مختلف شعبوں میں ہم آہنگی پیدا کر سکے اور جو نہ صرف حقیقت کی کامیاب عکاسی کرے بلکہ رہنمائی بھی کر سکے۔ ایک ادیب اور معمولی آدمی میں یہی فرق ہوتا ہے۔ عام شہری ان تبدیلیوں کو محسوس نہیں کرتا جو عالم فطرت اور سماج میں پیدا ہوتی رہتی ہیں لیکن ادیب ان کی تہ تک پہنچ جاتا اور نوع انسان کو ان سے واقف کراتا ہے۔ ادب میں انتہائی داخلیت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب ادیب سماجی مسائل کو پوری طرح سمجھ نہیں پاتا اور وہ ان رکاوٹوں اور دشواریوں پر غالب کرنے کی ہمت نہیں رکھتا جو ارتقا کے راستے میں پیش آتی ہیں۔ ہندستانی نوجوان ادیبوں کی حد سے زیادہ داخلیت کا سبب میرے خیال میں ان کے اجتماعی شعور کی کمی ہے۔ جب ادیب خارجی حالات سے مایوس ہو جاتا ہے اور وہ اس دنیا میں ایک شاندار مستقبل کی تعمیر کرنے کی کوششوں میں شکست خوردگی محسوس کرنے لگتا ہے تو وہ اپنی ذہنی تخیلی دنیا میں بسیرا کرنے لگتا ہے اور سارا حسن اسی دنیا کی تعمیر میں صرف کر دیتا ہے یہیں ادب میں "رومانیت" پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے فیض نے اپنی ایک نظم "موضوع سخن" میں سماج کی تمام بے انصافیوں کا ذکر کرنے کے بعد ایک حسینہ کے نرم ہونٹوں کے ذکر میں پناہ لے لی ہے ؎

اپنا موضوع سخن ان کے سوا اور نہیں
طبع شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں (فیض)

بعض ادیب تحلیل نفسی کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتے اور تمام خارجی مسائل سے روگرداں ہو کر "جنس" کے مسائل پر اپنا سارا زور قلم اور تخیل کی ساری قوت ختم کر دیتے ہیں۔ اس کا سبب بھی "اجتماعی شعور" کا فقدان اور "حقیقت" حقیقت سے گریز کا رجحان ہے۔ ان افسانوں اور ایسے ادب کو نفسیاتی ادب کا نام دیا جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ایسے ادیبوں نے نہ تو نفسیات کا سنجیدہ مطالعہ کیا ہے اور نہ تحلیل نفسی کے مختلف مکاتب پر گہری نظر سے غور کیا ہے۔ نفسیات کے موجودہ رجحانات یہ نہیں ہیں صرف جنس میں ہی سب سے اہم جبلت ہے یا یہ کہ صرف جنسی جبلت ہی انسانی اعمال و افعال کا مرکز ہے بلکہ آج کی نفسیات انسان کو "ایک کل" کی حیثیت سے دیکھتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان ادیبوں نے تحلیل نفسی کے نظریات کے متعلق صرف سنی سنائی معلومات حاصل کر لی ہیں۔

بعض نقاد مصر ہیں کہ اس ادب کو بھی ترقی پسند ادب کہا جائے کیونکہ ان کے خیال میں یہ نام نہاد ادیب حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں لیکن کوئی ایماندار ترقی پسند — جسے ترقی پسندی کے نام سے زیادہ اس کا مفہوم عزیز ہے — اس کے لیے تیار نہ ہوگا۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ ہمارے سماج میں جنسی مسئلہ بہت اہم ہے ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں جنسی گندگی بہت زیادہ ہے لیکن کیا ان کو دور کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ جنسی مسائل اور جنسی تجربات کو چٹخارے لیکر بیان کیا جائے اور پڑھنے والے میں بجائے اس کے کہ سماجی عفونت کے خلاف ایک جذبہ نفرت پیدا ہو وہ ایسے ادب سے لذت محسوس کرنے لگے۔ اگر آپ ایک ایسے افسانے کا مطالعہ کر رہے ہوں جس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ "جنس" بھی ہمارے معاشرتی رشتے میں منسلک ہے اور افسانہ نویس اس مقصد کو پیش کرنے کے لیے ایک انفرادی جنسی تجربے کو انتہائی عریانی بیان کے ساتھ پیش کرے تو کیا بنیادی مقصد پس منظر میں نہ چلا جائے گا اور کیا ایک پڑھنے والا اس جنسی تجربے سے لطف اندوز ہونے کے سوا کچھ اور بھی اثرات قبول کر سکیگا

ظاہر ہے کہ یہ صورت حال اور بھی زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے جب کہ ہمارے پڑھنے والوں کی اکثریت بھی جنسی بھوک اور جنسی انحرافات کا شکار ہو۔

جنگ کے آغاز کے بعد سے ہندوستان میں ایسے ہی ادب کا اضافہ ہونے لگا نظموں میں حد سے زیادہ رومانیت اور افسانوں میں جنسی انحراف اس دور کے ادب کے ایک بڑے حصے کی خصوصیت بن گئی۔ اس مرض کی وجہ وہ شکست خوردگی کی ذہنیت ہے جس کا ہمارے ادیب شکار ہیں۔ اس کے اسباب بھی سیاسی وسماجی ہیں اور میرے خیال میں وہ سیاسی تعطل بھی ایک اہم عنصر ہے جس میں ہمارا ملک گھرا ہوا ہے۔ ادیبوں کے سامنے راستہ صاف نہیں ہے۔ ساری دنیا ایک ایسی عالمگیر کشمکش میں گتھی ہوئی ہے جس میں ایک طرف تو آزادی پسند قوتیں ہیں اور دوسری طرف تاریکی، غلامی، بربریت۔ جہالت اور علم دشمنی کی قوتیں ہیں کوئی بیچ کا راستہ نہیں۔ فاشزم، تمدن، تہذیب اور ادب کا دشمن ہے۔ رولاں نازیوں کی جیل میں محبوس ہے۔ چین کے قدیم کتب خانے کو فاسست فوجوں نے تاراج کر دیا۔ فاشزم علم وادب کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اب ہمارے ادیبوں کو بھی تصفیہ کرنا تھا کہ وہ کس فریق کا ساتھ دیں لیکن ملک کے سیاسی تعطل نے اور سیاسی جماعتوں کی تنگ نظری نے معاملات کو بہت زیادہ پیچیدہ بنا دیا۔ بیرونی سامراج اس پر مستزاد۔ ہمارے ادیب ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گئے۔ ان میں وہ اجتماعی شعور تھا نہیں جو ان کی رہبری کرتا سوائے چند کے باقی سب ادیب یا تو انتہائی داخلیت اور رومان پسندی کا شکار ہو گئے یا "عشق جنس" اور تحلیل نفسی کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ گئے۔ ان ادیبوں نے وقت کے تقاضے سے اپنے کان بند کر لیے۔ تمام بندشوں کو توڑ کر اور اخلاق کا سے منہ موڑ کر ادب کو بری طرح رسوا کیا۔

ایک ایسے موقعے پر جب کہ انسانیت دوراہے پر کھڑی ہے جہاں اس کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا ہے اگر ادیب جنسی تجربات کو بیان کرنے لگے تو کیا ایسا ادیب ترقی پسند ادیب کہلائے گا؟ کیا حقیقت پسندی کے یہی معنی ہیں کہ کسی تجربہ کو خواہ کوئی اہمیت رکھے اور سارے انسانی مسائل کو پیچھے ڈال دیا جائے۔ اس پر آشوب دور میں لغویات کے تجربات بیان کرنا، ادب نہیں ادب کی رسوائی ہے مادہ کی ہجو نہیں انسانیت کی توہین اور انسانی سماج سے دشمنی ہے

ترقی پسند ادب پر تنقید کرنے والوں کو یہ معلوم ہو جانا چاہیے کہ ایسے ادب کو پیش نظر رکھ کر ترقی پسند ادب کو ہدف ملامت بنانا ادبی ایمانداری کے خلاف ہے۔ ترقی پسند ادب میں جنسی کجروی کے میلانات کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ تحلیل نفسی کے نام پر ادب کو رسوا نہیں کیا جا سکتا۔ قاضی عبد الغفار صاحب کے الفاظ میں "اگر اس جدید ادب کی غرض وغایت جنسیات کے ادنا جذبات سے ملوث ہو جائے اور یہ تحریر یا نئی "کتب فروشوں کی دکان پر صرف اس لیے فروخت ہو کہ وہ عریانی ہے تو ہمارا ادیب جنسیات کا ایک دلال بن جاتا ہے۔ یہ صورت اگر پیدا ہو جائے تو وہی نئے ادب کی موت ہے اور ذلیل موت ہے" لیکن نیا ادب مر نہیں سکتا۔ وہ وقت کے تقاضوں سے روگرداں نہیں ہوگا وہ انسانیت کا علمبردار ہے مظلوموں کا ساتھی ہے اور انسانوں کی اس جد وجہد میں کہ ایک بہتر اور شاندار مستقبل کی تعمیر کریں ان کا رہبر ہے۔ ایسا ہی ادب نیا اور ترقی پسند ادب ہے باقی جو کچھ ہے وہ کچھ بھی ہو مگر نیا اور ترقی پسند ادب نہیں۔

عالم خوندمیری ام اے (عثمانیہ)

آپ

چونکہ ہندوستانی ادب کا طرز تحریر اور اخلاق کو سامنے رکھ کر مضمون لکھا کریں تو ہندوستانی زبان کی بڑی خدمت ہوگی ہندوستانی زبان بنانے کے بہترین طریقے میں ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ اپنی زبان کی خدمت کرے۔

میں ناچنے والی ہوں یا نچانے والی یہ کوئی نہیں جانتا
کسی کو معلوم نہیں کہ جب میرے جسم کا ایک ایک بند ناچتا دکھائی دیتا
ہے تو اس کا پس منظر کتنے دردناک ماحول میں الجھا ہوتا ہے
میں عورت ہوں مجھے اپنی ہستی پر عبور حاصل ہے میں اپنے
جذبات کو قابو میں رکھ سکتی ہوں۔ میں مرد کی طرح جلدباز
نہیں ہوں جو اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر عورت کے
سامنے اپنی بےبسی کا اعتراف کر لیتا ہے۔ عورت کا مجازی
خدا کتنا مجبور و لاچار ہے۔

میں اسے اپنی نگاہوں کے اشارے پر نچاتی ہوں
اور وہ بوڑھے بندر کی طرح ہر وقت میرے اشارے
پر چلنے کے لیے تیار ہے۔ اگر اسے کہوں شادی کرو گے تو فوراً
اثبات میں سر ہلائے گا اور اگر کہوں کہ ان کے ساتھ شادی کرو گے
جب بھی ہاں کہیگا۔ اور اگر یہ کہوں کہ کنوارے
رہو گے جب بھی ہاں کہیگا۔ بھلا پھر وہ کیسے
کہتا ہے کہ میں اس کی نگاہوں کی جنبش
پر ناچتی ہوں۔ میں تو نچاتی ہوں۔ میرے
بدن کا لوچ اس کے جسم میں کپکپی سی
پیدا کرتا ہے۔ میرے بلوز میں دھڑکتی ہوئی
چھاتیاں اس کے تصور کو گرماتی ہیں اور وہ کسمسا کر رہ جاتا
ہے۔ میں جب نیم وا نظروں سے اس کی للچائی ہوئی نظروں
کے ساتھ ملاتی ہوں تو وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا
دکھائی دیتا ہے۔ کتنا لالچی اور کم ظرف ہے مرد۔ پھر بھی کہتا
ہے کہ میں نرگس کے کوٹھے پر گیا تو اس کی اک اک ادا پر روپوں
کی بارش کر دی۔

میں ہنستی ہوں تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑتی
دکھائی دیتی ہے۔ میں مغموم ہوتی ہوں تو وہ روتا نظر آتا ہے
پھر بھی کم ظرف کہتا ہے کہ وہ مجھے اپنے اشاروں پر نچاتا ہے
میں اس کے سامنے ناچتی ضرور ہوں۔ اس کی محفل میں اپنے
حسن کی رعنائیاں عام ضرور کرتی ہوں — کیوں — وہ نہیں
جانتا کہ میں اس کے غرور کو نیچا دکھانا چاہتی ہوں۔ میں اس کا
گھمنڈ توڑنا چاہتی ہوں۔ وہ جانتا ہے کہ میرے کوٹھے کا
"ارزاں حسن" کتنا مہنگا ہے۔ وہ زندگی جیسی انمول شے
دے کر اس "ارزاں چیز" کو خریدنا چاہتا ہے لیکن اس میں
اتنی ہمت کہاں۔ دیوالیہ ہو جائے اور ساتھ دوسروں کو
بھی دیوالیہ کر دے پھر بھی اس ایک نگاہ کو نہیں خرید سکتا
جو اس کے دل کو چین دے سکے۔

کتنا بےشرم اور بےغیرت ہے۔ اپنی عیاشی کی
داستانیں دوستوں کو سناتا ہے۔ فخر سے اپنے تعلقات اور
بیہودگیوں کو سب پر عیاں کرتا ہے۔ کیا عیاشی گندگی نہیں
ہے۔ بلی کو دیکھیے حیوان ہے اپنی گندگی کو پاس
کی مٹی سے چھپا دیتی ہے تاکہ اس کی بدبو سے
دنیا والوں کو تکلیف نہ پہنچے لیکن یہ مرد
تو اس حیوان سے بھی کمتر درجہ رکھتا
ہے۔ گندگی کو اچھالتا ہے اور اسی میں
اپنی شان سمجھتا ہے۔ قانون اس کا ہے
اس لیے اسے حکومت کا خوف نہیں ہے
حکومت اور قانون ایک ہی بات ہے حکومت
بھی تو اسی کی ہے۔ اسی لیے اپنی انانیت پر نازاں نظر آتا
ہے۔ حکومت اور قانون کا ٹھیکیدار جب میرے کوٹھے پر
آتا ہے تو اس کا دل میرے پاؤں کے نیچے کھیلتا ہے۔ طبلے
کی ہر گت اور میرے پاؤں کی ہر جنبش اس کی شخصیت کے
وقار اور اس کی انانیت کو کچلتی ہے۔ وہ ہنستا ہے قہقہے لگاتا
ہے فلک شگاف قہقہے شاید اس وقت شرابی ہوتا ہے
شرابی کو اپنی سدھ بدھ نہیں رہتی کبھی نوٹ نکال کر
کبھی تو اپنی ران پر رکھ کر دیتا ہے کبھی اپنے گالوں سے
چپکا کر دیتا ہے پھر لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں مجھ سے کہتا ہے
اسے اٹھا لو۔ وہ روپیہ جسے مزدور [illegible] بھر
کی محنت کے بعد کما کر لاتا ہے محض میرے [illegible] کا لمس

محسوس کرنے کے لیے" ادھر ادھر" رکھکر اپنی جنیاتی بھوک کو دور کرنا چاہتا ہے اپنی تشنگی کو یوں بجھانے کی کوشش کرتا ہے مگر افسوس ہے کہ وہ لمس اسے حقیقی مسرت نہیں بخشتا۔ بعض اوقات زیادہ نشے میں ہوتا ہے تو میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی گود میں گرا لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ نرگس کا ابھرا ہوا جسم میری گود میں گیند کی طرح کھیل رہا ہے۔ اپنے ہاتوں کو میرے نرم و نازک منہ کی طرف بڑھاتا ہے۔ میرے گلابی ہونٹوں کو انگلی سے چھیڑتا ہے سمجھتا ہے کہ رباب کے تاروں کو چھیڑ کر ان میں سے جنسیاتی کشش کا کوئی نغمہ نکلیگا۔ کبھی وہ گستاخ ہات میرے گالوں کی چٹکی لیتے ہیں کہ تمام گالوں کا خون نکال لیں شاید اسی خون سے تسکین ہوس ہو جائے۔ کبھی اسکی انگلیاں میرے گھونگریالے بالوں سے کھیلتی ہیں سمجھتا ہے کہ اپنی آرزوؤں کے گیسو سنوار رہا ہے۔ کبھی وہ ہات میرے سڈول بازوؤں پر حرکت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں سمجھتا ہے کہ سنگ مرمر کی مورتی کو اپنی حرارت نفس سے زندگی سے بخش رہا ہے۔ کبھی وہ ہات میرے شباب کی بے پناہیوں سے کھیلتے نظر آتے ہیں اور وہ اب اس کھیل میں ایسا کھو جاتا ہے کہ میں اس کا منہ دیکھتی ہوں۔ اس کے چہرے پر جذبات کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ اس وقت اپنی زندگی سے بے نیاز ہے میرے ہات جنبش کرتے ہیں تو مسکراتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کی بیخودی کو بڑھتا دیکھکر میں اور سمٹ کر اس کے ساتھ لگ جاتی ہوں وہ سمجھتا ہے کہ میں نے اپنا شباب اسکا گداز اسے بخشدیا ہے وہ بہت مسرور ہوتا ہے اور بیخودی میں اس کے ہات میرے شفاف رانوں پر کھیلتے ہیں اور میرے ہاتھ اس کی جیب کی طرف بڑھتے ہیں۔ بیوقوف جیب خالی کر دیتا ہے لیکن وہ ہات رانوں کا گداز محسوس کرنے کے بعد ایسے لاچار ہو جاتے ہیں کہ میں اس کے منہ پر ایک ہلکا سا تھپڑ مار کر الگ ہو جاتی ہوں اور وہ بیٹھا ہنسا کرتا ہے۔ بیچارا مرد — پھر بھی کہتا ہے کہ نرگس میرے اشاروں پر ناچتی ہے۔ نہیں جانتا کہ نرگس اسے نچاتی ہے۔

مرد ہے بڑا بہادر لیکن اس کا خوفناک ارادہ زندگی کی دیوار کے سائے میں ہچکیاں لے رہا ہے چاہتا ہے کہ نرگس کی سیم و زر کی بارش کرکے اس کا جسم خریدلے۔ لیکن آج تک کوئی بھی اس کے لمس کے بغیر کچھ حاصل نہیں کر سکا۔ میرا وقت فروخت ہوتا ہے یہ وقت کتنا دلچسپ اور رنگین ہوتا ہے جب وہ میرے شباب سے کھیلتا ہے۔ میں بعض اوقات اسکی گود میں کھو جاتی ہوں لیکن میں عورت ہوں صبر اور ضبط جانتی ہوں فوراً الگ ہو جاتی ہوں۔ وہ مرد ہے بیتاب اور بے صبر۔ مکھی کی طرح شہد پر گرا پڑتا ہے۔ اڑنے کا نام نہیں لیتا اڑے بھی کیسے وہ تو شہد میں پھنس چکا ہے۔ جب تک کہ تڑپ تڑپ کر جان نہ دیدے نکلنا محال ہے۔ دیکھتا ہے کہ سینکڑوں مکھیاں اپنی جان کھو چکی ہیں لیکن پھر بھی آتا ہے بیوقوف یہ نہیں جانتا کہ روپے اور جذبات کا کوئی لگاؤ نہیں۔ نرگس روپے سے کھیلتی ہے جذبات کی غلام نہیں لیکن یہ آفاق میری زندگی کو سہارا دے کر کہیں اس کو عشق کی رنگینیوں سے دور نہ لے جائے۔

شاہزادہ ایاز

کل ہندوارتقی مشاعرا

(بائیسواں سال)

پچھلے سالوں کی طرح اس سال بھی انجمن ارتقی کا مشاعرہ بتاریخ [illegible] روایتوں اور [illegible] کے ساتھ ماہ اپریل [illegible] کو [illegible] [illegible] میں ترتیب ہونگے [illegible] اور [illegible] لوگ [illegible] اور صاحب [illegible] سے شرکت کی [illegible] سید [illegible] امام صاحب [illegible] حضرت [illegible] شاہ [illegible] بانی [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] ناظم مشاعرا۔ [illegible]

سلطنت بہمنیہ پر ایک نظر

سنہ ۷۴۸ھ میں علاء الدین حسن گنگو بہمنی کی تخت نشینی نے کامل طور پر دکن کی خود مختاری کا اعلان کیا۔ سنہ ۹۲۴ھ میں محمود شاہ بہمنی کے انتقال پر بہمنی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اس لیے کہ اسی سن میں محمود کے انتقال کے بعد آخری صوبے دار قطب الملک نے گولکنڈہ میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ اگرچہ اسکے بعد بھی سنہ ۹۳۳ھ تک چار شہزادے ایک کے بعد ایک برائے نام بادشاہ ہوئے۔ ٹھیک یہی زمانا بابر کے شمالی ہند میں مغلیہ سلطنت کے سنگ بنیاد رکھنے کا ہے یعنی ۷ رجب سنہ ۹۳۲ھ میں اس نے پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کو شکست دی۔

مگر اس وقت تک بہمنی حکومت کے پانچ ٹکڑے ہو چکے تھے، محمود شاہ بہمنی ثانی ہی کے زمانے سے صوبے دار خود مختار ہونے لگے تھے۔ چنانچہ (۱) سنہ ۸۹۰ھ میں سب سے پہلے فتح اللہ عماد الملک برار میں خود مختار ہو گیا۔ مگر اعلان اس نے سنہ ۸۹۶ھ میں کیا۔ (۲) اسی سنہ ۸۹۶ھ میں ملک احمد نظام الملک نے خود مختاری کا اعلان احمد نگر میں کیا۔ (۳) سنہ ۸۹۵ھ میں یوسف عادل خاں نے عادل شاہ کا لقب اختیار کر کے بیجاپور میں خود مختاری کا علم بلند کیا۔ (۴) سنہ ۸۹۷ھ میں قاسم برید نے بیدر پر قبضا کر کے بریدشاہی حکومت کی بنیاد رکھی (۵) سنہ ۹۱۸ھ میں سب کے بعد قطب الملک گولکنڈہ میں خود مختار ہو گئے اس لحاظ سے بابر کے ہندستان فتح کرتے وقت سنہ ۹۳۲ھ میں برار میں دوسرا بادشاہ علاء الدین عماد شاہ۔ بیجاپور میں دوسرا بادشاہ اسماعیل عادل شاہ۔ اور اسی طرح سے احمد نگر میں دوسرا بادشاہ برہان نظام شاہ، بیدر میں دوسرا بادشاہ امیر برید اور گولکنڈہ میں قطب الملک بانی سلطنت قطب شاہی حکمرانی کر رہے تھے۔

بابر کے فتح ہندستان کے ۳۰ برس بعد یعنی ماہ ربیع الاول سنہ ۹۶۳ھ میں اکبر تخت نشین ہوا۔ اس کی عمر ۱۳ سال نو مہینے کی تھی اس وجہ سے عنان حکومت بیرم خاں کے ہاتھ میں رہی۔ چار سال بعد میں بیرم خاں سے بدگمان ہو کر اکبر نے حکومت خود سنبھالی۔ (بیرم خاں کی وفات سنہ ۹۶۸ھ میں واقع ہوئی) اس وقت اکبر کی عمر اٹھارہ سال کی تھی (سن عیسوی کے لحاظ سے اکبر نے ۶۳ سال کی عمر پائی اور ۴۹ برس حکومت کرنے کے بعد ماہ جمادی الآخر سنہ ۱۰۱۴ھ میں وفات پائی) اکبر کے خود مختار ہونے کے بعد سنہ ۹۶۹ھ میں برار کے تیسرے بادشاہ دریا عماد شاہ کا انتقال ہو گیا تو اس کا کم سن لڑکا برہان عماد شاہ تخت نشین ہوا چونکہ یہ بالکل بچا تھا اس لیے تفاول خاں وزیر کی نگرانی میں کاروبار سلطنت انجام پانے لگے مگر اس نے غداری کی اور شہزادے کو قید کر کے خود بادشاہ بن بیٹھا یہ بات احمد نگر کے مرتضیٰ نظام شاہ اول کو معلوم ہوئی اسکی عماد شاہی خاندان سے رشتہ داری تھی اور جب تفاول خاں نے اس کے حکم کی پروا نہ کی تو اس نے فوج کشی کی اور سنہ ۹۸۲ھ میں برار کو اپنی سلطنت کا جزو بنا لیا۔ اس طرح عماد شاہی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

احمد نگر میں حسین نظام شاہ تیسرا بادشاہ تھا جس نے سنہ ۹۷۲ھ میں انتقال کیا اور اس کا بیٹا مرتضیٰ نظام شاہ اول تخت نشین ہوا جس نے سنہ ۹۹۶ھ میں وفات پائی اس نے اپنے بیٹے میراں حسین کا نکاح ابراہیم عادل شاہ کی بہن خدیجہ سلطانہ کے ساتھ کیا اور دلہن کے ڈولے کے ساتھ مرتضیٰ کی بہن چاند بی بی اپنے بھائی سے ملنے کے لیے آئی مگر اس کا یہ آنا کچھ ایسا آنا تھا کہ بیجاپور جانا نصیب نہیں ہوا کیونکہ مرتضیٰ کے انتقال کے بعد احمد نگر میں ایسی خانہ جنگی شروع ہوئی جو آخر تک ختم نہیں ہوئی۔ چنانچہ مرتضیٰ کے بعد میراں حسین جو تخت احمد نگر پر بیٹھا تھا نہایت ظالم اور سفاک تھا جس کو بہت جلد امرا نے مار ڈالا اور مرتضیٰ کے بھتیجے اسماعیل کو تخت پر

بٹھایا مگر جب اسماعیل کے باپ برہان کو ان سب باتوں کی اطلاع ملی جسنے مرتضیٰ کی زندگی ہی میں اس کے خوف سے دہلی کے اکبر بادشاہ کے پاس پناہ لی تھی تو وہ واپس آیا اور بیٹے کو ہٹا کر برہان نظام شاہ ثانی کے لقب سے تخت نشین ہوگیا۔ اس نے احمد نگر کی عظمت رفتہ کو واپس لانے کی کوشش کی اور حکومت کا معقول انتظام کیا مگر احمد نگر کی بدقسمتی کہ چار سال تک حکومت کرکے فوت ہوگیا اور اس کا چھوٹا بیٹا ابراہیم تخت پر بیٹھا اس نے چند ہی مہینے حکومت کی تھی کہ ایک لڑائی میں اس کے تیر لگا جس کے صدمے سے اس نے انتقال کیا۔ اس کے انتقال پر احمد نگر میں بڑی افراتفری پھیل گئی اور بہت سے جھوٹے سچے دعویدار اٹھ کھڑے ہوئے۔ چاند بی بی نے ابراہیم کے بیٹے کو جس کی عمر صرف ڈیڑھ برس کی تھی اپنی سرپرستی میں بہادر نظام شاہ کے نام سے تخت نشین کیا۔ یہ ۱۰۰۴ھ کے واقعات ہیں (۱۵۹۵ء تک اکبر بادشاہ پورے شمالی ہند پر یعنی کشمیر سے نربدا تک اور بنگال سے سندھ تک قابض ہو کر کوس لمن الملکی بجا رہا تھا) مگر امرا نے اپنی آپس کی رقابتوں کی وجہ سے چاند بی بی کے اس انتخاب سے ناراض ہو کر اکبر کو اپنی امداد کے لیے عرضی بھیجی۔ گجرات سے شہزادہ مراد کی اور مالوہ سے خانخاناں کی فوجیں بڑھیں اور احمد نگر کا محاصرہ کرلیا۔ اور بمشکل تمام برار کا صوبہ لے کر چاند بی بی سے صلح کرلی (۱۵۹۶ء)۔ (اس وقت ابراہیم عادل شاہ ثانی اور محمد قلی قطب شاہ نے بھی اپنی فوجیں چاند بی بی کی مدد کو بھیجی تھیں) مگر یہ صلح کچھ پائیدار نہیں ثابت ہوئی۔ دو ہی سال بعد ۱۰۰۶ھ میں شہزادہ مراد اور خانخاناں نے پھر حملہ کیا اور دریائے گوداوری کے کنارے سوپہ کے مقام پر ایک بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کی طرف سے بھی بڑی بڑی فوجیں آئی تھیں۔ اگرچہ اس جنگ میں دکنی فوج کو سخت شکست ہوئی لیکن مغل بھی بڑا بھاری نقصان اٹھا کر واپس گئے۔ مگر آپس کی رقابتوں کی وجہ سے امرا کے ایک گروہ نے پھر اکبر سے امداد طلب کی اور اس نے دوبارہ فوج کشی کرکے احمد نگر کا محاصرہ کرلیا۔ اس دفعہ مغل فوج بہت زیادہ تھی اس لیے چاند بی بی نے مکرر صلح کرلینا چاہی مگر امرا نے یہ بدگمانی کی کہ چاند بی بی مغلوں سے مل گئی ہے چنانچہ انہوں نے اس کو شہید کردیا مگر اس سے انہیں کچھ فائدہ نہیں ہوا اور ۱۰۰۹ھ میں احمد نگر کو مغلوں نے فتح کرہی لیا اور بہادر کو قلعہ گوالیار پر بھیج دیا اس مرتبہ اکبر بادشاہ نے (چونکہ مراد کا انتقال ہوچکا تھا) اس لیے اپنے دوسرے بیٹے دانیال کو خانخاناں کے ساتھ تسخیر احمد نگر کے لیے روانہ کیا اور خود بھی ۱۰۰۸ھ ۱۵۹۹ء میں اسی ہزار فوج لے کر دکن کا رخ کیا تاکہ احمد نگر سے قریب رہے اور ساتھ ہی ساتھ خاندیس کو بھی فتح کرلے تاکہ دکن کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ رہے مگر خاندیس کے قلعہ اسیر گڑھ کے محاصرے نے اتنا طول کھینچا کہ تسخیر احمد نگر کی خبر اسے اسی جگہ ملی بہرحال ۱۰۰۹ھ ۱۶۰۰ء میں احمد نگر و برہان پور دونوں مغلیہ سلطنت کا جزو بن گئے اور معاملات دکن کو شہزادہ دانیال خانخاناں اور ابوالفضل کے حوالے کرکے اکبر نے آگرہ کو مراجعت کی۔ مگر ان دونوں فتوحات میں بڑا فرق یہ ہے کہ اسیر گڑھ کی تسخیر سے پورا خاندیس مغلوں کے قبضے میں آگیا لیکن احمد نگر کی تسخیر کے باوجود شاہجہاں کے زمانے تک نظام شاہی سلطنت کا وجود باقی رہا۔ اس وقت ملک عنبر جو ایک آفاقی حبشی تھا اور جو کسی زمانے میں تین دفعہ بک چکا تھا محض اپنی قابلیت سے ترقی کرتے کرتے اب دولت آباد کا طرفدار بن گیا تھا۔ اور اس افراتفری میں یہاں اس نے مضبوطی سے اپنے قدم جمالیے تھے ادھر احمد نگر کے قبضے سے نکل جانے کے بعد امرا نے برہان نظام شاہ اول کے پوتے مرتضیٰ کو مرتضیٰ نظام شاہ دوم کے نام سے نظام شاہی سلطنت کے قدیم پایہ تخت جنیر میں تخت پر بٹھا دیا۔ جب ملک عنبر اپنے جوڑ توڑ سے سلطنت کا وکیل مطلق بن گیا تو دولت آباد کے قریب موضع کھرکی کو پایہ تخت

کو اپنا مستقر بنا کر مرتضیٰ کو منیر سے یہیں لے آیا اور نہ صرف
نظام شاہی سلطنت کا بلکہ پورے دکن کا مختار مطلق بن گیا۔
ملک عنبر پہلا شخص ہے جس نے مرہٹوں کو اپنی فوج میں بھرتی
کر کے ان کو قزاقانہ جنگ کا طریقہ سکھایا۔

اکبر کی تخت نشینی کے وقت بھی بیدر میں امیر برید
ہی برسرِ حکومت تھا۔ اس نے ۹۴۹ھ میں انتقال کیا ہے
اس کے بعد سے اکبر کے انتقال تک اور پانچ بادشاہ برسرِ
حکومت آئے جن میں امیر برید ثانی اس سلسلے کا ساتواں اور
آخری حکمران تھا۔ اس نے ۱۰۱۰ھ سے ۱۰۱۸ھ تک حکومت
کی۔ اس کے بعد بیجاپور کے عادل شاہوں نے بیدر کو فتح کر کے
اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور ۴۲ سال تک اس پر ان کا
قبضہ رہا۔ اس طرح ان تینوں سلطنتوں کا تقریباً اکبر کے سامنے
ہی خاتمہ ہو گیا (اگرچہ نظام شاہی سلطنت ایک دوسری شکل میں
شاہجہاں کے عہد تک باقی رہی) اب دو سلطنتیں بیجاپور اور
گولکنڈہ باقی رہ گئیں۔ اکبر کی تخت نشینی کے وقت (۹۶۳ھ)
بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ اول کا آخری زمانہ تھا جس نے
۹۶۵ھ میں انتقال کیا (اسمٰعیل عادل شاہ کا ۱۶ [illegible] ۹۴۱ھ
کو انتقال ہوا۔ انتقال کے بعد اس کا نااہل بیٹا ملو عادل شاہ
صرف چھ مہینے کی حکومت کے بعد خود ہی کنارہ کش ہو کر بنگالہ
چلا گیا اس لیے ہم ابراہیم اول کو بیجاپور کا تیسرا بادشاہ کہتے
ہیں جس نے ۹۴۱ھ سے ۹۶۵ھ تک حکومت کی ہے) اس کے
بعد اس کا بیٹا علی عادل شاہ اول ۹۶۵ھ سے ۹۸۷ھ تک
عادل شاہی تخت کو زینت بخشتا رہا جس شان و شوکت سے
اکبر شمالی ہند میں براجمان تھا اسی آن بان سے علی عادل شاہ
بیجاپور میں داد حکومت دے رہا تھا۔ ادھر اکبر چتوڑ گڑھ
گجرات اور بنگال کو فتح کر رہا تھا تو ادھر علی عادل شاہ تالی کوٹ
کے میدان میں بیجانگر کی قسمت کا فیصلہ کر رہا تھا۔ یہ وہی فرماں روا
ہے جس کی بیوی چاند سلطانہ تاریخ دکن میں لافانی شہرت
کی مالک ہے۔ یہ بہت سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ معمولی کپڑے
پہنتا اور پرانے قالین پر بیٹھتا تھا۔ مطالعے کا اس قدر دلدادہ
تھا کہ آخر عمر تک ایک حقیقی طالب علم (اسکالر) رہا۔ ہندوؤں
اور غیر مذہب والوں کے ساتھ بہت رواداری کا سلوک کرتا
تھا چنانچہ اس کی فوج میں ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگ تھے
اسی نے ۹۸۰ھ میں نہ صرف بیجاپور بلکہ دکن کی خوبصورت
ترین جامع مسجد کی تعمیر کروائی جس کی اس کے والد ابراہیم
اول نے بنیاد رکھی تھی۔ رعایا کے آرام کے لیے نہروں اور نلوں
کا جال بچھا دیا اور گھر گھر پانی پہنچایا جو صدیاں گذر جانے کے
بعد بھی آج تک اسی طرح جاری ہے[۱]۔ اس کے بعد اس کا بھتیجا
ابراہیم عادل شاہ ثانی بیجاپور کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ یہ
ایسا لائق اور فاضل تھا کہ جگت گرو کے لقب سے یاد کیا گیا۔ اس
کی مدت حکومت بہت طویل ہے، ۴۹ برس اس نے حکومت کی
اور ۱۰۳۷ھ میں وفات پائی۔ یہی شہنشاہ جہانگیر کا بھی سن وفات
ہے۔ احمد نگر و خاندیس کے محاصروں اور فتوحات کے سلسلے میں اکبر
نے شریف سرمدی کو ابراہیم عادل شاہ ثانی کے پاس بیجاپور بھیجا

---

[۱] اس زمانہ میں ہندستان میں ہر جگہ ہندو اور مسلمانوں میں بڑی مخالفت تھی۔ اور کوئی بھی ان کے تعلق ایسا نہ تھا [illegible] گرو نانک کے جیسے لوگ ہندوؤں میں ایسے پیدا ہو سکے
جنہوں نے یہ کہہ کر کہ خدا ایک ہے ہندو مسلمان [illegible] دونوں کے باہمی اختلاف کو [illegible] دور کیا دوسری طرف مسلمان [illegible]
تدبیروں سے دونوں کی اجنبیت و مخالفت [illegible] بدل گئی۔ چنانچہ ادھر دکن کے سلاطین نے اپنا دفتر بجائے فارسی کے اردو میں کر دیا ملکی زبان کو ترقی دی
ہندوؤں کو فوج میں بھرتی کیا اور بڑے بڑے عہدے [illegible] ان کے علاوہ وزارت تک کے عہدے پر ہندوؤں کو سرفراز کیا اور ان سے رشتہ
ناتا جوڑا تو ادھر شمالی ہند میں اکبر اعظم نے راجپوت رانیوں کے ڈولے اپنے محل میں لا کر اور راجپوتوں کو بڑے بڑے عہدے دے کر
ملاپ کا ڈول ڈال دیا۔

اور [illegible] اٹھا لیا۔ اور اس کے کچھ ہی دن بعد سید جمال الدین حسین انجو کو ابراہیم کی لڑکی سلطان بیگم کا پیام شہزادہ دانیال سے شادی کرنے کے لیے روانہ کیا۔ ابراہیم نے اپنے میں تاب مقاومت نہ پاکر شہنشاہ کی یہ دونوں باتیں منظور کر لیں۔ چنانچہ پانچ سال کے بعد سنہ ۱۰۱۳ھ میں شہزادہ دانیال برہانپور سے احمد نگر تشریف لائے اور دلہن کو بھی بڑی تیاریوں کے ساتھ امرا کے جلوس میں بیجاپور سے احمد نگر بھیجا گیا۔ جشن شادی شہر پٹن میں قرار پایا جو احمد نگر سے بیس کوس کے فاصلے پر دریائے گوداوری کے کنارے واقع ہے مگر افسوس کہ اس شادی کے اسی سال اوائل ذی الحجہ میں کثرت شراب نوشی سے دانیال فوت ہو گیا اور اس حادثے کے چار مہینے بعد سنہ ۱۰۱۴ھ میں شہنشاہ اکبر نے بھی ۴۹ برس حکومت کرنے کے بعد اس دنیا سے رخت سفر باندھا۔ اور ابراہیم عادل شاہ اپنے ۴۹ برس پورے کرنے کے لیے باقی رہ گیا۔ تسخیر احمد نگر کے بعد اکبر بادشاہ دکن کا انتظام شہزادہ دانیال، خانخاناں اور ابو الفضل کے سپرد کر کے جب آگرے واپس گئے تھے تو وہاں ولیعہد سلطنت جہانگیر کی بغاوت وغیرہ کی وجہ سے کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ وہ بہت دنوں تک دکن اور فوج نہ بھیج سکا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ملک عنبر نے نظام شاہی سلطنت کے کئی علاقے دوبارہ فتح کر لیے اور اپنی قوت بہت بڑھا لی۔ اکبر بادشاہ اپنے انتقال تک پھر دکن کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ جہانگیر نے سنہ [illegible] میں خلیفہ تخت کو رونق بخشی۔

جہانگیر کے پورے عہد حکومت میں بیجاپور کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ ملک عنبر ہی مغلیہ فوجوں سے مقابلہ کرتا اور ان سے نپٹتا رہا۔ جیسا کہ ابھی اوپر بیان کیا گیا سنہ ۱۰۰۹ھ میں اکبر نے شہر احمد نگر کو فتح کر لیا تھا مگر ملک عنبر جیسے مدبر و دلیر سردار کے توڑ جوڑ نے نظام شاہی سلطنت کو اور پچیس سال تک خاتمہ سے بچا لیا بلکہ تمام دکن کو شمالی ہند سے آزاد رکھا۔ چنانچہ موضع کھڑکی کو اپنا صدر مقام بنا کر اور کیل کانٹے سے درست ہو کر مغلیہ فوج سے مقابلے کرنے لگا۔ حقیقت یہ ملک عنبر ہی ہے جس نے بیجاپور اور گولکنڈہ تک مغلوں کے ہاتھ کے راستے کو روک رکھا اور مرہٹوں کو اپنی فوج میں بھرتی کر کے قزاقانہ جنگ کی طرح ڈالدی اور مغل فوج پر چھاپے مارنے شروع کر دیے چنانچہ جہانگیر نے تخت نشین ہونے کے بعد گھر کے انتظام سے فارغ ہو کر سنہ ۱۰۱۸ھ میں خانخاناں کو دکن کی مہم پر روانہ کیا۔ مگر دکنی فوج نے مغلوں کو اتنا پریشان کیا کہ خانخاناں ہٹ کر برہانپور میں پناہ گزین ہو گیا اور نو برس کے بعد سنہ [illegible] میں شہر احمد نگر پر پھر ایک مرتبہ ملک عنبر کا قبضہ ہو گیا۔ جب شہنشاہ جہانگیر کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے بڑے جاہ و جلال کی تیاری کی اور شہزادہ پرویز کو اور خانخاناں کی جگہ خان جہاں لودی کو اس مہم پر مامور کیا۔ پیچھے سے راجا مان سنگھ کمک لیکر روانہ ہوا۔ گجرات سے عبد اللہ خان ازبک اپنی فوج لیکر آگے بڑھا مگر یہ ازبک سردار اس تیزی سے آگے بڑھا کہ دوسری فوجیں اس سے مل نہ سکیں۔ اور ملک عنبر نے اپنی قزاقانہ جنگ سے اس کو عاجز کر دیا۔ یہاں تک کہ سخت نقصان اٹھا کر اسے گجرات کی طرف پسپا ہونا پڑا۔ جب شہزادہ پرویز نے یہ حال دیکھا تو اسکو بھی برہانپور سے آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی اور مغلوں کو ایسی سخت شکست ہوئی کہ ملک عنبر کا احمد نگر کی پوری ریاست پر قبضہ ہو گیا۔ اور اس کو کچھ دنوں کے لیے فرصت مل گئی کہ وہ اپنے تدبر سے ملک کی فلاح و بہبود اور رعایا پروری کے کاموں میں بھی اپنا لوہا منوائے۔ اس فتح کی یادگار میں ملک عنبر نے کھڑکی کا نام فتح نگر رکھا۔ (باقی)

جہانگیر علی

[illegible] تک اس کا [illegible] لیکن اکبر کا قائم کیا ہوا ایسا [illegible] چنانچہ جب جہانگیر نے [illegible] جاتے تو ابراہیم عادل شاہ کو شاہی فرمان چوم کر اپنے سر پر رکھنا پڑا۔

پونجی

یہ اپنے اندر ایک ایسی کہانی رکھتا ہے جسمیں ہزاروں چھپیاں ہیں
اور سینکڑوں دلکشیاں جو نہ مٹنے والے نقش دلوں پر چھوڑتی ہے
آج چوتھے ہفتے میں دکھایا جا رہا ہے۔ پھر مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ
تیسرے اور چوتھے روز کا شبہ ہوتا ہے

جینت ، راگنی ، منورما ، اختر ، اسمٰعیل ، درگا موٹا ، ایل وغیرہ

یورپی موسیقی پر عربی اثرات

جب اس وسیع اختلاف پر غور کیا جائے جو مشرقی و مغربی موسیقی کو ایک دوسرے سے جدا کیے ہوئے ہے تو اس حقیقت کو پوری طرح ذہن نشین کرنا مشکل ہے کہ مغرب میں اسلام یا عربوں نے موسیقی کی کوئی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اہل مغرب موسیقی کو عمودی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں لیکن مسلمان اس کا تصور خطِ مستقیم کرتے ہیں یعنی وسیع نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فن موسیقی کے مغربی اصول ہم آہنگی اور مشرقی اصول خوش آہنگی کی تہ میں نمایاں فرق اور امتیاز موجود ہے اس کے علاوہ سر، تناسب اور راگ کو زینت دینے کے متعلق عربوں کے جو تصورات ہیں وہ اہل یورپ کے تصورات سے بالکل جدا ہیں۔ بہر طور دسویں صدی عیسوی سے پہلے مشرقی و مغربی فن موسیقی میں اتنا زیادہ بعد نہیں تھا جتنا کہ اب ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں میں حقیقی فرق بہت کم تھا کیوں کہ ان دونوں کو اب بھی ایک مشترک نسب نما کی سطح پر لایا جا سکتا ہے۔ ایک زمانے میں دونوں کی بنیاد فیثاغورثی سرگم پر تھی اور دونوں مشترک طور پر بعض یونانی اور شامی عناصر کے وارث ہوئے تھے۔ سب سے زیادہ یہ کہ ہم آہنگی کی اصطلاح کا جو مفہوم اہل یورپ سمجھتے ہیں اس کے لحاظ سے ہم آہنگی کا کوئی وجود نہیں تھا۔ ان میں سب سے نمایاں فرق یہ تھا کہ عربوں کے پاس ساحتی (تال دار) موسیقی کا نظام تھا۔ اس کے علاوہ راگ کی زینت کے متعلق ان کا تصور رونق تھا اور انہی دونوں چیزوں نے آخر کار مغرب پر اپنا اثر ڈالا۔

عربی موسیقی کا ماخذ بے شبہ قدیم زمانے کا سامی نظریہ و عمل تھا گو یہ دونوں حقیقت میں یونانی نظریہ عمل کی بنیاد نہیں تھے لیکن ان دونوں چیزوں نے نظریے و عمل کو متاثر ضرور کیا تھا اسلامی دور شروع ہونے سے پہلے یعنی ایام جاہلیت میں [illegible] ان کی عرب سلطنتیں بلا شبہ ایرانی اور بازنطینی رواج سے متاثر ہو چکی تھیں اور ان [illegible] (ایران اور بازنطیہ) کے پاس فیثاغورثی سرگم ہی [illegible] تھے۔ لیکن خود یہ فیثاغورثی سرگم ابتداً سامیوں سے لیے گئے تھے۔

حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی زمانے میں جب کہ حجاز کو سیاسی مرکزیت حاصل تھی اہل حجاز نے ساحتی موسیقی اختیار کر لی تھی جس کو وہ اپنی اصطلاح میں ایقاع کہتے تھے۔ اس زمانے میں اہل عرب نے موسیقی کا ایک نیا نظریہ اختیار کیا اس نظریے کا بانی ابن مسجاح نامی ایک مغنی تھا (متوفی سنہ ۷۱۵ء تا سنہ ۷۱۴ء)۔ اس میں ایرانی اور بازنطینی دونوں عنصر شامل تھے لیکن جیسا کہ ڈاکٹر فارمر نے لکھا ہے "ایران اور بازنطیہ سے لی ہوئی موسیقی نے عربوں کی قومی موسیقی کی جگہ نہیں لی بلکہ عربی درخت میں وہ بطور قلم لگائی گئی جو اپنی خصوصیتوں میں ممتاز تھی یہ [illegible] موسیقی، جس کا سرگم فیثاغورثی ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ زوال بغداد تک قائم رہا۔ (سنہ ۱۲۵۸ء)

اس دور ان میں بہت سی تبدیلیاں ہو چکی تھیں اور سرگم میں ان تبدیلیوں نے ایسا خلل ڈال دیا تھا کہ اسحاق موصلی نے سنہ ۸۵۰ء میں ضروری سمجھا کہ پورے نظریے کو قدیم فیثاغورثی نمونے پر پھر سے ترتیب دیا جائے۔ اصفہانی کے زمانے تک (سنہ ۹۶۷ء) تو یہ نظریہ قائم رہا لیکن اس کے بعد اور سے کے بتائے ہوئے خیالات نے [illegible] اپنا اثر ڈالنا شروع کیا۔ آخری چیز حقیقت میں زلزالی اور خراسانی سرگم تھی۔ قدیم یونانی نظریوں تک رسائی ہونے کی وجہ سے قدیم نظام کو بطور بنیاد قائم رکھنے میں مدد ملی جو ارسطو، ارسطوکسس، اقلیدس (یا جعلی اقلیدس)، نیقومیکس، بطلیموس اور دوسرے عالموں کی کتابوں کے ترجموں کی وجہ سے [illegible] آئے تھے۔ لیکن ان نظریوں کو اختیار کرنے کے باوجود

کندی (؟ ۸۷۴ء) اصفہانی اور اخوان الصفا (دسویں صدی
عیسوی) سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی، ایرانی اور بازنطینی موسیقی
کے نظاموں میں کوئی امتزاج نہیں ہوا بلکہ وہ ایک دوسرے
سے علیحدہ ہی رہے۔ گیارہویں صدی عیسوی تک ایرانی اور
خراسانی موسیقی کے اصول بھی اختیار کر لیے گئے تھے جو خاص کر
طرزوں میں نمایاں تھے۔ بعد میں صفی الدین عبدالمومن (
۱۲۹۴ء) نامی ایک نظریہ ساز نے ایک نیا نظریہ یا کم سے
کم قدیم نظریے کو منظم صورت میں پیش کیا۔ جس کو نظریۂ منتظم
کہتے ہیں لیکن درمیانی دور ختم ہونے سے پہلے ایک دوسرا نظام
اختیار کر لیا گیا جو باوسرگی نظریہ کہلاتا ہے۔ مشرق کے عربوں
میں اب تک بھی اس کا رواج ہے۔ اس بات کو خود عرب بھی
کھلے طور پر تسلیم کرتے ہیں کہ عربی موسیقی ایرانی اور بازنطینی اصول
سے متاثر ہوئی ہے۔ بعد میں ایرانیوں اور بازنطینیوں نے
بھی عربی فن سے بہت کچھ حاصل کیا تھا۔

موسیقی کا رواج

عربوں کے پاس موسیقی کا جو مفہوم ہے وہ الف لیلۃ و لیلۃ سے بخوبی
واضح ہوتا ہے۔ اس فن سے مسلمانوں کی گہری پسندیدگی ابن
عبد ربہ کی عقد الفرید، اصفہانی کی آغانی اور نویری نہایۃ الارب
فی فنون الادب جیسی کتابوں سے پوری طرح معلوم کی جا سکتی
ہے۔ پہلی کتابیں دسویں اور آخری تیرہویں صدی عیسوی میں
لکھی گئی ہیں۔ افسوس ہے کہ ان میں سے کسی ایک کا ابھی
یورپی زبانوں میں ترجمہ نہیں ہوا۔ ان سے معلوم ہوتا ہے
کہ گہوارے سے گور تک اور لوری سے مرثیے تک کسی نہ
کسی صورت میں عمر بھر موسیقی عربوں سے وابستہ اور پیوستہ
رہتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک عرب کی زندگی میں ہر
تقریب اپنی ایک خاص موسیقی رکھتی ہے —— یہ خواہ
غم ہو یا شادی، کام ہو یا کھیل، میدان جنگ ہو یا مذہبی رسم
حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ہر معزز عرب
کے گھر میں ایک مغنیہ کا وجود ایسا ہی لازمی تھا جس طرح آج
کل یورپ کے ہر گھر میں ایک پیانو کا رہنا ضروری ہے۔

یہاں ہم کو "عوام کی موسیقی" سے زیادہ بحث نہیں
ہے۔ جیسا کہ ابن خلدون نے (۱۴۰۶ء) میں لکھا ہے کہ جب
تک فن کار نہ ہوں حقیقی فن پیدا نہیں ہوتا۔ زمانہ قبل اسلام میں
بھی پیشہ ور مغنی موجود تھے۔ گو اسلام گانے بجانے کو اچھی
نظر سے نہیں دیکھتا لیکن اس رکاوٹ کے باوجود خلافت کے
زمانۂ عروج میں یہ طبقہ انتہائی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا
عربوں نے موسیقی کے تمام شعبوں کو جو ترقی دی ہے۔ اس کے
اعتبار سے کسی دوسرے ملک تاریخ کا موسیقی کو محض ایک
فن کی حیثیت سے تسلیم کرنا یقیناً کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

عربوں کو ہمیشہ آلاتی موسیقی سے بہت زیادہ حلقی
موسیقی سے شغف رہا ہے۔ اس میں ایک حد تک ان کا پر جوش
ذوقِ شاعری بھی ممد و معاون رہا ہے۔ البتہ اس ترجیح کی وجہ
شرعی نقطۂ نظر بھی تھا جو آلاتی موسیقی (مزامیر) کو پسند نہیں کرتا
حلقی موسیقی میں جو اشعار گائے جاتے ہیں ان میں قصیدے کے
علاوہ بہت سی چھوٹی چھوٹی شکلیں بھی تھیں جیسے قطعہ، غزل یا
زیادہ مقبول عام موال کہتے ہیں۔ مغرب میں دوسری شکلیں
زجل اور موشحہ بعد کو رائج ہوئیں۔ سروں کی ترتیب طرز
کے اعتبار سے ہوتی تھی یا سرگم کے اعتبار سے اور اس کا تال
یعنی ایقاع میں ہونا لازمی نہیں تھا۔ ہر فن کار مشق یا سلیقے
میں گاتا یا بجاتا تھا۔ ہم آہنگی کی اصطلاح جن معنی میں اہل یورپ
بولتے ہیں اس کی شکل اس زمانے میں مفقود تھی۔ اس کی بجائے
عربوں کے پاس سروں کی زینت تھی جس میں بعض وقت سروں
کے پردوں کو ایک ساتھ اس کے چوتھے پانچویں یا آٹھویں
حصے کو چھیڑنا پڑتا تھا۔ یہ عمل "ترکیب" کہلاتا ہے۔ حلقی موسیقی
کے ساتھ جوڑ ملانے کے لیے جو آلات ہوتے تھے ان میں عود
تنبور۔ قانون۔ قصب، نے شامل ہوتے تھے اور طبل
دف یا تنبیب ایقاع کو قوت دیتے تھے۔ یہ آلات موسیقی
کے اصول یا اسلوب سے مطابقت رکھتے تھے۔ چند صدیوں سے

مزامیر بھی ہوتے تھے لیکن اکثر و بیشتر وہ حلقی راگوں میں بطور ابتدا یا وقفہ استعمال ہوتے تھے عربوں کے پاس موسیقی کی شاید سب سے زیادہ اہم شکل "نوبہ" تھی۔ یہ حلقی اور آلاتی موسیقی کی ایک قسم تھی جس میں کئی آتار چڑھاو ہوتے تھے یہ چیز خاص کر مغرب میں ترقی پائی تھی۔ یہاں تک جس موسیقی سے بحث کی گئی ہے اس کو بزمی موسیقی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ہم بعض وقت کثیر تعداد طایفے (سنگت) کا حال بھی پڑھتے ہیں لیکن عام قاعدہ یہ تھا کہ طایفے (سنگت) میں فن کاروں کی تعداد بہت تھوڑی ہوتی تھی۔

جلوس یا قومی مظاہروں کی مناسبت سے میدانی موسیقی عام طور پر زمر، سنئے، بوق، نفیر، طبل، نقارا، نقاصہ اور کاسہ جیسے آلات تک محدود ہوتی تھی۔ قومی طایفوں نے مسلمانوں کے فوجی مظاہروں میں ایک اہم حصہ لیا ہے اور فوجی تدبیروں کے ایک جز کی حیثیت سے اس کا مرتبہ مسلمہ تھا بڑے عہدے داروں کا طایفہ ان ہی سے وابستہ رہتا تھا' اسکی وسعت عہدے دار کے مرتبے و اعزاز پر منحصر تھی اس طرح فوجی نوبہ میں ضربوں یا آوازوں کی تعداد بھی عہدے کے اعتبار سے کم یا زیادہ ہوتی تھی۔

گو موسیقی خصوصاً آلات موسیقی شریعت کی نگاہوں میں مردود تھے لیکن اس کے باوجود موسیقی کا روحانی اثر واضح طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔ صوفی کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ وہ موسیقی کو باطنی انکشافات کا ایک ذریعہ سمجھتا تھا۔ کیوں کہ اس سے وجد آتا ہے اور وجد انکشاف کا ذریعہ ہے یہاں تک کہ درویشوں یا طریقوں کی برداریوں میں موسیقی کا ہونا تو لازمات سے تھا۔ غزالی لکھتے ہیں موسیقی سننے سے جو حالت طاری ہوتی ہے اسکو وجد کہتے ہیں۔ اپنے رسالہ موسیقی اور وجد میں انہوں نے ایک جگہ پوری سات دلیلیں یہ ثابت کرنے کے لیے پیش کی ہیں کہ وجد لانے کے لیے موسیقی خود قرآن سے زیادہ موثر ہے۔ الف لیلہ و لیلہ میں ہم یہ پڑھتے ہیں کہ موسیقی بعض لوگوں کے لیے غذا ہے اور بعض کے لیے دوا۔ یہ خود رائی "موسیقی کے اثر" کے سوال سے پیدا ہوتی ہے۔ اس اصول نے 'خواص اشیا' کے اصول کو ماننے۔ اجرام فلکی کی موسیقی اور اعداد کے نظریے سے مل جل کر اپنی طرف غیر معمولی توجہ منعطف کر لی تھی موسیقی سے علاج کرنے کا یہ عقیدہ کافی مقبول ہے۔

مسرت و خوشی کے موقع پر عوام ہر قسم کے آلات موسیقی استعمال کرتے تھے لیکن عورتوں میں خاص طور پر دف مقبول تھا۔ اس میدان میں جہاں گشت گویوں کے لیے بھی اپنی جگہ موجود تھی۔ اس کے ساتھ عام طور پر طبل اور شاہین ہوتی تھی۔ یہ ایک ہاتھ سے طبل اور دوسرے سے شاہین بجاتے رہتے اپنا سر ہلاتا رہتا تھا جو گھونگرو لگی ہوئی ٹوپی سے مزین ہوتا تھا۔

سمرقند سے لیکر بحر کاہل تک کی مروجہ اصطلاحیں اس بات کا کافی ثبوت بہم پہنچاتی ہیں کہ اس سلسلے میں عربوں نے مغرب میں عملی فن کی بڑی خدمت انجام دی ہے

آلات موسیقی

عربی زبان میں آلات موسیقی کے گوناگوں نام ملتے ہیں۔ لیکن یہاں ان کے دسویں حصے سے بھی بحث کرنا ممکن نہیں ہے عربوں نے تو آلات موسیقی کی صنعت کو فن لطیف کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ مزامیر کی صنعت پر رسالے لکھے جاتے تھے اور بعض شہر جیسے اشبیلیہ مزامیر کی صنعت کے لیے خاص شہرت رکھتے تھے۔ صرف عود کے گروہ میں ہر قسم کی وضع و شکل کے باجے ہوتے تھے۔ زمانہ قبل اسلام کے مزامیر کے علاوہ عربوں کے یہاں عود قدیم بھی تھا جو زمانہ حال کی مستدلمیع کے مشابہ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ عود کامل بھی تھا اور اس کی سب سے بڑی قسم شاہ رود تھی۔ ہم تک جو نمونے پہنچے ہیں ان میں بعض بڑے بڑے مزامیر پر تصویریں بھی بنائی گئی ہیں طنبورے کی قسم میں بعض طنبور ترکی کی طرح بڑے اور بعض طنبورے قلمان کی طرح چھوٹے ہوتے تھے قیشارہ بھی ہوتا تھا جو پہلے مربع کہلاتا تھا یہ ایک چپٹا مستطیل نما آلہ

ہوتا تھا اور یہی بعد کو قیثارہ کے نام سے مشہور رہوا۔ اہل یورپ کے لیے کمانی دار مزامیر زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ پہلے پہل ان سے اہل یورپ رباب کی عام اصطلاح کے ذریعے روشناس ہوئے یہ بھی ہر وضع و شکل کے ہوتے تھے جن میں خاص کر کمانچہ لیرا اور شنک مشہور رہیں۔ تکمی تانت یا تاروں کے مزامیر میں چنگ، صنج، قانون نزہتہ اور نستار ہوتے تھے۔

مزامیر کی چھوٹی بڑی بہت سی قسمیں تھیں ان میں سے نرم سے لیکر جن میں سے بعض کی لمبائی گز بھر بھی ہوتی تھی، شبابہ اور بوق جیسے چھوٹے باجے بھی ہوتے تھے جن کی لمبائی ایک تہائی گز بلکہ اس سے بھی کم ہوتی تھی۔ منہ سے بجانے کے آلات میں زمر، سرنئے، زلالی اور عیطا ہوتے تھے۔ بوق کا شمار منہ سے بجانے والے آلات میں ہے اور یہ دھات سے بنتا ہے۔

گودث کی اصطلاح ہر قسم کے طنبورے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ لیکن جب خاص معنی میں استعمال کرتے ہیں تو اس سے ایک چوکور آلہ مراد ہوتا ہے۔ صنعت و جسامت کے اعتبار سے دائرہ نما باجوں کے بھی بہت سارے نام ہیں جیسے طار، دایرہ وغیرہ۔ ڈھول کی بھی متعدد قسمیں پائی جاتی ہیں جیسے طبل، نقارہ، قصاعہ وغیرہ۔ طبل کو کاسہ کہتے تھے یہ آلہ کھرتال کے لیے بھی استعمال ہوتی تھی اور اس کی چپٹی قسم کو صنج کہتے تھے۔

عرب ریح قوائی (نیو مانک) جیسے ارغنون اور ما قوائی (ہائیڈرالک) دونوں قسم کے سازوں سے واقف تھے اور غالباً دولاب سے بھی درمیانی دور میں یورپی فن داں اس سے بخوبی تھے۔ یہ زمانہ حال کی ہرڈی گرڈی اور عربی الشعرہ کے مشابہ ہوتا تھا۔

یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اہل عرب کئی آلات موسیقی کے ایجاد کرنے والے اور قدیم آلات میں اصلاح کر کے ان کو ترقی دینے والے دونوں تھے ہمارے پاس بہت سی شہادتیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ رباب اور قانون کا موجد (معلم ؟) فارابی۔ (سنہ ۹۵۰ء) ہے ابتدائی نویں صدی عیسوی میں زنام نے نرکل سے بجانے کا ایک آلہ ایجاد کیا جو سنے زنانی یا زلالی کہلاتی ہے زلزل (سنہ ۷۹۱ء) عود الشبوط کا موجد ہے۔ خاکم ثانی (سنہ ۹۶۱ء) نے منہ سے بجانے والے باجے بوق میں اصلاح و ترمیم کی سندیا (ابتدائی نویں صدی عیسوی) نے بھی ایک خاص قسم کا عود ایجاد کیا تھا۔ البیاسی عبدالماجد (گیارھویں صدی عیسوی) دونوں ارغنون ساز تھے اور صفی الدین عبدالمومن نے (سنہ ۱۲۹۴ء) ایک چوکور سرودی باجہ ایجاد کیا جو نزہتہ کہلاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے ایک اور ساز بھی ایجاد کیا تھا جو مغنی کہلاتا ہے۔

گو نویں صدی عیسوی کے ابتدائی زمانے ہی میں کسی نہ کسی قسم کی ترمیم پیدا ہو چکی تھی لیکن اکثر مغنی یہ فن کانوں ہی کے ذریعے حاصل کرتے تھے۔ بعض مغنی اس بات کا یقین رکھتے تھے کہ ان کو جنوں کے ذریعے راگوں کا الہام ہوتا ہے۔ عرب مغنیوں کا لباس اور ان کی وضع قطع بھی قابل توجہ ہے۔ لانبے بال، رنگا ہوا چہرا، رنگے ہوئے ہات، گہرے رنگ کا لباس —— یہ سب چیزیں اس جماعت کو متاثر کی ہوئی تھیں یہ چیزیں شاید ابتدائی اسلامی عہد کے مخنثوں کی یادگار تھیں مغنیوں میں بہت سے آختہ ہوتے تھے۔ بعض بطور سزا ایسا کر دیے جاتے تھے اور بعض کو غالب لڑکوں کی سی آواز پیدا کرنے کے لیے آختہ کر دیا جاتا تھا جو بہت پسند کی جاتی تھی۔ خلیفہ کے دربار میں کسی مغنی کی سرپرستی صرف فن ہی کی وجہ سے نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کی سیاسی افادیت کی بنا پر بھی مغنی ایسے پیشہ کی وجہ سے بہت سے ایسے گھروں میں بھی بار پا جاتا تھا جہاں اکثر شراب کا ایک جام کسی سیاسی اہمیت کا راز فاش کر سکتا تھا۔ علاوہ ازیں بہت سے ایسے خیالات بھی تھے جو بہ نسبت کسی اور ذریعے کے راگ کے توسط سے زیادہ موثر طور پر پھیلائے جا سکتے تھے۔ چنانچہ اور علاقوں کے لوگ جو عرب کی تقلید کرنے لگے تھے اپنی محنت کا صلہ اس طرح وصول کرتے تھے

ابو النصر خالدی ایم۔ اے (علیگ)

بنگالی زبان کا ارتقا

بنگال ہندستان میں آریائی تہذیب کا قدیم مرکز ہے پراگ جیوتش کی ماقبل تاریخی ریاست جو موجودہ جلپائی گوڑی سے آسام کے آخری جنگلوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس ملک کی سب سے پہلی آریائی نوآبادی تھی۔ رامائن اور مہابھارت کی مقدس کتابوں میں بھی اکثر مقام پر اس کا ذکر ہے۔ "منو" کے مطابق یہ آریاورت کا ایک حصہ تھا۔

یہ خطہ زمین میں ابتدا ہی سے مذہب کی عمومی تحریکوں کا گہوارہ رہا ہے۔ ایک زمانے میں بدھ اور جین مت والوں نے تقریباً ساری آبادی کو اپنے نئے عقاید میں رنگ لیا تھا اور برہمنی تحریک پر صدیوں جمود کی حالت طاری رہی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بنگال کی سرزمین نئے مذہبی عقاید کی بار آوری میں ہمیشہ زرخیزیت کا ثبوت دیتی رہی ہے۔ ۲۴ تیرتھنکر (مقدس بزرگوں) میں سے ۲۳ نے بنگال میں مکش (مکتی) حاصل کی۔ انکی ریاضت کا مقام "سمت شیکھر" پہاڑیاں تھیں جو ضلع ہزاری باغ میں واقع ہیں۔

یہ ملک ہندو تقلید پسندی کے خلاف صدیوں کھلی بغاوتوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ بدھ مت اور جین مت کے اثرات اس قدر زیادہ غالب تھے کہ "منو" کے قوانین چھوت کے خوف سے ہندوؤں کو بنگال جانے سے روکتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برہمنیت ایسے ملک میں جہاں بدھ مت کے بکثرت نمایندے موجود تھے کئی ہزار سال تک پنپ نہ سکی۔ دسویں صدی کے اواخر میں بدھ مت کے پیروؤں نے پراکرت میں کتابیں لکھنا شروع کیں۔ اس پراکرت کو کرشن پنڈت نے جو صرف و نحو کا زبردست ماہر تھا۔ "پیشاچ پراکرت" کا نام دیا یعنی ایسی زبان جو بھوتوں میں بولی جاتی ہے۔ آخر ایسا حقارت آمیز نام کیوں دیا گیا۔ یہ کوئی راز نہیں۔ بات یہ ہے کہ بدھ مت والوں کی بولی جسمیں بدھی پیروان مت کتابیں تصنیف کر رہے تھے انہیں سنسکرت اسکول کے لوگ ہرگز قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے جسے بدھ مت کے احیا کے ساتھ فروغ ہوا تھا۔ اس ابتدائی بنگالی زبان میں گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی کے درمیان متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ یہ چھوٹی مکمل اور نامکمل کتابیں تانتری بدھیوں کے ہاتوں اپنے عقاید کی تبلیغ کے لیے تصنیف کی جا رہی تھیں۔

لیکن بدھ مت والوں کی یہ کوششیں کہ بنگالی زبان کو ادبی حیثیت دی جائے سرد پڑ گئیں اس لیے کہ بنگال میں ہندو مت کی تحریک کا دوبارہ احیا ہو رہا تھا۔ اور اس کے بعد بدھ مت کے نمایندے مایوس ہو کر اپنی تصنیفوں کے ساتھ نیپال اور برما میں جا بسے۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ بدھ مت کو ہندستان میں ہر مقام پر برہمنیت کے مقابلے میں شکست ہوئی۔ ششکر وجے اپنی ایک تاریخی کتاب میں لکھتا ہے:-

"بدھ مت کے بڑے بڑے عالم جو بدھ کے غیر مہذب اصولوں کی تبلیغ کرتے تھے انہیں اکثر عالمانہ مباحثوں میں شکست اٹھانی پڑی اور تب ان کے سر تیر سے تراش کر کونڈی میں ڈال دیے گئے اور ان کے جسم کو کوٹ کر ریزہ ریزہ کر دیا گیا۔ اس طرح یہ زہریلے عقاید ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو گئے اور ملک پھر ایک بار خطرے سے آگاہ ہو گیا۔"

بنگال میں بدھ مت کے زوال اور اس کے پیرووں کے منتشر ہو جانے کے بعد اس نئی پروان چڑھتی ہوئی زبان کا کوئی سرپرست نہ رہا۔ سنسکرت ادبا۔ جنہوں نے ہندو مت کو نئی تابندگی دی اور جنہیں کلاسیکی قدیم قواعد کا اعلا مذاق تھا۔ بدھ مت والوں کی رواج دی ہوئی پراکرت کو نہایت حقارت سے دیکھتے تھے۔ ایسے پنڈت کی موجودگی میں "بنگالی" کا مستقبل نہایت تاریک تھا۔ یہی نہیں بلکہ جو لوگ اس مقامی زبان کو ترویج دینے اور اسے کتابی زبان بنانے کی سعی میں تھے۔ سنسکرت جاننے والے بڑی شدت سے انکی مخالفت کرتے تھے۔ ذیل کا مشہور سنسکرت عبارت ان کے باغیانہ پن کی سچی تصویر ہے:-

اگر کوئی پرشس "اٹھارہ پران" یا رامائن کی داستانیں بنگالی زبان میں سنیگا تو اسے نرکھ میں ڈالدیا جائے گا"۔

متذکرہ بالا بحث وتمحیص سے یہ بات قارئین پر ظاہر ہوگئی ہوگی کہ برہمن بنگالی زبان کی تدریجی ترقی سے بہت رشک کرتے اور اس کا کتابی زبان ہوجانا تو انہیں کسی طرح گوارا نہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے مذہب کے تمام حقایق سنسکرت کتابوں ہی میں مقفل رہیں۔ ان حقایق کا کسی دوسری عام پسند زبان یا مقامی بولی کے ذریعے عوام میں مشتہر کرنا گویا اس بڑی طاقت سے ہاتھ دھو بیٹھنا تھا جس کا اجارا انہوں نے لے رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس ملکی زبان کو پھولتی پھلتی اور پروان چڑھتی دیکھنا نہ چاہتے تھے۔ علاوہ اس کے نہ صرف سنسکرت جاننے والے لوگ اس کے خلاف تھے بلکہ خود بنگالی لکھنے والوں کی رائے اس زبان کے سرمایے اور وسایل کے متعلق کچھ اچھی نہ تھی۔

سوال یہ ہے کہ پھر اس غریب مقامی زبان نے برہمنوں کی لعنت کے باوجود راجاؤں کے دربار میں کس طرح بار پایا۔ اس زمانے میں ہر ہندو دربار کا یہ معمول ہوگیا تھا کہ وہ اپنی زینت اور شان وشوکت کے لیے چند سنسکرت علما اور اہل ہنر رکھتا تھا اور راجا بکرماجیت کے عہد سے تو ہر ہندو راجا کے لیے یہ لازمی ہوگیا کہ اس کے دربار میں شاعری، ادب، فلسفہ اور منطق کے بڑے بڑے اہل فن ہر وقت موجود رہیں۔ اس طرح یہ راجا مہاراجا زبان وادب کی خدمت کرتے رہے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں بنگالی زبان کے دو شعرا بھارت چند اور رام پرشاد نے بڑا نام پیدا کیا اور راجا کرشن چندر نے انہیں معزز خطابات دے کر انکی بڑی ہمت افزائی فرمائی۔ اس راجا کا بنگالی زبان پر بڑا احسان ہے۔ علاوہ ازیں اس کے جانشینوں اور سرداروں نے بھی کچھ کم توجہ نہیں کی۔ انہوں نے بنگالی زبان کے ابتدائی شاعروں کی سرپرستی قبول کی اور انہیں ہر طرح سے مدد دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ راج درباروں کے سنسکرت پنڈتوں اور عالموں کی مخالفت کے باوجود یہ نئی زبان ترقی کے زینے طے کرتی گئی۔

بنگالی زبان کو ادبی معیار تک پہنچانے میں دیگر متعدد اثرات کے علاوہ مسلمانوں کے حملے کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس لیے کہ اگر ہندو راجا اسی طرح خود مختار رہتے تو بنگالی زبان کا درباروں میں رسائی پانا بہت دشوار تھا۔

تیرہویں صدی کی ابتدا میں پٹھان بنگال پر قابض ہوئے وہ بڑی دور سے آئے اور بنگال کے میدانوں میں قیام گزین ہوگئے۔ اب انہیں اپنے پہاڑوں کو واپس جانے کا کوئی خیال نہ تھا۔ ان پٹھان بادشاہوں نے بنگالی زبان سیکھی اور دست نگر ہندوؤں سے میل جول بڑھا کر ان میں گھل مل گئے۔ ان کی مسجدوں کے گنبد اور مینار۔ مندروں کے ترسول اور کلس کے دوش بدوش آسمانوں تک بلند ہوگئے۔ ہندوؤں کے مذہبی تیوہار۔ درگا پوجا اس دھوم دھام کے جلوس اسی آن بان کے ساتھ نکلتے تھے۔ جس طرح مسلمان محرم، شب برات اور دوسرے تہوار مناتے تھے۔ ان مسلمان حکمرانوں نے یہاں آکر سنسکرت رزمیہ نظموں رامائن اور مہابھارت کا بڑا شہرا سنا اور ہندوؤں کی گھریلو اور مذہبی زندگی پر ان کے غیر معمولی اثرات دیکھ کر انہیں ان نظموں اور ان کے مضامین سے واقفیت حاصل کرنے کی خواہش ہوئی انہوں نے بڑے بڑے عالم ادیبوں کو مقرر کیا کہ وہ اپنی ملکی مادری زبان میں ان کا ترجمہ کریں۔ مہابھارت کا پہلا بنگالی ترجمہ گوڑ کے حکمران نصیر شاہ کے حکم سے کیا گیا جس نے چالیس سال تک بنگال کی سرزمین پر بادشاہت کی۔ دوسرا ترجمہ جس کا مترجم کوندر پرمیشور تھا چٹاگانگ کے صوبیدار پرغل خان کے حکم سے ہوا۔ نصیر شاہ اس ملک کی زبان کا سب سے بڑا مربی تھا۔ ودیاپتی اپنا ایک گیت اسی بادشاہ سے معنون کرتا ہے اور ایک دوسرے گیت میں سلطان غیاث الدین کا نام بڑی عزت کے ساتھ لیتا ہے۔ کریتی واس کو رامائن کے ترجمے کے لیے گوڑ کے کس حکمران نے مقرر کیا تھا اس کا نام بہ تحقیق معلوم نہ ہوسکا۔ بنگالی زبان کا دوسرا بڑا سرپرست حسین شاہ تھا۔ اسی نے کلکتہ کے رہنے والے ایک شخص مالادھر واسو سے "بھاگوت گیتا" کا ترجمہ

بنگالی میں کروایا تھا۔ قدیم بنگالی ادب میں ایسے بہت سے اشارات ملتے ہیں جن سے یہ پایا جاتا ہے کہ ہندو حسین شاہ کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان کو اس پر بڑا اعتماد تھا۔ اس سلسلے میں نکن ٹھاکر کے نام کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو کسی راج کا ایک مسلمان وزیر تھا۔ اس کے حکم سے سترویں صدی کے ایک شاعر سلاول نے ملک محمد کی پدماوت کا ترجمہ نہایت نفیس سنسکرت آمیز بنگالی میں کیا۔ اس شاعر سلاول سے ایک دوسرے مسلم سردار سلیمان کی بہت سی فارسی کتابوں کا بنگالی میں ترجمہ کروایا۔

بہرحال بنگالی زبان کے حق میں مسلمانوں کی اس عظیم الشان سرپرستی اور خدمت کا یہ اثر ہوا کہ ہندو راجاؤں کے درباروں میں بھی اس کی رسائی ہو گئی اور وہ بھی اس کے مربی بن گئے۔ برہمن اس عظیم سلطنت کی مخالفت نہ کر سکتے تھے اور اس لیے وہ جس زبان کو پہلے حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اب اسی کا دم بھرنے پر مجبور ہو گئے۔ بعد میں خود انہوں نے بنگالی میں نظمیں لکھیں اور سنسکرت ادب کے شہ پاروں کو بنگالی میں منتقل کرنے لگے۔

بنگالی حکمرانوں کی اس حمایت اور مربیانہ سرپرستی کا تذکرہ بنگال کی ابتدائی تصنیفات میں جگہ جگہ ملتا ہے اور انہیں کہیں کہیں اس امر کی بھی تفصیل ہے کہ بنگالی شعراؤں کی درباری سرپرستی کس طریقے سے کی جاتی تھی۔ جب شام کے دھندلے سائے سونامورا پہاڑیوں پر جھاڑی دار درختوں کے جھنڈوں پر پھیلنے لگتے۔ صوبہ دار فرغل خاں اپنے ساتھیوں، مصاحبوں اور وزیروں کو فرغل پور ــــ اپنے محل میں بلاتا اور ان کے سامنے مہابھارت کا منظوم ترجمہ شدہ پاٹ سنا کر سامعین سے داد حاصل کرتا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے مسلمانوں کے بعد ہندو راجاؤں نے ان کی پیروی کی اور اسی ریت کو برقرار رکھا۔ اس طرح میتھل شاعر ودیا پتی کے دو اور شیو سمہا اور دوسرے میتھلا حکمرانوں کے مرہون منت ہیں۔ "چاندی" کا نیرجالی مصنف مکند رام "پانکورا" کے "جیسا مرہی" رکھتا تھا۔ "شیوایَن" لکھنے والے رامیشور کو کرن گرہ کے راجا یشونت سمہا کی سرپرستی حاصل تھی۔ گنگا رام کی "دھرم منگل" بردوان کے راجا کیرتی چند کی مرہون منت ہے۔ راجا جے چند نے رامائن کے ترجمے کا کام شاعر بھباتی کے سپرد کیا تھا اور سنسکرت ادب کے دیگر متعدد شاہکار "تپرا" کے راجا کی نگرانی میں ترجمے ہوئے۔

مسلمانوں کے دور میں بنگالی زبان کی تیز ترقی کے دیگر اسباب میں سے دو اہم یہ ہیں۔

(۱) ہندو مت کا احیا۔ جسے "پرانی انقلاب" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

(۲) سولہویں صدی عیسوی میں بنگال کی وشنو تحریک

حقیقت یہی ہے کہ بنگال پر مسلمانوں کے حملے سے قبل ہی بنگالی ادب کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔ اس دور کے چند نامکمل ادبی شہ پارے ہماری رہبری کرتے ہیں۔ یہ حکمت آمیز کہاوتوں اور پر مغز مقولوں پر مشتمل ہے جو گھریلو اور زراعتی مقاصد پر روشنی ڈالتے ہیں انہیں۔ انہیں متصوفانہ طرز کی چھوٹی مختصر کتابیں بھی ہیں جو بدھمت کے تانتری اصولوں پر لکھے گئے ہیں۔ بنگال کے پال راجاؤں کی عظمت میں بہت سے گیت اور نظمیں بھی موجود ہیں۔ چند ایسے مجموعۂ قصص اور گیتوں کا بھی پتا چلتا ہے جو دھرم ٹھاکر اور دوسرے خاندانی دیوتاؤں کی بہادری کی تفسیر ہیں۔

بنگال کی سب سے پہلی کتاب جو بدھمت کے اثرات کی آئینہ دار ہے "وکار نو" ہے۔ یہ قدیم بنگالی زبان میں ہے۔ اور اس میں زراعت، نجوم، طب اور دیگر گھریلو زندگی کے متعلق بہت حکیمانہ مقولے اور کہانیاں درج ہیں۔ ڈاکر چین اس نوع کی دوسری تصنیف ہے۔ ان میں جو کہاوتیں درج ہیں ان میں بدھ عقائد کے نقوش کو نمایاں طور پر اجاگر کیا گیا ہے۔ تیسری قابل ذکر کتاب کا نام "خانا رچن" ہے۔ یہ تصنیف قدیم بنگالی بھاشا میں ہے اور عوام میں بہت زیادہ مقبول ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان میں ڈاکر وچن کی بہ نسبت زیادہ تغیر و تبدل کیا جا چکا ہے۔ پہ لسنو

اور فرسودہ اسلوب بیان میں بنگالی ادب کے ارتقائی نقوش صاف نظر آتے ہیں۔ بنگال جیسے ملک میں جہاں آبادی کا بیشتر حصہ دیہاتوں پر مشتمل ہے۔ یہ کہاوتیں ضرب المثل اور مقولے وہی رنگ اختیار کر چکے ہیں۔ ڈاک وچن میں علاوہ دیگر امور کے عورت کی فطرت پر تنقید کے بہترین نمونے موجود ہیں۔

"شوہر گھر کے اندر ہے بیوی گھر کے باہر دروازے پر بیٹھی ہے۔ وہ اپنا سر چاروں طرف گھماتی ہے اور مسکراتی ہے۔ ڈاک کہتا ہے ـــ ایسی بیوی کے ساتھ شوہر کی زندگی محفوظ نہیں۔"

چولھا باورچی خانے میں ہے لیکن گھر والی کھانا گھر کے باہر پکاتی ہے۔ وہ اپنی چھوٹی زلفیں پھیلاتی ہے اور ایک بڑی گرہ میں انہیں باندھ دیتی ہے اور بار بار گردن پھیر کر پیچھے دیکھتی ہے (جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو) وہ پانی سے بھرا ہوا گاگر خالی کر دیتی ہے اور اسے دوبارا بھرنے کے لیے پنگھٹ پر جاتی ہے راہگیروں پر ترچھی نگاہیں ڈالتی ہے اور اپنی سہیلیوں سے باتیں کرتے وقت نظریں بچا بچا کر آنکھوں آنکھوں میں اجنبیوں سے سرگوشیاں کرتی ہے۔ وہ شام کا دیا جلاتے وقت اپنے سر کو ہلاتی ہے۔ ایسی عورت کو گھر میں نہ رکھنا چاہیے

بنگال کا آسمان موسم بہار کے آغاز میں صاف اور شفاف سرما میں دھندلا اور برسات میں بکھرے ہوئے بادل اور چمکیلی بجلیوں سے بھرا ہوتا ہے۔ موسم کی یہ خوشگوار تبدیلیاں دل کے تاروں کو چھیڑ کر فطرت کے گہرے مطالعے کی دعوت دیتی ہیں۔ یہ مختلف موسم، انسانی طبایع۔ وہاں کے کھیت، رنگ برنگ پھول، درخت اور ان کے پتوں پر مختلف طریقوں سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہاں زندگی ماہ بماہ تبدیل ہوتی ہے اور فطرت اس دلفریب خطہ زمین کے خوبصورت اسٹیج پر بارہ حسین پیکروں میں بے نقاب ہو کر رقص کرتی ہے ـــ چنانچہ بارہ ماسا یا بارہ مہینوں کا بیان اس پہلے دور کے قدیم شعرا کا پسندیدہ موضوع رہا ہے جو ہر مہینے کے کیفیات رنج و مسرت کو

تفصیل بیان کرنے میں کبھی تھکتے نہیں دکھائی دیتے۔

بدھ کے مندر میں بدھ کی مورت کی پوجا اسی طرح کی جاتی ہے جیسے شیو کی۔ بدھ مت کی مذہبی کتابوں میں ہندو پروہتوں نے اس قدر اصلاح اور ترمیم کی ہے کہ اب وہ عوام کی نظروں میں ہندوؤں کی اپنی مذہبی نظمیں خیال کی جاتی ہیں۔ تاہم یہ کتابیں بلاشبہ ابتدا بدھ مت اسکول ہی کی ہیں۔ دھرم منگل نظمیں اس کا ایک عمدہ مثال ہے۔ دھرم ٹھاکر جس کی برتری بزرگی اور عظمت کی تعریف میں اصل ابتدائی نظمیں لکھی گئیں۔ بدھ کی قائم مقامی کرتا ہے اور بدھ مت جتھے میں دوسرا درجہ رکھتا ہے، رامائی پنڈت نے بھی شونی پران میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں خود دھرم منگل نظموں میں بدھ مت کے مینا ناتھ۔ گورا ناتھ۔ ہادیپ اور کانوپ جیسے رشیوں اور بزرگوں کا ذکر جگہ جگہ آتا ہے۔ وہ دنیا یا تعلیم جو شونیا باد کہلاتی ہے اور جو تخلیق و آغاز کائنات کی تشریح کرتی ہے آگے چل کر بدھ مت اسکول کی اصولی غور و فکر کا میدان بن جاتی ہے اور اس اصولی مسئلے کی توجیہ و تشریح نہ صرف شونیا پران بلکہ دھرم منگل نظموں میں تفصیل کی گئی ہے۔

اوپر بیان کر چکا ہوں کہ دھرم ٹھاکر کی شان میں لکھی ہوئی نظمیں ہندو پروہتوں اور پجاریوں کے ہاتھوں تغیر و تبدل کی جا کر ان میں ہندو خیالات بکثرت داخل کر دیے گئے لیکن باوجود اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۴۰۰ قبل مسیح تک برہمن پجاری اس خیال سے کہ ان کا دھرم نشٹ نہ ہو جائے دھرم ٹھاکر کے پیروؤں میں زیادہ گھل مل نہ سکے۔ اور اسی سال مانک گنگولی نامی ایک برہمن کو دھرم ٹھاکر کی طرف سے سپنے میں فیضان ہوا اور یہ القا ہوا کہ دھرم منگل لکھے تو یہ شاعر دہشت زدہ ہو کر منہ کے بل گر پڑا اور کہا اگر میں نے آپ کی مدح میں کوئی نظم لکھی تو میں ذات کے باہر ہو جاؤں گا۔ اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ درحقیقت میں دھرم ٹھاکر کے لیے ہندو مندر میں کوئی جگہ نہ تھی۔

دھرم منگل گیت جو دھرم دیوتا کی شان و توصیف میں ہیں

ان کے مصنفین متفقہ طور پر تسلیم کرتے ہیں کہ میور بھٹ اس موضوع کا سب سے پہلا شاعر ہے۔ میور بھٹ کا زمانہ ٹھیک ٹھیک نہیں بتلایا جا سکتا۔ البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے حملے سے کچھ پہلے تک وہ بقید حیات رہا۔ سیتا رام جو پندرہویں صدی عیسوی کے ایک دھرم منگل کا مصنف ہے میور بھٹ کے ایک گیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہ (گیت) دقیانوسی تھا اور زمانے کے امتداد کے ہاتھوں مسخ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میور بھٹ دھرم منگل کا باوا آدم — سیتا رام سے کم سے کم چار سو سال قبل جنم لے چکا تھا۔

ان نظموں کی بنیاد تخلیقی طور پر بدھ مت کی روحانیت پر تھی لیکن ہندو برہمنوں کے ہاتھوں میں اپنی اصلیت سے بہت دور ہو گئیں۔ دھرم منگل گیتوں میں سے اکثر مینا کے راجا لاوسین کی دلیرانہ شجاعت اور اس کے کارناموں سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہ موضوع تاریخی ہے۔ لاوسین کے محل کے کھنڈرات (مینا گڑھ) میں اب تک دیکھے جاتے ہیں۔ اچھا سے گھوش کا بڑا قلعہ بنکورا ضلع میں اپنے ندی کے کنارے اب بھی اپنی بربادی کی داستان دہرا رہا ہے۔ کالی کا مندر بھی جو شیام روپ کہلاتا ہے اور جہاں اچھا سے پوجا پاٹ کیا کرتا تھا۔ اسی مقام پر نظر آتا ہے۔

دیہاتی رزمیہ دھرم منگل نظموں کو ابتدائی ایام میں دہقانی لوگ لے سے پڑھتے اور گایا کرتے تھے۔ گو ادبی حیثیت سے ان کی کوئی اہمیت نہیں لیکن مسلمانوں کے حملے سے پہلے کے واقعات کی اجمالی تفصیل سے مملو ہیں اور بلحاظ مواد تاریخی نہایت بیش بہا ہیں۔

میور بھٹ جیسا کہ کہا جا چکا ہے دھرم منگل گیتوں کا پہلا خالق ہے۔ اس کے بعد کیلا رام، روپ رام، رام چندر، شیام پنڈت، رام داس، چکرورتی اور دوسرے شاعروں نے بدھ مت کی ان کہانیوں کو جو ابتداً دھرم ٹھاکر کو عظمت دینے کے لیے لکھی گئی تھیں رفتہ رفتہ اپنا کر کے ہندو والیا۔

شاعر ورندا بن داس اپنی مشہور بنگالی تصنیف چیتنیہ بھاگوت میں ایک نئے قسم کے گیتوں کی طرف اشارا کرتا ہے جو بنگال کے بعض پال راجاؤں کی شان میں لکھے گئے تھے۔ مہا پال کی حمد میں مدن پال کا سی لوح کتبہ اس بیان کی تصدیق کرتا ہے کہ مہا پال کی رشتانہ زندگی اور جنگجو روش نے — جیسے شیو ثانی کا درجہ ملا تھا — بنگال کے عمومی گیتوں کے لیے ایک پسندیدہ موضوع کی بنا رکھی۔ بعد ازاں جب شیویانہ خیالات کو فروغ ہوا تو مہا پال کے نام کو شیو کے نام سے بدل دیا گیا۔

پال راجاؤں کی مدح کے یہ مقبول عام قصیدے ان کے مرنے کے بعد ہی لکھے گئے لیکن یہ حالت میں ہمیں ملتے ہیں وہ زیادہ قدیم نہیں ہے ان کی زبان قابل لحاظ طور پر زمانہ حال کے رنگ میں رچی ہوئی ہے۔ ان گیتوں کو بیشتر زمینی دیہاتو میں کورس کی صورت میں گایا کرتے تھے ان کی مقبولیت اسی طبقے میں بہت زیادہ تھی۔ یہی وجہ ہوئی کہ زمانے کے انقلاب کے ساتھ ان کی روایتوں میں دہقانوں کے نقطہ نظر اور ان کے مذاق کے مطابق تبدیلیاں ہوتی گئیں۔

ان گیتوں میں شاعرانہ لطافتیں اور نزاکتیں بہت کم ہیں۔ یہ دیہاتی شاعری کے اجڈ اور بھدے تخیلات کا مظہر ہیں۔ استعارے اور تشبیہات جن سے اسلوب نگارش کو آراستہ کیا گیا ہے عام اور پیش پا افتادہ ہیں۔ جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ دیہاتی لوگ ان کلاسیکی معیارات سے بالکل بے بہرہ تھے جو اب ہندو سماج کے نچلے طبقوں میں بھی عام نظر آتے ہیں۔

اب میں "مانک چندر راجا رگان" کا ذکر کروں گا یہ ایک بے ڈھنگی نظم ہے جو سر سے پا تک ایک لطیف ہندو گداز میں ڈوبی ہوئی ہے جسے پڑھ کر دل لذت یاب ہوتا ہے اور آنسو بھی بہاتا ہے۔ اودنا گوپی چند کی بدنصیب بیوی ہے وہ جوگی بن کر اسے چھوڑ رہا ہے۔ بیوی اپنے پران ناتھ کے چرنوں پر روتی ہوئی گرتی ہے۔ اور ایک مخلص ہندو دھرم پتنی کی طرح کہتی ہے۔

"اے راجا مجھکو چھوڑ کر کسی دور دراز مقام پر نہ جا۔

یہ ٹھنڈا مکان۔ یہ وسیع ناقابل بیان خوبصورت بنگلہ میں نے کس کے لیے بنوایا ہے۔

کیا تم مجھے میری جوانی میں چھوڑ جاؤ گے۔ میری جوانی اب کس کام کی۔

اے میرے من کے نگینے! اب میری کھلی ہوئی باہیں ہمیشہ خالی رہیں گی۔

میرے پڑوس کی جوان اور بن بیاہی سکھیاں اپنے اپنے شوہروں کے سنگ رنگ رلیاں منائیں گی۔

میں ابھاگن سنسان خالی مکان میں رویا کروں گی۔

اے راجا!۔۔۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔

میں تمہارے ساتھ رہ کر تمہارے انمول جیون کی نگہبانی کرونگی

جب تمہیں بھوک لگے گی۔ میں کھانا پکاؤں گی۔

میں تمہیں پانی پلاؤنگی جب تم پیاسے ہوگے۔

ہنسی اور کھیلوں میں ہم اپنا بہت سا وقت بتا دیں گے۔

ہم کھلے میدانوں میں چہل قدمی کریں گے اور دلچسپ باتوں میں اپنی تھکن کو بھلا دینگے۔

لیکن جب ہم لوگوں کے مکانوں کے قریب پہنچیں گے تو میں تمہیں اپنا گرو ظاہر کروں گی

جب تم آرام کرنا چاہو گے میں ایک ٹھنڈی بوریا تمہارے لیے بچھا دوں گی۔

تم تکیے پہ سر رکھکر لیٹ جاؤ گے اور میں دھیرے دھیرے تمہارے پاؤں دبا کر کتنا خوش ہونگی۔

موسم گرما میں تمہیں پنکھا جھلوں گی۔ ماگھ کے سرد مہینے میں میری گرم باہیں تمہیں حرارت پہنچائیں گی۔"

گوپی چند کہتا ہے:۔

جوگیوں کا ساتھ دینا بہت مشکل ہے۔ تمہیں ایسے ایسے پرخار راستوں اور ایسے ایسے جنگلوں میں سفر کرنا ہوگا جو شیر اور آدم خور جانوروں سے بھرے ہوئے ہیں۔"

رانی جواب دیتی ہے:۔

مجھے بہلانے کے لیے یہ جھوٹے بہانے ہیں۔

ایسی بے بنیاد باتوں پر کیونکر یقین کر سکتی ہوں۔

تم میرے لیے انجیر کا درخت ہو گے اور میں بیل بنکر اس پر چھا جاؤں گی۔

جب میں اپنے باپ کے گھر کنواری تھی راجکمار! تم نے اسی سمے جوگی کا بن لے کر کیوں نہ دنیا کو تیاگ دیدیا۔

اب میں کنواری نہیں رہی۔ جوان ہوں اور تمہاری محبت کے قابل ہوں۔

اگر اب تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے تو میں نراس ہو کر خودکشی کر لوں گی۔"

علی احمد بی۔ اے (متعلم)

سرکس گرل
بریج رانی - بابراؤ

جوانی کی پکار
ایک سوشل فلم

جنگل کی شہزادی
جان کاوس - تاڑیا

حیدر آباد کا مرکزی سینما جو اپنی نوعیت کے
بہترین اسٹنٹ فلموں کیلئے مشہور ہے
کرشنا ٹاکیز
گلزار حوض

مرزا رسوا کی ایک نایاب مثنوی

سنہ ۱۹۳۶ء میں میرے عزیز دوست میر تراب علی خاں حیدرآباد نے اپنے ذخیرے میں سے امراؤ جان ادا کا ایک مختصر رسالہ جنون انتظار یعنی فسانہ مرزا رسوا مجھے دیا تھا جس پر میں نے ایک سرسری مضمون "امراؤ جان ادا اور مرزا رسوا" کے عنوان سے لکھا جو ادبی دنیا کی جولائی سنہ ۳۶ء کی اشاعت میں طبع ہوا اور دوستوں نے بہت پسند کیا۔ باز صاحب نے اب ایک اور نایاب مثنوی مرزا رسوا کی میرے حوالے کی ہے اگر مثنوی آپ حضرات کو پسند آئے تو مرحوم کے لیے دعا فرمایئے اور اگر مضمون پسند آئے تو باز صاحب کی بلند پروازی کی داد دیجیے

یہ مثنوی ہاف رایل پاکٹ سائز کے ۴۰ صفحات پر ختم ہوئی ہے جس کا مسطر (۲۱) سطری ہے اس کا سرورق بھی نہیں ہے جا بجا "مثنوی امید و بیم" نام ہے سنہ ۱۸۹۶ء کی تصنیف ہے غالباً اشاعت بھی اسی سال ہوئی ہے۔ ایک مختصر سا دیباچہ بھی ہے جو نقل کیا جاتا ہے۔

کون پہچان سکے تیری ذات۔ اصل توحید ہو جب نفی صفات ما عرفناک ہے قول سید۔ ان پہ اور آل پہ ان کی صلوات

خدا کی قدرت میں اکثر چیزیں چشم ظاہر بیں کو غیر منظم معلوم ہوتی ہیں حالانکہ وہی ان کا عین انتظام ہے۔ عجب نہیں کہ یہ مختصر نظم بھی اس کلیہ سے خالی نہ ہو، حسن تالیف کے ملاحظہ کے لیے سلیقہ فہم سخن شرط ہے۔

جزو اول میں ان آرزوؤں کا ذکر ہے جو کبھی پوری نہ ہونگی اور ان حسرتوں کا بیان ہے جو دل ہی دل میں خون ہو جائیں کسی کے تصور سے رمز و کنایت، شکوہ و شکایت کا سلسلہ خواہ مخواہ پیدا کیا گیا ہے۔ اس چھیڑ چھاڑ کی کچھ اصل ہے یا نہیں ہے نہ اس سے ناظرین کو سروکار نہ شاعر کو ضرورت اظہار، صرف اتنا کہہ دینا شاید کافی ہو کہ شکایتیں سراسر غلط اور شکوے بالکل بے جا ہیں۔

یہ ہجر و وصل کیا ذکر ستم کیا — ہماری شاعری کیا اور ہم کیا

جزو دوم میں صنع خدا کی عظمت پر اجمالی نظر کی گئی ہے۔ پھر انسان کے دل و دماغ کا مختصر بیان ہے۔

جزو سوم میں طلسم امید و بیم کی ایک نمایش دکھائی گئی، ختم کلام ایسے تنزل پر ہے جسے نہ مجاز کہہ سکتے ہیں نہ حقیقت۔ شاعر کے خیالات کی تکمیل ناظرین کی وسعت نظر کے حوالے ہے اور تعقیق معترضین کے ذمہ ہمت پر موقوف رکھی گئی ہے دیکھنے والے دیکھ لیں گے اور سمجھنے والے سمجھ جائیں گے۔

لمولفہ

ہم اپنے دل میں خوش ہیں عیب میں کی نکتہ چینی سے
بھلائی کچھ تو سمجھے ہیں برائی دیکھنے والے

لکھنؤ اکتوبر سنہ ۱۸۹۶ء — محمد ہادی مرزا

اس کے بعد عنوان کے عنوان سے نو شعر ہیں انہیں بھی ملاحظہ کیجیے۔

غیرت دامن گلچیں ہے یہ نظم — حیرت جلوہ پردیں ہے یہ نظم
حسن گلدستہ انظار بلند — لطف دیباچہ افکار بلند
نازش فہم سے وقعت اس کی — ستم ایجاد ہے جدت اس کی
دل حاسد کے لیے برق بلا — قلب دشمن کے لیے تیر قضا
نام ہے جس کے ہے عنوان بیاں — جس سے ہے یہ سر و سامان بیاں
ایک ہے خوبی تقریر میں وہ — فرد ہے شوخی تحریر میں وہ
دلبری بھی ہے نزاکت بھی ہے — حسن صورت بھی ہے سیرت بھی ہے
کیوں نہ چاہوں اسے دلدار ہے — کیوں نہ دل دوں کہ دل آزار ہے وہ
جان سے بڑھ کے ہے توقیر اس کی — نسخہ دل پہ ہے تصویر اس کی

اس کے بعد ایک (۷) شعر کی غزل ہے۔

لاابالی ہے طبیعت میری — قیس سے بڑھ کے ہے وحشت میری
لائق رحم ہوں کیا پوچھتے ہو — آنکھ سے دیکھ لو حالت میری
واہ کیا خوب مری عزت کی — اسی قابل تھی محبت میری
یہ تو کہہ دو کہ برائی کیا ہے — کیوں نہ اس راہ پہ آتی طبیعت میری

تم پہ مرتا ہوں یہ سب جانتے ہیں　　اسی باعث سے ہے شہرت میری
اپنی تقدیر پہ شاکر ہوں میں　　تم سے بیجا ہے شکایت میری
یاد ہے یاد ہے اب تک مرنا　　حشر یعنی شب فرقت میری

جز اول کا آغاز ذکر عنوان شباب بہ تمہید حال خراب" سے متاثر ہوتا ہے۔

مدد اے حوصلہ عشق و وفا　　مدد اے ولولہ حرص و ہوا

اس قسم کے گیارہ شعر ادا کر کے "حال خراب" کا ذکر شروع کرتے ہیں۔

سب مرے حال سے باہر ہو جائیں　　آرزوئیں مری ظاہر ہو جائیں
ہاں مجھے حسرت رسوائی ہے　　لوگ جانیں کہ یہ سودائی ہے
حال دل یار سے کہنا ہے مجھے　　شوق اظہار تمنا ہے مجھے
تاکہ ظاہر ہو محبت میری　　پاکبازوں میں ہو شہرت میری
سب مجھے جانیں کہ سودا ہے اسے　　نہ ملے مجھ سے نہ ملنا ہو جسے
مجھکو نفرت ہے ریاکاری سے　　چڑھ ہے عیاری و مکاری سے
دل سے ہوں خادم ارباب وفا　　میری طینت میں نہیں مکر و دغا
حضرت اوج ہیں میرے استاد　　جو کہ ہیں موجد طرز ایجاد
شعر گوئی کو ہے جو ناز ان پر　　شاعر آل محمد جعفر
ہیں وہ یکتا خلف الصدق دبیر　　مرثیہ گو ہے جناب شبیر
مستفیض انکی عنایت سے ہوں میں　　مستفید انکی محبت سے ہوں میں
ایسے ولیوں کی ثنا پر کیا فخر　　ان کی تعریف پہ ہے زیبا فخر
چاروں سے نہیں یہ شوق سخن　　بچپنے سے مجھے ذوق سخن
قدردانوں میں ہے عزت میری　　نکتہ سنجوں میں ہے شہرت میری
مجھکو پہچانتے ہیں اہل ہنر　　جوہری جانتے ہیں قدر گہر
لوگ آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں مجھے　　آرزوؤں سے بلاتے ہیں مجھے
رونق بزم سخن ہے مجھ سے　　زینت صحن چمن ہے مجھ سے
یہ جو ہے مشغلہ تازہ بتاز　　کیا کروں میں کہ طبیعت ہے گداز
دل لگانا کوئی تقصیر نہیں　　دل لگی لائق تعزیر نہیں
دل کی وحشت اثری سے خوش ہوں　　اپنی آشفتہ سری سے خوش ہوں
ایک مدت سے میں سودائی ہوں　　حسن صورت کا تماشائی ہوں

دم نکلتا ہے ستمگاروں پر　　جان جاتی ہے دل آزاروں پر
زندگی حسن پرستی میں کٹی　　غفلت و رندی و مستی میں کٹی
عاشق حسن خداداد ہوں میں　　کشتہ حسرت بیداد ہوں میں
بچپنے ہی میں گنہگار رہا　　بادۂ عشق کا سرشار رہا
اک پری وش پہ طبیعت آئی　　دل یہ سمجھا کہ قیامت آئی
وہ تڑپنا شب تنہائی کا　　وہ بگڑنا دل سودائی کا
اک بت وعدہ فراموش کی یاد　　اور اس یاد میں شوق فریاد
یار سے وعدہ وفائی کی امید　　اپنی آہوں سے رسائی کی امید
ہائے وہ ذلت و خواری کے مزے　　ہائے وہ نالہ و زاری کے مزے
کسی پہلو جو نہ چین آتا تھا　　گھر سے مجبور تڑپ کے نکل جاتا تھا
جان دینے کی قسم کھا لینا　　ہو کے مایوس وہ سم کھا لینا
مگر اس زہر نے تاثیر نہ کی　　کیونکہ یہ خواہش تقدیر نہ تھی
کی عزیزوں نے دوا جان بچی　　بچ گئی جان تو کیا جان بچی
ہو گئے سب کی نگاہوں میں حقیر　　پڑ گئی پاؤں میں بھاری زنجیر
شورش زخم جگر یاد ہے ہاں　　شورش دیدہ تر یاد ہے ہاں
شعر گوئی کی لڑکپن سے ہے دھن　　ہے اسی سن سے مجھے ذوق سخن
یہ تو تھا پہلے پہل کا مذکور　　ہے عزیزوں میں جو ابتک مشہور
آج تک لوگ ستاتے ہیں مجھے　　چھیڑتا ہوں میں۔ چھیڑتے ہیں مجھے
کم نہیں ہیں یہ ستانے کے لیے　　اب بھی ہنستے ہیں رلانے کے لیے
کیا کہوں ان کو دل آزار تو ہیں　　خیر جیتے رہیں غمخوار تو ہیں
دیکھ لی خوب محبت ان کی　　اب ہے بیکار شکایت ان کی

بیان عشق تازہ

پھر ہوا عشق دل مضطر کو　　دو خبر میرے نصیحت گر کو
ہے بہت حال پریشان میرا　　ٹکڑے ٹکڑے ہے گریبان میرا
دھجیاں ڈھونڈھ کے لاسکو تو　　پھر رفوگر کو بلائے کوئی
ہائے وہ ہاتھ سے جانا دل کا　　وہ کسی شخص پہ آنا دل کا

سراپا بھی اسی سلسلے میں نظم کر دیتے ہیں۔

زلف بکھرائے ہوئے تا سر دوش　　چشم بد مست نگہ آفت ہوش
بیوفائی کا نشان چین جبین　　آنکھ میں نام مروت کا نہیں

سانولا رنگ نشیلی آنکھیں   شوخ طرار رسیلی آنکھیں
وہ چھریرا بدن اس کا نازک   سر بسر ناز سراپا نازک
قد وہ بوٹا سا قیامت آفت   فتنہ اٹھنے ہی کو ہے قد قامت
اس کا انداز جو مجھ کو بھایا   اک نظر دیکھتے ہی دل آیا
گو کہ ہیں ہم بھی پرانے عشاق   فن معشوق گری میں ہیں طاق
آنکھ بے شرم نگاہیں بے باک   دل ہوس کوش طبیعت چالاک
چشم کو شوق نظر بازی کا   ادعا اشک کو غمازی کا
مگر اس شوق پہ قابو نہ چلا   کسی عنوان سے جادو نہ چلا
باتوں باتوں میں کیا عہد وفا   میں یہ سمجھا کہ ہوئی ترک جفا
دفعتاً عہد محبت توڑا   غیر سے رشتہ الفت جوڑا
ہم نہ سمجھے تھے کہ ایسے ہو تم   الغرض خوب ہو جیسے ہو تم
تم پہ مرتا ہوں خدا جانے کیوں   چاہتا ہوں تمہیں کیا جانے کیوں
اے مرے دل کے جلانے والے   آگ میں آگ لگانے والے
دل میں جو بات ہے کیونکر نہ کہوں   کیا کہوں تجھ کو ستمگر نہ کہوں
بیوفائی کی بھی حد ہوتی ہے   کج ادائی کی بھی حد ہوتی ہے
تم پہ ظاہر ہے مرا جوش جنوں   چاہتے ہو کہ میں دیوانہ ہوں
چاک کرتا ہوں گریباں اپنا   تم بچاتے رہو داماں اپنا

انھی ہجر و فراق کے جھگڑے میں جزو اول کو ختم کیا ہے۔ جزو دوم "خطاب بہ نفس و طلوع صبح پیری" سے شروع ہوتا ہے۔

اے دل بے خبر اے خانہ خراب   صبح ہوتی ہے نہ ہو مائل خواب
خواب غفلت کا یہ ہنگام نہیں   استراحت کا یہ ہنگام نہیں
جلوہ گر ہے سحر بیم و امید   حیرت افزا ہے طلوع خورشید
دور ہو دور ہو اے یاد شباب   دور ہو دور ہو اے خانہ خراب
اے جوانی نہ ستا تو مجھ کو   یاد اپنی نہ دلا تو مجھ کو
عمر بیکار نہ ہرگز کھو تو   اپنی تقدیر پہ راضی ہو تو
حیف ضائع ہوئے چالیس برس[1]   زندگی اور ہے دس بیس برس[2]

موت کی یاد سے ڈرنا کیسا   قبل مرنے کے یہ مرنا کیسا
ماسوا اللہ کی الفت ہے خبط   ہے یہ مضمون سراسر بے ربط

موتوا قبل ان تموتوا

وہم ہستی سے گذر جاتا تھا   موت کے قبل ہی مر جاتا تھا
موت کیا چیز ہے ترک لذات   ہے اسی موت سے مقصود حیات
رنگ و بو سے نہ ہے کچھ مطلب   تیرے نزدیک یہ معدوم ہیں سب
جز فنا اور نہ ہو کچھ مطلوب   جز خدا اور نہ ہو کچھ مطلوب

با ہمہ و بے ہمہ

غیر سے تجھ کو محبت نہ ہے   زن و فرزند سے الفت نہ ہے
الفت غیر سے ہے یہ مقصود   جس سے ہو ترک خیال معبود
ورنہ ہے عین عبادت الفت   اصل ایمان ہے محبت الفت

محبت بے غرض

چاہیے تجھ کو محبت سب سے   ہاں! مگر ہو نہ کسی مطلب سے
جب غرض ہو تو محبت کیسی   اس محبت سے عداوت اچھی

مسلک صاحبان تسلیم و رضا

ہے یہی مسلک تسلیم و رضا   ہیں اسی راہ پہ سب اہل صفا
جز خدا غیر سے ڈرتے ہی نہیں   جز خدا اور پہ مرتے ہی نہیں
شاد رہتے ہیں صعوبت میں بھی   شکر کرتے ہیں مصیبت میں بھی
ہیں فرشتوں سے وہ رتبے میں سوا   ہیں وہی اشرف مخلوق خدا

ذکر معجزہ ظاہری کہ از حضرت ایشاں پیدا شود

معجزے کو جو کرے تو تحقیق   یاد رکھ اس میں ہماری تدقیق
دیکھو اعجاز حسین ابن علی   تا کہ ہو راز خفی تجھ پہ جلی
روز عاشورا بڑا کام کیا   غور سے دیکھ تو کیا کام کیا
جو زمیں سے نہ فلک سے ہوگا   نہ بشر سے نہ ملک سے ہوگا

مقام صاحبان تسلیم و رضا

دیکھ لے صبر و وفا کے بندے   ایسے ہوتے ہیں خدا کے بندے

---

[1] مرزا صاحب کی ولادت سنہ ۱۸۵۵ء کی تھی یہ مثنوی سنہ ۱۸۹۶ء میں یعنی اپنی عمر کے چالیسویں سال میں کہی ہے۔ — تمکین

[2] مرزا صاحب اپنی زندگی اس کے بعد دس بیس برس کی سمجھتے تھے مگر سنہ ۱۹۳۲ء تک زندہ رہے یعنی ۷۷ سال کی عمر پائی۔ — تمکین

ہیں وہ مقتول رہ عشق و وفا   خود خدا ان کی دیت ہے بخدا
صاحب قدرت اعجاز ہیں وہ   حامل راز ہیں ممتاز ہیں وہ
کیا بتاؤں کہ ہے کیا حال ان کا   خوش ہیں وہ لوگ خوشا حال ان کا
جن کو توفیق خدا دیتا ہے   ان کو ایسوں کی ولا دیتا ہے

دنیا جانتی ہے کہ مرزا رسوا امامیہ مذہب کے پیرو اور مجتہد تھے مگر ان میں مولویانہ تنگ نظری مطلق نہ تھی۔ ان اشعار کو ملاحظہ فرمایئے۔

میں بتاؤں تجھے کیا تھے بہ دلا   اس میں اکثر کو ہوا ہے دھوکا
تو سمجھتا ہے زبانی صلوات   تجھ کو کافی ہے فقط بہر نجات
اس سے مقصود ہے اظہار ولا   ہو مگر دل سے بھی اقرار ولا
یہ تو ہے ان کی مودت سے غرض   اور بھی کچھ ہے محبت سے غرض
عمر بیکار نہ ہرگز کھونا   ان کے اخلاق کا پیرو ہونا
تا میسر ہو تجھے حسن عمل   تیری طینت سے نکل جائے خلل
گو کہ ممکن نہیں ویسا ہونا   کیا ضرورت ہے نکما ہونا
ہاں یہی تصفیۂ باطن ہے   دیکھ ممکن ہے کہ ناممکن ہے
حسن اخلاق ہے عین طاعت   تو اسے ترک نہ کر اک ساعت

نیم ملا

نیم ملا سے تو از حد ڈرنا   ان کی تقلید نہ ہرگز کرنا
ان کی تشخیص ہے از بسکہ سقیم   مار ہی ڈالیں گے یہ نیم حکیم
ظاہر شرع پہ واجب ہے عمل   تاکہ باطن میں نہ کچھ آئے خلل
نہ کہ باطن تو ہو بالکل ابتر   اور ظاہر پہ عمل ہو یکسر

دیکھیے تو یہی ملاؤں کی حقیقت کس مزے سے بیان کی ہے

یہ سمجھتے ہی نہیں مغز سخن   سر بسر جہل سراسر کودن
ان کی معقول ہے وہ نامعقول   جسنے برباد کیے فقہ و اصول
جب ہو کچھ بحث تو لا یعنی دلیل   غیر قوموں میں ہو جس سے تذلیل
جانتے ہی نہیں یہ علم کلام   عقلا کو ہے خطاب ان سے حرام
نہ محقق نہ مناظر ہیں یہ   محض مغرور و مکابر ہیں یہ
کیا بتائیں گے ہمیں راہ نجات[1]   ہیں یہ خود گمرہ کوئے ظلمات
نہ قیاس ان کا نہ عقل ان کی ٹھیک   فلسفہ کفر ہے ان کے نزدیک
اہل تقلید سے رغبت ہے انہیں   اہل تحقیق سے نفرت ہے انہیں

اب مرزا صاحب نے اپنے موضوع (فلسفہ اور منطق) کی طرف رخ کیا ہے دیکھیے کس زور و شور سے للکارتے ہیں۔

فلسفے سے نہ ہو کیوں ان کو عناد   دشمن عقل ہیں یہ اہل فساد
ان کی تفصیل ہے بالکل مجمل   ان کی تاویل سراسر مہمل
انکی صحبت میں ہو ضائع اوقات   بجز ظن سے ہے خالی کوئی بات
اہل حکمت کو برا کہتے ہیں   کچھ سمجھتے نہیں کیا کہتے ہیں
ان کو ہرگز نہ سلجھتے دیکھا   اصطلاحوں میں الجھتے دیکھا
چند الفاظ جو ہیں ورد زبان   ان کو سمجھے ہیں یہ علم دو جہان
جو مسائل کے ہیں بالکل مردود   علم سے ان کے وہی ہیں مقصود
چند باتوں پہ ہے حکمت کا مدار   اور سب زعم ہیں ان کے بیکار
ان کی حکمت ہے فقط خود رائی   نہ قیاسی ہیں نہ استقرائی
مبتدی میں ہے جو بین الدفتین   ان کے نزدیک ہے وہ عین الیقین
رائے ان کی بدلتی ہی نہیں   بحث اس باب میں چلتی ہی نہیں
تجربے سے نہیں ان کو سروکار   نظریات سے بالکل انکار
ان کو آثار جہاں سے کیا کام   ان کو اسرار نہاں سے کیا کام
نہ زمانے کے جز و کل سے غرض   نہ ترقی نہ تنزل سے غرض
اگلے وقتوں سے محبت ہے انہیں   اہل یونان سے ارادت ہے انہیں
سن لیے ہیں جو کچھ ان کے اقوال   بس وہ کافی ہیں پئے استدلال
جو ارسطو نے کہا تھا سچ ہے   جو کتابوں میں لکھا تھا سچ ہے
فکر دنیا سے ہیں از بس مالوف   انکی ہمت ہے اسی پہ موقوف

یہ تھا ملاؤں کا حال۔ اب ذرا مرزا صاحب کی زبانی اپنے زمان کی کہانی بھی سنیے۔

---

[1] جس زمانے میں یہ مثنوی کہی گئی ہے غالباً انہیں دنوں ایک مولوی صاحب نے راہ نجات کے نام سے ایک کتاب چھاپی تھی جسے شایع کی تھی میں سمجھتا ہوں کہ اسی پہ طنز ہے۔ تمکین

بس بس اے خامۂ جادو تحریر / قابل فہم نہیں یہ تقریر
اب جہاں محو ہے خود رائی میں / لطف کیا قافیہ پیمائی میں
کون سنتا ہے ترانے تیرے / وحشت افزا ہیں فسانے تیرے
دل عزیزوں کا دکھا جاتا ہے / رنگ چہروں سے اڑا جاتا ہے
اندنوں ہے یہ نصیحت بیکار / لوگ ہیں جام ہوس سے سرشار
علم و حکمت کی انھیں فکر نہیں / ایسی باتوں کا کہیں ذکر نہیں
اک زمانے کو ہے دولت کی تلاش / علم ہے آلۂ تحصیل معاش
منفعیت کا زمانے میں ہے دور / مادیت نے نکالے ہیں یہ طور
ہے جہاں حرص و ہوا پر مایل / شاد و نادر ہیں خدا کے قایل
وہ جو بنتے ہیں بظاہر دیندار / ان کو ہے حد سے زیادہ انکار
کوئی دل ان کے ٹٹولے تو سہی / راز سربستہ کو کھولے تو سہی
کیا کہوں منہ سے یہ کیا کہتے ہیں / زر کو کم بخت خدا سمجھے ہیں
خود غرض کو یہ سمجھتے ہیں فہیم / خود غلط کو یہ سمجھتے ہیں حکیم
ان کی حکمت نہیں جز کذب و دروغ / ہے جہالت کو زمانے میں فروغ
پختہ کاری کو زبوں کہتے ہیں / ہوشیاری کو جنوں کہتے ہیں
حرص نے انکو کیا ہے گمراہ / رحم و ایثار کو سمجھے ہیں گناہ
معصیت نام ہے ناداری کا / مصلحت اسم ہے عیاری کا
ان کا انصاف ستمگاری ہے / ان کا اخلاق ریاکاری ہے

اب حکمت کے ان مسائل دقیقہ کو سنیے جو ہندستانی نظم میں اس سے پہلے کبھی نہیں آئے۔ ہندستانی شاعری پر ایک الزام اکثر شد و مد سے یہ بھی لگایا جاتا ہے کہ اس میں سوائے چوما چاٹی کے کوئی مضمون نظر ہی نہیں آتا۔ مرزا مرحوم نے یہ مثنوی سنہ ۱۸۹۶ء[1] میں لکھی ہے یعنی آج سے پورے ۴۶ سال قبل۔ غور کیجیے ایک لکھنوی شاعر لکھنؤ اسکول ہی کے ایک استاد اوج کا شاگرد ان دنوں یہ مثنوی لکھتا تھا جب ہندستانی شاعری چوما چاٹی دھتڑ کا اکھاڑا بنی ہوئی کے مضامین کے لیے مخصوص تھی سارا لکھنؤ اس کام میں لگا تھا۔ لکھنؤ تو لکھنؤ دلی اسکول کے شعرا باوجود اپنی ثقاہت کے مخصوص علمی اور فنی مسایل کو شعر سے دور ہی رکھتے تھے۔ ہندستانی شاعری پر الزام لگانے والے ذرا اس حصے کو غور سے ملاحظہ کریں۔ ہماری بدنصیبی سے نہ جانے اس قسم کی کتنی چیزیں کونے کھدروں میں پڑی ہوئی ہیں۔ خدا بھلا کرے جناب ناز صاحب کا کہ انھوں نے اس کو نکالا۔ اور یہ مثنوی چالیس سال کے بعد دوبارہ شایع ہو رہی ہے۔

قابل غور ہیں اسرار وجود / دیکھنا چاہیے آثار شہود
کچھ تو سمجھیں یہ معما کیا ہے / کچھ تو دیکھیں یہ تماشا کیا ہے
ہے جہاں صنعت صانع پہ دلیل / آیۃ اللہ ہے یہ بے تاویل
غور سے دیکھو شہود اشیا / اک تماشا ہے نمود اشیا
دیکھ تو صنع خدا کی عظمت / حیرت افزا ہے فضا کی وسعت
جس میں لاکھوں متحرک اجسام / اک وطیرے پہ ہیں گردش میں مدام
راستوں میں نہ وہ اٹکیں نہ بھٹکیں / اپنے محور سے کبھی ہٹ نہ سکیں
نہ الجھتے ہیں نہ گرتے ہیں وہ / ایک ہی وضع سے پھرتے ہیں وہ
کیوں گریں دوڑ کے چلتے ہی نہیں / حد سے باہر وہ نکلتے ہی نہیں
بیضوی شکل کسی کی تدویر / حرکت جس میں اسے بے تاخیر
متشاکل متزاید حرکات / متباین متشابہ حالات
جرم میں کوئی زیادہ کوئی کم / ایک سے ایک کو ہے ربط بہم
اک نئی شان ہے دیکھو جسکو / کھینچتا ہے یہ اسے وہ اس کو
یہ نہ سمجھو کہ ہیں اتنے تارے / آنکھ سے دیکھے ہیں جتنے تارے
نظر آتے نہیں ہم کو اکثر / جو کہ ہیں حد نظر سے باہر
دیکھو کیا حال ہے سیاروں کا / عجب انداز ہے رفتاروں کا
گردشوں کے لیے میدان وسیع / اک تناسب ہے بطی اور سریع
سینکڑوں شمس ہزاروں اقمار / بلکہ اس سے بھی کہیں بڑھ کے شمار
شمس کے گرد ہیں سایر سیار / گرد سیارہ ہیں دایر اقمار
روشنی سب کو کوئی کم کوئی سوا / ایک سے ایک کرے کسب ضیا

(باقی)

تمکین کاظمی

[1] [illegible]

ہندستانی ادب
حیدرآباد دکن
DELHI

تار کا پتا
"ادب" حیدرآباد دکن
قیمت
ایک پرچا (۸/)

رجسٹرڈ آصفیہ (۱۹۹۱)
رجسٹرڈ برطانیہ
ام (۲۴۴۴۲)
چندہ سالانا (عہ)

ہندستانی ادب

ایڈیٹر:- غلام محمد خاں ام-اے (عثمانیہ)

جلد (۴) | خورداد ۱۳۵۳ف | اپریل ۱۹۴۴ء | نمبر (۷)

فہرست مضامین

ہمارے خیالات

سرپور پیپر ملز حیدرآباد دکن کا کچا چٹھا

نمبر (۳)

ڈائرکٹران کمپنی اور حکومت توجہ کرے

سرپور کے بارے میں ہم اب تک جو بھی لکھتے آرہے ہیں اس کا مقصد یہ ہے کہ کمپنی کے قیام سے ملک کو جیسا چاہیے فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے۔ کمپنی کے جو ڈائرکٹر اپنی بنیا ین ذہنیت اور تنگ نظری کو کام میں لا کر صرف نفع کی طرف اپنی للچائی ہوئی نظریں لگائے رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ اس کمپنی کے منیجنگ ڈائرکٹر کو اپنے حریص اور طماع آقاؤں کی حرص و آز کی آگ بجھانے کے لیے نفع کے نت نئے طریقے سوجھ پڑتے ہیں چاہے ان طریقوں سے ملک کو نقصان ہی کیوں نہ پہنچے ان برے حالات میں جبکہ ملک والوں کو فائدے کی بجائے نقصان پہنچ رہا ہے گورنمنٹ پر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ کمپنی کے متعلقہ افراد اور ملازمین کو توجہ دلائے۔ اس کے بعد بھی حالات نہ سدھر سکیں تو اس کے پورے کاروبار کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔ ہم حیران ہیں کہ آخر حکومت کمپنی کا محض نفع ہی نفع جمع کرنے کی پالیسی اور اس کے عوامی اداروں کو تباہ کرنے والے نیتوں سے باخبر ہو کر اس کے تدارک کا کوئی صحیح حل کیوں نہیں معلوم کرتی۔

آنے والے نمبر میں تفصیلات دیکھیے

مضامین کی کثرت اس میں شک نہیں کہ ہندستانی ادب نے اپنی حیثیت سے ترقی کی طرف قدم آگے نہیں بڑھایا ہے جس کا اصل سبب یہ ہے کہ اس نے اپنے پروپیگنڈے اور پرچار کی طرح اب تک تجارتی اصول پر نہیں ڈالا ہے اور نہ ہی کسی دستکاری کو اس نے اپنا شعار بنایا ہے ظاہر ہے کہ تجارتی نقطہ نظر سے یہ کوئی خوبی نہیں کہلا سکتی بلکہ ایک طرح سے اس کو کمزوری ہی کہنا چاہیے مگر کیا کیا جائے کہ ہم اپنی فطرت اور طبیعت سے مجبور ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بغیر کسی کوشش کے یہ رسالہ علمی ادبی اور تحقیقی ذوق رکھنے والے طبقوں میں آئے دن مقبول و مشہور ہوتا جا رہا ہے جس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم پائے ہوئے لوگوں کی توجہ دن بدن اس طرف بڑھتی جا رہی ہے اور پایہ کے مضامین اس کثرت سے وصول ہو رہے ہیں کہ مضمون لکھنے والوں کی توقع کے مطابق ہم عمل نہیں کر سکتے۔ اور مہینوں انکو انتظار میں رکھنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اچھے اور معیاری مضامین یکدم کثرت سے وصول ہو جائیں تو ہم سب کے سب مضامین ایک نمبر میں تو دے نہیں سکتے ان میں سے کچھ پہلے اور باقی بعد میں دیے جا سکیں گے اور ان کے بعد جو مضمون وصول ہوں انہیں سلسلے وار دینا زیادہ مناسب ہے چنانچہ شروع ہی سے ہمارا یہی عمل رہا ہے اور اب تو ہم اس اصول کی سختی سے پابندی کر رہے ہیں۔ ان واقعات اور حالات کا لحاظ کرتے ہمیں توقع ہے کہ مضمون بھیجنے والے حضرات دیری کا گلا شکوا نہیں کریں گے۔

ایک نیک مشورا یہ نیک مشورا ہم اپنے ان کرم فرماؤں کو دینا چاہتے ہیں جن کی فیاضیوں کی کثرت ہمارے لیے وبال جان بن گئی ہے مضمون لکھنے کا شوق جنون کی حد تک پہنچ گیا ہے اگرچہ ذوق پیدا کرنے کیلیے یہ ضروری ہی نہیں مگر مضمون کو کسی معیاری رسالے میں چھپوانے کا سودا ابھی تو ٹھیک نہیں! ہر وہ طالب علم جو قلم پکڑنا جانتا ہے اور ہر وہ لکھا پڑھا شخص جو غلط سلط چار سطریں لکھ جاتا ہے اپنے آپ کو بلند پایہ مضمون نگار سمجھ کر ضرورت سے زیادہ اپنے ٹکٹ کے ساتھ اس توقع پر مضمون بھیجتا ہے کہ گویا ایڈیٹر خالی بیٹھا ہے اور فقط انہیں محترم کے مضمون کا انتظار تھا۔ "جلد چھاپو، فوراً چھاپو، اسی نمبر میں چھاپو" کا تانتا ایک مرتبہ بندھ گیا تو پھر تار ٹوٹنے ہی نہیں پاتا۔ اس قسم کے

فضول پلندے جمع کرتے کرتے ہم تنگ آگئے ہیں۔ اس لیے ایسے لوگوں کو ہمارا نیک مشورہ ہے کہ جنکی نثر و نظم کو کالی نا کرتے کاغذ کا بیجا استعمال نہ کریں اور نہ ہی غیر ضروری طور پر ہم کو دق کیا کریں۔

پارے پاروں جیسے دلچسپ عنوان کو کچھ عرصے سے ہم نے عمداً اور مجبوراً روک رکھا ہے۔ عمداً اس لیے کہ ہم اس بارے میں ہندستانی ادب پڑھنے والوں کی رائے معلوم کرنا چاہتے تھے اس میں شک نہیں اس سے پہلے بھی ہم نے ایک مرتبہ یہ عمل کیا تھا اس وقت بھی ہمارے ہاں کثرت سے خط وصول ہوئے تھے کہ پارے جیسے دلچسپ حصے کو ہر نمبر میں ضرور دیا جائے۔ اس مرتبہ بھی مسلسل خط چلے آرہے ہیں اور پڑھنے والوں کا تقاضا ہے کہ اس سلسلے کو ہم بند نہ کریں۔ اس لحاظ سے ہمیں بڑی خوشی ہوئی کہ ہندستانی ادب پڑھنے والوں نے واقعی ایک دلچسپ اور مفید چیز کو پسند فرمایا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ پاروں کا حصہ نہ صرف دلچسپی کا سامان بنتا ہے بلکہ اس سے بہت کچھ مفید معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔ اسی لیے شروع ہی میں ہم نے اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے یہ سلسلہ قائم کر دیا تھا۔

اس خصوص میں ہم نے "مجبوراً" کا لفظ بھی استعمال کیا یہ اس لیے نہیں کہ کسی کے دباؤ یا جبر سے ہم نے پاروں کا سلسلہ روک رکھا ہے بلکہ مضامین کی کثرت نے جگہ نکالنے پر ہمیں مجبور کر دیا۔ ہمیں اس بات کا سخت افسوس ہے کہ چھپنے کے قابل مضامین کثرت سے وصول ہو رہے ہیں لیکن کوشش کے باوجود ہم ان مضامین کو جلد چھاپنے سے مجبور رہتے ہیں۔ اچھے سے اچھے مضامین علحدہ کر کے سلسلہ قائم کر دیتے ہیں لیکن اس کے بعد بھی چار مہینے سے پہلے کوئی مضمون چھپائی کی صورت نہیں دیکھ سکتا۔

اس ضمن میں یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ ہماری انتہائی آرزو اور دلی تمنا تھی کہ رسالہ کم سے کم چار جز یا ۶۴ صفحے پر نکالا جائے تاکہ اس طرح حجم کے بڑھ جانے سے اچھے مضامین ہر مہینہ زیادہ تعداد میں چھپ سکیں مگر سخت افسوس اور بڑی مایوسی کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ادارے کے مالی حالات اس بات کی قطعی اجازت نہیں دیتے ورنہ ہم بہت پہلے اس اہم مقصد کی تکمیل کر دیتے۔ اس اسکیم کو کامیاب بنانے کا دار و مدار رسالے کے ان مخلص پڑھنے والوں پر ہوتا ہے جنہیں اپنی زبان اور ادب سے تھوڑی بہت دلچسپی ہوتی ہے اور جو انکی ترقی کی خاطر رسالوں کی گرتی حالت کو سنبھالنا ضروری سمجھتے ہیں۔

صحت ہندستانی ادب کے پچھلے نمبر میں صفحہ ۱۴۲ پر جناب علی اختر حیدرآبادی کی جو غزل چھپی تھی اس کے چھٹے شعر کے دوسرے مصرعے میں ہر دو "مگر" تو "کی بجائے "تھی" پڑھا جائے

تبصروں کی کتابیں اس خصوص میں ہم ایک سے زیادہ مرتبہ اپنے پرچے میں ہم اعلان کرتے آئے ہیں کہ جن صاحب یا ادارے کو اپنی کتاب یا کتابوں پر ہم سے تبصرہ کروانا مقصود ہو وہ براہ کرم ہر کتاب کے دو نسخے روانا کیا کریں۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے بار بار اعلان کے بعد بھی ایک ہی کتاب روانہ کی جا رہی ہے اس لیے انکو ہمارا یہ مشورہ ہے کہ اگر آپ واقعی تبصرہ کروانا چاہتے ہیں تو اور ایک ایک کتاب بھیج دیجئے ورنہ ٹپے کے ٹکٹ بھیجکر کتابیں واپس منگوا لیجئے۔ جوابی ٹکٹ بھیجے بغیر مسلسل خطیں لکھکر ہمیں توجہ دلانے سے کچھ حاصل نہیں۔ امید کہ آگے چل کر تبصرے کی کتابیں بھیجنے والے اس اصول کا ضرور خیال رکھیں گے۔

افسانہ نمبر ہم تقریباً ہر نمبر میں اپنے "افسانہ نمبر" کا برابر اعلان کرتے چلے آرہے ہیں کہ ہمارا یہ افسانہ نمبر [illegible] ۱۳۵۳ف برابر جون ۱۹۴۴ء میں نکلے گا۔ چنانچہ اس خاص نمبر کی تیاریاں ہم نے شروع کر دی ہیں اور اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ہندستان کے چوٹی کے افسانہ لکھنے والوں سے نہ صرف افسانے بلکہ افسانوی ادب کے مختلف پہلوؤں پر مضامین بھی حاصل کریں۔ اس خصوص میں ایک حد تک ہمیں توقع ہے کہ اہم مواد فراہم ہو جائے گا جس کو ہم ایک خاص نمبر کی شکل میں اب سے دو مہینے بعد آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے قابل ہوں گے۔ اس بارے میں اگرچہ سب معیاری لکھنے والوں کے پاس دعوت نامے بھیج دیے جا چکے ہیں جن میں سے اکثر حضرات نے تشفی بخش جواب بھی دیدیا ہے لیکن اس کے باوجود ممکن ہے ہم سے سہو ہوا ہو اور بعض ایسے حضرات کے نام دعوت نامے جاری نہ ہوئے ہوں جن کو بھیجے جانے چاہئیں تھیں ان سے ہم درخواست کرتے ہیں کہ وہ بلا تکلف اپنے مضامین ہمارے ہاں روانا کر دیں

ہندستانی ادب اور املا

کون نہیں جانتا کہ ہندستانی ادب ایک خاص مقصد کو لیے ہوئے جاری ہوا ہے۔ ہندستانی ادب کے نمونے سے ظاہر ہے کہ یہ رسالہ ہندستانی زبان اور ادب کی سچی خدمت اس کی ترقی اور پھیلاؤ کیلیے وقف ہے۔ آج چار سال سے وہ زبان و ادب کی بےغرضانہ خدمت کرتا چلا آرہا ہے۔ شاید یہ کہنا بےجا نہ ہو کہ ہندستانی زبان کا یہی ایک علمبردار ہے حالانکہ ہندستان جیسے بڑے ملک یا برِ اعظم میں جہاں اس ملک کی زبان ہندستانی جو ملک کے ہر صوبے اور شہر میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے جس کی ضرورت اور اہمیت کو دوست دشمن سب ہی محسوس کر رہے ہیں عملی طور پر قدم نہیں اٹھایا جا رہا ہے بلکہ آپس کے جھگڑوں کے باعث ملک کی عام فہم زبان اور عام پسند زبان کی ترقی میں تنگ دلوں کی طرح طرح کے طریقہ پر روڑے اٹکائے جا رہے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ روڑے مخالفت کرنیوالے ہوا ہی کے باعث ایسی زبان کا تعطل کر رہے ہیں بلکہ ان میں سے بعض ہندی یا اردو کے نام نہاد [illegible] کے تحت بھی زبردستی تعطل کر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں زبان کی ترقی کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ سیدھے زبان کو دھکا پہنچتا ہے۔

زبان اور وہ بھی ایک ملک کی قومی زبان کسی خاص جماعت یا طبقے کی ملک نہیں ہوا کرتی۔ یہ بات تو بتلانے کی بھی نہیں جس کو ہر طبقہ والا جانتا ہے کہ [illegible] زبان تو ملک اور قوم کا ورثہ ہوتی ہے جس پر ملک میں رہنے بسنے والے ہر طبقے اور ہر فرد کو برابر برابر کا حق پہنچتا ہے۔ ہندو یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ مسلمان یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندی ہندوؤں کی میراث ہے لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ کیا کسی ہندو یا مسلمان کو یہ کہنے کا حق ہے کہ ہندستانی مسلمانوں یا ہندوؤں کی ملک ہے۔ یہ [illegible] اس لیے کہ ہندستانی [illegible] ہندی والے ہوں یا اردو والے سب کی میراث ہے جس پر ہر ہندستانی [illegible] اپنے آپ کو ہندستانی سمجھتا ہے قانونِ فطرت کے مطابق برابر کا حق حاصل ہے۔

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ کہاں کی حجت ہے کہ "ہندستانی" کو جو ہمارے سارے ملک کی ایک زبان ہے ہندو کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے اردو کو دوسرا نام دے رکھا ہے بالکل اسی طریقے پر مسلمان کہتے ہیں کہ یہ محض دھوکے کی ٹٹی ہے اصل میں تو ہندستانی ہندی کا ایک نیا نام ہے جو ہندوؤں کی مذہبی زبان کا دوسرا نام ہے۔ ہم حیران ہیں کہ آخر ان دونوں جماعتوں کی عقل پر تعصب کے ایسے پردے کیوں پڑ گئے ہیں۔ اور یہ دونوں طبقے کسی چیز کی حقیقت کو پہچاننے اور اس پر غور کرنے کی زحمت کیوں گوارا نہیں کرتے۔ آخر یہ مذہبی تعصب کی جنگ کب تک ہماری تنگ دلی اور اسکے نتیجے ملک کی ایک پھلنے پھولنے والی زبان کو کب تک ترقی سے روکے رہیں گے؟

ہم شروع ہی سے ایک غیر فرقہ وارانہ قومی زبان "ہندستانی" کی ترقی کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ ہماری ہمیشہ کوشش رہتی ہے کہ ہر وہ چیز اور ہر وہ طریقہ جو اس زبان کے بنانے میں مددگار ثابت ہو اس کو جہاں تک ممکن ہو اختیار کر لیا جائے۔ ایک نئی زبان کے بنانے میں جس قدر [illegible] چاہیے بلکہ ہر اصلاح و ترمیم قبول کر لینی چاہیے۔ چنانچہ اسی اصول اور نظریے کے تحت زبان کے بنانے اور اس کو صحیح کرنے کے خیال سے ہم نے اب تک بہت سی نئی چیزوں کا اضافہ کیا ہے جن میں سے ایک "ہندستانی زبان" کے صحیح املا کی تحریک بھی ہے۔

املا میں جدت پسندی کی تحریک کو پیش کیے اگرچہ کافی عرصہ گزر چکا لیکن ہم نے یہ کام بہت دھیرے دھیرے کیا ہے۔ شروع شروع میں جب کہ یہ تحریک ہر شخص کے لیے نئی چیز تھی۔ ہر پڑھنے والا اس اصلاحی شکل کو کتابت کی غلطی یا غلطیاں سمجھ لیا کرتا تھا۔ ان میں سے اکثر لوگ ہمیں ان جانی بوجھی غلطیوں کی طرف توجہ دلایا کرتے تھے۔ اگر ان خطوں میں معقولیت ہوتی اور خط جواب دینے کے قابل ہوتا تو ہم جواب دینے کی امکانی کوشش کرتے تھے لیکن ان لوگوں کے جوابوں کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا جاتا تھا جو کسی چیز پر غور کیے بغیر یا بلا سوچے سمجھے ادارے پر جا و بے جا حملے کر دیتے تھے اور اس طرح اپنی کم علمی کا ثبوت دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے "آدھے حکیموں" کے مشوروں کو سن کر ان کے جوابوں میں اپنا قیمتی وقت کون ضائع کرے گا۔ چنانچہ ایسے سب اعتراض کرنے والوں کے ساتھ ہم نے وہی کیا جو ہم کو اصولی طور پر کرنا چاہیے تھا یعنی ان کے جاہل اعتراضوں یا بے معنی مشوروں کو ردی کی ٹوکری کا نوالا بنا دیا۔

ہم ایک بڑے عرصے سے اس خصوص میں بڑے ہی صبر و تحمل کے ساتھ مخالفت میں ہر ایک بات یا ادبی و لسانی گالیوں کو سنتے چلے آ رہے ہیں۔ ہمارے اس صبر کا ایک ہی مقصد یہ تھا کہ مخالفت کی زہریلی ہوا کے باوجود نئی تحریک کو ادب پہچاننے والی نظروں کے سامنے غور کرنے کے لیے پیش کیا جاتا رہے۔ دیکھیں کہ زبان کی اصلاح اور ترقی کے بارے میں ان کی کیا رائے ہوتی ہے۔

آپ کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ بعض قدر پہچان نظروں نے ہماری اس تحریک کی تعریف کرتے ہوئے اس کو سراہا ہے اور ہمیں یہ نیک مشورہ دیا ہے کہ جہاں تک جلد ہو سکے اس تحریک کو اجاگر کیا جائے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ کسی چیز کو پیش کرنا ہمارا کام ہے مگر اس کو ترقی کے راستے پر ڈالنا زبان اور ادب کے ان ان گنت شیدائیوں کا فرض ہے جو پورے ہندستان کے لیے ایک ہی ملی جلی زبان کے متمنی ہیں۔ جب تک کہ اس تحریک کو اجتماعی شکل میں آگے نہ بڑھایا جائے اس وقت تک اس کا ابھرنا مشکل ہے۔ ہماری تو یہ خواہش ہے کہ ادارہ کے علاوہ ملک کے پورے ادبی رسالے بھی اس اہم تحریک پر روشنی ڈالیں۔

آج کی صحبت میں ہم نے اس عنوان کا صرف تمہیدی حصہ بیان کیا ہے۔ آنے والے نمبر میں ہم وضاحت کے ساتھ اس بارے میں اپنے ان خیالات کا اظہار کریں گے جن کو ایک عرصے سے آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے۔

ہندوستان ہمارا

(اس نظم کو جناب ضمیر صاحب نے چھپوا کر تقسیم کیا ہے جس کی ایک کاپی اس رسالے میں بھی چھپائی کی غرض سے بھجوائی تھی۔ نظم کا موضوع بیان ہے اور یہی خیالات اچھے تھے اس لئے کہ اس سے پہلے اور شاعروں نے بھی اسی میدان میں طبع آزمائی کی ہے۔ نظم اقبال کی مشہور نظم کے خیالات کی آئینہ دار ہے اس میں شک نہیں کہ ایک حقیقت سے اس نظم کے خیالات بہت اچھے ہیں اور بعض جگہ تو شاعر نے کمال سے بھی کام لیا گیا ہے اسکے باوجود معنی اور مقصد کے اعتبار سے یہ نظم قابل قدر ہے۔ سچ پوچھیے تو ملک کو اس قسم کی نظموں، قومی ترانوں کی سخت ضرورت ہے مگر افسوس ہے کہ ہمارے جوان شاعر زیادہ تر عشقیہ میں مبتلا ہیں خصوصاً غزل گوئی جو اس زمانہ میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتی اس پر اپنی قوت ذہنی اور قیمتی وقت کو برباد کر رہے ہیں اگر ہر شاعر ملک کی محبت کے گیت گایا کرے اور قومی ترانے [illegible] تمام ہندوستانیوں میں [illegible] ہندوستانیوں [illegible] مگر ضمیر صاحب [illegible] مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے [illegible] انجام دیا [illegible] کہ ان کا عمل ان کے خیالات کا آئینہ دار ہو۔) ——— ایڈیٹر

زیر سما ہے جنت ہندوستان ہمارا — سب سے قدیم تر ہے نام و نشاں ہمارا
تہذیب یاں سے پھیلی چاروں طرف جہاں میں — ہے زیر بار احساں سارا جہاں ہمارا
شعر و سخن کے جوہر ہر وقت یاں سے نکلے — حاوی تھا ہر زباں پر علم اللساں ہمارا
یونان و مصر و ایران ہم سے سبق ہیں سیکھے — نظم و نسق میں رہا اک ترجماں ہمارا
جاپان و چیں نے ہم سے حاصل کیا تمدن — علم و ہنر ہے ان کا عکس رواں ہمارا
ہیئت کی سب سے پہلی منزل یہیں ہوئی طے — تھا ہندسہ کا بانی پہلا مکاں ہمارا
طب اور حساب سیکھا دنیا نے سب یہیں سے — اب تک بھی سارا عالم ہے مدح خواں ہمارا
شیر و شکر تھے مل کر فاتح کے ساتھ مفتوح — گویا کہ ایک ہی تھا سب خانداں ہمارا
ہم نے بھی کی حکومت ہندوستان کے باہر — برتاو ایک ہی تھا ہر و عیاں ہمارا
انسانیت کا آغاز اس ملک سے ہوا ہے — مسکیں کا اشک شو تھا پیر و جواں ہمارا
توحید مطلق انساں سیکھا عرب سے آخر — واقف تھا پھر بھی اس سے دیدہ وراں ہمارا
دشت حجاز کا ہے مغرب رہین منت — مشرق کا رہنما تھا یہ خاکداں ہمارا
زندوں پہ مہر و شفقت مردوں کی قدر و عظمت — گوتم کا فلسفہ تھا جادو بیاں ہمارا
دنیا کی ناثباتی انساں کی بے بساطی — تھا اعتقاد ان پر جوں جزو جاں ہمارا
بیگانہ و یگانہ دونوں کو ایک مانا — دشمن کو بھی یہ جانا ہے میہماں ہمارا
ظلم و ستم کو ہم نے ہر وقت پاپ سمجھا — رحم و کرم کا گھر تھا جنت نشاں ہمارا
عالم فریفتہ تھا حسن و ادا پہ ہندی — مہر و وفا ہی مسلک تھا جاوداں ہمارا
ہندوستاں کی بیٹی تھی آبرو کی دیوی — قسمت نے رو دیا ہے کر امتحاں ہمارا
جب سے وطن بنایا عربی ہوں یا عجمی — کہتے ہیں صدق دل سے ہندوستاں ہمارا
یارب یہی دعا ہے سب کی ضمیر کے ساتھ — رکھ قائم اور دائم دار الاماں ہمارا

عبدالرحمان خاں ضمیر

قول فیصل

(طویل نظم قول فیصل کا ایک ورق)

عقل ٹھہراتی ہے جس جا وہ مقام آ ہی گیا
وہ مقام راز جس پر گہری بدلی چھائی ہے
زندگی کی نا تمامی کے جہاں کھلتے ہیں راز
کشتیاں طوفان عشرت میں جہاں بہتی نہیں
چیختا ہے دل، غرور زندگی کچھ بھی نہ تھا
جب خداوندی کی پیشانی سے اڑ جاتا ہے نور
ٹوٹنے لگتے ہیں جب گم کردہ راہی کے حجاب
تکمیل جب بچوں کا بن جاتا ہے دنیا کا نظام
جب زبان زندگی پر کانپتا ہے اک سوال
ہر طلسم عیش و عشرت ٹوٹ جاتا ہے جہاں
عبرتوں کے قلب انسانی پہ جب پڑتے ہیں تیر
جب ہر اک فرعون کے دل سے یہ آتی ہے صدا
جب کھلے بندوں بتاتا ہے نظام روزگار
جب زباں سے اپنی خود کہتا ہے پندار حیات

رات گذری صبح کا آخر پیام آ ہی گیا
زندگی دنیا کی جس کے گرد پھرتی آئی ہے
عقل جب کرتی ہے خود بیچارگی کا امتیاز
ارتقا کے بازوں میں جنبشیں رہتی نہیں
علم کہتا ہے شعور زندگی کچھ بھی نہ تھا!
جب بساط عجز پر دم توڑ دیتا ہے غرور!
زندگی جس وقت خود کرتی ہے اپنا احتساب
الاماں کیا چیز ہے فطرت کا وقت انتقام
جس کو سن کر سر جھکا لیتا ہے دانش کا جلال
روح میں چبھتا ہے ایوان امارت کا محال
خواب سے بیدار ہو جاتے ہیں جب روح و ضمیر!
کار دوراں کچھ نہیں سمجھا ہے موسا کا خدا!
ہے کوئی پوشیدہ قوت بھی یہاں سرگرم کار
علم و آگاہی کے دھوکے کھا رہی ہے کائنات!

الغرض گذرا سفر کا عہد، منزل آگئی
کشتی عمر رواں نزدیک ساحل آگئی!

علی اختر

سلطنت بہمنیہ پر ایک نظر

(سلسلے کے لیے پچھلا نمبر دیکھیے)

جہانگیر دکن سے غافل نہیں تھا اور اپنے باپ کے فتح کیے ہوئے ملک کا اس طرح قبضے سے نکل جانا اس کے لیے سوہانِ روح تھا جب اس نے دیکھا کہ پرویز و مان سنگھ اتنے دنوں دکن میں رہ کر بھی ملک عنبر کو زیر نہ کر سکے تو اس نے شہزادہ خرم (شاہ جہاں) کو جس نے ابھی ابھی یعنی ۱۰۲۳ھ میں اودے پور کے مغرور رانا کو شکست دے کر اسے حاضرِ دربار ہونے پر مجبور کیا تھا۔ شاہ کا خطاب دیکر اور اپنے ہاتھ سے کمر میں تلوار باندھ کر پورے ساز و سامان کے ساتھ دکن کی مہم پر روانا کیا اور کچھ روز بعد خود بھی مالوا کی طرف کوچ کیا۔ تاکہ مقام جنگ سے قریب رہے۔ مگر دکنی سرداروں کی نا اتفاقی پہلے ہی سے مغلوں کا راستا صاف کر چکی تھی۔ چند دکنی سردار خانخاناں سے مل گئے تھے اور شاہنواز خان پسر خانخاناں نے ملک عنبر کو شکست دے دی تھی۔ اس لیے ملک عنبر نے ۱۰۲۵ھ میں احمد نگر اور اس کا شمالی علاقا دے کر شاہ خرم سے صلح کر لی۔ مگر یہ صلح چار پانچ سال سے زیادہ پائیدار نہیں رہی موقع ملتے ہی دکنیوں نے پھر چھاپے مارنے شروع کر دیے اور جب شہنشاہ کشمیر کے دورے پر تھے۔ یہ لوگ آگے بڑھتے بڑھتے نربدا پار کر کے مالوے کے جنوبی حصے میں لوٹ مار مچا دی جب شہنشاہ کو خبر لگی تو پھر شاہ خرم اس مہم پر مامور کیے گئے یہاں تک کہ ۱۰۳۰ھ میں ملک عنبر نے نہایت عاجزی سے دوبارا صلح کی درخاست کی۔ بہت سا ملک اور سالانہ پیش قرار خراج ادا کرنے کے وعدے کے ساتھ نہایت عاجزی سے ملک عنبر نے دوبارا صلح کی درخاست کی جو منظور ہوئی اور شاہ خرم نے فتح کی خوشخبری شہنشاہ کی خدمت میں روانا کر دی۔ ان جنگوں میں بھی بیجاپور اور گولکنڈے نے روپیا اور فوج سے ملک عنبر کی خاموشی کے ساتھ مدد کی مگر ملک عنبر ان مقابلوں کی تاب نہ لا سکا۔ جب وہ صلح کرنے پر مجبور ہوا تو گولکنڈا اور بیجاپور بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ چنانچہ ان سلطنتوں نے اپنے بچاو کے لیے شہزادہ خرم کی خدمت میں تحفے اور نذرانے پیش کیے۔ پھر بھی ۱۰۳۰ھ سنہ ۱۶۲۱ء کے عہد نامے کے لحاظ سے احمد نگر کے ساتھ بیجاپور اور گولکنڈے پر بھی خراج عاید کیا گیا۔

احمد نگر پر بارا لاکھ اور بیجاپور پر اٹھارا لاکھ اور گولکنڈے پر بیس لاکھ۔ یہ زمانا بیجاپور میں ابراہیم ثانی کا اور گولکنڈے میں محمد قطب شاہ کا ہے۔ ابھی دکن کی فتح سے فراغت نہیں ہوئی تھی کہ اسی سال ایرانیوں نے قندھار پر قبضا کر لیا اور شہنشاہ نے اسی فاتح دکن کو قندھار کی مہم سپرد کی۔ پہلے تو حکم کی تعمیل میں یہ روانا ہو گیا مگر مالوے تک آنے کے بعد اس کو کچھ شبہ ہوا کہ دکن سے جہاں میرے اثرات اب کافی ہیں قندھار جیسے دور دست اجنبی مقام پر بھیجنے کا کیا مطلب ہے چنانچہ اس نے کچھ ٹال مٹول کیا اور کچھ شرطیں پیش کیں۔ نور جہاں نے جو اپنے داماد شہریار کے لیے راستا صاف کر رہی تھی اس موقع کو غنیمت جانا اور خرم کے خلاف جہانگیر کے کان بھرے چنانچہ جہانگیر اس سے ناراض ہو گیا۔ اس کی جاگیر شہریار کے نام منتقل کر دی اور اس کو دکن واپس جانے کا حکم ہوا۔ پھر ان واقعات نے کچھ ایسی پیچیدہ صورت اختیار کی کہ خرم کی حیثیت ایک باغی شہزادے کی ہو گئی جس کی سرکوبی کے لیے نور جہاں کے مشورے سے کابل کا سپہ سالار مہابت مقرر ہوا۔ خرم کے تین چار سال نہایت پریشانی میں گذرے اور وہ دکن بنگال و مالوے میں مارا مارا پھرا اور جہاں جہاں شاہی فوجوں سے مقابلہ ہوا شکست[۱] کھائی۔ یہاں تک کہ ۱۰۳۴ھ میں اپنے دو لڑکے

---

[۱] کہتے ہیں کہ خرم کو جب شکست ہوئی تو گولکنڈے کے شمالی سرحد پر داخل ہو کر اس نے قطب شاہ سے مدد مانگی۔ یہ پہلا واقعہ ہے کہ کوئی مغل شہزادہ گولکنڈے کے حدود میں داخل ہوا ہے۔ لیکن اب مشکل یہ تھی کہ خرم کی مدد کرنا سلطنت سے دشمنی مول لینا تھا کیونکہ مغل فوجیں خرم کا تعاقب کر رہی تھیں

بطور یرغمال کے دربار میں بھیجو اسے مگر شہنشاہ کا دل صاف نہ ہوا (اس مدت میں دکنی سلطنتیں مغلوں کی تاخت سے محفوظ رہیں) اسی اثنا میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ مہابت خاں شہنشاہ سے بگڑ گیا اور نور جہاں سے بھی اس کی ان بن ہوگئی اور وہ الٹے خرم کا غمخوار بن گیا۔ جب خرم کو اس کا علم ہوا تو یا تو وہ سندھ کے راستے ایران جانے کی سوچ رہا تھا یا اب گجرات کے راستے دکن لوٹا اور وہیں مہابت خاں سے آملا۔ اسی الٹ پھیر میں زمانہ دو تین سال اور آگے نکل گیا۔ ۱۰۳۵ھ میں اسی سال کی عمر میں ملک عنبر نے وفات پائی۔ ۱۰۳۶ھ میں پرویز نے برہان پور میں انتقال کیا۔ اور خود شہنشاہ جہانگیر نے ماہ صفر ۱۰۳۷ھ میں اس دنیا سے کوچ کا نقارہ بجایا اور اسی سال ابراہیم عادل شاہ ثانی نے بھی جہانگیر سے کچھ پہلے ۱۱ محرم الحرام ۱۰۳۷ھ کو اس دنیائے فانی سے منہ موڑا۔

جہانگیر کی اس پوری مدت سلطنت میں عادل شاہیوں اور قطب شاہیوں کی مغلوں سے کہیں بھی کھلی کھلی مڈبھیڑ نہیں ہوئی مگر یہ ملک عنبر کو اپنی فوج اور روپے سے برابر مدد دیتے رہے تاکہ وہ مغل سیلاب کو ان کی فصیلوں تک آنے سے روکے رہے۔ اس کے علاوہ مغلوں کو روکنے کے اور بھی مختلف سیاسی حربوں سے کام لیتے رہے لیکن آخرکار عالمگیر کا سیاسی تدبر سب پر غالب آیا۔ جس سال شاہجہاں نے مغلیہ سلطنت کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی ہے اسی سال یعنی ۱۰۳۷ھ میں محمد عادل شاہ بیجاپور میں تخت نشین ہوا۔ یہ بیجاپور کا آخری بلند حوصلہ اور باہمت بادشاہ ہے اسی نے اپنے لیے وہ عالیشان گنبد تعمیر کروایا جو نہ صرف یہ کہ روئے زمین پر سب سے بڑا گنبد ہے بلکہ وہ اپنی سرگوشی کی منزل کی وجہ سے عجائبات عالم سے ہے اور یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ ادھر شاہجہاں نے شمالی ہند میں تاج محل بنوا کر فن تعمیر میں حسن کاری کی لطافتوں اور نزاکتوں کو اسی پر ختم کر دیا تو ادھر محمد عادل شاہ نے جنوبی ہند میں بولتی گنبد تعمیر کرا کے تعمیر کاری کی ندرتوں پر مہر لگا دی۔

نظام شاہی سلطنت کچھ ایسی سخت جان نکلی کہ جہانگیر کے بعد شاہجہاں کا ابتدائی عہد بھی اس کے نیچے بچائے کھچے کی تسخیر میں صرف ہوا۔ ملک عنبر کے انتقال کے وقت نظام شاہی سلطنت پر مرتضیٰ نظام شاہ دوم متمکن تھا۔ لیکن دولت آباد کے قلعے اور فتح نگر (دکھڑکی) اور اس کے نواحی علاقے کے ذرا سے ٹکڑے کے علاوہ تمام نظام شاہی سلطنت پر مغل قابض تھے۔ اس پر بھی ملک عنبر کا بیٹا فتح خاں مرتضیٰ کو بالکل بے دست و پا کر رکھا تھا اور اسے دولت آباد کے قلعے سے باہر نہیں نکلنے دیتا تھا۔ اس سے زیادہ قابل افسوس بات یہ ہے کہ فتح خاں کا دل اپنے مرحوم باپ کی سی حب وطن کے جذبے سے بالکل خالی تھا اس نے شاہجہاں سے ساز باز کر لی اور مرتضیٰ کو قتل کر کے اس کے دس سالا بیٹے حسین کو تخت پر بٹھا لیا۔ بات دراصل یہ ہوئی کہ شہنشاہ جہانگیر نے شاہ خرم کی بغاوت کے زمانے میں اپنے انتقال سے کچھ پہلے خان جہاں لودھی کو دکن کی مہم پر مامور کیا تھا اس نے احمد نگر کا تمام مغربی علاقہ جو صوبہ بالاگھاٹ کہلاتا ہے نظام شاہی حکومت کے حوالے کر کے ان سے صلح کر لی تھی اور

۴؎ وہ گولکنڈہ پر ٹوٹ پڑیں اس لیے محمد قطب شاہ نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا بظاہر تو اس نے مدد دینے سے انکار کیا مگر خفیہ طور پر غلے اور روپیے سے مدد کر کے اس کو رخصت کیا لیکن بنگال میں جب اس کو ناکامی ہوئی تو وہ ایک دفعہ اور گولکنڈے کی حدود میں آیا لیکن محمد قطب شاہ نے بڑی ترکیب سے اس کو رخصت کیا۔

۵؎ بلکہ بعض دفعہ تو ملک عنبر نے اپنے جوش شجاعت میں ان ریاستوں کو اپنا باجگذار تصور کیا اور جبراً ان سے فوج اور روپیہ وصول کیا اور ان کے مقبوضات پر بھی چھاپے مارے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے قبر نورس کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور پچیس برس تک شہنشاہی فوج کو بھی اپنی قزاقانہ جنگ سے ایسا تنگ کیا کہ ان کا ناک میں دم کر دیا اور اس کی زندگی تک مغلوں کو دکن میں چین سے حکومت کرنی نصیب نہ ہوئی۔

۶؎ ہندوستان کے لیے یہ فخر کیا کچھ کم ہے کہ اس کے شمال و جنوب میں یہ دونوں عمارتیں اسلامی فن تعمیر کے ارتقا کے وہ انتہائی نقطے ہیں کہ تعمیرات کا شاید کبھی ان سے بڑھ کر

خرم کے شہنشاہ ہونے کے بعد اس نے باغی ہو کر دکن کے امرا کو شہنشاہ کے خلاف ابھارنے لگا تھا۔ اس بغاوت میں مرتضیٰ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ اب خود شہنشاہ نے دکن کا رخ کیا اور برہان پور سے تین فوجیں احمد نگر کے علاقے پر بڑھائیں اور گجرات کے صوبے دار اعظم خاں کو حکم پہنچا کہ احمد نگر کے مغربی علاقوں میں گھس جائے چنانچہ مرتضیٰ نظام شاہ ثانی نے جا بجا اعظم خاں سے شکست کھائی اور خان جہاں لودی بھی شہنشاہی افواج سے شکست کھا کر آخر کالنجر کے قریب لڑ کر مارا گیا (سنہ ۱۰۴۰ھ / ۱۶۳۰ء) یہ حالت دیکھ کر کہ نظام شاہی سلطنت اگر بالکل ہی ختم ہو گئی تو پھر بیجاپور کی باری ہے محمد عادل شاہ نے مرتضیٰ کی مدد کے لیے فوج روانہ کی مگر فوج پہنچنے سے پہلے فتح خان نے غداری کی اور مرتضیٰ کو قتل کر کے مغلوں سے صلح کر لی اور اس کے بیٹے حسین کو تخت پر بٹھا دیا اور مشہور کر دیا کہ اس کا سرپرست شاہجہاں ہے پس دہلی کی فوجیں نظام شاہی علاقے کو چھوڑ کر بیجاپور کی ریاست میں گھس گئیں اور آصف خان نے شہر بیجاپور کا محاصرہ کر لیا، لیکن وبا اور قحط سے پریشان ہو کر محاصرہ اٹھا لیا (سنہ ۱۰۴۰ھ / ۱۶۳۰ء) شاہجہاں دہلی واپس گئے اور دکن کی مہم خانخاناں مہابت خان کے سپرد کر گئے۔ کہ وہ فتح خان کی سرکوبی کرے جو موقع ملتے ہی مغلوں سے ٹوٹ کر عادل شاہیوں سے مل گیا تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۰۴۲ھ / ۱۶۳۲ء میں اگرچہ فتح خان نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا مگر قلعہ دولت آباد کو مہابت خاں نے فتح کر ہی لیا، حسین نظام شاہ کو قلعہ گوالیار میں بھیج دیا گیا اور تمام ملک پر مغلوں نے قبضہ کر لیا۔ فتح خاں کو مغل دربار میں کوئی عہدہ مل گیا لیکن اس نظام شاہی سلطنت کی سخت جانی کچھ ایسی تھی کہ پھر بھی اس کا تسمہ لگا رہ گیا یعنی احمد نگر کے ایک مرہٹا سردار شاہجی بھونسلے نے، نظام شاہی خاندان کے ایک شہزادے مرتضیٰ نامی کو شاہ گڑھ کے مقام پر تخت نشین کر کے بہت جلد کسی ترکیب سے نظام شاہی سلطنت کے قدیم پایۂ تخت جنیر پر قبضہ کر لیا اور مرتضیٰ کو وہاں لے جا کر اور خود پیشوائے سلطنت بن کر کوکن کے قلعوں پر قبضہ کرتا گیا یہاں تک کہ اپنے آقا کے نام سے بالاگھاٹ کے تمام علاقے پر آزادانہ حکومت کرنے لگا (یہ وہی ترکیب ہے جو ملک عنبر نے اختیار کی تھی مرہٹوں نے بعد میں ہر کام میں ہو بہو ملک عنبر کی نقالی کی ہے) اس اثنا میں مہابت خاں کا انتقال ہو گیا اور محمد عادل شاہ کی کمزوری سے شاہجی بھونسلا اتنا قوی ہو گیا کہ احمد نگر کے کئی مغربی اضلاع اس کے قبضے میں آ گئے شہزادے شجاع اور اس کے ساتھ جو سردار دکن بھیجے گئے تھے وہ بھی اس کا کچھ انسداد نہ کر سکے اس لیے سنہ ۱۰۴۵ھ / ۱۶۳۶ء خود شاہجہاں نے پھر ایک مرتبہ دکن کا رخ کیا اور دولت آباد گئے۔ یہاں سے گولکنڈا اور بیجاپور کو دو سفارتیں بھیجی گئیں۔ گولکنڈے سے یہ مطالبہ تھا کہ وہ پیشکش کی مقررہ رقم ادا کرے۔ خلفائے راشدین کی شان میں جو تبرا ہوتا ہے اسے روک دے اور شاہ ایران کی بجائے بادشاہ ہند کا نام خطبے میں داخل کیا جائے عبداللہ قطب شاہ نے ان تمام شرائط کو منظور کیا اور تعمیل کی۔ بیجاپور سے یہ مطالبہ تھا کہ شاہجی بھونسلا اور دوسرے نظام شاہی سرداروں کو اپنی ملاقات سے الگ کر دے اور ان کی شورش میں کسی طرح سے ان کی مدد نہ کرے اور نظام شاہی ریاست کے جن قلعوں پر بیجاپوریوں نے اپنی توپیں چڑھا دی ہیں وہ ہٹالی جائیں اس کے صلے میں ریاست احمد نگر کے بعض ساحلی اضلاع دیے جائیں گے مگر محمد عادل شاہ نے ان شرائط کے ماننے میں پس و پیش کیا جس کی وجہ سے بیجاپور کے خلاف تین فوجیں روانہ کی گئیں۔ ایک فوج مہابت خاں کے بیٹے خان زماں خان کی سرکردگی میں احمد نگر کی جانب سے تاکہ شاہجی بھونسلا کی جاگیر اور وطن کو پامال کرتے ہوئے کوکن کے علاقے میں پہنچ جائے۔ شائستہ خاں اور الاوردی خاں جنیر و ناسک کی تسخیر پر مامور ہوئے اور تیسری فوج خان دوران کی ماتحتی میں ناندیڑ و قندہار کے درمیان بڑھی کہ اودگیر کو فتح کر کے حدود بیجاپور میں داخل ہو جائے چنانچہ احمد نگر کا علاقہ فتنہ فساد سے پاک کرنے کے بعد ہر طرف سے مغل فوج نے بیجاپور پر حملہ کر دیا، محمد عادل شاہ کو قلعہ بند ہو کر صلح کرنی پڑی اور [illegible] لاکھ روپے سالانہ پیشکش دینے کا عہد ہوا اور حسب معاہدہ شاہجہاں نے دریائے کرشنا کے تمام مغربی علاقے محمد عادل شاہ

نے سپرد کر دیے۔ ان میں بھالکی، چاکنہ اور کوکن کا وہ حصہ تھا جس میں چاکن اور پونا وغیرہ ہے۔ اور شاہ جی بھونسلا کو بھی بیجاپور میں ملازمت کرنے کی اجازت مل گئی۔ اس صلح نامے کی تحریر کے بعد شہزادے اورنگ زیب کو صوبیداری دکن پر متعین کر کے شاہجہاں نے دہلی کو مراجعت کی (۱۰۴۶ھ میں) جب جنیر سلطنت مغلیہ کے قبضے میں آ گیا تو نظام شاہی خاندان کے آخری فرمانروا یعنی نظام شاہ سوم کو اورنگ زیب کے قائم مقام خان زماں خان کے حوالے کیا اور خود شاہ جی نے محمد عادل شاہ کے دربار میں ملازمت اختیار کر لی۔ پونا و سوپا کے پرگنے اسے بطور جاگیر عنایت ہوئے اور جب بیجاپور کی ملازمت سے اس نے جنوب کی فوج کشی کی تو وہاں کے مفتوحہ علاقے کرناٹک میں بھی بعض مقامات انعام میں ملے۔ سلطان محمد عادل شاہ و شاہجہاں کا پورا پورا معاہدہ ۱۰۶۶ھ میں شاہجہاں کو ایک ایسا مرض لاحق ہو گیا کہ وہ کام کرنے کے قابل نہ رہا اور سارا انتظام دارا شکوہ کے ہاتھ میں چلا گیا [illegible] کے چاروں بیٹوں میں [illegible] شروع ہو گئی۔ شاہجہاں کی حیثیت ایک معزول بادشاہ کی سی ہو گئی۔ اسی ۱۰۶۷ھ میں [illegible] عادل شاہ نے انتقال کیا۔ گویا [illegible] یہاں پر حکومت [illegible] یہاں شاہ [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ شاہجی کی اصلیت کیا ہے [illegible] طور پر بیان کر [illegible] مرہٹا طاقت [illegible] اسی شخص نے ڈالی تھی۔

شاہجی کا باپ مالوجی دراصل [illegible] کا رہنے والا تھا اور نظام شاہی حکومت میں [illegible] سے [illegible] مرہٹا [illegible] کی ابتدا اسی نے کی ہے [illegible] جنیر کے قلعہ شیونیری کی قلعداری سے سرفراز ہوا تھا [illegible] کہ مالوجی کو اولاد نہ ہوتی تھی وہ ایک بزرگ شاہ شریف کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کا طالب ہوا اور خدا تعالیٰ نے مالوجی کو دو بیٹے عنایت فرمائے۔ اس نے ان بزرگ کے نام پر ایک کا نام شریف جی اور دوسرے کا نام شاہ جی رکھا۔ جب شاہ جی کو شاہجہاں نے محمد عادل شاہ کی ملازمت کر لینے کی اجازت دیدی تو اس نے بھی قبول کر کے اس کی خدمت کی اور اپنے جنگجو مرہٹا [illegible] کو لیکر محمد عادل شاہ کے لیے تقریباً تمام جنوبی ہندستان میسور اور جنجی تک فتح کر لیا مگر خود محمد عادل شاہ نہایت کمزور بادشاہ تھا اور شاہجہاں نے جب نظام شاہی سلطنت کا خاتمہ کر کے بیجاپور کو اپنا باجگذار بنا لیا تو محمد عادل شاہ کے وقار کو اس سے سخت صدمہ پہنچا۔ مرہٹے جو چالیس پچاس سال سے اب تک نظام شاہی اور عادل شاہی حکومت کے وفادار اور جاں نثار تھے اور جب انہوں نے دیکھا کہ ایک ریاست ختم ہو چکی ہے اور دوسری لب بام ہے اور مغل شہنشاہ (شاہجہاں) سے نسبت دور دہلی میں تھا ہے۔ تو قدرتاً ان کو خیال ہوا کہ ہم خود اپنی ایک سلطنت کیوں نہ قائم کریں اور بیجاپور کے [illegible] بادشاہ اور عیاش امرا کے پیچھے کیوں اپنی قوت صرف کریں جبکہ ہم جنگجو ہیں، محنتی و جفاکش ہیں اور ملک عنبر کے طفیل میں ملک داری اور سیاست سے بھی پوری طرح پر واقف ہو چکے ہیں، تو پھر کیوں نہ ملک عنبر کی طرح معقول کاروائی کرتے ہوئے اپنی حکومت کا نقشہ جمائیں۔ شاہ جی کے منجھلے بیٹے سیواجی نے ان کے اس تخیل کو پورا کیا اور محمد عادل شاہ کی کمزور حکومت سے فائدہ اٹھا کر بیجاپور کے متعدد قلعوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ محمد عادل شاہ کے کہنے پر بھی شاہجی اپنے بیٹے کو روک نہ سکا۔ اگرچہ بادشاہ نے اسے نظر بند بھی کر دیا۔ سیواجی پونا اور اس کے اطراف کے حصوں پر قبضہ جماتا ہی چلا گیا یہاں تک کہ محمد عادل شاہ کے بعد جب اس کے بیٹے علی عادل شاہ دوم نے سیواجی کی گوشمالی کے لیے افضل خاں کی ماتحتی میں ایک جرار لشکر روانہ کیا تو سیواجی نے دھوکے سے افضل خاں کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد تو عادل شاہی حکومت سے وہ بالکل بے پروا ہو گیا اور جب کہ عالمگیر جنگ تخت پادشاہی میں مصروف تھا

؎ شاہجہاں نے دریائے تاپتی کے جنوب میں دکن کے صوبے کر دیے: خاندیس، برار، دولت آباد و تلنگانہ کا صوبہ [illegible] اورنگ زیب [illegible]

موقع پاکر مغل علاقوں پر بھی اسنے خوب چھاپے مارے اور کچھ مدت
بعد ۱۶۷۴ء (۱۰۸۵ھ) میں رائے گڑھ میں بڑی دھوم دھام سے اپنی تاجپوشی
کا جشن منا کر مہاراجا شیواجی کا لقب اختیار کیا۔ یہاں تک کہ اس
تاجپوشی کے چھ سال بعد ترپن سال کی عمر میں ۱۶۸۰ء (۱۰۹۱ھ) میں اسنے
وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سنبھاجی جانشین ہوا اور کچھ
دن بعد نواح برہان پور کو لوٹ لیا جس کی وجہ سے شرفائے بادشاہ
سے فریاد کی۔ اب بادشاہ عالمگیر شمالی ہند کے انتظام سے
پوری طرح فارغ ہو چکے تھے، دکن میں مرہٹوں کی قوت سے
روز بروز ان کا خلل و فتنہ بڑھ رہا تھا۔ اسلئے کہ سنبھاجی بڑا
ظالم و بدکار انسان تھا۔ حد سے مسلمانوں کا دشمن تھا یہاں تک ہندو
بھی اس سے ناراض تھے اور خود اس کے ہمقوم مرہٹے
بھی اس سے نفرت کرنے لگے تھے۔ جب اس کو گرفتار کر کے
شاہی کیمپ لیجا رہے تھے تو جس گاؤں سے سنبھاجی گزرتا
تھا وہاں کی عورتیں اور بچے باہر نکل کر اس کی گرفتاری پر
خوشیاں مناتے تھے، کیونکہ اس کے وحشیانہ افعال سے ہندو
مسلمان سب ہی ناراض تھے۔ بدکار ایسا کہ اسی وجہ سے باپنے
(شیواجی) نے ایک مرتبہ قید کر دیا اور اس نے بھاگ کر مغلوں
کی پناہ لی۔ بہر حال اس میں سب وہی عادتیں تھیں جو ایک
بد طینت میں ہوتی ہیں۔ شیواجی میں جو انتظامی قابلیت
تھی وہ اس میں مطلق نہ تھی جیسے ... کی صحبت میں رہنے کی وجہ
سے بدمزاج ہوگیا تھا۔ دکن کی اسلامی ریاستیں بیجاپور اور گولکنڈہ
مرہٹوں کے ظلم و زیادتی کے خلاف شہنشاہی فوجوں کی مدد کرنے کی
بجائے الٹے مرہٹوں کی حمایت کرتیں اور انکو اپنے تئیں
مغلوں سے اپنے بچاؤ کا ذریعہ سمجھتیں۔ یہ ریاستیں بھی بہت
خراب ہو کر کمزور ہوگئی تھیں اور ان کی اندرونی حالت نازک
تھی۔ مغلوں کی باجگذار ہونے کے باوجود یہ اپنے واجبات پورا
ادا نہیں کرتی تھیں اور آئے دن مغلوں کو ان پر فوج کشی کرنی پڑتی تھی
اب شہنشاہ عالمگیر شمالی ہند کے انتظام سے بالکل فارغ ہو چکے
تھے۔ اس لیے ۱۶۸۱ء (۱۰۹۲ھ) میں دکن کا رخ کیا اور برہانپور ہوتے

ہوئے اورنگ آباد پہنچ گئے۔ رستے ہی میں ایک فوج دے کر
شہزادہ معظم کو کوکن کیطرف روانہ کیا۔ اس فوج نے سنبھاجی کے
تمام علاقے کو پامال کر ڈالا اور سنبھاجی بھاگ کر پہاڑی قلعوں میں
چھپا پھرا۔ اتنے میں بارش شروع ہوئی جس سے شاہی فوج
میں وبا پھیل گئی اور رسد پہنچانے میں بھی دقت ہونے لگی اسلیے
شہزادہ احمد نگر واپس آگیا (۱۶۸۲ء / ۱۰۹۳ھ)

بیجاپور میں سلطان محمد عادل شاہ کی وفات کے بعد اس کا
بیٹا علی عادل شاہ ثانی تخت نشین ہوا۔ اس کی عمر اس وقت
۱۸ سال کی تھی۔ اس کی حکومت کا چوبیس سال کا ابتدائی زمانہ
وہ تھا جبکہ شاہجہاں آگرے کے قلعے میں ایک معزول بادشاہ کی حیثیت
سے نظربندی میں زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔ اس میں کوئی
شبہ نہیں کہ نظام شاہی سلطنت کے پورے زوال سے اب
بیجاپور اور گولکنڈہ براہ راست مغلوں کی زد میں تھے۔ مرہٹوں
کی بغاوتوں اور شورشوں نے امرائے بیجاپور کی آپس کی نااتفاقیوں
اور بادشاہ کے عدم تدبر نے اور خود مغلوں کی حکمت عملی نے
بیجاپور کو بہت کمزور کر دیا تھا۔ علی عادل شاہ ثانی کا زمانہ اس
کی کمزوری ہی کا زمانہ تھا کہ نہ امرائے دربار اس کے قابو میں تھے
اور نہ مرہٹوں کی شورش کے رفع کرنے پر قادر تھا۔ چنانچہ یہ
کبھی مغلوں کا ساتھ دیتا اور کبھی مرہٹوں کا۔ اگرچہ عالمگیری سپاہ
سالار دکن پر برابر فوج کشی کرتے رہے مگر خود شہنشاہ کو اتنی مہلت
نہیں ملی کہ وہ بذات خود شمال سے دکن کا رخ کرتے۔ کر انکے
سردار بیجاپور کو گولکنڈہ سے برابر خراج وصول کرتے رہے
اسی حالت میں علی عادل شاہ ثانی نے تقریباً ۱۰ سال حکومت
کرنے کے بعد ۱۲ شعبان ۱۰۸۳ھ کو انتقال کیا۔ اس کے بعد
اس کے بیٹے سکندر کو جس کی عمر کا ابھی پانچواں سال شروع
ہوا تھا۔ تخت نشین کیا اور عادل شاہی سلطنت کی رہی سہی
قوت بھی ختم ہوگئی۔

بیجاپور کے امرا یہ خیال کرتے تھے کہ نظام شاہی سلطنت
کے ختم ہونے کے بعد مغلوں کو روکنے کی اب بھی ایک صورت تھی

کہ مرہٹوں کو جن کی قوت آجکل بہت بڑھی ہوئی ہے آگے کیا جائے اور در پردہ ان کی مدد کرکے خود کو مغلوں سے محفوظ رکھا جائے مگر مغل شہنشاہ اپنی باجگذار ریاست کے اس طرز عمل کو اپنے ہی خلاف کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ جب شہزادہ اعظم اپنی فوج لیکر احمد نگر آگیا تو شہنشاہ نے یہی خیال کیا ہوگا کہ ان دونوں ریاستوں پر اتنا دباؤ ڈالنا چاہیئے کہ مرہٹوں کی مدد نہ کر سکیں اور چونکہ انہوں نے بہت دنوں سے خراج بھی ادا نہیں کیا تھا اس لیے جب خط و کتابت سے کچھ کام نہ نکلا تو شہنشاہی فوجوں نے پہلے بیجاپور ہی کا رخ لیا اور یہ مہم شہزادہ محمد اعظم کے سپرد کی گئی۔ بیجاپور سے تیرا اٹھارہ کوس کے فاصلے پر مقام اینڈی غازی الدین خاں بہادر کی بہادری اور شجاعت سے شاہی لشکر کو کامل فتح حاصل ہوئی (۱۰۹۵ھ / ۱۶۸۵ء) اور شہر بیجاپور کو گھیر لیا گیا۔ چونکہ قلعہ میں فوج اور سامان خورونوش بافراط تھا اسی لیے محاصرے نے طول کھینچا۔ ادھر شہزادے کے رفیقوں میں کچھ نا اتفاقی ہو گئی ملکے شہزادہ معظم اپنے بھائی کی حمایت میں قلعے والوں سے سازش کیے ہوئے تھا اور اس کے بعض ہمراز محصورین کی درپردہ امداد کر رہے تھے اسلیے شہنشاہ کو خود جانا پڑا۔ چند مہینے میں قلعہ فتح ہو گیا اور ماہ ذیقعدہ ۱۰۹۷ھ / ۱۶۸۶ء میں ریاست بیجاپور مغلیہ حکومت کا ایک صوبہ بن گئی سکندر عادل شاہ کا شاہانہ احترام کیا گیا۔ اور بیجاپور ہی امرا عہدوں اور منصبوں سے سرفراز ہوئے۔ علی عادل شاہ ثانی۔ عالمگیر کا ہمعصر ہے۔ عالمگیر کی نصف مدت سلطنت شمالی ہند میں گزری اسی زمانے میں علی عادل شاہ ثانی نے انتقال کیا جب تیس سال کی عمر میں شہنشاہ دکن آئے ہیں تو اس وقت ایک نوعمر لڑکا سکندر عادل شاہ بیجاپور میں تخت نشین تھا۔

جہانگیر علی

ہندستانی زبان کی خدمت ہر ہندستانی پر فرض ہے

آجکل

ہر تمنا میری ان کا مدعا ہے آجکل ؛ زندگی ہی زندگی کا آسرا ہے آجکل

ذوق الفت بے نیاز ماسوا ہے آجکل ؛ مجھکو ان سے ان کو مجھ سے واسطہ ہے آجکل

انتہائے قرب و رابطہ باہمی کے باوجود ؛ سینہ میں دل [illegible] ہے آجکل

یوں تو ایسا اضطراب بے تحاشہ پہلے بھی تھی ؛ لیکن اس عالم میں کچھ فرق آ گیا ہے آجکل

ہو گیا ہے چشم خود بیں کو بھی عرفان خودی ؛ خوش نگاہی میں اضافہ ہو رہا ہے آجکل

اپنی اپنی حد میں پردہ کی محرمیت نہ پوچھ ؛ ظاہر و باطن کا جلوہ آئینہ ہے آجکل

امتیاز حالت مطلوب تک باقی نہیں ؛ گردش دوراں سے یہ لمحہ جدا ہے آجکل

کاش عمر رفتہ کی تاریخ بھی پلٹے ورق ؛ دلنوازی دلربائی کا صلہ ہے آجکل

دل تو دو ہیں پھر اک زیر و بم تجربہ ہوتے ؛ حسن بھی منجملہ اہل وفا ہے آجکل

دین و دنیا سے الگ اور اک عہد جدا ؛ شوق کی دنیا کا عالم دوسرا ہے آجکل

چشم و دل سے دور اور وہم و گماں سے دور تر ؛ ہم کو اس عالم میں بھی دیکھا گیا ہے آجکل

حسن و الفت دونوں اک منزل پہ آ کر گم ہوئے ؛ کیا خبر ہے کون کس کا رہنما ہے آجکل

اس لئے اسے بخشش تعلق ہے لطیف احساس سے
اہل دل سے پوچھیے کیسی فضا ہے آجکل

بہار برنی

"آج موسم بھی تو خوشگوار نہیں ہے۔" فریدوں نے یہ کہکر بڑی تکلیف سے کروٹ بدلی اور اپنی بیوی کی طرف دیکھنے لگا جو ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوئی تھی اور کچھ فاصلے پر ایک پرانی میز کی طرف جھکی ہوئی کھڑی تھی۔ وہ انتہائی حسین تھی مگر اسکی آنکھوں سے تھکن کا اظہار ہو رہا تھا مگر اسکے گھنگریالے بال بکھرے ہوئے تھے اور اسکی نقرئی پیشانی پر سیاہ بالوں کے نازک حلقے اس کے حسن کو دوبالا کر رہے تھے۔ وہ اپنے جسم کے لباس میں تھی جو زرد یا ہلکے بھورے رنگ تھا جس پر سیاہ فیتیں لگی ہوئی تھیں یہ بہت کچھ میلا ہو گیا تھا اور کثرت استعمال سے قریب قریب بوسیدہ ہونے کو تھا۔ یہ لباس اس کے جسم پر سے ڈھیلا ہو کر لٹک رہا تھا۔

"مگر آپ کو ہوا کیا ہے؟" بانو نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں کچھ تمسخر اور طنز شامل تھا، فریدوں نے اپنے سر کے گھناونے کالے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اپنا پیلا چہرا اٹھایا جس پر ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی اور پھر اپنی بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔

ایک سکنڈ کے لیے بانو نے اپنے شوہر سے نظریں ملائیں اور وہ نظریں فوراً فریدوں کے دل میں اتر گئیں — بدکار نظریں! — کیا وہ بدکار ہو سکتی تھیں؟ — وہ نظریں! — وہ سوچنے لگا، اسکی نظریں برابر بیوی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ کچھ وقفے کے بعد بانو نے لاپروائی سے پوچھا "آج اتوار ہے نا؟"

"مجھے کیا معلوم!" اسنے جواب دیا۔

"او! اب آپ کو ہفتے کے دن بھی یاد نہیں رہتے۔"

فریدوں کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ وہ اپنا سر اپنے سیدھے ہاتھ پر رکھکر کروٹ لیٹ گیا اب وہ کچھ شوق بھری نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھ رہا تھا وہی عورت تھی جسے وہ دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر چاہتا تھا۔

بانو سیدھی کھڑی ہو گئی اور پھر میز پر ہاتھ رکھکر اسی طرح جھک گئی۔ پرانی میز کے ہلنے کی وجہ کچھ آواز پیدا ہوئی۔ وہ بولی "آج سے

دس دن بعد آپ کی سالگرہ ہے" مگر ہم اسے کس طرح منا سکتے ہیں؟

"مگر میں سمجھتا ہوں کہ مجھے ہسپتال جانا ہے"

"اوہ! اس وقت تک تو شاید آپ واپس آجائیں" بانو کے چہرے سے تھکن کے آثار ظاہر تھے۔

"جی! اگر نہیں!! اسوقت تک میں مرجاوں تو شاید میری لاش گھر لائی جائے گی۔"

بانو نے ایک قہقہا لگایا "تو بھی کا نورا" فریدوں نے محسوس کیا۔ اس نے ایک سرد آہ بھری۔ مگر اصل میں بانو نے صرف مذاق سے ہنستے ہوئے کہا "تم مر جاوگے؟ اوہ صاحب پھر میں تمہارے جسم کو لیکر کیا کروں گی؟"

وہ اسی حالت میں لیٹا ہوا تھا۔ اس کا سر ہاتھ پر تھا۔ وہ اسی طرح اپنی بیوی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ خیال اس کے دل میں کئی دفعہ پیدا ہوا تھا مگر اس نے کبھی اسپر یقین نہ کیا — یہ خیال بلکل سچ تھا "وہ میری موت کو خوشی آمدید کہیگی اور اپنی نجات کا ذریعہ سمجھے گی" یقیناً محبت کا یہ انجام تھا۔ شخص نے اسکی محبت میں خود کو بھلادیا جس پر ہر طرح کا اعتماد اور یقین کیا! ایک جان دو قالب۔ یہ ایک پرانا قصہ ہے۔ خواہ مخواہ کی بات ہے نہیں! اب تو ان میں سے ایک آقا اور دوسرا غلام تھا یا دونوں ایک دوسرے کے دشمن تھے۔

آہ! کاش دنیا ایسے خوفناک خوابوں سے بھری ہوئی نہ ہوتی!

پھول اور کانٹے

---×---

بانو اب بھی میز پر جھکی ہوئی کھڑی تھی۔ وہ اپنی تھکی ہوئی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی "اوہ! میں بہت تھکی ہوئی ہوں" وہ جلدی سے بولی اور اپنے ہلکے سنہرے بالوں والے نازک سر کو اپنے حسین ہاتوں سے پکڑ کر کہنے لگی "شاید آپ تعجب کریں گے کہ آپ کی اس بیماری سے میں زیادہ رنجیدہ کیوں ہوئی۔ کیوں نہ آپ کی خدمت کا رنگ میں کچھ نہیں کر سکتی۔ میں نے اپنی ہر چیز تم سے

حوالے کر دی ہے۔ تمہیں دینے کے لیے میرے پاس اب کوئی
چیز نہیں ہے؟" "نہیں!" فریدوں نے سسکتے ہوئے کہا "یہ میں جانتا
ہوں"

اب وہ کچھ غور کرنے لگا۔ بانو نے جو کچھ کہا تھا وہ درست تھا وہ
رات دن محنت کرتی تھی اور اپنی خواہش سے دونوں کی زندگی کو
آلودہ بنانے کی کوشش کرتی، اگرچہ اس میں خوبیاں تھیں مگر وہ کافی
نہ تھیں۔ جو اسے اپنے شوہر کو دیا شاید اس کا شوہر اس کی ضرورت
محسوس نہ کرتا تھا۔ البتہ یہ بالکل سچ ہے ایک طرف تو وہ فریدوں کے
لیے رحمت کا فرشتہ تھی اور دوسری طرف کسی حد تک شیطان سے
کچھ کم نہ تھی۔ اس کے قالب میں [illegible] مرجھائی ہوئی روح
تھی [illegible] ایک غیر طبعی تسکین بھی [illegible] میں حاصل
ہو سکتی۔

آہ [illegible] دوسرے سے کس قدر مختلف تھے!

فریدوں نے اپنے سر کو اپنے [illegible] پر گرا کر کہنے لگا
"[illegible] کے لیے اپنی زندگیوں کو بالکل
ضائع کیا۔"

"ہاں!" بانو نے فرش پر ٹہلتے ہوئے کہا "بالکل یہی بات
ہے۔"

فریدوں نے اپنے سر کو [illegible] کر کے بانو کی طرف دیکھنے
لگا۔ وہ [illegible] اور [illegible] تھی۔ وہ اس کا
چہرہ سا [illegible] سفید دانتوں جیسے ہاتھ اور [illegible] سا پیٹ
[illegible] اس کا قدم [illegible]
چھوٹے بالوں کا گچھا اس کی سفید گردن پر پھیلنے لگا۔ [illegible]
ٹہل رہی تھی یکایک لمحہ بعد میں اس نے اپنے آپ کو اس حالت
میں محسوس کیا جیسے فریدوں اور اس کی محبت کی ابتدا ہوئی تھی اور
جب وہ بھی دل و جان سے فریدوں کو چاہتی تھی۔ [illegible] محبت
— اس واقعے کی یاد سے اس نے اپنے جسم میں کچھ گرمی
محسوس کی۔

فریدوں اس طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ [illegible]
کمزور ہو اب دواخانا جانے کے لیے تھا۔ وہ تعجب کر رہا تھا
کیا وہ بھی اس کے ساتھ دواخانا جائے گی؟ اسے خود بھی
کبھی نہ چاہا۔ وہ اپنے اکیلے جانے ہی کو ترجیح دیتا تھا مگر
وہ بے حد کمزور تھا۔ بغیر کسی کی مدد کے وہ چل بھی نہ سکتا تھا
ایک دو گھنٹے کے بعد دواخانے کا آدمی آیا۔

"کیا میں ان کے لیے تمہاری کچھ مدد کر سکتی ہوں" بانو
نے آدمی سے پوچھا اور خاموش کھڑی رہی۔

"جی نہیں! شکریہ! میں سب کچھ ٹھیک طور پر کر لونگا"
بانو اسے چھوڑ کر اندر چلی گئی۔

"اگر وہ تمہاری شریک حیات نہ ہوتی، اگر اس کا وجود
بھی نہ ہوتا" فریدوں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا "کیا تم اس وقت
زیادہ مطمئن رہ سکتے؟ شاید نہیں!!"

فریدوں نے اپنی [illegible] سال کی بچی کا خیال کیا جو اپنے
کمرے میں بیٹھی اپنے سبقوں کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ اس کو
خدا حافظ کہے بغیر ہی چلا جانا چاہتا تھا — اف خدایا بچے
پیدا کرنا بھی کس قدر خوفناک ہے۔ ہم واقف ہیں کہ دنیا
مصیبت اور آلام سے بھری ہوئی ہے اس کے باوجود ان
ننھی جانوں کو اس آلام خانے میں لانا — اوہ! کس قدر
خوفناک ہے۔

یہ لڑکی بھی فریدوں کے ساتھ [illegible] جیسا سلوک
کرتی تھی۔ وہ اپنی ماں کے جملہ اوصاف سے متصف تھی۔
باپ کی عادتیں تو اس میں کچھ بھی نہ تھیں۔ ماں ہی کا سا [illegible]
وہ بالکل اسی کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی اور باپ پر اسی طرح
نامہربان تھی جس طرح اصلی ماں۔

فریدوں نے ان گزرے ہوئے دنوں کو یاد کیا
جبکہ وہ ایک ننھی سی جان تھی اور جب بیوی خاوند اسے دیکھ کر
بے حد مسرت محسوس کرتے تھے مگر یہ خوشی اب موجود نہ تھی
وہ بالکل فنا ہو چکی تھی جس طرح دنیا کی ہر چیز فنا ہو جاتی
ہے۔ اس کی [illegible] — غیر مستقل مزاج اور ضدی عورت—

جو ہر شخص کے ساتھ بڑے تپاک اور شائستگی سے پیش آتی تھی جو
بے حد شائستہ اور مذہبی تقدس رکھنے والی سمجھی جاتی تھی .....
ہر ایک پر مہربانی کر سکتی تھی مگر نامہربان تھی تو صرف ......
آہ! وہ دونوں ایک دوسرے سے کس قدر مختلف تھے!

وہ اپنے بستر سے اٹھا، لباس بدلا، اس کے پاؤں
لرز رہے تھے۔ اس نے اپنا سامان باندھ لیا اسکی پیشانی سے پسینے
کے بڑے بڑے قطرے ٹپک رہے تھے۔

آہ! اس نے اپنی بیوی کو کس طرح کھو دیا! وہ بیوی جو اسکی
پاکیزہ محبت اور مہربانی اسکی روح اور جسم دونوں کے لیے رحمت
کا باعث ہوگی۔ اسکی بیوی اب بیوی نہ تھی۔

جب وہ ہسپتال جائے گا تو وہاں اسکی خدمت کے لیے ایک
نرس رہے گی۔ اسے خدا پر اعتبار ہے!

آخرکار جب وہ اپنا بیگ اور سامان باندھ کر تیار ہو گیا
تو اپنے لکھنے پڑھنے کے کمرے کی طرف چلنے لگا۔ اس کے پیر لڑکھڑا
رہے تھے۔

وہ اپنی لڑکی کو ایک خط لکھنا چاہتا تھا — ایک خط جسے
لڑکی بڑی ہو کر پڑھے — اور جب وہ ہوا خانے ہی میں مر جائے
اسے یقین تھا کہ وہ مر جائے گا۔

جب وہ کمرے میں پہنچا تو اس نے ایک عجیب و غریب
آواز سنی — اف! یہ کیا ماجرا ہے؟ وہ غور سے سن رہا تھا
تھوڑی دیر میں جان لیا کہ بازو کے کمرے میں اسکی بیوی نیند
میں خراٹے بھر رہی ہے —

وہ اپنی میز کے سامنے بیٹھ کر لکھنے لگا۔

"کیا تمہیں یاد ہے چھوٹی شہرخ — یاد کرو وہ وقت
جب کہ ہم دونوں کس قدر خوش رہا کرتے تھے — تم —
میری ننھی منی لڑکی — میں — تمہارا جوان مسرور اور تم سے
محبت کرنے والا باپ تھا۔ کیا تمہیں یاد ہیں وہ گانے جو میں
راتوں میں جبکہ تمہاری ماں کہیں باہر جاتی تو تمہیں سلانے
کے لیے گایا کرتا تھا۔ میں تمہارے لیے گاتا تھا میں گانا مطلق
نہیں جانتا مگر تم ہمیشہ مجھے گانے کے لیے کہتی تھیں کیونکہ تم
سمجھتی تھیں کہ مجھے اچھی طرح گانا آتا ہے۔

پیاری بیٹی! یہ خط تمہارے ہاتھ میں اس وقت
ہوگا۔ جب کہ میں ایک ایسی دنیا میں چلا جاؤں گا جہاں تک
تمہاری نظریں نہیں پہنچ سکتیں۔ تم مجھے یاد رکھنا نہ بھولنا
پیاری بیٹی۔ مگر ہاں اپنے معصوم دل میں میری یاد ضرور رکھنا۔
مجھے بھول نہ جانا۔ پیاری شہرخ — تمہیں سمجھنا چاہیے موت
ہم سب کو دنیا سے لے جائے گی کسی کو جلد کسی کو دیر سے
کیا تمہیں یاد ہے جب میں تمہارے پیٹ پر ہاتھ پھیرتا تو تم خوب
ہنسا کرتی تھیں اور کہتیں ابا ابا! ہمیں گدگدیاں نہ کرو۔

جب کبھی سورج غروب ہوتا ہے، جب چاند نکل آتا
ہے جب کبھی میں آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں کو دیکھتا ہوں
جب ہوائیں سائیں سائیں کرتی ہوئی درختوں میں سے گزرتی
ہیں — پیاری شہرخ! مجھے تمہاری یاد آتی ہے۔ اب تم بڑی
ہو گئی ہو — پھر بھی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میری ننھی منی
شہرخ میری گود میں کھیل رہی ہے۔

میں اور بہت کچھ لکھنا چاہتا تھا، چھوٹی شہرخ، مگر
بیمار ہوں، مرنے کے قریب ہوں۔ مجھ میں بہت کم طاقت
باقی رہ گئی ہے۔ خدا حافظ!!! میری بیٹی — تمہارا باپ
تم سے محبت کرتا تھا اور زندگی کے آخری لمحوں تک بھی وہ
تمہیں یاد کرتا رہے گا — تم ایک ایماندار — اور
نیک عورت بننے کی کوشش کرو۔"

اس نے اس خط کو ایک لفافے میں بند کرکے اس پر شہرخ
کا نام لکھ دیا اور میز کے خانے میں چھپا کر رکھ دیا۔ اب وہ اپنی
پیشانی سے پسینا پونچھ کر کھڑا ہو گیا اور بازو کے کمرے کا دروازہ
کھولا۔ دروازہ کھلنے کی آواز سے اسکی بیوی جاگ اٹھی "اب
آپ اور کیا چاہتے ہیں؟"

"میں جا رہا ہوں"

— کہاں ؟ — ہسپتال — ! آپکی مرضی !!"

لیکن تم جانتی ہو میں کس قدر بیمار رہوں میں کچھ کھا بھی نہیں سکتا۔

بانو نے اپنی گوری گردن مٹکا کر کہا " مگر مجھے یقین ہے آپ کا ہاضمہ اتنا خراب نہیں ہے !"

بانو کے یہ لفظ ایک تکلیف دینے والے گھونسے کی طرح محسوس ہوئے اب اسے بے حد ہمدردی کی ضرورت تھی۔ وہ مکان چھوڑ رہا تھا اور اپنی موت کی تیاری میں مصروف تھا۔ بہت اچھا اب مجھے جانا چاہیے باہر گاڑی میرا انتظار کر رہی ہے۔!

بانو اپنا گون اوڑھکر فریدوں کے ساتھ چلنے لگی دونوں گاڑی میں سوار ہو گئے اور گاڑی چلنے لگی، فریدوں بے حد تکلیف اور تھکن محسوس کر رہا تھا۔ وہ اب سیدھی طرح بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا اسکی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں وہ کسی کے زانو پر سر رکھ کر لیٹ جانا چاہتا تھا وہ بانو کے زانو پر سر رکھکر لیٹ گیا۔ اس لیے نہیں کہ وہ اسکی بیوی ہے بلکہ صرف اس لیے کہ وہ اسی کے مانند ایک انسان ہے — مگر بانو محبت کا اظہار کرنا تو کجا اسی طرح بیٹھی خشک اور تند لہجہ میں بات کر رہی تھی — اسی آواز سے فریدوں کو کبھی محبت تھی۔ — وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسکی آنکھوں سے آنسو آہستہ آہستہ اسکے رخسار پر ڈھلک رہے تھے

گاڑی دواخانے کے سامنے رکی۔

وہ جھٹ گاڑی سے اتر گئی اور لاپروائی سے کہنے لگی دروازہ بند ہے"!

"ہو کیا تم دروازے پر دستک نہیں دے سکتیں !"

تھوڑی ہی دیر میں دروازہ کھلا اور بانو اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے تک لے گئی۔ " اچھا خدا حافظ" بانو نے جلدی سے کہا اور چلتی بنی۔

دن ہفتوں میں بدلتے گئے وہ اپنے بستر پر خاموش ساکت بالکل مردے کی طرح پڑا رہتا۔ اسکی بیوی اسے ملنے کے لیے آیا کرتی تھی۔ وہ خطوط اور اخبارات اپنے ساتھ لایا کرتی کبھی کبھی جب شہرخ بھی اسکے ہمراہ آجایا کرتی تو اس وقت وہ خوب روتا وہ اپنے ہاتھوں سے اپنا چہرا چھپا لیتا تھا تاکہ بچی اس کا چہرا نہ دیکھ سکے۔

" آخر انہیں ہوا کیا ہے" ؟ بانو نے ڈاکٹر سے پوچھا !

عارضے کا اثر معلوم ہوتا ہے" ڈاکٹر نے کہا۔

" مگر کوئی خطرے کی بات تو نہیں نا ؟" ڈاکٹر نے اس دفعہ کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اسکی نظروں سے پہچان گئی کہ اب کوئی امید نہیں۔ اس نے محسوس کیا جیسے اسکے کندھے سے کوئی بھاری بوجھ گرنے والا ہے۔

ہر طرف سکون تھا مگر فریدوں بے کل تھا۔ ہر وقت بے چینی سے کروٹ بدلنے کی کوشش کرتا لیکن اسمیں کروٹ بدلنے کی بھی طاقت نہ تھی کبھی کبھی ایک آدھ آنسو اس کے آنکھوں سے ڈھلک جاتا تھا وہ آنسو پونچھنا تو چاہتا مگر اسمیں ہاتھ اٹھانے تک کی سکت نہ تھی۔

اسکی زندگی درد اور تکلیفوں سے بھری ہوئی تھی......

ہاں اسی کی زندگی جسے کئی سنہرے سپنے دیکھنے کی امید تھی۔

یہ تو دنیا کا دستور ہی ہے۔ تقریباً ہر شخص ایسے سنہرے سپنے دیکھتا ہے۔ اسے رہ رہ کر شہرخ کا خیال آ رہا تھا اسنے خیال کیا کہ جب شہرخ چار سال کی تھی اور اپنے رات کے لباس میں آکے شب بخیر کہنے کے لیے اسکے کمرے میں آتی اور جب تک وہ جواب میں شب بخیر نہ کہتا وہ ہرگز وہاں سے واپس نہ جاتی۔ اف اس دنیا میں اس کی زندگی کس طرح بسر ہوگی۔

اسے خود اس بات کا علم نہ تھا کہ وہ اس رات کو مرجانے والا ہے۔ آہ !! آہ !! — آہ !!! — وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔ بہت تھکا ہوا — موت اسکی منتظر تھی — وہ بالکل اکیلا تھا۔ مرتے وقت کوئی محبت سے اس کا ہاتھ پکڑنے والا بھی نہ تھا۔

اسے اپنے ماں باپ یاد آئے جو مر چکے تھے۔ اسکی

اپنے پیارے بھائیوں اور بہنوں کو یاد کیا ـــ وہ بھی مر چکے تھے یکایک اس کے رگ و پے میں ایک مسرت کی لہر دوڑ گئی اس نے سوچا کہ اب وہ ان سب کے ساتھ رہے گا۔ اس کے خیالات کا یہ چکر لگا رہا تھا وہ ہنستے کے عالم میں اپنے بستر پر خاموش پڑا ہوا تھا۔ خدا انسانوں پر بڑا مہربان ہے ! ـــ یہ کتنا پیارا خیل ہے ! مرنے والوں کے لیے تسلی کا ایک ذریعہ ـــ اللہ سب پر مہربان ہے !! ـــ جو کوئی اپنی جان کھوتا ہے "اسے" پاتا ہے وہ اب اپنی جان کھونے والا تھا۔ ہاں وہ مرنے والا تھا مگر کیا اسکی روح کا بھی خاتمہ ہو جائے گا؟ ـــ

اسکی روح ! ـــ روح کیا چیز ہے ؟ ـــ ایک خاص قسم کا تجسس اسے تڑپا رہا تھا۔ یکایک اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔

نرس کمرے میں آئی اور اسے پینے کے لیے کچھ دینا چاہی مگر وہ تکیے پر سر رکھکر بے حس پڑا تھا۔ وہ واپس چلی گئی کھڑکی سے پھولوں کی ہوا آ رہی تھی ـــ مگر وہ تھکا ہوا تھا۔ موت ! ـــ او موت !! ـــ جلد آ ـــ آ جلد آ جا ـــ

یک لخت اس کا سارا بدن اینٹھ گیا۔ وہ چندھیائی ہوئی حیران نظروں سے اوپر دیکھنے لگا۔ اسے کوئی تجلی نظر آ رہی ہے اس نے اپنے سامنے ایک بڑا گلاب کا پھول دیکھا ! نہیں ! گلاب کا کرہ ـــ جو کرہ زمین سے بھی زیادہ بڑا تھا سورج کی سنہری روشنی اس پر پڑ رہی تھی ....

.... اور اس کی سینکڑوں سنہری پتیوں کو چمکا رہی تھی۔ یہ پھول بے حد خوشبو دار تھا۔ اسکی نظروں کے سامنے چمک رہا تھا اور اس میں سے کچھ پر اسرار لطیف و نازک آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کے ارغوانی اور سنہری پتیوں کے درمیاں لاکھوں آزاد روحیں تقریباً غیر مرئی حالت میں موجود تھیں

ـــ یہی انسانوں کی آخری قیام گاہ ہے ـــ اس کے تقریباً مردہ شعور نے محسوس کیا۔

نور الحسن (خماریہ)

حقایق

گناہ و معصیت نے درد کی پوشاک پہنی ہے
جدھر دیکھو ادھر اک انقلاب کرب بنی ہے
یہ کیوں اجڑے ہوئے ہیں آہ رنگ و بے چشم عالم میں
کوئی ندی لہو کی کیا ہر سو آنکھوں سے بہتی ہے

یہ چہرہ سے ہوئے اعمال پہنچ کر رہیں مالکی
تباہی کی طرف عالم کا عالم کھنچا آیا ہے
پسینا صبر و استقلال کے ماتھے پہ کیا آئے
یہ ہر سو جبر و استبداد کا سایہ ہی چھایا ہے

جہاں سورج کی حاجت ہو وہاں شمع ظفر لاؤ
ضیا بخش زمانا شمع کا نوری نہیں آتی
یہ مانا قحط از املاک میں بھی اہل ثروت ہیں
مگر افراط زر سے اشتہا پوری نہیں ہوتی

پرستاران سیم و زر سے کہہ دو ہوش میں آئیں
خدایوں بھی دعا کے بیکساں جو رنگ بھر لائے
گرانی انتہائی شکل جب اپنی دکھاتی ہے
تو دولت کا نشہ فاقہ کی ترشی سے اترتا ہے

جو اعلائے صدا کے علمبردار ہیں ساغر
قدم ان کے بھی ڈگمگاتے ہیں کہیں راہ صدا میں
یقیناً بدر کے میدان میں نصرت انہیں ہاتھ آئی
جو مٹھی بھر جماعت تھی ہزاروں کے مقابل میں

ساغر چشتی

ہندی اردو کے جھگڑوں کو مٹانا ہر ہندستانی کا فرض ہے
اس کا ایک ہی حل یہ ہو سکتا ہے کہ ہندستانی اپنی زبان
صرف "ہندستانی" ہی استعمال کیا کریں ـ

وعدہ!

(جنگ پر جانیوالے سپاہی کا اپنی مادرِ گیتی سے)

آؤں گا اک دن یقیناً آؤں گا!!

جا رہا ہوں ملک و ملت کے لیے!
عزم و ہمت کی صداقت کے لیے!
مادرِ گیتی کی عظمت کے لیے!

آؤں گا اک دن یقیناً آؤں گا!!

فتح کے پرچم کو لہراتا ہوا!
شانِ آزادی سے اٹھلاتا ہوا!
دشمنوں کے سر کو ٹھکراتا ہوا!!

آؤں گا اک دن یقیناً آؤں گا!!

حوصلوں کو آزمانا ہے ابھی!
کاٹنا ہے سر کٹانا ہے ابھی!
ظلم کی بنیاد ڈھانا ہے ابھی!

آؤں گا اک دن یقیناً آؤں گا!!

میں تشدد جبر سہہ سکتا نہیں!
ننگِ ملت بن کے رہ سکتا نہیں!
حوصلے کیا کیا ہیں کہہ سکتا نہیں!

آؤں گا اک دن یقیناً آؤں گا!!

میں جواں ہوں قوم پہ ریکھا ہوا!
ہے لہو غیرت کا رگ رگ میں رواں!
کارفرما ہے اخوت بے گماں!

آؤں گا اک دن یقیناً آؤں گا!!

منزل و مقصد ہمارا ایک ہے!
ایک کشتی ہے کنارا ایک ہے!
لاکھ طوفاں ہو سہارا ایک ہے!

آؤں گا اک دن یقیناً آؤں گا!!

زندگی کی قدر و قیمت تاکیے!
عارضی لمحوں کی راحت تاکیے!
فقر گمنامی کی ذلت تاکیے!

آؤں گا اک دن یقیناً آؤں گا!!

رات کی تاریکیاں چھٹ جائینگی!
بیڑیاں ذلت کی جھٹک جائینگی!
راہ کی دشواریاں ہٹ جائینگی!

آؤں گا اک دن یقیناً آؤں گا!!

زعمِ باطل کو مٹاتا آؤں گا!
وسعتِ عالم پہ چھاتا آؤں گا!
گیت آزادی کے گاتا آؤں گا!

آؤں گا اک دن یقیناً آؤں گا!!

صہبا (لکھنوی)

عنوان سے اس رائے کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس وقت ہمارے پاس یونانی زبان میں جو کتاب "مبادیات نغمہ" کے نام سے موجود ہے وہ اصل میں دو تصنیفوں ـــــ "اصول" "ایاگسی" اور "مبادیات" "ادُو کزشیا" ـــــ سے مرکب ہے۔ عربی ترجموں میں دو کتابیں۔ اقلیدس کے نام سے بھی منسوب ہیں کتاب النغم اور کتاب القانون۔ نیقوماقوس کے خیالات کتاب الموسیقی الکبیر نامی ایک کتاب اور دوسری قاموسوں میں ملتے ہیں۔ ان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیقوماقوس نے واقعی یہ بڑی کتاب لکھی تھی جس کا وہ خود اپنی کتاب مبادیات میں حوالہ دیتا ہے۔ جیسا کہ خود یونانی زبان میں اس کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے۔ مبادیات ایک قاموس سے ترتیب دی گئی تھی ثابت بن قرہ نے (۹۰۱ء) نیقوماقوس کی ایک اور کتاب ارثماطیقی کا بھی ترجمہ کیا تھا جس میں ضمناً موسیقی سے بھی بحث کی گئی ہے۔ بطلمیوس بھی اپنی ایک کتاب رسالہ فی الموسیقی کی وجہ سے مشہور تھا۔ غالباً یہ وہی کتاب ہے جس کو آج کل ہم رسالہ موسیقی کے نام سے جانتے ہیں۔ یونانی زبان کی دوسری تصنیفیں جو عربی ترجموں کی صورت میں ہم تک پہنچی ہیں ان میں۔ آواز سازوں کے متعلق چند رسالے ہیں جو ارشمیدس اور اپولونیس سے منسوب ہیں ان کے علاوہ ایک اور مصنف کے رسالے بھی ملتے ہیں جو مرطوس یا مرسطوس کے نام سے معروف ہے۔ ان رسالوں کا موضوع بھی بیشتر موسیقی ہے۔

عربی زبان میں موسیقی کے نظریہ پر لکھی ہوئی سب سے قدیم قلمی کتابیں جو اس وقت موجود ہیں اور جن سے یونانی اثرات کا اظہار ہوتا ہے وہ کندی (۸۷۴ء) کی کتابیں ہیں۔ اس نے موسیقی کے اصول پر سات رسالے سپرد قلم کیے تھے اور ان میں تین ضرور اس وقت بھی ملتے ہیں یعنی رسالہ فی اجزاء الخبریہ الموسیقی۔ رسالہ فی اللحون، رسالہ فی خبر تالیف الالحان۔ ان کے علاوہ ایک اور کتاب رسالہ فی الاخبار عن صناعۃ الموسیقی بھی ہے۔ سرخسی (۸۹۹ء) اور منصور بن طلحہ بن طاہر اس کے شاگرد ہوئے ہیں اور اس کے ہم عصر علماے موسیقی میں ثابت بن قرہ (۹۰۱ء) محمد بن ذکریا رازی (۹۲۳ء) اور قسطا بن لوقا (۹۳۲ء) شامل ہیں۔ ان کے بعد تمام نظریہ سازوں کے گل سر سبد فارابی کا شمار ہے۔ موسیقی پر اس کی کتابوں میں کتاب الموسیقی الکبیر۔ کتاب فی احصاء الایقاع مراتب الایقاعات ہیں۔ ان کے علاوہ اس نے اپنی دو مشہور جامع کتابوں ـــــ مراتب العلوم اور احصاء العلوم میں بھی موسیقی پر بحث کی ہے۔

فارابی لکھتا ہے کہ اس نے کتاب الموسیقی الکبیر اس لیے تالیف کی تھی کہ جو کچھ یونانیوں نے موسیقی کے متعلق لکھا ہے اس میں مشکلات کے علاوہ ابہام بھی ہے۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ ایسی باتیں بہت کم عربی کتابوں میں تھیں۔ فارابی کے بعد علماؤں میں سب سے بڑا ریاضی داں بوزجانی (۹۹۸ء) ہوا ہے۔ اس نے بھی ایک کتاب جامع فی علم الایقاع لکھی ہے۔ اسی زمانے میں چند قاموس (جوامع) نگار بھی ہوئے ہیں جو عام طور پر اخوان الصفا (۱۰ویں صدی عیسوی) کے نام سے مشہور رہیں۔ ان لوگوں نے موسیقی پر بھی ایک رسالہ لکھا ہے جو اس وقت بہت مقبول ہوا۔ محمد بن خوارزمی (دسویں صدی) کی کتاب مفاتیح العلوم میں علم موسیقی کا حزانہ کھولنے کے لیے بھی ایک کنجی (مفتاح) موجود ہے۔

ابن سینا (۱۰۳۷ء) بھی خاص شہرت رکھتا ہے فارابی کے بعد اس نے عربی زبان میں علم موسیقی کی سب سے زیادہ اہم خدمت انجام دی ہے۔ موسیقی پر اس نے اپنی کتاب شفا اور نجاۃ میں بحث کی ہے۔ اس نے المدخل الی صناعۃ الموسیقی کے نام سے بھی ایک کتاب لکھی ہے۔ موسیقی کے متعلق اس کی ایک اور کتاب احصاء العلوم میں بھی چند اصطلاحیں ملتی ہیں۔ اس کے شاگرد ابن زیلہ نے (۱۰۴۸ء) ایک کتاب الکافی فی الموسیقی لکھی ہے اور اس کے ہم عصر ابن ہیثم نے (۱۰۳۹ء) جو ریاضی طبعیات

ایت ذہین عالم تھا، اقلیدس سے منسوب دو کتابوں کی
ں لکھیں۔ اس نے یہ کتابیں مصر میں تالیف کی ہیں جہاں
رقابل مصنف الوحات امیتہ نے (م ۱۱۳۴ء) رسالۂ موسیقی
۔ ١١ویں صدی عیسوی میں جو بہت سارے علمائے موسیقی گزرے
ان میں ابن تقاشی (م ۱۱۶۵ء)، بیلی اور اس کا بیٹا عبدالمجید
۱۱ء) اور ابن منع (م ۱۱۵۶ء) قابل ذکر ہیں۔ ١٣ویں صدی
دی میں جو نظریہ ساز گزرے ہیں، وہ مذکورہ بالا عالموں
سے زیادہ پایہ کے ہوئے ہیں علم الدین (م ۱۲۵۱ء)
رو تمام کا سب سے زیادہ ممتاز ریاضی داں تسلیم کیا جاتا
۔ اصول موسیقی کے عالم کی حیثیت سے یہ خاص شہرت
تا تھا۔ بعید تر مشرقی علاقوں میں نصیر الدین (م ۱۲۷۴ء)
س قسم کی شہرت حاصل تھی۔ موسیقی پر اس نے جو رسالہ
تھا وہ آج تک محفوظ ہے۔

اسلامی اسپین میں ابن فرناس (م ۸۸۸ء) کے بعد
سلمہ مجریطی (م ۱۰۰۷ء) اور کرمانی (م ۱۰۶۶ء) کا حال پڑھتے
جنہوں نے اخوان الصفا کے رسالوں کو مقبول عام بنایا
سرے علمائے موسیقی میں ایک یہودی ابوالفضل حسدی
یارہویں صدی عیسوی) اور محمد بن حداد (م ۱۱۶۵ء) ہیں
ن اصول موسیقی پر لکھنے والوں میں ان سے زیادہ قابلیت
ن باجہ (م ۱۱۳۸ء) کی قسمت میں آئی تھی۔ اس نے
سیقی پر جو رسالہ لکھا ہے اسکو مغرب میں وہی شہرت و مقبولیت
ل ہوئی جو مشرق میں فارابی کی کتاب کو حاصل تھی۔ ابن
ند نے (م ۱۱۹۸ء) ارسطو کی کتاب النفس کی جو فاضلانہ
رح لکھی ہے اس میں آواز کے نظریے پر بھی وضاحت سے
ث کی ہے۔ ١٣ویں صدی عیسوی میں مشہور ابن سبعین
۱۲۶۹ء) اور اس کا ہم عصر قرطبی گزرا ہے۔ جب سپانیہ
ہاتھ سے مرسیہ نکل گیا تو اس کو نصرانیوں علوم الاربعہ
کھانے کے لیے مامور کیا۔

١٣ویں صدی عیسوی میں صفی الدین عبدالمومن (م ۱۲۹۴ء)
نے نظام پسندوں کے دبستان کی بنیاد رکھی اس کے نظریے
مشہور شرفیہ اور کتاب فی الایقاعات الموسیقی نامی ایک
کتاب میں تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ حاجی خلیفہ کا
بیان ہے کہ اس کا شمار اصول موسیقی پر لکھنے والے مصنفوں
کی "صف اول" میں ہوتا تھا۔ بعد کو آنیوالے بہت سے
نظریہ ساز اس دبستان سے تعلق رکھتے تھے۔ شمس الدین
محمد بن مرحوم (م ۱۳۲۹ء) نے موسیقی پر نظم میں ایک
رسالہ لکھا تھا اور محمد بن عیسیٰ بن مزہ (م ۱۳۵۸ء) نے
بھی ایک کتاب لکھی تھی۔

ایک زیادہ بھاری بھرکم کتاب شرح مولانا مبارک
شاہ کے نام سے ملتی ہے۔ یہ شاہ شجاع (م ۱۳۵۹ء تا ۱۳۸۴ء)
کے نام معنون کی گئی تھی۔ صفی الدین عبدالمومن کے نظریوں کی
وضاحت کے لیے جو شرحیں تالیف ہوئی تھیں، ان میں یہ
بھی ایک ہے۔ اسی عربی علم کے نام ایک اور کتاب معنون کی گئی
تھی جس کا نام مقالات فی العلوم ہے اس کے ایک حصہ میں
موسیقی پر بھی بحث ملتی ہے۔ یہ کتاب غالباً جرجانی (م ۱۴۱۳ء)
کے قلم کی رہین منت ہے الزجزہ فی مسلمۃ الایقاع واللحون
کا مصنف عامر ابن قادر کردی (م ۱۳۴۰ء) ہے ابن
فناری (م ۱۴۳۰ء) نے موسیقی سے اپنی کتاب الاحصاء میں
بحث کی ہے۔ شمس الدین عجمی نے الزجزہ فی مسلمۃ الایقاع
واللحون (١٥ویں صدی) کے نام سے ایک مفید رسالہ اپنی
یادگار چھوڑا ہے۔ لاذقی (م ۱۴۹۴ء) نے ایک قابل قدر
رسالہ سپرد قلم کیا تھا جو "فتحیہ" کے نام سے مشہور ہے۔ ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ حاجی خلیفہ اس مصنف کو صفی الدین عبدالمومن
اور عبدالقادر غیبی کے ہم پایہ و ہم عصر سمجھتا ہے اور سب سے
آخر میں محمد بن مراد کا گمنام رسالہ ہے (م ۱۴۲۱ء تا ۱۴۵۱ء)
ہم نے اس رسالہ کو اس لیے یہ نام دیا ہے کہ یہ رسالہ سلطان محمد
بن مراد کے نام معنون کیا گیا ہے۔ نظام پسند دبستان کے
بانی کی تصنیفوں کے بعد غالباً یہی سب سے زیادہ اہم رسالہ ہے

کے متعلق ابتدائی اندازا کرنے کے لیے قسطنطین افریقی (سنہ ۱۰۸۷ء) کو دیکھنا چاہیے کیوں کہ سب سے پہلے جن لوگوں نے عربی کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا تھا ان میں یہ بھی ایک ہے۔ اس نے اپنی کتاب فطرت انسانی (دے ہیومانا نایتورا) اور ایک دوسری کتاب میں اجرام سماوی اور موسیقی کے شفا بخش اثرات کے عربی نظریے پیش کیے ہیں گنڈی سالوس ——— (سنہ ۱۱۳۰ء و سنہ ۱۱۵۰ء) نے اپنی کتاب اقسام فلسفہ میں ایک کتاب موسیقی پر بھی لکھا ہے اس باب کا بڑا حصہ فارابی کی دو کتابوں احصاء العلوم اور مراتب العلوم کے لاطینی ترجموں کے لفظی ترجموں کے نقلی اقتباسوں پر مشتمل ہے آخر الذکر کتاب کے ترجمے میں غالباً خود اس کا بھی حصہ ہے۔ رسالہ موسیقی ——— کا بھی اسی مصدر سے ماخوذ ہونا معلوم ہوتا ہے درآں حالیکہ اس کتاب کا مصنف (جعلی) ارسطو بتایا گیا ہے اور ونسنٹ ڈی بووے (سنہ ۱۲۶۴ء) نے اپنی کتاب (اسپیکیولم دوکٹرینالے) میں بوتھیس، الیگزینڈر اور گائیڈو کے ساتھ ساتھ فارابی کے اقتباسات بھی دیا گیا ہے (جو اپنی حیثیت میں ٹھیک) (سنہ ۱۲۷۰ء) اسی ڈس اسپینی ایسا عالم موسیقی ہے جو قسطنطین افریقی کی کتابوں سے روشناس تھا اس نے (آرس میوزیکا) (فن موسیقی) کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کی ایک تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ماخذ بھی فارابی ہے۔ یہی بات کیل ورڈبی ——— ——— (سنہ ۱۲۷۹ء) بن ——— (سنہ ۱۳۱۵ء) تیفیڈر ——— (سنہ ۱۳۰۰ تا ۱۳۶۹) اور ——— دے فلدا ——— (سنہ ۱۴۹۰) کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔

روجر بیکن اپنی کتاب اوپس ٹرشیم میں جہاں موسیقی پر بحث کرتا ہے وہاں وہ بطلیموس کے ساتھ ساتھ فارابی کا ذکر کرتا ہے۔ خصوصاً جہاں دے سائنٹیس ——— کا ذکر آتا ہے۔ موسیقی معالجاتی قدر وقیمت کے سوال پر بحث کرتے ہوئے وہ ابن سینا سے بھی استعادا کرتا ہے ——— والٹر اوڈنگٹن (سنہ ۱۳۲۰ء) نے اپنی کتاب (دے اسپیکیولیشن میوزیکاس نظریہ موسیقی) میں اور اینجلبرٹ (سنہ ۱۳۳۱ء) نے اپنے مشہور و معروف رسالے دے میوزیکا (موسیقی) میں ابن سینا سے کافی استفادہ کیا ہے۔ جیروم مراوی (دے میوزیکا تیرھویں صدی عیسوی) نے رسالہ موسیقی دے میوزیکا ——— ایک باب فارابی کے لیے بھی مختص کیا ہے اور ایک دوسرے باب میں وہ بوتھیس السیڈور سینٹ وکرا کے ہیوگ ارزا کے گائیڈو اور گارلینڈیا کے ساتھ ساتھ فارابی کے اقوال بھی موقع محل اور مناسبت کے بڑی خوبی اور انتہائی احتیاط کے ساتھ نقل کرتا ہے۔ جیساکہ جارج والا (سنہ ۱۴۹۷ء) تا ملہ جارج ریشی (سنہ ۱۵۰۴ء) کا مارے ریسس (سنہ ۱۳۵۰) کی کتابوں سے ظاہر ہے (۱۷ویں صدی ع) میں بھی فارابی یورپی عالموں کو اپنی طرف متوجہ کرتا رہا۔ آخر الذکر نے ہی احصاء العلوم کے ترجمے کو دوبارہ شائع کیا۔

علمی ادبی تعلقات کے ذریعے جو فائدے ——— حاصل ہوئے جن کا خاکا اوپر دیا گیا۔ وہ زیادہ عظیم الشان نہیں، اس سے بہت زیادہ اہم عربوں کے صوتی نظریے کا یورپ میں دخل ہوتا ہے ابن السعدی (سنہ ۱۱۹۵ء) بیان کرتا ہے کہ اموی عہد کے اسپین میں (۸ ویں تا ۱۱ ویں صدی ع) قرطبہ میں دنیا کے تمام حصوں سے حصول علم کے لیے طلبہ جمع ہوتے تھے اس لیے کہ قرطبہ میں ہر جگہ سے اہل علم موجود تھے ازاں جملہ موسیقی کا بھی مطالعہ کیا جاتا تھا۔ جو علوم اربعہ کا ایک جز ہے۔ اسی طرح بہت سے یورپی طالب علموں نے لاطینی ترجموں کی مدد بغیر

علوم کے منبعوں سے براہ راست فیض حاصل کیا ہو۔ مختصر یہ یعنی
وہ نصرانی جو اسپین میں مسلمانوں کے زیر حکومت رہتے تھے بھی
غالباً عربی زبان ہی بولا کرتے تھے۔ چنانچہ ان لوگوں نے علوم
علوم کی نشر و اشاعت میں نہایت اہم حصہ لیا ہے۔ یہ تو ہم
اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب روجر بیکن جامعہ آکسفورڈ
میں اپنے طلبا کو خطبے دیتے ہوئے عربی کے ناقص لاطینی
ترجموں کے حوالے دیا کرتا تو یہ طالب علم اس کا مضحکہ اڑایا
کرتے تھے اس لیے کہ اپنے استاد کی سندوں تک ان کو
عربی دانی کی وجہ سے راست دسترس حاصل تھی۔ اگر
ایڈیلارڈ باتھوں (ابتدائی ۱۲ویں صدی) کی طرح انگریز
حکیم نے بھی اپنے ناظرین و سامعین کو یورپی مدرسے چھوڑ کر
اسلامی مدرسوں میں داخل ہونے کا مشورہ دیا تھا تو کوئی
تعجب کی بات نہیں۔ یورپ کے علماے موسیقی یونانی نظریۂ
موسیقی سے ارسٹوکسینس کیا، پہلے بوتھیس، کاسی دورس اور
السیدورسے واقف ہوئے تھے درآں حالیکہ مسلمانوں
کے پاس [illegible]، ارسطاکوس، آقلیدس، نیقوماخس،
بطلیموس اور اسی قسم کے دوسرے مصنفوں کی کتابیں تھیں
اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ اگر عربی زبان میں موسیقی پر جو
بہترین کتابیں لکھی گئی تھیں ان کا لاطینی میں ترجمہ نہ ہوا
ہوتا تب بھی اگر صرف یہ حقیقت دریافت ہو جاتی کہ عربوں
نے ان یونانی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا تو اس سے بہت
فائدہ بخش نتیجے نکل سکتے تھے۔

یہ بات کہ مسلمانوں نے سرگم کے مسئلے اور ابجدی
ترسیم کے سلسلے میں بھی اہل یورپ پر اپنا اثر ڈالا تھا
کسی حد تک قطعیت سے نہیں کہی جا سکتی۔ آلاتی موسیقی
پر مسلمانوں کا عطیہ بہت زیادہ واضح ہے۔ چنانچہ
اسی موضوع پر لکھی ہوئی قدیم ترین دستاویز جو [illegible] سے
[illegible] ہے۔ اس حقیقت کو کھلے طور پر
[illegible] تک ترسیم کا تعلق ہے اسلامی

مشرق میں اس کے استعمال کا قدیم ترین زمانہ قریب سنہ ۹۰۰ء
سے زیادہ نہیں۔

موسیقی کے سلسلے میں مسلمانوں کا یورپ کو غالباً سب سے
زیادہ اہم تحفہ ساحتی موسیقی ہے۔ فرانکو کولونی (سنہ ۱۱۹۰ء)
سے پہلے یورپ میں موزوں موسیقی کا پتا نہیں لگتا اس کے
برخلاف ۱۰ویں صدی عیسوی ہی سے ساحتی موسیقی یا
ایقاع عربی موسیقی کا ایک جزو لاینفک تھا۔ چنانچہ کندی
(سنہ ۸۷۴ء) کی ایک کتاب میں اس کا بیان موجود ہے
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف ترقیموں کی ساحتی قدریں
بلکہ وہ متناسب سُر بھی ابتداً عربوں سے لیے گئے تھے
جو فرانکو اور اس کے دبستان میں ملتے ہیں۔ چنانچہ ایک
لاطینی رسالہ (دے منیسوریس ایم دس کا نیتو) (سنہ ۱۲۰۰ء
تا سنہ ۱۲۸۰ء) میں ہم کو ترقیموں کی خاص خاص قسمیں نظر آتی
ہیں جن کے نام (ال موا ہیم ———— اور
ال مواریفا) ہیں اور یہ عربی الاصل ہیں۔ دوسری طرف جو
ہانس ڈی موری (۱۴ویں صدی) کی کتابوں میں ہمیں
ایک ترکیب کا حوالہ ملتا ہے جو (آلفسترچہ)
کے نام سے معروف ہے اور یہ بھی عربی الاصل ہے
قرون وسطا کا (ہاکٹ) جس کو مابر سٹوڈی
ہینڈلو (سنہ ۱۳۲۶ء) ترقیموں اور وقفوں کا مجموعہ کہتا
ہے وہ دراصل عربی کے ایقاعات ہیں ٹھیک اسی طرح
جس طرح عربی لفظ العنق ابن سینا کی کتاب قانون کے
لاطینی ترجمے میں (الہاشس) بن گیا ہے

عملی فن

مسلمانوں کی آلاتی موسیقی کی نشر و اشاعت
گویوں کے طبقے کی رہین منت ہے۔ قرون
وسطا میں فن موسیقی کو پھیلانے والے دراصل یہی لوگ
تھے۔ مغربی گویوں کی زرق برق پوشاک، لانبے لانبے
بال رنگے ہوئے چہرے شاید مشرقی اثرات کا نتیجہ
تھے۔ یقیناً مسلمان مغنیوں کی باقیات تھے جو

تونی ناٹ ادبو (۹۵۸ء) کے زمانے تک بھی یہ موریسکو مسلمانوں کی تقلید میں اپنے چہرے رنگا کرتے تھے۔ ابو کے لیے باسکو زبان میں زمستل ترین کا لفظ ــــــ رائج ہے۔ یہ در اصل عربی کا ... الزین ہے۔ انگریزی کے (ماسکر) کی طرح اپنی زبان کا (ماسکارا) عربی کا مسخرہ ہے۔ جیدہ تھا سے اندلس میں موسیقی سے متعلق بیسیوں الفاظ عربی الاصل ہیں مثلاً زمبارا، درابانڈا، مستعار ( ) ان سب کا عربی الاصل ہونا ظاہر ہے۔

مسلمانوں کی صالح تر تہذیب کا اثر مغربی یورپ پر پڑنا لازمی تھا۔ یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ نویں صدی عیسوی میں نصرانی اہل اسپین ردیف اور وزن میں عربی اصول کا اتباع کرنے لگے تھے۔ دسویں صدی عیسوی میں تو یہودی بھی اس سے متاثر ہو چکے تھے۔ چونکہ شعر اور موسیقی باہم مربوط ہیں اس لیے ظاہر ہے کہ جو شعر جس تال سر میں گائے جا سکتے تھے وہ بھی مستعار لیے جاتے تھے۔ نصرانی اسپین میں عرب اور یہودی دونوں قوموں کے آثار موسیقی ملتے ہیں۔ دسویں صدی عیسوی میں جب بارسلونا کے کونٹ پراونس کے حکمران ہو گئے تو ممکن ہے یہ لفظ عربی طرب سے مشتق ہوا۔ عربوں کا امیر اور اس کا معنی طروب اور اس کے ا جانگلر ( ) کی صورت میں دوبارہ نمودار ہوئے۔

مغربی یورپ کے لیے آلات موسیقی کا عطیہ بہت نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ یہ بات کہ مغربی یورپ کے آلات موسیقی کے نام بلکہ خود آلات موسیقی اور ان کی صنعت تعلیم مسلمانوں ہی کا عطیہ ہے عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے۔ رباب، ربیک، فلوٹ اور ناکارا کا اصل نمود رباب، قیثارہ اور نقارہ ہونا مسلم ہے۔

اہل یورپ نے آلات موسیقی کے ہو بہو سے نئے نئے نام اختیار کر لیے ان سے ہمیشہ یہ ثابت ہونا ضروری نہیں کہ خواہ وہ آلات بھی نئے تھے ممکن ہے کہ یہ بیاک دبلو [illegible]

کی وجہ سے ہو۔ مسلمانوں کے بہت سے ایسے ساز یورپ میں داخل ہوئے جو نمایاں طور پر اہل یورپ کے لیے بالکل نئے تھے اور یورپی موسیقی کے لیے بھی قابل لحاظ اہمیت رکھتے ہیں۔ پہلے تو عود طنبور اور قیثار قسم کے تار دار آلات کا پورا گروہ مغرب پہنچ گیا۔ اس کے بعد مختلف قسم کے کمانی دار آلات در آمد ہوئے۔ ان مزامیر کے ابتدائی رواج کے متعلق ہمارے پاس ایسو ہل (۸ ویں صدی) مقراور سالڈرس (دسویں صدی ع) کی شہادتیں موجود ہیں۔ یہ مزامیر اپنے ساتھ بہت سی خوبیاں بھی لیتے آئے۔ مسلمانوں سے ربط و تعلق پیدا ہونے سے قبل یورپی گروہ کے پاس تار دار آلات میں صرف بین اور بربط تھا اور بجاتے وقت ان کو صرف اپنے کانوں کی راہ نمائی پر اکتفا کرنا پڑتا تھا۔ یورپ میں جب مسلمانوں کے عود طنبور اور قیثار آئے تو معلوم ہوا کہ ان سازوں کے طور پر فردوں (انگریزی فرٹ) کے ذریعے ترقیمیں قائم کی جاتی ہیں اور ترقیموں کا یقین پیمائش سے ہوتا ہے۔ صرف تنہا یہی ایک چیز ترقی کی ایک بڑی منزل تھی۔ شاید ان فردوں کی وجہ سے یورپ میں نہاسر کا استعمال ممکن ہو سکا۔

غرض مسلمانوں کے تعلقات سے یورپی موسیقی کو جو سب سے بڑا فائدہ حاصل ہوا وہ اہل یورپ کی ساختی موسیقی اختیار کرنا تھا۔ اور یہ چیز نظریہ سازوں کی توجہ سے بہت پہلے گویوں کے ذریعے عام ہو چکی تھی۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ لحن یا راگ کی زینت سے کام لیا جانے لگا۔ مسلمانوں کے دوسرے فنوں میں لحن کا بدل طغرائی گل کاری ہوتی ہے لحن کی ایک قسم ترکیب کہلاتی تھی۔ ترکیب کا مطلب یہ تھا کہ وقت واحد میں ایک ہی سر کے چوتھے یا پانچویں اور آٹھویں سے سر ضرب لگائی جائے۔ غرض کہ اہل یورپ کو ہم آہنگی کی طرف لے جانے کی پہلی تحریک غالباً اسی کی وجہ سے ہوئی۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ قرون وسطیٰ کے ایک ترکیب

غزل

یہاں کچھ ایسے مسکرا رہے ہیں وہاں کچھ ایسے کراہتے ہیں
زہے تکلف ستم ظریفی مجھے محبت سکھا رہے ہیں
ادھر سے شرما کے جا رہے ہیں ادھر سے ٹھوکر کھا رہے ہیں

ابھی محبت چھپا رہے تھے ابھی محبت جتا رہے ہیں
حسین تکلی کی خاک سے ہر روش پہ جلوہ دکھا رہے ہیں
شباب کے ولولے نہیں ڈوبی ہوئی اور انہیں دبا رہے ہیں
وہی نتیجہ کہ جس سے میں ابتدائے الفت میں کانپتا تھا
یہ الجھنیں ہیں کہ آج وہ بھی اسی نتیجے پہ آ رہے ہیں
سحر کے کھلتے ہوئے اندھیرے کا رات اوڑھ کر نگاہیں
وہ اپنے چہرے سے زلف رفتہ رفتہ ہٹا رہے ہیں
ہماری بیکاریوں پہ فرقت نصیب آپ ہنس رہے ہیں
ابھی مصیبت نہیں پڑی ہے خوب آنسو بہا رہے ہیں
اگر تصور نہیں وہی ہیں تو میرے پہلو میں گدگدائیں
یقین مجھکو ابھی نہیں ہے وہ میرے برابر آ رہے ہیں
میں شام وعدہ ذرا سی تاخیر بعد پہنچا تو چھپ کے دیکھا
وہ زیر رخسار ہاتھ رکھے کوئی غزل گنگنا رہے ہیں
بنے ہوئے روح شعر و نغمہ بصد ادائے نظر نوازی
مجھے سمجھ کر وہ میری تصویر کو مخاطب بنا رہے ہیں
تم جدائی چھپا کے دنیا سے ایک آفت خرید لی ہے
کسی کو میں کچھ بتا رہا ہوں کسی کو وہ کچھ بتا رہے ہیں
ہمیں ملے شاد ہوش آتے ہیں ورنہ دنیا کے آزدہ
تمہیں بھی صد اتفاق دلچسپ جستہ جستہ سنا رہے ہیں

شاد عارفی

نوائے وقت

سینۂ وقت میں پوشیدہ ہیں لاکھوں خورشید
ہر شب تار سے اک تازہ سحر پیدا کر
خاک میں فطرت آدم کی جو مضمر ہیں ہنوز
انہی ذرات سے خورشید و قمر پیدا کر
ذرے ذرے میں یہاں ایک شرر تابندہ ہے
جلوۂ محسوس میں ہے جلوۂ نظر پیدا کر
شعلۂ درکار ہیں ترکیب نشیمن کے لیے
گل و نسریں سے بھی طوفان شرر پیدا کر
یاس و آلام کی وادی میں بھٹکنے والے
نغمۂ غم میں بھی نغمے کا اثر پیدا کر
ہر اندھیرے میں اجالا نظر آ جائے تجھے
کم سے کم ایک تو ایسی بھی نظر پیدا کر
ذوق تقلید ہے افکار و نظر کی توہین
ہٹ کے منزل سے نئی راہگزر پیدا کر
ہے ترے نقش قدم پر مہ و انجم کی نگاہ
شورش پا میں بھی انداز خضر پیدا کر
کارواں رخت سفر کھول چکے منزل پر
شام منزل ہی سے اب صبح سفر پیدا کر
افق کے اب سرخ ہوئی جاتی ہے چشم مریخ
جرعۂ جام سے اب خون جگر پیدا کر
زلف و رخسار سے جو کھیل چکا ہے صدیوں
اب اسی بزم سے شمشیر و تبر پیدا کر
داستاں کہنہ میں تو بہت عام ہوئی
کوئی افسانہ بعنوان دگر پیدا کر

شور (دہلی)

جب گئی وہ تو یہ پیشی آکر   کھل گئی آنکھ مری گھبرا کر
ایک مدت ہوئی دیکھا تھا جو خواب   ہے اسی دن سے مرا دل بیتاب
ہے مقدر میں خدا جانے کیا   اسکی تعبیر ہے کیا جانے کیا

اب پھر کیفیت نفس سنانے لگتے ہیں ـــــ

سر مکتوم ہے کیفیت نفس   کسکو معلوم ہے ماہیت نفس
محشرستان ہے خیال انساں   ایک طلسمات ہے حال انسان
کبھی ناظر ہے کبھی ہے منظور   کبھی مختار کبھی ہے مجبور
مرکز دائرہ بیم و رجا   محور دائرہ حرص و ہوا
جمع ہیں اس میں صفات متضاد   ہے مرید آپ ہی اور آپ مراد
کبھی طاعت میں ملک سے بھی سوا   کبھی رفعت میں فلک سے بھی سوا
رہرو منزل بدنامی شوق   گرہ وادی ناکامی شوق
اپنی کوشش پہ کبھی ناز اسے   ناامیدی سے کبھی ساز اسے
مشتعل کوے جفا میں کبھی   مستقل راہ وفا میں نہ کبھی
کبھی آوارہ میدان ہراس   کبھی گم کردہ عقول و حواس
کبھی جلوہ ہے کبھی طور ہے یہ   کبھی سایہ ہے کبھی نور ہے یہ
میکش میکدہ جوش و خروش   خود فراموش سراسر مدہوش
کبھی دیوانۂ حسن تجرید   کبھی مستانۂ جام توحید
یوں تو کیا چیز خدائی میں نہیں   مثل اسکا نہ ملا ہم کو کہیں
سر پہ ہے فلک مینا رنگ   زیر پا سطح زمیں رنگا رنگ
دیکھ یہ چاند ستارے ہیں   جنکو گن گن کے بشر ہارے ہیں
لائق دید ہیں انکی چمک   قابل سیر یہی ایک رنگ
قابل رشک ہے عالم کی بقا   ہم زمانے میں نہ تھے اور یہ تھا
ہم نہ ہوں گے یہ رہیگا قائم   دور دورہ ہے اسی کا دائم
بیشک اس دہر سے کد ہے ہمکو   حسرت عمر ابد ہے ہمکو
ایسا ہے یہ بھی اگر ہم نہ رہے   جب نہ ہوں ہم تو یہ عالم نہ رہے
اوڑ گئی باغ سے جب بلبل زار   کون دیکھیگا گلستاں کی بہار
ہم نہ انساں تو دنیا کیوں ہو   جب نہ ہو قیس تو لیلیٰ کیوں ہو
اور اگر سب ہیں یہیں رہنے کو   بس ہمیں ایک ملے مرنے کو
ہم یہاں آئے ہیں بس جینے کے لیے   کیا بنایا تھا مٹانے کے لیے

اب خاتمہ ملاحظہ کیجئے ـــــ

بس بس اے دل بیگنہ میں بیکار   کون سنتا ہے تری حالت زار
اہل ظاہر جو سنیں گے یہ طور   ترش رو ہوکے کہیں گے فی الفور
کفر بکتی ہو تری تقریر میں ہے   اس پہ شاکر ہوں جو تقدیر میں ہے
تجکو تکفیر سے کچھ خوف نہیں   اہل تزویر سے کچھ خوف نہیں
بسکہ دشوار ہے یہ طرز سخن   وہ سمجھیں گے جو ہیں اہل فن
کون سمجھے یہ معما تیرا   شکر سے بڑھ کے ہے شکوہ تیرا

اس قصیدے کو ختم کرکے ایک عاشقانہ غزل اسی بحر میں لکھتے ہیں۔

کیا کہیں تم کو ستمگر نہ کہیں   بات مطلب کی ہے کیونکر نہ کہیں
دل میں چبھتی ہیں ادائیں تیری   پھر کہیں کیا انہیں نشتر نہ کہیں
اپنی تصویر پہ تم خود غش ہو   تم سے پھر کیوں اسے بہتر نہ کہیں
بے نیازی کی بھی حد ہوتی ہے   کیوں ترے قلب کو پتھر نہ کہیں
اس قدر ناز کر صنم اے مرزا
سننے والے تجھے کافر نہ کہیں؟

اس مثنوی کا معتدبہ حصہ ہم نے نقل کیا ہے جس کے مطالعہ سے مرزا صاحب کی قادر الکلامی اور قابلیت کا اندازہ ہو جائیگا اسکی ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ ۱۹۹۱ء میں مرزا ہر سوائے حکمت و فلسفہ، ہیئت و نفسیات پر اظہار خیال کیا ہے اس زمانے میں دو ایک رسالے ہیئت پر ایک آدھ مختصر سا رسالہ فلسفے اور منطق پر ہندستانی میں نظر آتا تھا نفسیات پر کسی نے نثر میں بھی خامہ فرسائی نہیں کی تھی تو پھر تا بہ نظم چہ رسد؟

ہندستانی شاعری پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اس میں بلند مضامین نظر نہیں آتے اور ہندستانی شعر میں فلسفہ کا تحمل نہیں ہو سکتا اس کے جواب میں ہم اس مثنوی کو پیش کرتے ہیں اہل نظر اسکو دیکھ کر یقیناً اپنی رائے بدل دینگے اس مثنوی میں یہی خصوصیت نہیں ہے کہ مضامین حکمیہ نظم ہوئے ہیں بلکہ اس میں شعری خوبی اور شاعرانہ لطافت بھی موجود ہے جو متن خالص اس کی شوخی قبول میں " اس بحر میں ہے جس کا ایک شعر ضرب المثل بنا ہوا بچے بچے کی زبان پر ہے۔

کرن تھا بے فغاں درویش — قہر درویش بجان درویش

مرزا صاحب کی اس مثنوی کو مومن کی مثنوی کے ساتھ ملاکر دیکھیے تو آپ کو حیرت ہوگی کہ مرزا نے باوجود لکھنؤ اسکول کے شاعر اور لکھنوی استاد کے شاگرد ہونے کے مومن کا رنگ اختیار کیا ہے۔ آخری غزل آپ نے پڑھی ہے مطلع سے مقطع تک پانچوں شعر مومن کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں خصوصاً یہ شعر۔

بے نیازی کی بھی حد ہوتی ہے — کیوں ترے قلب کو تھم نہ کہیں

بالکل مومن کے انداز کا ہے اور مقطع تو معلوم ہوتا ہے کہ مومن ہی کا ہے۔

اسقدر ذکر صنم اے مرزا — سننے والے تجھے کافر نہ کہیں

بجائے مرزا کے مومن لکھ دیجیے تو کوئی نہیں سمجھ سکیگا کہ مومن کا مقطع ہے یا کسی اور کا۔

تمکین کاظمی

جان کے دشمن باز نہ آنا

دل کے داغ نہ مٹنے پائیں
زخم ہرے ہیں سوکھ نہ جائیں
دکھ کی ماری روح کو ہرگز
سکھ کے داغ نہ لگنے پائیں

دل کے زخم کو چھیڑے جانا
جان کے دشمن باز نہ آنا

دل کی کھیتی پھر نہ ہری ہو
خشک چمن میں آب نہ تری ہو
ایسا اجڑے بوٹا بوٹا
باغ نہ پھر آباد کبھی ہو

دل کے زخم کو چھیڑے جانا
جان کے دشمن باز نہ آنا

صحن چمن تاراج خزاں ہو
تختہ گل بے نام و نشاں ہو
غنچہ غنچہ مرجھا جائے
نکہت گل آہوں کا دھواں ہو

دل کے زخم کو چھیڑے جانا
جان کے دشمن باز نہ آنا

ریت جہاں کی ایسی بدلی
دوست سے دشمن کی بن آئی
مٹ گئیں ساری جی کی امنگیں
چوٹ کچھ ایسی دل نے کھائی

دل کے زخم کو چھیڑے جانا
جان کے دشمن باز نہ آنا

نغمہ (لکھنوی)

دوسرا شاندار ہفتہ
الجھن
مشہور ڈائرکٹر مسٹر اچاریہ
کنوارا باپ کے خالق نے بنایا ہے
دلکش واقعات، رنگین نظاروں، انوکھے خیالات
کو شفق کی رنگینی اور شہد کی مٹھاس میں سمو کر
پیش کیا گیا ہے جسکا لطف خود دیکھنے سے ہی اٹھایا جا سکتا ہے
ادا کار
سردار اختر، مظہر خاں، کرشنا کانت، راجکماری شکلا
رائل ٹاکیز

الٹی گنگا

افلاس کی بھینٹ

رامی حسین تو نہیں تھی لیکن ناک نقشے کے لحاظ سے وہ بدصورت بھی نہ تھی۔ شباب خود ایک بہت بڑی خوبصورتی ہے۔ اسکی شربتی آنکھیں ملیح چہرا۔ موزوں قد و قامت ہر دیہاتی نوجوان کو اپنا گرویدا بنانے کے لیے بہت کافی تھا لیکن قسمت کی ہیٹی وہ گاؤں کے ایک ادھیڑ عمر کے مزدور رامو کی بیوی تھی جس کا ایک پاؤں فالج کے اثر سے حال ہی میں معذور ہو چکا تھا۔ اور اب وہ کام کاج کے بھی قابل نہ تھا دو بچے بھی اسنے اس مصیبت میں زیادتی کے لیے انہیں عنایت کیے۔

"ماں بابو سے کہو روٹی لانے کے لیے بھوک بہت ہو رہی ہے۔"

رامی کے ایک ننھے نے روتے ہوے کہا۔

رامی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ دونوں بچے بھوکے تھے رات کو انہیں صبح کا وعدہ کرکے سلا دیا گیا تھا۔ اب صبح وہ کیوں نہ مانگیں۔ اور مانگیں تو یہ کہاں سے لا کر دے۔ جبکہ شوہر گھر پر پڑا کراہ رہا ہے دوسرا کوئی مددگار بھی نہیں۔ "ماں بابو کو کیا ہو گیا وہ بازار کیوں نہیں جاتے" دوسرے ننھے بچے نے بلک کر کہا بچوں کی اس بلبلاہٹ کو وہ بڑی بے چینی سے برداشت کر رہی تھی اس سے ان معصوموں کا کوئی جواب بن نہیں پڑتا تھا کہ ایک جانب آواز بلند ہوئی "اری شہر میں کام چل رہا ہے وہاں مزدوری کے لیے کیوں نہیں چلی جاتی۔ میرے منہ میں کل سے ایک کھیل تک نہیں گئی ...... ہائے ...... اف" ..... رامو نے کروٹ لیتے ہوئے کہا "پیٹ کے لیے جانا ہی پڑے گا۔ مگر ان بچوں کو کون سنبھالے گا میں انہیں لیے کیسے کام کر سکوں گی آج تم سنبھال لو انہیں" رامی نے کہا "نہیں یہ مجھ سے نہ ہو سکیگا۔ دیکھتی نہیں میں خود ہی تکلیف میں ہوں پھر ان چیاں پیاں کو کیونکر سنبھال سکتا ہوں، لے جا انہیں بھی اپنے ساتھ کیا کریں گے یہ مجھے پھر تیرا کام میں بھی جی لگ جائے گا" رامو نے کہا۔ رامی کے لیے اب سوا اس کے کوئی چارا ہی نہ تھا کہ دونوں بچوں سمیت وہ کام پر چلی جائے وہ اٹھی ایک کو کندھے پر اور دوسرے کو گود میں لیکر شہر کی جانب جو گاؤں سے تین میل کے فاصلے پر تھا چل پڑی۔ وہ آنسو بہاتے ہوئے شہر کا راستہ طے کر رہی تھی۔ اس نے سوچنا شروع کیا۔ "میں بھی کبھی بچی تھی" .... اس کے خیالات کی ریل گاڑی ماضی کی پٹڑیوں پر چلنے لگی وہ بھی کبھی بچی تھی۔ اگر باپ کو اس نے دیکھا نہیں تھا۔ لیکن ماں کی آغوش میں اسے وہ سب کچھ سکون میسر تھا جو اور بچی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ اس کا بچپن کتنا مسرت کن اور فردوس نظر تھا۔ گاؤں کی لڑکیاں جب ندی کنارے ریت میں گھروندے بناکر کھیلتے ہوئے اسکو مہارانی کہکر پکارتیں تو وہ پھولے نہ سماتی تھی تمام گاؤں کے لوگ اسکو رامی رانی کہکر پکارتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ وہ تونگر ماں کی بیٹی تھی بلکہ اس لیے کہ اسکی سیرت سے گاؤں کے لوگ بہت خوش تھے۔ بچپن کا زمانا آنکھ جھپکتے گزر گیا اور شباب کی منزلیں طے ہونے لگیں۔ ماں کی کچھ زینات تھیں انکے بھائی نے ماں کو چکنی چپڑی باتوں میں لاکر تمام زینات فروخت کر دیں اور ایک روز وہ بھی اپنے بچوں کو لیکر گاؤں سے غایب ہو گیا۔ اب کیا تھا ماں کی آنکھیں کھلیں۔ کیا ہوتا اب جب "چڑیاں چگ گئیں کھیت"۔ ماں نے اب محنت مزدوری سے اپنا اور رامی کا پیٹ پالنا شروع کر دیا۔ بڑی تنگدستی کے ساتھ زندگی بسر ہونے لگی۔ اس کے باوجود بھی رامی خوش تھی۔ جوانی کی اٹکھیلیاں شباب کی سرمستیوں اور پریشانیوں کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتیں۔ اسکی جوانی اور خوبصورتی سے گاؤں کا ہر نوجوان متاثر تھا ہر ایک چاہتا تھا کہ رامی اسکی شریک زندگی ہو جائے۔ گاؤں میں ایک غریب کمنڈو کا بیٹا شرنو بھی رہتا تھا۔ جس کو وہاں کے لوگ بڑی عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ایک روز رامی گوبر کے اوپلے تھوپ کر گھر واپس ہو رہی تھی کہ راستے میں ایک بہت بڑا سانپ اسکے قریب سے گزر رہا تھا۔ رامی چیخ مار کر گر پڑی اور ادھر سے شرنو بیلوں کی جوڑی لیے ..... پیا ملن کو جانا ..... گاتے ہوئے آ رہا تھا۔ رامی پر نظر پڑتے ہی اس نے اسکو اٹھا لیا اور منہ

آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے محسن کا شکریہ ادا کیا اور مسکراتی شرماتی
وہاں سے چلی گئی۔ یہ واقعہ ان دونوں میں محبت پیدا کرنے کا ایک ذریعہ
ثابت ہوا۔ اس کے بعد دونوں میں محبت ہوگئی۔ رات گئے دونوں
چھپتے چھپاتے ندی کنارے ملتے اور خوب خوب محبت کی باتیں ہوتیں
عہد و پیمان کیے جاتے۔ مسرتوں کا زمانہ تھا۔ عیش و عشرت کے
دن تھے۔ دونوں نے ایک رات ندی کنارے چاند اور تاروں
کو گواہ کرکے آخر یہ عہد کر ہی لیا کہ وہ دونوں مرتے دم تک
ایک ہی رہینگے۔ اور کوئی قوت انہیں اس ارادے سے باز نہ رکھ
سکیگی۔ زمانے کو گذرتے دیر نہیں لگتی۔ انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ۔
جنگ کے خوفناک آتشیں شعلے ملکوں کو جلاکر شہر سے گاؤں تک
پہنچنے لگے۔ بھوک اور فاقوں سے تنگ آکر گھنڈو نے اپنے بیٹے
شرنو کو فوج میں بھرتی کرکے محاذ پر بھیج دیا۔ رامی کی زندگی کا ساز
خاموش ہوگیا۔ گنگناہٹ آہوں میں، خوشیاں اشکوں میں تبدیل
ہوگئیں۔ اس کے لیے اب دن رات دونوں برابر تھے ماں نے
اسکی یہ حالت دیکھ لی اور اسکی شادی کی فکر میں رہنے لگی لوگوں
کے بہکانے اور کہنے سننے سے ایک روز اسی گاؤں کے عمر رسیدہ
راموں کے گلے رامی باندھ دی گئی۔ گاؤں کی شرمیلی دوشیزہ نے
ماں کے اس نادر شاہی حکم کے آگے آخر اپنے سر تسلیم کو خم کر ہی دیا
جوانی کی خوشیاں کافور ہوگئیں اور دل گرفتہ ہوکر اس نے ایک اور ہی
دنیا میں قدم رکھا۔ یہاں آکر اسے کن کن مصیبتوں کا مقابلہ کرنا پڑا
...... گرانی بھوک ...... فاقے ..... اور ان افلاس اور نکبت
کے ماروں پر اللہ نے اپنی مہربانیوں کی بارش بھی شروع کر دی
سال کو ایک کے حساب سے دو لاچار جانیں ان کی مصیبتوں
میں زیادتی کے لیے ان کے ذمے کر دی گئیں۔ اس کی مہربان ماں
بھی اس دنیا سے چل بسی ..... اب تو اسکی مصیبت اور دگنی ہوگئی
کیونکہ اس کا شوہر بھی اب بالکل معذور ہو چکا تھا نہ وہ روزی کما
سکتا ہے اور نہ ان کو پال سکتا ہے۔ اب تو رامی کو ہی کام ڈھونڈنا پڑیگا
سسکیوں کی دنیا اور یہ بے بسی کا عالم۔ انہی خیالات میں کھوئی
ہوئی وہ شہر میں داخل ہوئی۔ جہاں مزدور اپنے کام میں لگے ہوئے تھے

"بابو جی مجھے بھی کچھ کام ملیگا"۔ رامی نے کرسی پر بیٹھے ہوئے
مستری سے کہا۔ اس کے جواب میں مستری نے رامی کو سر سے
پاؤں تک دیکھا اور مسکرا دیا۔ "تو مزدوری کریگی ..... نازک
..... پھول جیسی نازک لڑکی۔ تو مزدوری کیا کر سکے گی۔ اس دھوپ
میں پتھر توڑ سکے گی تو؟" مستری آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولا "ہاں
پیٹ کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے بابو جی"۔ "اری تیرے کوئی مرد
نہیں"۔ "ہے کیوں نہیں، لیکن وہ تو بیمار ہے اس لیے میں چلی
آئی"۔ "او ..... یہ بات ہے۔ کہیں رہتی ہے تو" "نہیں بابو جی
میں یہاں سے ایک قریب کے گاؤں میں رہتی ہوں"۔ "کیا نام
ہے تیرا" "میں رامی ہوں"۔ "رامی! اچھا جا وہ سامنے عورتیں
پتھر توڑ رہی ہیں جا تو بھی شریک ہو جا گو تو دیر سے آئی ہے
لیکن پوری مزدوری ہم دلا دینگے تجھے"۔ رامی کام پر لگ گئی دونوں
بچوں کو اس نے ایک درخت کے نیچے بٹھا دیا لیکن بھوک کے بچے
کہاں چین لینے دیتے "ماں بھوک ہو رہی ہے روٹی دے" یہ
تھا جملہ جو بچوں کی زبان پر تھا۔ خود رامی بھوک سے نڈھال تھی
دو روز سے اسے کھانا نہیں ملا تھا اور ایسی سخت محنت تو شاید
اس نے اپنی عمر بھر میں بھی کبھی نہیں کی تھی۔ شوہر کا خیال الگ
اسے ستا رہا تھا۔ دوپہر تک اس نے بچوں کو کسی طرح ٹالا لیکن
دوپہر کے بعد بچے بھوک سے نڈھال ہوگئے اب ان میں رونے تک
کی بھی سکت نہ تھی چھوٹے چھوٹے منہ کھول کر ماں کو اشارہ کرتے تھے
آہ! رامی کیا کر سکتی تھی مزدوری ملنے کو ابھی آدھا دن باقی تھا
اب کس طرح ان ننھوں کے لیے کھانا مہیا کر سکتی تھی وہ بچوں
کے پاس چلی آئی۔ دونوں کو اپنے زانو پر لٹا کر سمجھانا شروع
کیا۔ بچے نقاہت اور کمزوری سے رو بھی نہیں سکتے تھے بھوک
کی شدت نے بیہوشی طاری کر دی دونوں اسکے آغوش میں
سو گئے اسے مستری نے آکر ڈانٹا۔ "اری آرام سے بیٹھ کر پوری
مزدوری حاصل کریگی"۔ اس کا کلیجا دھک سے کر کے رہ گیا۔ "نہیں بابو جی
بچوں کو سلانے کے لیے آگئی تھی"۔ وہ ڈھلتی کمر زمین پر ٹکا کر کھڑی
ہوئی۔ "اری تیرے بچے ایسے بے حواس کیوں پڑے ہیں" مستری نے پوچھا

رامی کے آنکھوں سے آنسو بہنے لگے "کل سے بھوکے ہیں باوجی"۔ مستری چلا گیا اور تھوڑی ہی دیر میں کچھ پھل اور دودھ لیکر لوٹ آئی۔ یہ لے اور اپنے بچوں کو کھلا۔ اس نے کہا "آپ نے کیوں تکلیف کی باوجی"، رامی نے کہا۔ "خیر یہ بھی کہنے ہوئے" وہ سامان رامی کے سامنے رکھ دیا۔ رامی نے بچوں کو جگا کر کھلایا اور انہیں وہیں چھوڑ کر چلی گئی۔ مستری بچوں کے پاس بیٹھ کر رامی کو گھور رہا تھا اسکی یہ بد نظریں اپنی نیت کو رامی سے چھپا نہ سکیں۔ وہ ایک آفت سے نکل کر دوسری آفت میں پھنس گئی تھی چھ بجے تمام مزدور کام سے علٰحدہ ہوگئے رامی اپنی مزدوری لیکر بچوں کے ساتھ شہر کی طرف روانہ ہوگئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو مستری بھی گنگناتا ہوا تھوڑی دور کے فاصلے پر اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ رامی تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ وہ جوار خریدنے کے لیے ایک دکان پر ٹھہر گئی جہاں مزدوروں کو بازار کے عام نرخ سے سستی جوار فروخت کی جاتی تھی اس نے دیکھا کہ ایک جم غفیر جوار کو حاصل کرنے کے لیے دھینگا مشتی میں منہمک ہے۔ رامی جیسی کمزور اور فاقہ زدہ عورت کس طرح اس میں داخل ہوکر اپنے لیے جوار حاصل کر سکتی لیکن جوار حاصل کرنا ضروری بھی تو تھا۔ وہ دونوں بچوں کو ایک جگہ بٹھا کر مٹھی میں پیسے دبائے اس امتحان گاہ میں داخل ہوئی۔ جونہی وہ گھسی ایک زور کا ریلا اس کی طرف آیا اور یہ دھڑام سے زمین پر آ رہی اور پیسے زمین پر بکھر گئے ہجوم میں پیسے کدھر گئے پتا نہ چلا۔ دنیا اسکی آنکھوں میں اندھیری ہوگئی۔ "دن بھر پیٹ سے پتھر باندھ کر محنت کرنے کا صلا یہ ملا" رامی نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "اب کیا ہوگا" اس سوچ میں مضطرب ہوگئی وہ لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی اور لڑکھڑاتی ہوئی آگے بڑھی دونوں معصوم بچے اس کی صورت کو تک رہے تھے اور یہ آنسوؤں سے اپنا منہ دھوتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ "ارے کیا ہوگیا دیوانی" اس اچانک آواز سے وہ لرز گئی پیچھے مڑ کر دیکھا تو مستری کھڑا تھا۔ رامی کی زبان گنگ ہوگئی اس کا دل امنڈ آیا۔ وہ بغیر جواب دیے آگے بڑھ گئی۔ "تو نے مجھے کیوں نہیں کہا تھا تمام پیسے گنوا دیے تو نے

اب کیا کرے گی"۔ مستری نے کہا "کیا کروں باوجی میری قسمت ہی خراب ہے"۔ وہ رونے لگی اور چلنے لگی .... اس جگہ جہاں شہر کی بستی ختم ہو رہی تھی اور گاؤں کو جانے والی لمبی سڑک پڑی ہوئی تھی۔ وہ نقاہت سے بے حال ہوکر ٹھہر گئی۔ اندھیرا ہوچکا تھا۔ تین میل کی مسافت اکیلی ...... کوئی ساتھی نہ تھا ...... پیٹ خالی .... ہات خالی کیا صورت لے کر جائے کس طرح جا سکے گی ..... اندھیری رات میں .... ننھے بچوں کو لیکر جنگل میں سے .... نہ معلوم کیا کیا مصیبت پیش آئے۔ اس نے یہ سوچنا شروع کیا "اب کیا ہوگا ؟!! .... بچے اندھیری رات سے سہم کر اس کی چھاتی سے چمٹنے لگے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مستری کھڑا مسکرا رہا تھا۔ رامی نے آگے بڑھنا چاہا۔ "اتنی اندھیری رات کہاں جائے گی تو رامی جنگل کا مقام اور ننھے ننھے بچے آج رات میرے ہاں بسر کر صبح اٹھ کر چلی جانا۔ بچے بھوکے ہیں اور تو بھی تو ...... میں تیری کل پوری کی مزدوری تجھے دے دونگا ......" رامی کی نگاہیں افق کے پار خلا میں کچھ دیکھ رہی تھیں اس نے کچھ بھی نہیں سنا۔ اور سنا بھی تو خاک سمجھ میں نہیں آیا۔ "کیا ہوگیا اسے" مستری اس کی خاموشی سے بہت خوش تھا۔ گویا اس کے دل میں خوشی کے لڈو پھوٹ رہے تھے۔ اسکی ہمت بندھ گئی وہ آگے بڑھا اور رامی کا ہات اپنے ہات میں لے لیا "چل میرے ساتھ کیوں کھڑی ہے یہاں" مستری آگے بڑھنے لگا۔ ایک معمولی سی رکاوٹ کے بعد غیر ارادی طور پر رامی اسکے پیچھے چل پڑی۔

نیاز علی خاں نیاز

موت کے گھاٹ

چندرا نے اپنی نرگسی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "بتاؤ میرا کیا اپرادھ ہے بتاؤ بھگوان ناتھ میری کون سی ادا ناگوار ہے بتاؤ مجھ سے کیا دوش ہوا تم کو مجھ سے کیوں نفرت ہو گئی ناتھ" لیکن ہریش نے سوائے کراہنے کے کچھ جواب نہ دیا۔ غریب ہریش چار دن سے نمونیا کے مہلک مرض میں مبتلا تھا افسوس کہ ان غریبوں کے پاس آنا نہ تھا کہ وہ کسی وید کو بلاتے یا کسی قسم کا علاج کراتے غریب چندرا کے پاس سوائے چند پرانے کپڑوں کے اور کچھ نہ تھا اس کے پاس جو کچھ اثاثہ تھا وہ اس نے اپنے سوامی کی تیمارداری میں نذر کر دیا تھا۔ اوپر آسمان دور اور زمین سخت کی مثال صادق آتی تھی غریب دور افلاس کے قیدی چندرا کا ہے اپنے ہریش کے پیر دبا رہی تھی گاہے اس کی صورت دیکھتی کبھی آنچل اٹھا اٹھا کر دعا مانگتی تھی۔ لیکن کوئی امید کارگر نہ ہوتی تھی چندرا اسی کشمکش میں تھی کہ ہریش نے آنکھیں کھول دیں اور کہا "چندرا ذرا سا مجھ کو دودھ دو" چندرا گھبرا گئی اور "ابھی لائی سوامی" کہہ کر گھر سے باہر چلی گئی اور سیدھا اس نے بازار کا راستہ لیا اور وہ سیدھے ایک گوالن کے گھر گئی اور کہا "مجھے خیرات میں ذرا سا دودھ دیدو پرماتما تمہارا بھلا کرے گا" اس گوالن کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہوا اور اس نے ذرا سا دودھ ایک مٹی کے برتن میں ڈالکر دیدیا۔ چندرا اسے دعائیں دیتی ہوئی بھاگی گھر سے چند ہی قدم کے فاصلے پر وہ ایک سائیکل سوار سے ٹکرا گئی اور سارا دودھ زمین کی نذر ہو گیا اس کی یہ حرماں نصیبی پر افلاس کی دیوی جسنے اس کے گھر میں جنم لیا تھا مسکرائی سورج نے اس کے اس ناقابل بیان صدمے کی تاب نہ لاکر اپنا چہرا دامن مغرب میں چھپا لیا اور سارے عالم پر اس کی قسمت کی تاریکی کی طرح اندھیرا چھا گیا۔ چندرا اس رنج کی متحمل نہ ہو سکی اور رو پڑی سچ ہے جب شکستہ مضراب پر مبہم جذبات پہنچتے ہیں تو وہ ایک ٹھیس سے ٹوٹ کر ہی رہتا ہے پیالہ جب لبریز ہو جاتا ہے تو چھلک پڑتا ہے وہی حال اس حرماں نصیب چندرا کا ہوا اول تو اس کا دل پاش پاش تھا اس صدمے سے اور بھی چور چور ہو گیا۔ اور اس کا پیمانہ بھی چھلک پڑا چندرا رو رہی تھی اور دنیا ہنس رہی تھی۔ چندرا روئی اور اپنے بار غم کو کچھ ہلکا کیا۔ صرف غم کو گھونٹ گیا اور غریب شکستہ دل کچھ آگے بڑھی اور اشکوں سے منہ دھوتی اپنی قسمت کا ماتم کرتی گھر تک تو پہنچ گئی لیکن اندر جانے کی اس میں سکت نہ تھی اس نے سوچا کہ اگر میرے سوامی نے دودھ مانگا تو میں کیا جواب دونگی اس خیال کے آتے ہی وہ پھر ایکبار اپنی قسمت آزمائی کے لیے آگے بڑھی اور چند قدم کے فاصلے پر ایک سفید ریش بزرگ نظر آئے اس نے کہا مجھے کچھ پیسے دیجیے میرے سوامی دم توڑ رہے ہیں۔ میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں ان کو دودھ لاکر پلا سکوں اس بزرگ نے کچھ پیسے نکال کر اس کے دست سیمیں پر رکھ دیے چندرا کا کملایا ہوا چہرا دمک اٹھا اس نے شکریہ ادا کیا اور دودھ خرید کر جلدی جلدی اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئی چندرا جب گھر میں داخل ہوئی تو اس کا نازک جسم بید کی طرح لرز رہا تھا۔ آج اس کو تیسرا فاقہ تھا۔ مگر اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا۔ اٹھو ناتھ میں دودھ لائی ہوں۔ اس کی آواز کو پہچان کر ہریش نے آنکھیں کھول دیں اور حسرت بھری نگاہیں چندرا پر ڈالیں کچھ کہنا چاہتے لیکن اظہار مدعا نہ کر سکے اور ایک آخری ہچکی نے ہریش کی حیات مستعار کے جام زندگی کو لبریز کر دیا اور اپنی نیک شعار بیوی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس پاپی دنیا میں چھوڑ گیا کمزور اور ناتواں زیر بار اس المناک سانحے کی تاب نہ لا سکی اور چیخ مار کر زمین پر گر پڑی آہ افلاس تو نے کتنوں کو موت کے گھاٹ نہیں اتارا ہے!

محمد سلیم خان سلیم

پریم شانتی

اس کے قدم ڈگمگا نہیں سکتے تھے اسلیے کہ ایک انسان — معصوم انسان کی زندگی کے سنورنے یا بگڑنے کا سوال درپیش تھا۔ لیکن وہ اس کو کس طرح اپنا بنا سکتی تھی جس کو شروع ہی سے اس سے نفرت کرنا سکھایا گیا تھا۔

میں اپنے باغ میں کھڑی دیکھ رہی تھی۔ جبکہ انور اپنی نئی دلہن کو اپنے گھر لایا تھا۔ انور کا عالیشان مکان جس میں پانچ پیڑیاں زندگی بسر کر چکی تھیں۔ میرے مکان کے سامنے ہی تھا۔ انور نے اپنی دلہن کے ساتھ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مجھے دیکھا اور وہیں سے مجھے دیکھ کر دستی ہلائی۔ اس کی دلہن نے بھی مجھے دیکھا اور مسکراتی ہوئی آگے بڑھی۔ میں نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہ سمجھا کہ انور کی شادی جمیلہ کے ساتھ بالآخر میری زندگی میں تبدیلی کا پیش خیمہ ہوگی کسی کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ میرے دل میں انور کی محبت جاگزیں ہے اس لیے کہ انور مجھ سے تیرہ سال بڑا تھا۔ وہ مجھے پیاری بچی کہکر بلایا کرتا تھا۔ اور جب سے کہ وہ ولایت سے واپس ہوا تھا اور اپنے آبائی مکان میں رہنے لگا تھا۔ مجھے اپنی ننھی دبچی کہکر ہمیشہ میری خاطرداری کرتا تھا میں اپنے گھر کی بہ نسبت انور کے عالیشان پرانی وضع کے محل کو زیادہ پسند کرتی تھی۔

مجھے قدیم چیزوں سے بہت انس تھا مجھے معلوم کہ میں کب سے لکڑیوں کے سہارے چلنے لگی تھی اسلیے کہ بچپن ہی میں میرے کولہے کی ہڈی سرک گئی تھی۔ جس کا اس وقت کسی کو خیال تک نہ ہوا اور میں ہمیشہ کے لیے روگیلی ہو گئی لیکن اس میں بھی ایک بھلائی میرے لیے مضمر تھی، وہ یہ کہ میں آرام کے ساتھ سکون کی زندگی بسر کرنے لگی میرے باپ کو جب وقت میری اس افتاد کا اثر ہوا تو انہوں نے بہترا علاج معالجہ کرایا لیکن چونکہ عرصہ گزر چکا تھا کوئی فائدہ نہ ہوا اور میں [illegible] کے لیے معذور ہو گئی اور بغیر سہارے کے میرے لیے پھرنا دشوار ہو گیا۔ ڈاکٹر قریشی گو میری جسمانی کمزوری ختم نہ کر سکے حالانکہ بیچارے نے بہترا علاج کیا لیکن میری ترقی کے لیے انہوں نے بہت کچھ کیا۔ وہ مجھے ہمیشہ یہ کہتے "بیٹی دنیا میں بہت سی باتیں مسرت کی حامل ہیں تم قدرت کے مطالعے کی عادت ڈالو اور زیادہ کھایا نہ کرو بلکہ کچھ فاقہ بھی کیا کرو کہ اس سے صحت اچھی رہتی ہے۔ جب صاف ہوگی تو تم کو دنیا کی بڑی خوشی حاصل ہوگی۔ تم کھانا رغبت سے کھا سکو گی" میری آنکھوں میں اب ڈاکٹر قریشی کی تصویر پھر رہی ہے وہ انکی بڑی بڑی روشن آنکھیں گھنی داڑھی اور گل پچکے مجھے اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر قریشی کو میرا خاطر خواہ علاج نہ کر سکنے کا دلی رنج۔ وہ مجبور رہتے۔ کارخانہ قدرت میں کسی کو دخل نہیں۔ قریشی نے ایک مرتبہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر مجھ سے کہا کہ "میری بچی زندگی لطف اٹھانے کے لیے ہے۔ لیکن دوسروں کو بھی زندگی کا لطف اٹھانے میں مدد دینا چاہیے تم اپنے بھائی بندوں کی امداد کرو جو دکھی ہیں ان کو ہنساؤ

"دل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاروں کعبہ یک دل بہتر است"

یہ کہکر ڈاکٹر قریشی مجھے خدا حافظ کہتے ہوئے رخصت ہو گئے لیکن میں سوچتی رہی کہ ڈاکٹر صاحب نے ایسی بات کہی ہے جو میں کبھی نہ بھولوں گی میں زندگی کا لطف اٹھاؤں گی اور اپنے محسنوں کی امداد کروں گی اور جہاں تک ہو سکے یہ سمجھنے کی کوشش کروں گی۔ میں اپنا تیج ہوں

کے چل پھر نہیں سکتی میں سمجھتی ہوں کہ مجھے اس میں کامیابی ہوئی
ایک ہی دن میں جب کہ ہم ورزش اور سورج کی روشنی کے صحت
بخش اثرات کے متعلق پڑھ رہے تھے، میں نے ان دونوں چیزوں
کی طاقت کو سمجھ لیا۔ میں نے دوسرے ہی دن سے چند مخصوص ورزشوں کی
پہل کر دی جو میں آسانی سے پلنگ پر پڑے پڑے کر سکتی تھی
میں روزانہ کچھ دور جہاں تک کہ میں آسانی سے چل سکتی چلنے
لگی اور گھنٹوں سورج کی روشنی میں پڑی رہتی جس سے میرے
کولھے کے درد کو بہت فائدہ ہوا۔ میرے والدین بھی میری حالت
کی درستگی سے مسرور ہونے لگے اور ان کو بھی میری طرح امید بندھنے
لگی کہ میں نری اپاہج نہ رہوں گی۔ میں مدرسے میں بھی کامیاب
زندگی گزارنے لگی میری آواز بہت ہی صاف اور سریلی تھی
میں دوسری لڑکیوں کی طرح سب کچھ کر لیتی تھی۔ بجز بھاگ
دوڑ کے۔ میں نے تیرنا بھی سیکھ لیا تھا۔ تفریحی پارٹیوں میں
بھی میں شریک ہونے لگی غرض کہ میں زندگی کا اسی طرح لطف
اٹھانے لگی، جس طرح میرے ساتھ کی لڑکیاں اٹھاتی تھیں
مجھے صرف ایک بات کی کمی محسوس ہوتی تھی وہ یہ کہ میرا کوئی
دوست نہ تھا لڑکے مجھ سے گریز کرتے تھے۔ ہر ایک مجھے
چاہتا تھا اور مجھ پر مہربان تھا۔ لیکن میری معذوری نے
میرے گرد دیوار سی بنا رکھی تھی جس کو میں شکست نہیں کر سکتی
تھی۔ میں اکثر تنہائی محسوس کرتی اور اپنے کو بڑی عمر کی سمجھنے
لگی درآنحالیکہ میری عمر پندرہ سال کی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی
کہ انور کو میں پسند کرتی تھی۔ ہم دونوں بڑے دوست ہو گئے
تھے۔ بلا کسی تعارف کے۔ اسکی وجہ یہ ہوئی کہ ایک دن انور نے
دیکھا کہ میں دھوپ کی خاطر اپنی کرسی بدقت تمام باغ کی طرف
سرکا کر لیجا رہی ہوں انور نے راستے سے گزرتے ہوئے
جیسے وہ بنک جا رہا تھا جہاں وہ منیجر کی حیثیت رکھتا تھا ٹھہر کر
مجھ سے کہا کہ میرے مکان کے پیچھے کے برآمدے کو کوئی استعمال
نہیں کرتا وہاں دھوپ اچھی آتی ہے اور علیحدہ مقام بھی ہے
تم وہاں جاؤ اور میری نانی سے کہہ دو کہ میں نے تم کو وہاں بھیجا

کھانے کے لیے بھیجا ہے میں انور کے کہنے پر اسکی نانی کے پاس گئی
انہوں نے میری بڑی خاطر مدارات کی اور انور کے مشورے سے
بہت ہی خوشی کے ساتھ اتفاق کیا ان کی خوشی کی انتہا یہ تھی کہ
وہ خوش خوش مجھے تمام چیزیں بتلانے لگیں خصوصاً اپنے
بیش قیمت قالین جنکو وہ بہت عزیز رکھتی تھیں۔

میں بہت خوش تھی اب میرا یہ دستور تھا کہ میں روزانہ
دھوپ کھانے کے لیے اس برآمدے میں جاکر بیٹھا کرتی
جو نہایت فرحت بخش مقام تھا اسکے قریب ہی انگور کا کنج
تھا جسکی سرسبزی اور شادابی سے آنکھوں میں تراوٹ آتی
تھی۔

انور کی شادی تک میں نے یہ محسوس نہ کیا کہ جو چیز میری
خوشی کا باعث ہے وہ انور کی محبت ہے۔ میرے دل میں
انور کی محبت تھی اور مجھے اس وقت اس کا احساس ہوا جبکہ
انور شادی کر کے دلہن کو اپنے گھر لایا۔ انور کی شادی پر مجھے
اب محسوس ہونے لگا کہ میرے چین و آرام کا خاتمہ ہو گیا
لیکن پھر بھی میں نے سوچا کہ اس خیال کو اپنے دل میں نہ رہنے
دونگی میں نے سوچا کہ میں اب انور کی محبت کا خیال چھوڑ دوں گی
اور اسکو صرف میں ایک دوست سمجھونگی اور حسب معمول روزانہ
اسکی نانی کے پاس جایا کروں گی۔ شاید انور کی بیوی بھی میری
دوست بن جائے چونکہ وہ بھی میری طرح لڑکی تھی اور ابھی
انیسویں سال سے آگے قدم نہ رکھا تھا میں اسی طرح سوچ بچار
کرتی رہی اسمیں ایک ہفتہ گزر گیا اس کے بعد میں ایک دن پھر
انور کے گھر گئی اور دروازہ کھٹکھٹایا انور کی نانی نے اندر سے
پوچھا "کیا تم ہو رفیقہ — میں تو تمہاری کمی کئی دن سے محسوس
کر رہی تھی" پھر انہوں نے انور کی بیوی کا ذکر چھیڑ دیا اور کہنے
لگیں کہ اچھا ہوا کہ انور کی شادی ہو گئی۔ تم جانے سے پہلے جمیلہ (انور
کی بیوی) سے مل کر جانا۔ وہ کمروں کی درستگی میں لگی ہوئی ہے۔
مشرقی حصے کے چھ کمرے ان میاں بیوی نے اپنے لیے لیے ہیں
"مشرقی حصے کے چھ کمرے" "مجھے بھی یہ کمرے بہت پسند

اندر کے عالیشان محل کے ۲۵ کمروں میں سے میں بھی اپنی کمرہ
کو پسند کرتی تھی، خصوصاً ان تمام چیزوں کے ساتھ جو قدامت کا
خاموشی کے ساتھ اظہار کرتے تھے۔ ہر کمرے کی سجاوٹ جداگانہ
تھی اور جس قدر پرانا وہ محل تھا اسیقدر پرانے اسکی زیبائش
کے سامان بھی تھے۔ یہ عجیب بات تھی کہ جمیلہ کی اور میری پسند
ایک ہی تھی اس نے بھی وہی کمرے پسند کیے جو مجھے پسند تھے
اتنے میں جمیلہ وہاں آگئی اور میرے کاندھوں پر ہاتھ رکھ
کر کہنے لگی کہ تم ہی رفیقہ ہو۔ انور نے مجھ سے تمہارا حال بیان کیا
تم کو روزانہ پچھلے برآمدے میں آکر سن باتھ لینا چاہیے جیسا کہ
تم پہلے کیا کرتی تھیں"

میں نے کہا تم کتنی اچھی ہو۔ میں ضرور آؤنگی۔ مجھے برآمدے
میں بیٹھے انگور کی ہری ہری بیل دیکھنے سے بڑا لطف آتا ہے
میں یہ سوچنے لگتی تھی کہ اس بیل کا چند سال پہلے کیا منظر
ہوگا۔

بہت جلد میں اور جمیلہ مل گئے اور اسی طرح آپس میں
باتیں کرنے لگے جیسے ہم بہت دنوں سے ایک دوسرے کو
جانتے تھے۔ میں جمیلہ کی شکر گزار رہتی کہ انور کی طرح اس نے
بھی میری معذوری کو نظر انداز کر دیا تھا۔ جمیلہ مجھے اپنے کمرے
میں لے گئی اور اس نے جو نیا ریڈیو لگایا تھا وہ دکھانے لگی کمرے
کے پردے بھی جمیلہ نے نئے ڈالے تھے۔ لیکن مجھے سب سے زیادہ
وہ جگہ پسند تھی جہاں پرانے ہتھیار دیوار پر لٹکے ہوئے
تھے۔ مجھے پرانی چیزوں سے بہت انس تھا ہتھیاروں کے
کے اوپر لاطینی زبان میں ایک مقولہ درج تھا انور نے مجھے بتایا کہ
اسکا مقولہ یہ ہے کہ "آفت آپڑے تو گھبراؤ نہیں اسپر
قابو حاصل کرنے کی کوشش کرو"

اس دن سے میری مسرت بھری زندگی شروع ہوئی
جمیلہ کو اور مجھے ایک دوسرے سے محبت ہو گئی میں جمیلہ
کو اپنی بہن سمجھنے لگی اور مجھے یقین ہو گیا کہ بہت جلد میری معذوری
دور ہو جائے گی۔ لیکن اب بھی کبھی کبھی مجھے تکلیف ہو جاتی تھی
درد کی شدت کے باعث میں کبھی کبھی سامنے بھی نہیں جا سکتی
نہ جمیلہ کے گھر، خود جمیلہ میرے پاس آجاتی تھی اور ا
پڑھنے کا سامان ساتھ لیتے آتی اور ہم دونوں پہاڑی پ
گھنٹوں باتیں کرتے رہتے اور باتوں سے نہ تھکتے میں
جمیلہ کی صورت دیکھا کرتی اور اس میں خوش رہتی جمیلہ
حسین تھی میں سمجھنے لگی تھی کہ انور نے کیوں فریفتہ ہو کر
شادی کر لی۔ اس لیے کہ وہ بلا کی حسین تھی۔ اسکی روشن آنکھیں
کی "دیوی حسن" کی آنکھوں کی طرح جاذب نظر تھیں جسکی
انور کی نانی کے کمرے میں آویزاں تھی اسکی بھویں ایسی
تھیں کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا یہ یہاں پر پھیلا سے ہو
ہیں۔ جب وہ مسکراتی تو اس کا چہرہ بہت ہی بھلا معلوم ہوتا
اور یہ معلوم ہوتا کہ سمندر لہریں مار رہا ہے۔ لیکن جب ا
آجاتا یا خود انور آجاتا تو میں ہمیشہ منہ پھیر لیتی۔ اس
کو دیکھ کر جو محبت جمیلہ کی آنکھوں سے ٹپکنے لگتی اسکو
نہیں کر سکتی تھی! اس لیے کہ میرے دل میں انور کی محبت
تھی اگرچہ میں بہت کچھ اسکی محبت کو اپنے دل سے د
تھی۔

ہائے! اف۔ میں سمجھتی ہوں کہ قتل سے بھی
خوفناک ہے اور میں خوش تھی کہ میں نے اس پر قابو حاصل کر
جمیلہ اور انور کی یکجہتی و محبت پر میں خوش ہونے لگی،
گئے اور میں بچھونے چھوڑنے کے قابل ہو کر جمیلہ کی ہونے وا
کے لیے رکھتی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ مجھے بچے کے پیدا ہو
پہلے ہی اس سے محبت پیدا ہو گئی تھی۔ جمیلہ کے د
ماں کی شفقت کا ولولہ تھا ہم سب سمجھتے تھے کہ "لڑ
ہوگی۔ شاید کوئی ماہر نفسیات ہی یہ بتلا سکے کہ میرے
اس ہونے والی لڑکی "کی محبت کیوں موجزن تھی۔
کی لڑکی کے لیے غالباً یہ جذبہ الفت درست نہ تھا
کہ دنیا میں رہتی تھی اسلیے کہ میری معذوری مجھے اپنی
کی طرح زندگی گزارنے کے مانع تھی۔ اسی طرح د

اور جمیلہ کے ایک چاند سا لڑکا پیدا ہوا۔ یوسف اپنے باپ کے مشابہ تھا مجھے اس سے بہت محبت ہو گئی۔ کچھ عرصہ اور میں نے محسوس کیا کہ جمیلہ کی صحت پہلے کی طرح نہ رہی بلکے وہ کمزور ہو گئی تھی۔ وہ کرسی پر تکیوں کے سہارے بیٹھ سکتی تھی۔ اس کی اس حالت کا انور پر بڑا اثر ہوا۔

میں نے ایک دن اپنی ماں کو باپ سے یہ کہتے سنا کہ "اسکو دل کی بیماری ہے، وہ برسوں زندہ رہ سکتی ہے لیکن ذرا سا صدمہ یا تکلیف یا علالت اسکی موت کا باعث ہوگی" میں یہ سنکر سہم گئی اور وہاں سے مغموم الٹے پاؤں واپس ہوئی۔ میں نہیں سمجھتی کہ جمیلہ کی حالت اس درجہ خطرناک ہے۔ یہ سنکر میرا دل بیٹھ گیا۔ اس خیال سے کہ وہ پیارے یوسف کو اس عالیشان محل کو اور اپنے جان نثار انور کو چھوڑ جائیگی۔

وہ بھی کیا اچھے دن تھے۔ میں خوش تھی اور زندگی کا لطف اٹھا رہی تھی ـــ جمیلہ مجھے جمیلہ زیادہ پیاری تھی۔ اور یوسف بھی جس سے خدا جانے مجھے کیوں انس ہو گیا تھا۔ میری زندگی کی انتہائی خوشی کی ساعتیں وہ ہوئیں جو میں پیاری جمیلہ اور یوسف کے ساتھ گذراتی۔ میں یہ محسوس کرتی تھی کہ جمیلہ زیادہ خاموش رہتی ہے نہ معلوم اسکے دل میں کیا خیالات گزرتے ہوں کسی کے دل کا حال دوسرا کیا جان سکتا ہے لیکن مجھے ایک موہوم سا خیال یہ ہوتا کہ جمیلہ متفکر اور مغموم ہے لیکن وہ ایسی صابر تھی کہ کبھی اسنے اپنی علالت کا ذکر تک نہ کیا۔ اسی طرح دن گزرنے لگے، عید کے موقع پر میں نے یوسف کو تحفہ دیا۔ جس پر وہ بہت خوش ہوا وہ مجھ سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ اس طرح دو سال گزر گئے جمیلہ کی حالت بدستور تھی۔ اب ہماری خوشی یوسف سے وابستہ تھی وہی اس گھر کی رونق تھا۔ جسکی ہر ادا دل لبھانے والی تھی یوسف کو دو سال کی عمر ہی سے گانے کا شوق ہو گیا تھا۔ جب کبھی وہ باغ میں ٹہلنے جاتا تو بیانڈ پر قومی ترانہ سنکر وہ بہت خوش ہوتا۔ میں اور جمیلہ معصوم یوسف کی معصومانہ حرکتوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے لیکن بالعموم تمام جمیلہ اپنے بستر پر پڑے پڑے یوسف کی طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی ایک دفعہ جمیلہ نے مجھ سے کہا "حقیقتہ تم کو یوسف سے محبت ہے" تو جب میں نے کہا کہ مجھے وہ دل و جان سے پیارا ہے تو جمیلہ کے چہرے پر بشاشت کی ایک لہر سی دوڑ گئی یونہی دن گزرتے گئے لیکن جمیلہ کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی اور جب یوسف کی عمر پانچ سال کی ہوئی تو انکے سر سے ماں کا سایہ اٹھ گیا۔ اس درد ناک واقعے کے بعد دن گزرتے گئے ادھر انور مغموم اور ادھر میں بھی اداس رہتی تھی۔ مجھے دنیا کی کوئی چیز نہیں بھاتی تھی

انور اب بھی مجھے بچی کہکر پکارتا اور شاید وہ مجھے یوسف کی طرح چھوٹی بچی سمجھتا تھا۔ مجھے انور سے ایسی ہی محبت تھی جیسے پہلے تھی مجھے اب اپنے بیساکھیوں سہارے کی لکڑیوں سے نفرت ہونے لگی تھی اور میں سمجھتی تھی کہ میرے اپاہج ہونے کا باعث بیساکھیاں ہی ہیں۔ حالانکہ یہی وہ میرے خاموش خدمتگار تھے جنکے بغیر میرا جینا پھرنا دشوار تھا۔ میں ان دنوں اکثر سوچا کرتی کہ شاید انور دوسری شادی کر لیگا۔ یوسف کی دوسری ماں گھر میں آئے گی یہ میری طرح ہرگز یوسف سے محبت نہ کرے گی

یوسف کی نانی کا ان دنوں میرے ساتھ بھی طرز عمل بدلا ہوا تھا۔ وہ ہر اس لڑکی کو جو انور کی ملاقاتی ہوتی بری نظر سے دیکھتی تھیں مجھے اب انور کے گھر میں پہلی سی یگانگت کی کمی نظر آنے لگی اسلیے میں نے اسکے گھر آنا جانا بھی کم کر دیا۔ میں یہ سمجھنے لگی کہ انور مجھے ایک معذور لڑکی سے زیادہ نہیں سمجھتا افسوس کہ اسکو میری محبت کا اندازہ نہیں تھا وہ اپنے دوستوں کے ساتھ مذاق میں دن گزارتا تھا لیکن میں یہ سمجھتی تھی کہ وہ محض ظاہری چیز ہے جمیلہ کی محبت اسکے دل سے کبھی فراموش نہ ہوگی، اور یہ ہنسی دل لگی محض غم غلط کرنے کی ایک موہوم سی کوشش ہے، اسلیے کہ وہ دلی رنج و غم ایسا نہ تھا جو دور ہو سکے یونہی کئی برس گزر گئے لیکن انور نے دوسری شادی نہیں کی یوسف اب بڑا ہو گیا تھا مجھے یوسف سے اور بھی زیادہ محبت ہو گئی تھی اور میں ہمیشہ اس کے ساتھ محبت اور ہمدردی سے پیش آتی ۔۔۔

وہ ہمیشہ اپنی ان مشکلات کو مجھ سے بیان کرتا جو وہ اپنی نانی سے کہتے ہوئے ڈرتا تھا اور میں ہمیشہ اسکی دلجوئی اور مدد کرتی۔ انور نے مجھے پہلی دفعہ ایک عورت سمجھکر اس وقت دیکھا جبکہ ہم دونوں کی ملاقات جمیلہ کے قبر پر ہوئی۔ ایک دن جبکہ میں وہاں حسب معمول پھول چڑھانے گئی تھی اس وقت انور بھی آگیا تھا۔ قبر پر پھول چڑھانے کے بعد جب ہم لوٹنے لگے تو انور نے مجھ سے کہا۔

"رفیقہ عجیب بات ہے کہ تمہاری آنکھیں جمیلہ کی آنکھوں سے بہت ملتی جلتی ہیں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جمیلہ میرے سامنے کھڑی ہے"

میں نے کہا انور تم نے اس سے پہلے مجھے اس نظر سے نہیں دیکھا۔ یہ کہکر میں کچھ شرما سی گئی پھر ہم دونوں قبرستان سے باہر نکلے اور انور نے مجھے اپنی موٹر میں بٹھا کر ساتھ لے لیا لیکن مجھے تعجب ہوا جبکہ وہ گھر جانے کی بجائے شہر کے باہر کے میدان کی طرف جا پہنچا اور ہم لوگ موٹر سے اتر کر ایک سبزہ زار پر جاکر بیٹھ گئے اور اسی وقت انور نے مجھ سے کہا "رفیقہ اب تو تم بچی نہیں رہیں۔ اب تو تم بڑی ہوگئی ہو" میں نے کہا ہاں انور تمہیں بڑے ہوئے بہت دن ہوئے اسکے بعد انور نے مجھے اپنے آغوش میں لے لیا۔ میں نے اپنا تن من سب اس کے حوالے کر دیا اور یہ محسوس کیا کہ دس سال سے میں جس کی محبت کو اپنے دل میں لیے ہوئے تھی وہ آج مجھے مل گیا میں نے کہا انور مجھے ہمیشہ تم سے محبت رہی ہے۔

انور نے کہا خیر جانے بھی دو ان گزری ہوئی باتوں کو رفیقہ اب تو ہم دونوں کی شادی کر لینی چاہیے۔ اسی روز شب میں انور نے اپنی نانی سے اسکا ذکر کیا جس پر انہوں نے نہایت کرخت لہجے میں کہا کہ "تم جانتے ہو کہ میں یوسف کی اچھی طرح خبر گیری کر رہی ہوں اسپر بھی اگر تم اس کے لیے سوتیلی ماں لانا ضروری سمجھتے ہو تو تمہاری مرضی"

سوتیلی ماں۔ ان الفاظ کو سنکر مجھے قلق ہوا

مجھے یوسف سے بے انتہا محبت تھی۔ میں اسکی پیار
میں اسکی سوتیلی ماں بننا نہیں چاہتی تھی۔ جب میں نے ا
انور سے کہا تو اس نے کہا "تم کو نانی کے باتوں کا خیال
لیکن میں ان کی باتوں کو ذرا ملحوظ نہ کر سکتی تھی مجھے یاد تھا کہ
سوتیلی ماں کی کیا بھیانک تصویر یوسف کے دل میں
تھی میں سمجھتی تھی کہ یوسف سے جو کچھ انہوں نے کہا تھا یو
سمجھتا تھا اور ان کی کہی ہوئی باتوں کو یوسف کبھی نہ بھو

جس دن ہماری شادی ہوئی یوسف کا چہرہ
مراسم شادی کی ادائی کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ اپنی
میں چھپا ہوا ہے۔ اور میں جانتی تھی کہ نانی کو اس کے
کا پہلے سے علم تھا جب میں نے دیکھا تو یوسف زار و
تھا۔ جب انور نے اس پوچھا کہ بلانے پر بھی آ
نہیں دیا تو اس پر یوسف منہ پھلا کر خاموش ہوگیا
کہا پیارے یوسف آو اپنی خالا کو پیار دو ہم دونوں
رہے تھے اس پر اسنے روتے ہوئے غصے سے جا
چلی جاؤ تم بڑی بھیانک ہو۔ تم بھی سوتیلی ماں کی ط
تم پیا کو مجھ سے چھڑاے جاؤگی۔ تم نے یہ منصوبے
بنا رکھے تھے مجھے تم سے نفرت ہے"

انور نے کہا یوسف ......"

لیکن میں نے انور کو اور کچھ کہنے سے روک دیا اور کہ
یوسف میں تمہارے پیا کو تم سے نہیں چھڑاونگی میں و
مجھے تم سے محبت ہے تم مجھے اپنی دوسری ماں سمجھو ا
نہ سمجھو۔ انور کے ساتھ شادی ہونے کی مجھے خوشی تھی
ماں باپ بھی اس سے خوش تھے۔ لیکن جب میں ا
دونوں کے لیے فرحت آباد جانے لگے تو میرے دل
پیدا ہوا کہ نہ معلوم ہماری واپسی تک یوسف کو کیا
نہ جا دے گا۔

جب ہم لوگ واپس ہوئے تو میرا اندیشہ صحیح
پہلے ... زندگی پر یوسف کے غم و یاس نے ظلمت

یوسف میرا بیٹا یا یوسف دتھا۔ وہ اب مجھ پر مہربان نہ تھا جیسا تھا اور مجھے ہمیشہ شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا۔ مجھے یہ محسوس ہوتا کہ میں نے اپنے اس کل کو کھو کر انور کو پایا تھا۔ میں یوسف کے لیے اب سوتیلی ماں کی حیثیت رکھتی تھی اور یہ محسوس کرتی تھی کہ وہ اب مجھ سے نفرت کرنے لگا ہے۔ اب یوسف اپنا زیادہ وقت اپنی نانی کے ساتھ گزارتا۔ میں اگر بلاتی بھی تو وہ اپنی نانی کے اشارے سے میرے پاس آنے کے لیے رکتا یہاں تک کہ میں اسکو کھانا کھلانے کے لیے بلاتی تو اسکی نانی اسکو روک لیتی اور اپنے ساتھ کھانا کھلاتی۔

اب گھر کا پورا کام کاج میں دیکھتی۔ میری معذوری کے باعث مجھے ہر کام میں دیر لگتی لیکن پھر بھی میں ہر کام کی تکمیل کر لیتی تھی۔

نانی سے میری پہلی تکرار اسوقت ہوئی جبکہ یوسف اپنے دوستوں کے ساتھ تفریح پر جانے کے لیے مصر تھا۔ اسکی نانی یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ جاوے۔ اس پر یوسف نے مجھ سے اپنی خواہش ظاہر کی۔ میں نے خوش ہو کر کہا تم خوشی سے جا سکتے ہو۔ میں تمہارا سامان سفر ٹھیک کر دونگی۔

یوسف نے اپنے باپ سے کہا پیارے ساتھیوں میں ایک لڑکا ہے جو بین بہت اچھی بجاتا ہے۔ کاش میں بھی سیکھ جاتا مجھے بھی بجانا آجاتا اس پر انور نے ہنس دیا۔ میں نے کہا کیوں نہیں تم بھی اچھی طرح بین بجانے لگو گے۔ آئندہ سال جب تمہارے مدرسے میں موسیقی کا جلسہ ہوگا تو تم کو پہلا انعام ضرور ملیگا۔

میں اکثر پیانو بجاتی اور میرے ساتھ یوسف سارنگی بجاتا تھا۔ وہ مجھے پیانو بجاتے بڑے شوق سے سنتا تھا۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ اسکو موسیقی کا بہت شوق ہے وہ چند دنوں میں بہت اچھا بین اور سارنگی بجانے لگا۔ میں نے کہا یوسف تم بڑے آرٹسٹ موسیقی داں بنو گے۔

ایک دن مقابلہ مقرر ہوا۔ سامعین کی بہت بڑی تعداد تھی جو اس مقابلے کے دن ہوا نتیجہ کمیٹی پیر کے دن سنانے والی تھی۔ پیر کے دن میں نے یوسف سے کہا تم جلدی جاؤ میں بھی آتی ہوں۔ یوسف کے جانے کے بعد میں بھی روانہ ہوئی لیکن مجھے پہنچنے میں کچھ دیر ہوئی جس وقت دیکھا تھا کہ سب بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے اس وقت یکدم محسوس کیا کہ کوئی میرے گلے میں بانہیں ڈال کر مجھ سے لپٹ گیا۔ اسوقت میں نے یوسف کو کہتے سنا "امی کتنی دیر سے آئیں اور نتیجہ سنا گئے نہیں۔ مجھے پہلا انعام کا مستحق قرار دیا گیا ہے یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہے۔ تمہاری مدد کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں بہت خوش تھی لیکن محبت کے آنسو میری آنکھوں سے جاری تھے یوسف پہلی مرتبہ مجھ کو اس محبت سے "امی" کہہ رہا تھا اور اسکا اس طرح مجھے پکارنا میرے لیے اسکے جیتے اور انعام سے زیادہ قیمتی تھا۔

اس مقابلے میں کامیابی کی وجہ سے اب یوسف کو شہر کے سب سے بڑے کالج میں شرکت کا حق حاصل ہو گیا۔ اس کے بعد کے مہینے بہت ہی اچھی طرح گزرے اور میں نے انتہائی کوشش کر کے ملک کے مشہور مقابلہ موسیقی میں جو دلی میں ہونے والا تھا یوسف کی شرکت کا انتظام کیا۔ جس دن یہ مقابلہ تھا میں اور انور گھر میں بیٹھے ریڈیو پر یوسف کے مظاہرے کو شوق سے سن رہے تھے اسوقت انور نے کہا "رفیعہ کیا تم سمجھتی ہو کہ تمہاری یہ جد وجہد درست تھی کیا یوسف کی خاطر جو تکلیف تم نے اٹھائی ہے باوجود اسکے قابل نفرت برتاؤ کے جو اس نے تمہارے ساتھ کیا ہے اسکا کوئی معاوضہ ہے۔ میں نے کہا۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ وہ مجھے ماں کہکر پکارے اور اسکو میں جو کچھ جو اسکی آرزو سمجھتی ہوں۔ یوسف آرٹسٹ ہے اور تم جانتے ہو کہ آرٹسٹ کیسے تنک مزاج ہوتے ہیں۔ انور ہنسنے لگا۔ میں جانتی تھی کہ انور کو کس درجہ خیال ہے اور میرے بچے یوسف سے محبت ہے۔ آخر کار مجھے جسکی میری تمنا تھی وہ حاصل ہوگئی۔ دلی سے یوسف کا خط آیا جو اس نے پیاری ماں سے شروع کیا تھا۔

اس خط میں یوسف نے دل کھول کر سب باتیں لکھی تھیں۔ اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔ اس نے یہ بھی ظاہر کر دیا تھا کہ کسطرح اسکی نانی نے میری طرف سے اسکے خیالات خراب کیے تھے اور کسطرح اسکے ذہن نشین یہ چیز کر دی گئی تھی کہ سوتیلی ماں بڑی ہی بلا ہوتی ہے۔ کسطرح اسکے لیے یہ غلط خیال باعث غم تھا کہ انور اسکو زیادہ مجھے چاہتا ہے۔ ماضی کی تمام درد بھری کہانی اس خط میں بھری ہوئی تھی۔ یوسف کے دلی جذبات اس خط سے آشکارا تھے اور خط کے یہ آخری جملے میرے لیے بہت ہی قیمتی تھے ——"پیاری ماں میں تم کو سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ تمہاری ہی بدولت ہے۔ مجھے اس مقابلے میں انعام اول کا مستحق قرار دیا گیا اور میرا انتخاب موسیقی کے کالج کی پروفیسری کیلئے ہو گیا ہے۔" یوسف کا خط پڑھکر میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ آج میں نے [illegible] سب کچھ پا لیا ہے۔ ماں [illegible] نثار رہنے [illegible]

افضل حسین فاروقی [illegible]

ارن پکچرس کی
نرالی دنیا
بھارت مووی ٹون
کا
ابلا
دیپک محل
آپکے ہر دلعزیز سینما میں دیکھیے
کرشنا ٹاکیز

قواعد

۱۔ یہ رسالہ ہر فصلی مہینے کے پہلے ہفتے میں شایع ہوا کرے گا۔

۲۔ حجم حالات زمانہ کے ساتھ ساتھ گھٹتا بڑھتا رہے گا۔

۳۔ دل آزار مباحث کے سوا ہر موضوع پر مضامین قبول کیے جائیں گے۔

۴۔ بے لاگ تنقید اور تبصرے کے لیے اس رسالے کے صفحے ہر وقت کھلے رہیں گے۔

۵۔ مستقل خریداروں کو وقت پر رسالہ نہ پہنچے تو ۱۵ تاریخ تک اطلاع دینے پر رسالہ بھیج دیا جائے گا۔

۶۔ جواب طلب امور کے لیے جوابی کارڈ یا ٹکٹ لگا ہوا لفافہ، اور مضامین کی واپسی کے لیے بھی مناسب ٹکٹ لگا ہوا لفافہ لازمی طور پر بھیجا جائے۔

۷۔ اشتہار صاف ہوں ورنہ دفتر کسی قسم کی غلطی کا ذمہ دار نہ ہوگا۔

۸۔ جب تک اشتہار کی اجرت پہلے وصول نہ ہو اشتہار چھاپے نہ جائیں گے۔

۹۔ مضامین وغیرہ صرف ایک ہی رخ پر خوشخط لکھے جائیں۔

۱۰۔ اگر رسالے کی خریداری منظور ہو تو ایک سال کا چندہ پہلے ہی بھیج دیا جائے۔

منیجر "ہندستانی ادب" علم پورا۔ حیدرآباد دکن

(عہد آفریں برقی پریس میں چھپا)

افسانہ نمبر
ہندستانی
ادب
حیدرآباد دکن
ایڈیٹر
غلام محمد خاں ایم۔اے (عثمانیہ)

رجسٹرڈ آصفیہ ۱۰۴ افسانا نمبر رجسٹرڈ برطانیہ ام ۴۴۳۴

چندہ سالانہ (۵) روپے قیمت افسانا نمبر (عہ) روپیہ

ہندستانی ادب

ایڈیٹر: غلام محمد خاں ایم۔ اے (عثمانیہ)

حیدرآباد دکن

جلد ۴ امرداد۔ شہریور ۱۳۵۳ف — جون۔ جولائی ۱۹۴۴ء نمبر ۹، ۱۰

مقالے

افسانے

منظوم افسانے

ہمارے خیالات

—— : چند ضروری باتیں : ——

ہمیں اس بات کا سخت افسوس ہے کہ ہم وعدہ کی پابندی نہ کر سکے جیسا کہ اعلان ہوا تھا ہمارا یہ خاص نمبر ایک مہینہ پہلے نکل جانا چاہیے تھا اور ہماری ہرگز یہ نیت نہ تھی کہ دو مہینے کا پرچہ ملا کر ایک ساتھ نکالا جائے اگر ایسا ہوتا تو ہم اعلان ہی نہ کرتے۔

ہماری مشکلوں کو خریدار یا رسالے کے پڑھنے والے بہتر طریقہ پر نہیں سمجھ سکتے بلکہ وہ لوگ جو ہماری طرح مشکلوں آفتوں اور مصیبتوں کا سامنا کرتے ہوئے علم و ادب اور زبان کی خدمت میں اپنا سب کچھ لٹا دے رہے ہیں وہ اس کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ اس میں ذرا برابر بھی مبالغہ نہیں بعض ایسی ہستیاں موجود ہیں جو خدمت کی خاطر ایثار سے کام لیتی ہیں یا ایسے لوگ جن کا مطمح نظر محض یہ ہوتا ہے کہ انہیں کچھ علمی ادبی اور زبان کی خدمت انجام دینا ہی ہوتا ہے۔ اس سے شیدایان کے دل کو سکون اور روح کو تسکین ہوتی ہے یہی ایک چیز ہمارے دلی اطمینان کا باعث ہے جس کے سہارے ہم آگے بڑھے چلے جا رہے ہیں ہم خود نہیں جانتے کہ یہ چرخ چلتا رہا اور حرکت قلب کی طرح اچانک کب بند ہو جائے گا۔ اس حادثہ کی ذمہ داری ہم پر نہ ہوگی بلکہ ان عیش پرستوں پر جو اپنی نظری اور نفسانی لذتوں کی خاطر پیسے کو پانی کی طرح بے دریغ بہا دیتے ہیں لیکن کسی علمی ادبی کام کی خاطر ایک پھوٹی کوڑی بھی خرچ کرنا گوارا نہیں کرتے۔

اس وقت ہمارے سامنے صرف ہندستانی ادب ہی کا سوال نہیں ہے بلکہ ہم ان تمام علمی ادبی اور زبان کی خدمت کرنے والوں کی طرف سے وکالت کا فرض انجام دے رہے ہیں جن کی طرف سے تشدد اور خاص کر تعلیم یافتہ حضرات الاسلال کو اس طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ ہوگا کہ ایک ایک کر کے علم و ادب کی یہ زندگانی کی شمعیں بجھ جائیں گی اور علم و ادب کی دنیا میں سچی خدمت کرنے والا ان کی کمی کا باعث ایک خلا محسوس ہوگا۔

ہندستانی ادب کے پڑھنے والے یہ جانتے ہی ہیں کہ یہ رسالہ جنگ کی وجہ سے شروع کیا گیا ہے ... ایک طرف تو دنیا کے بڑے بڑے سیاستداں بھی یہ نہ سمجھ سکتے تھے کہ یہ جنگ اتنے طول کھینچے گی اور دنیا پر اتنی تباہیاں لائے گی

ترقی کی امید پر پرچہ جاری کیا گیا تھا ہم نے سوچا کچھ تھا اور ہوا کچھ مصیبت کی انتہا ہو گئی اب تو سوائے مایوسی کے اور کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ گویا ہر چیز کی قیمت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا اور ہو رہا ہے۔

کاغذ | کاغذ کی قیمت میں جو اضافہ ہو رہا ہے اس سے تقریباً ہر شخص واقف ہے یعنی کتنا بھی اضافہ ہوا اگر رسالہ چلانا مقصود ہے تو زیادہ سے زیادہ دام دے کر بھی خریدنا ہی پڑے گا۔ چنانچہ ہر شخص خرید رہا ہے اور ہم بھی خرید رہے ہیں۔ مگر خرید لانے اور خریدنے میں فرق ہے۔ اس فرق کی تفصیلات میں جانا اس لیے مناسب نہیں ہے کہ رسالوں کے شوقین اور پڑھنے والے خصوصاً سمجھدار اور علم دوست حضرات کے لیے ہمارا یہ ہلکا سا اشارہ ہی کافی ہے۔ بس سمجھ لیجیے کہ ہم خریدنے پر مجبور ہیں چاہے حالات کیسے ہی ہوں۔

سپر لور پیپر ملز | ہم نہیں جانتے تھے کہ کس بنا پر "سپر لور پیپر ملز حیدر آباد دکن" کی شکایت کریں معلوم ہوتا ہے کہ اسے اپنی شہرت منظور ہے اور بے پیسے کے اپنا اشتہار چاہتی ہے اس لیے کمپنی نے بار بار ہم کو دق کرنے کی ٹھان رکھی ہے۔

ہماری اس مرتبہ کی غیر معمولی دیری کی اصل ذمہ داری بھی "سپر لور پیپر ملز" ہے۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ جس طرح اور وں کو کاغذ دیا جا رہا ہے اسی طرح ہم کو بھی اپنے اس خاص نمبر کے لیے زائد کاغذ مل جائے گا لیکن کمپنی کے بعض عہدہ داروں نے عین موقع پر ہم کو انکار کا جواب دے دیا ظاہر ہے کہ خاص نمبر کے لیے کاغذ کی زیادہ ہی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ مقررہ کی ہوئی مقدار سے ہم نے زیادہ کاغذ مانگا کمپنی نے مقررہ مقدار دیتے ہوئے زائد کاغذ دینے سے صاف انکار کر دیا عین چھپائی کے زمانے میں ہم پریشان ہو گئے۔ نہ صرف پریشان بلکہ بے حد پریشان ہونا پڑا بڑی کوششوں کے بعد ہم چور بازار سے زیادہ قیمت دے کر کاغذ خریدنے کے قابل بنے جب چور بازار ہی ٹھہرا تو ہم نے اور بھی نقصان کا تہیہ کر لیا چنانچہ کھردرے کاغذ کے بجائے چکنا کاغذ خرید لیا اگرچہ ہمیں اس طرح بہت کچھ خسارہ برداشت کرنا پڑا لیکن چونکہ یہ ہمارا پہلا "افسانہ نمبر" تھا اتفاق سے چور بازار کی صورت دیکھنی پڑی تو ہم نے کہا کہ جہاں اتنی زیادہ دینے پڑ رہے ہیں تو نفاست اور خوش نمائی کی خاطر چند اور بھی سہی یہ سب کچھ ہم نے "افسانہ نمبر" کے شائقین کی خاطر کیا دیکھیں اب وہ ہماری خاطر کیا کرتے ہیں۔

ناولٹس کے لیے رنگین آرٹ پیپر حاصل کرنا کچھ آسان کام نہیں۔ یہ اتنا کٹھن کام ہے کہ یہاں اس کے لیے تو باقاعدہ آرڈر دینا پڑتا ہے۔ اس کے بعد قیمت منہ مانگی دینی پڑتی ہے۔ ہم نے یہی گوارا کیا تاکہ ناولٹ بھی اچھا رہے اور رنگین چھپائی کا مقصد بھی پورا ہو۔

بہرحال لکھائی چھپائی کی نفاست اور ظاہری خوش نمائی کا بھی ہم نے اس دفعہ بہت زیادہ خیال رکھا تاکہ وہ لوگ بھی خوش ہو جائیں جو محض ظاہر پرست ہوتے ہیں۔

افسانہ نمبر

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آج کل افسانہ لکھنے اور افسانے پڑھنے کی وبا پھوٹ پڑی ہے جس طرح ہر چیز کی کثرت میں خوبی باقی نہیں رہتی وہی حال آج کل افسانوں کا بھی ہے۔ ہر شخص افسانہ لکھنے لگا ہے چاہے چھپے یا نہ چھپے، معیار پر اترے یا نہ اترے، مگر وہ سمجھتا ہے کہ افسانہ لکھ کر وہ ایک اہم ذمہ داری سے سبکدوش ہو گیا۔ مختصر یہ کہ افسانوں کی اتنی کثرت اور بہتات ہے کہ اگر آئے دن ایک رسالہ محض اس غرض کے لیے جاری کیا جائے تب بھی پورے افسانوں کی کھپت نہ ہو لیکن اس کی مثال ایسی ہی ہوگی جیسے ناقص پلندوں سے ردی دان کو بھر دیا جائے۔

موضوع کے اعتبار سے شاید یہ قصہ سنانا بے جا نہ ہوگا کہ جب پہلی مرتبہ ہم نے ہندستانی ادب کے جاری کرنے کا اعلان کیا تو جہاں پیشگی مبارکباد کے تہنیتی نامے، مخلصانہ اور استفساری قسم کے متعدد خط وصول ہوئے، ان میں ایک خط یہ بھی آیا تھا کہ "آپ افسانہ نمبر کس مہینے میں نکالیں گے۔ جلد نکالیے۔ بڑی اچھی چیز ہوگی اور اس سے آپ کو مزید فائدہ پہنچے گا میں بھی ایک نیا افسانہ روانہ کروں گا اور اپنے احباب سے بھی افسانے دلواؤں گا۔"

اس سے ظاہر ہے کہ افسانوں یا افسانہ نمبروں کو جو مقبولیت حاصل ہو گئی ہے وہ کسی دوسرے نمبر کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ اب اس کے بعد ہمارے پاس وقتاً فوقتاً خط آتے رہے آخر کار ہمیں افسانہ نمبر نکالنے پر مجبور ہونا ہی پڑا۔

اگرچہ ہندستانی ادب کو جاری ہوئے چار سال کی مدت گزر چکی لیکن کبھی ہم نے اپنے طور پر خیال تک نہ کیا کہ افسانہ نمبر نکالا جائے اس کی اصل وجہ یہی تھی کہ ہم افسانہ نمبروں کی بہتات سے سہمے ہوئے تھے۔ ہمارے اس [illegible] سے کوئی خاص افسانہ نمبر مراد نہیں بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ آج کل کے اکثر رسالوں کا ہر معمولی نمبر بھی اپنی جگہ افسانہ نمبر ہی ہوا کرتا ہے اس لیے کہ ہر نمبر میں افسانوں کی اتنی کثرت ہوتی ہے کہ اس کو افسانہ نمبر کہنے میں ہرگز دریغ نہیں ہو سکتا۔ جب افسانہ نمبروں کی اتنی کثرت ہو تو پھر اور اضافے کی ضرورت ہے؟ بس اسی وجہ سے ہم ٹالتے چلے آ رہے تھے لیکن ہندستانی ادب کے پڑھنے والوں کی مسلسل اور پے در پے فرمائشوں اور خواہشوں پر آخر ہمیں بھی افسانہ نمبر نکالنے والوں کی فہرست میں شامل ہونا ہی پڑا۔

افسانہ کیا چیز ہے؟ کیسا ہونا چاہیے اور اس سے کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ یہ ایسے بحث طلب سوالات ہیں جو مختلف موضوعوں کے تحت حل ہو سکتے ہیں چنانچہ اسی غرض کی تکمیل کے پیش نظر ہم نے افسانوی ادب پر چند تنقیدی مقالے شروع ہی میں پیش کر دیے ہیں۔ ان تمام مضامین میں افسانے کے ہر پہلو کا جواب مل سکتا ہے۔ ان مضامین سے آپ یہ بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ ہندستان میں افسانوں کا رواج کب سے ہوا اور قصے کہانیوں کی افسانوی اہمیت کو کب محسوس کیا گیا۔ مشرقی افسانے کس رنگ میں ہوا کرتے تھے اور مغربی اثر نے ان کو کیا سے کیا کر دیا نیز یہ کہ موجودہ شکل میں افسانوں کی کیا خاص اہمیت ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ جتنے بھی افسانہ نمبر نکلتے ہیں سب کے سب محض وقتی تفریح کا آلہ کار بنے ہوئے رہتے ہیں۔ بعض افسانہ نمبروں میں چند افسانے ایسے بھی نکل آتے ہیں جو حقیقی معنی میں افسانے کے معیار پر اتر سکتے ہیں۔ افسانے جیسا کہ آج کل عام طور پر سمجھا جاتا ہے، صرف نفسانی خواہشوں کی تکمیل کا واسطہ یا ذریعہ سمجھا جائے تو ہمیں اس بارے میں ایک لفظ بھی کہنا نہیں ہے اور اگر افسانے کو زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ناصحانہ اور ناقدانہ انداز میں روشنی ڈالنے کا بہترین آلہ مان لیا جائے تو پھر لازمی طور پر اس سے ہمیں کچھ نہ کچھ سبق ملنا چاہیے۔ جس افسانے سے سوائے عیش و عشرت، عریانی، گندگی اور محض نفسانی خواہشوں اور بے سروپا داستانوں کے کوئی نتیجہ نہ نکلے وہ قصہ یا تحریر افسانے کی صحیح تعریف میں داخل نہیں ہو سکتی بلکہ کوک شاستر کی قائم مقام ہوگی۔ یہی وہ موانعات تھے جن کی وجہ سے ہم افسانہ نمبر نکالتے جھجکتے تھے۔ ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ کامیاب افسانہ [illegible] ہو سکتے ہیں [illegible] اور ہر دل عزیزی حاصل ہو سکتی ہے جب کہ ہر افسانہ [illegible] بیہودگی، گندگی، بے سروپا باتیں [illegible]

حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ایسے مجموعوں کی مانگ اتنی بڑھ جاتی ہے کہ بعض وقت تو نمبر دوبارہ بھی چھاپنا پڑتا ہے۔ ہم ایسے افسانوں کو افسانہ نہیں بلکہ بقول ایک صاحب منو آتش کے پلندے سمجھتے ہیں۔ ہم اس قسم کے گندے ادب کے قائل ہیں اور نہ ہی اس کے پرچار کو روا رکھتے ہیں۔ اس سے ہمارے ادب اور آنے والی نسلوں کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

ترقی پسند ادب یا عریانیت

یہ ایک ٹیڑھا اور اہم مسئلہ ہے جس پر تفصیلی روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے کسی اور موقع پر ہم اس اہم فرض کو انجام دے سکیں۔ آج کل ترقی پسند ادب اور عریاں ادب کی رو برقی رو سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ چل رہی ہے۔ اس نوبت پر ہم اس مسئلے کی طرف صرف یہ اشارا کرنا چاہتے ہیں کہ جہاں تک ہم نے ترقی پسند ادیبوں کی تصنیفوں اور تحریروں کو پڑھا ہے اس سے عریانیت کی کہیں بھی تائید نہیں ہوتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم ترقی پسند ادب کے کس حد تک قائل ہیں اور ہمارے نزدیک اس کی کیا اہمیت ہے؟ ہماری معلومات کی حد تک ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عریاں لکھنے والوں کی ایک جماعت ہی الگ ہے جس کے لکھنے والے ہر لفظ کو عریانی کے سمندر میں غوطے دے کر نکالنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا بھی یقین ہے کہ اس جماعت کا ترقی پسند مصنفین کی جماعت سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ ہمارے خیال میں جن لوگوں نے ترقی پسند ادب کو ٹھیک طور پر سمجھا نہیں ہے وہ ترقی پسند ادب اور عریاں ادب کو گڈمڈ کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے اس وقت ہم ترقی پسند ادب کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتے بلکہ ہم تو یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ عریانیت کو ترقی پسند ادب سے موسوم نہ کیا جائے بلکہ عریاں نگاری یا افسانویت کا ایک مستقل گروہ/فن بن گیا ہے جس کی روک تھام نہایت ضروری ہے۔ چونکہ اس لحاظ سے ہمارا نقطۂ نظر پیش ہے اس لیے ہمارے افسانہ نمبر میں "عریانی پرستوں" کو خشک اور صفاچٹ میدان ہی نظر آئے گا۔ حالانکہ اس نمبر کا ہر افسانہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

مقالے

ہم نے امکان بھر کوشش کی ہے کہ افسانہ نمبر صحیح معنوں میں افسانہ نمبر ہو۔ چنانچہ افسانہ نمبر کی حقیقی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ہم نے افسانوی ادب پر چند تحقیقی مقالے پیش کیے ہیں۔

ان مقالوں میں سب سے پہلا مقالہ اکبرالدین صدیقی کا "افسانے کا ارتقا اور اس کی فنی خصوصیات" ہے۔ مقالے میں افسانے کی تعریف و حقیقت، قدیم افسانوی ادب ہندستان میں افسانے کی ابتدا اور اس کی موجودہ شکل سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ نیز افسانے کے معیار کو بلند کرنے میں ترقی پسند ادیبوں کا جو بھی حصہ رہا ہے اس کی طرف بھی اشارا کیا گیا ہے۔ اس مقالے کے دوسرے حصے میں افسانے کی فنی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مقالہ حقیقی معنی میں مقالہ ہے اور معلومات سے بھرا ہوا ہے ہمیں یقین ہے کہ افسانوں کے شوقین اس مقالے کو پڑھ کر اپنی رائے اور حالت کو بدل سکیں گے۔

دوسرا مضمون ناصرالدین فاروقی کا "سجاد حیدر یلدرم اور ترکی افسانے" ہے۔ سجاد حیدر ہی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ترکی ناولوں اور افسانوں کا پہلی بار ہندستانی میں ترجمہ کیا۔ اس سے ہندستانی افسانوی ادب میں ایک اچھا اضافہ ہوا۔ سجاد حیدر کے ترجمے پڑھنے سے آج سے پچیس سال پہلے کے افسانوی مذاق کا پتا چلتا ہے کہ ترکی افسانوں میں اگرچہ یہ ادق پسندی کا نہ تھی لیکن سجاد حیدر نے اپنے گھر کے ماحول کے مطابق گل و بلبل کی زبان کو ترجیح دی۔ سجاد حیدر کا ایک خاص رنگ تھا چنانچہ انھوں نے جو ترکیبیں وضع کیں اور جو عجیب و غریب استعارے استعمال کیے وہ خود ان کی تراش تھی فاروقی نے ٹھیک لکھا ہے کہ "انھوں نے حیات انسانی کی تحلیل کی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی جذبات کو انھوں نے جس باریک بینی اور جدت طرازی کے ساتھ منظر عام پر لایا ہے وہ ان کی افسانہ نویسی کا کمال ہے"

"افسانہ نگاری کی ٹکنیک" ایک نہایت ہی بہتر اور معلومات بھرا مقالہ ہے۔ علی احمد نے اس عنوان کے تحت افسانے کی تعریف، ناول، ناولچہ، ڈراما اور مختصر افسانے کے فرق کو بتایا ہے اس کے کردار اور پلاٹ کی اہمیت پر بکار روشنی ڈالی ہے۔ پھر افسانے اور ڈرامے کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد افسانے کے مواد کی فراہمی کے طریقے بتائے ہیں اور آخر میں

افسانے کی بعض خصوصیات کو بعض مثالوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ
مضمون اپنی گوناگوں خصوصیات کے اعتبار سے افسانے پڑھنے اور
لکھنے والوں کے لیے مشعل ہدایت کا کام دے گا۔ افسانوی ادب پر
اس قسم کے ٹھوس اور معلومات آفریں مضامین کی سخت ضرورت ہے
تاکہ ادبی رجحانات رکھنے والے اس سے سبق حاصل کر سکیں۔

"ہمارے افسانے" افسانوی دنیا میں نصیحت کا پہلا سبق ہے۔
ماہر القادری نے مضمون میں جو کچھ کہا ہے آگے چل کر "کفارہ" نامی
افسانے میں اس کو ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ مگر شاید اس
پر ہمارا یا اصول پر خود وہ قائم نہ رہ سکیں۔

زندگی خود افسانہ ہے اور افسانہ آرٹ کا دوسرا نام ہے
آرٹ میں جب تک زندگی کی حلاوتوں کی جھلکیاں موجود نہ ہوں
آرٹ نامکمل رہے گا۔ اس لیے آرٹ کی تکمیل کے لیے حلاوتوں کی چاشنی
ضروری ہے ورنہ بے لنک آرٹ روکھا پھیکا اور غیر جاذب نظر ہوگا۔
ماہر القادری خود ایک آرٹسٹ ہیں اس لیے وہ ہم سے کہیں بہتر طریقے
پر آرٹ کے اس فلسفے کو سمجھ سکتے ہیں۔

"جدید افسانے اور عریانیت" میں آزاد صاحبہ نے ان تمام
بدتمیزیوں کا جائزہ لیا ہے جو بعض فحش نگاروں کا مسلک بن گئی
ہیں۔ مضمون میں عریاں نگاری کی تدریجی ترقی کو بہتر پیرائے میں
بیان کیا گیا ہے۔ مضمون کیا ہے عریاں لکھنے والوں کے لیے
تازیانہ ہے جس سے انھیں سبق لینا چاہیے۔ مضمون جس خاص
مقصد کے لیے لکھا گیا ہے اس کی وضاحت کے لیے پورے
نمونے یقیناً ضروری تھے لیکن چونکہ "ناصح بے عمل" کے اطلاق
کا ڈر تھا اس لیے نمونوں کے بعض خاص حصے نکالتے ہوئے ہم نے
مضمون کے شروع میں اپنا ایک نوٹ دے دیا ہے۔ بہرحال
عریانیت پسندوں کی غیر مستحسن کوششوں کی روک تھام کی طرف
جو توجہ دلائی ہے اس کے لیے آزاد صاحبہ شکریے کی مستحق ہیں۔

افسانے افسانے کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ افسانے کی
ہر قسم ہماری زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتی ہے مگر آج کل
افسانے کی ایک ہی قسم قرار دے دی گئی ہے اور ہزاروں نوسکھ
لکھنے والے اسی ایک ڈگر پر چلتے ہیں۔ افسانے کی وہ مقبول قسم
اور ہر دل عزیز قسم رومان یا عشق و عاشقی کی داستان ہے۔
اس میں شک نہیں کہ افسانوں میں جب تک زندگی کے اس رنگین
جز کو داخل نہ کیا جائے اس وقت تک افسانے کا پایہ بالکل
نہیں اٹھایا جا سکتا۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ تہذیب اور اخلاق
کو ہاتھ سے جانے دیا جائے۔

افسانے لکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ بھی ایک خاص
اور مستقل فن ہے اس پر عبور حاصل کرنے کے لیے تحریر کے اس
گہرے سمندر میں اپنے آپ کو غرق کر دینا پڑتا ہے تب کہیں
اس مرتبے کو پہنچنے کے بعد افسانے لکھنے پر کامل قدرت حاصل
ہو سکتی ہے۔ ایک ایسا ماہر فن افسانے لکھنے والا ہر نمونے کو کامیاب
شکل میں پیش کر سکتا ہے۔ دو چار واہیات قصوں کو بے ربط
اور بے ڈھنگے طریقے پر لکھ کر اپنا شمار بھی افسانے لکھنے والوں میں
کرنا ایک ایسا ہی جرم ہے جیسے بغیر ڈگری رکھے اپنے آپ کو کسی
جامعہ کا گریجویٹ ظاہر کرنا۔ ایسے ہی نااہل افسانے لکھنے والے
محض شہرت اور نام کمانے کی خاطر انتہائی عریاں قسم کے قصے لکھ کر
اپنی مانگ بڑھا لیتے ہیں۔ عام مذاق تو کوئی مذاق ہی نہیں ہوتا اسی
لیے ایسے فحش گندا اور اخلاق سے گرے ہوئے قصے قبولیت عام
حاصل کر لیتے ہیں۔ ایسے قصے لکھنے والے خود فریبی کے وہم میں مبتلا
ہو کر اپنے آپ کو ایک بڑا افسانہ لکھنے والا سمجھ بیٹھتے ہیں حالانکہ
وہ یہ تک نہیں سمجھ سکتے کہ حقیقت میں انھیں شہرت کا تمغا نہیں ملا ہے
بلکہ کلنک کا ٹیکا لگا ہے۔

افسانہ محض عشق و عاشقی کی داستان ہی نہیں بلکہ ہم اس کے
ذریعے سماج اور بگڑے ہوئے معاشرے کو سدھار سکتے ہیں۔ ہماری
زندگی غلط طریقوں بے جا رسموں اور فضولیات سے بھری پڑی ہے
ہم غلطیوں کے ایک نہایت ہی ڈراؤنے اور تباہ و برباد کر دینے
والے طوفانی سیلاب میں بہے چلے جا رہے ہیں۔ اس لیے اس بات
کی سخت ضرورت ہے کہ سماج سدھار اور اصلاحی قسم کے افسانے
زیادہ سے زیادہ تعداد میں لکھے جائیں [illegible]

مقالے

افسانے کا ارتقا اور اس کی فنی خصوصیات

افسانے کا ارتقا

افسانہ کیا ہے

سب سے پہلے ہم یہ دیکھیں گے کہ افسانہ ہے کیا چیز۔ افسانہ کہانی ہے۔ ایسی کہانی جو ہمیں مہد سے لحد تک بہلاتی رہتی ہے۔ ہم اپنے بچپن میں اس کے لیے گوش برآواز رہتے تھے۔ لڑکپن میں ان کہانیوں کو مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے۔ جلنے کی کتنی راتیں ہم نے کہانیاں پڑھنے میں گزار دیں۔ غرض جہاں ہم بہل جاتے ہیں ان ان باتوں میں ہمیں دلچسپیاں اور رنگینیاں نظر آتی ہیں اور کیف و سرور حاصل ہوتا ہے یہ سب کہانیاں ہیں البتہ ان کہانیوں کے معیار جدا جدا ہیں۔ کوئی کہانی ہمیں بے جان اور پھیکی سی معلوم ہوتی ہے اور کوئی جاندار۔ کوئی ہمیں ہنساتی ہے اور کوئی رلاتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کہانی پڑھنے سے ہمیں رنج ہو رہا ہے ہم اپنے دل کو سمجھا رہے ہیں لیکن پھر بھی پڑھے جاتے ہیں۔ بعض دفعہ آنکھوں سے آنسو کی دھار بہا دیتے ہیں لیکن کہانی نہیں چھوڑتے اور جب کہنے والا اس کمال سے کہے تو اس کے کیا کہنے۔ جب یہ دلچسپی کمال کا درجہ حاصل کر لیتی ہے تو تاثیر بن جاتی ہے اور ہم محسوس [illegible]

قدیم تخیل

ان کہانیوں کے متعلق قدیم تخیل یہ ہے کہ یہ دل بہلانے کے لیے کہی جاتی تھیں۔ بادشاہوں کے دربار میں داستان گو مقرر تھے جو ہر دربار میں کہانیاں کہتے اور یہی کہانیاں بادشاہ کے لیے لوری کا کام دیتیں۔ گلی کے نکڑ پر اکثر داستان گو کے سامنے بڑے بوڑھے اور بچے جمع ہو جاتے اور وقت گزاری کے لیے کہانیاں کہی جاتیں۔ مگر ان دونوں کہانیوں میں فرق ہوتا بادشاہ اپنے شایان شان کہانی سنتا یعنی کے یادگار قصے اس کے گوش گزار کیے جاتے اور عوام کو انھیں کہانیوں سے جری اور جواں مرد سپاہی بنائے جاتے۔ زمانہ کروٹیں لیتا رہا اور کہانیاں بھی اپنے پہلو بدلتی رہیں۔

قدیم افسانوی ادب

ایلیڈ اور اڈیسی اور رستم و اسفندیار کی کہانیوں کا دور گزر گیا اور گلستان و بوستان اور ایسپ کی کہانیاں کہی جانے لگیں۔ جب زمانہ اور بھی گزر گیا تو کہانیوں میں رومانیت پیدا ہو گئی اور ان میں عشق و محبت کے گن گائے جانے لگے۔ ان کو فن کا رتبہ یورپ اور امریکہ میں حاصل ہوا۔ واشنگٹن اروِنگ اور [illegible] ایلن پو نے امریکہ میں ڈی لارنس۔ جوائس اور [illegible] نے انگلستان میں [illegible] پر خاص پابندیاں عائد کیں۔ اس سے پہلے [illegible]

قصے لکھے جاتے "طلسم جنت کی ادھڈا نٹے دوزخ کی سیر کراتا۔ تخت ہوا میں اڑتے تعویز اور طلسمے بڑے بڑے مافوق الفطرت کام کر جاتے۔ اس کے بعد محبت کی دنیا آباد ہوئی۔

لیکن مذکورہ بالا مغربیوں نے ان تمام چیزوں سے ہٹ کر زندگی کے ہر مرحلے کو اپنے افسانے کا موضوع بنالیا۔ "انسانی جذبات۔ غم و غصہ۔ سرور و انبساط۔ رشک و حسد۔ ظلم و ستم۔ رحم و کرم۔ خوف و ہراس حسن و عیب اور معصیت و غفلت فطرت اور اس کی نیرنگیاں فلسفہ اور اس کی باریک بینیاں نفسیات اور معاشرہ غرض کوئی ایسی چیز نہیں بچی جسے افسانے کے پلاٹ کے لیے استعمال نہ کیا گیا ہو"[1]

۔ لہر دنیا کے سارے ادب میں دوڑ گئی۔ روس اٹلی امریکہ۔ ترکی۔ انگلستان غرض کہ ہر اعلیٰ زبان میں ایسے افسانے لکھے جانے لگے اور افسانہ آسمان سے زمین پر آرہا۔ یعنی "ادب برائے ادب" کا خیال فرسودہ ہوگیا اور ادب برائے زندگی کی برقی لہر دوڑ گئی اب افسانوں کے کردار ہم آپ جیسے انسان بن گئے ورنہ اب تک فوق الانسان ہی تھے۔ مغربی ممالک کے سیاسی رجحانات کا اثر ادب پر بھی پڑتا گیا اور عصری افسانہ نگاروں نے مقامی سیاست اور حکومت کے تانے بانے سے اپنے افسانے تیار کیے اور اس طرح حکومت کے مظالم رعایا کے سامنے آتے گئے اور ان کے قلوب کو آزادی کے ہنگوروں میں جھلانے لگے چنانچہ روس اور فرانس کا انقلاب افسانہ نگاروں ہی کا رہین منت ہے جن میں ڈاسٹفسکی۔ گورکی۔ ترجینیف اور چیخوف اور فرانسیسیوں میں والٹیر سے لے موپاساں سے کم و بیش سب شامل ہیں۔

ہندستان میں افسانہ نگاری

ان اثرات سے ہندستان بھی بچنے نہ پایا یہاں بھی افسانے کے ارتقائی مدارج وہی ہیں جو اور دوسرے ادبیات میں پائے جاتے ہیں۔ مگر غدر کے بعد جس طرح تمام دوسرے اصناف ادب میں تغیر ہوگیا اسی طرح افسانے میں بھی تبدیلی پیدا ہوگئی۔ اور عصری افسانہ نگاروں نے باغ و بہار۔ آرائش محفل اور فسانۂ عجائب کی راہ کو قطعی ترک کر کے اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی۔

نذیر احمد

نذیر احمد نے افسانوں میں گھریلو زندگی کے واقعات صاف صاف بیان کیے ہیں اور اس وقت کی ہر لحاظ سے تمدنی کیفیت پیش کر دی ہے لیکن وہ دہلی کے باہر نہ نکل سکے۔ ان کے افسانے کی ساری چیزیں دہلی کی ہیں۔ انھوں نے فطرت سے زیادہ قربت حاصل کر لی اور لوگوں کے لیے زیادہ دلچسپی کے سامان فراہم کر دیے اور ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا کی۔ ان کے ناولوں کے نمونے نامکمل سہی لیکن نقش اول کہلانے کے مستحق ہیں۔

سرشار

سرشار نے اپنے وطن لکھنؤ کی ٹکسالی زبان استعمال کی۔ محاورے اور روزمرہ کی شوخی کو اپنا خاص رنگ بنایا مگر طرز ادا "مقفیٰ ضرور ہے لیکن ناموزوں نہیں معلوم ہوتی" انھوں نے ایک ایسا طرز اختیار کیا تھا جو افسانہ نویسی کے واسطے موزوں تھا۔ ان کے قصے میں لوگ نفس قصہ سے زیادہ عبارت سے دلچسپی لیتے ہیں[2] ان کے ناول میں خامیاں ضرور ہیں ان کے ناولوں میں پلاٹ اور کردار میں یکسانیت نظر نہیں آتی

[1] ہمارے افسانے صفحہ ۸

[2] تاریخ ادب اردو صفحہ ۱۲۰

لیکن ان کی زبان - اسلوب - دلچسپی اور دلکشی میں پڑھنے والا اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ اس کو ان خامیوں کا کم احساس ہوتا ہے۔

شرر اور سجاد حسین

یہ خامیاں سجاد حسین کے ہاں کیسر ندارد ہیں ندرت بیان کے لحاظ سے بھی ان کا مرتبہ بلند ہے مزاحیہ ناولوں کی کامیابی کا سہرا انہیں کے سر ہے - شرر نے ہر موضوع پر طبع آزمائی کی اور دفتر کے دفتر اپنی یادگار چھوڑ گئے - ان کی منظر نگاری مشہور ہے - ناول کا ہر باب اور ہر باب کے لفظ چند صفحے منظر کشی کی نذر ہو جاتے ہیں - "ان پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اگر ان کی ناولوں میں کردار کے نام بدل دیے جائیں تو پھر ناولوں کو ممیز کرنا مشکل ہوگا - تاریخی ناولوں میں صداقت کو بھی ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے[1] لیکن یہ ظاہر ہے کہ وہ تاریخ نہیں لکھ رہے تھے بلکہ ان کا مطمح نظر ناول لکھنا تھا اگر ایسا نہ کیا جاتا تو تاریخ اور ناول میں کیا فرق باقی رہ جاتا ان خامیوں کے باوجود بھی انھوں نے اردو ناولوں کو انگریزی ناولوں کے شانہ بہ شانہ لا کھڑا کیا انھوں نے ہندستانی ادب میں اسکاٹ کی جگہ لی ہے - اسکاٹ نے در پردہ تبلیغ کی اور با کمال ناول نگار بنا - شرر نے مقصد کو چھپا نہ سکے اور لوگوں کو انگشت نمائی کا موقع مل گیا -

محمد علی اور راشد الخیری

حکیم محمد علی بھی انھیں کے ساتھی ہیں - راشد الخیری نے نذیر احمد کی اتباع کی اور پھر ان میں انفرادیت پیدا ہو گئی انھوں نے عورت کی المناک زندگی کو اپنا موضوع بنالیا اور اس طرح چھوٹے چھوٹے افسانے میں اس کو خاص جگہ مل گئی - مگر ہر افسانہ ایک ہی انداز رکھتا ہے اور دو تین چیزیں پڑھنے کے بعد وہ تازگی محسوس نہیں ہوتی تھی[2] اور غم و الم کی شدت جس کو بیان کرتے ہوئے زبان رکھتی ہے ان کے قلم سے نہایت تفصیل کے ساتھ بیان ہو جاتی ہے اسی رجحان کی وجہ سے علامہ راشد الخیری کے ساتھ "مصور غم" کا لقب بہت زیب دیتا ہے[3]"

موجودہ افسانہ نگار

اب وہ زمانا تھا کہ ساری دنیا اقتصادی مصائب میں گرفتار تھی - سیاسی انتشار اور حکومت اور رعایا کے درمیان اختلافات پیدا ہو چکے تھے ان چیزوں کا اثر ادب پر بھی پڑا ناولوں کے لکھنے اور پڑھنے کی فرصت نہ پاکر لوگ مختصر افسانہ نویسی اور افسانہ خوانی کی طرف راغب ہوئے اور مصنفین کو ان کی طلب پوری کرنی پڑی - ان میں نیاز - پریم چند - پطرس - رشید احمد صدیقی اور مجنوں گورکھپوری پیش پیش رہے - اور ہندستانیوں کی قومی تمدنی - معاشرتی - اقتصادی - سیاسی تاریخی اور سماجی حالات کو اجاگر کیا اور ان کی تحریروں کو پڑھ کر ہر شخص یہ سمجھنے لگا کہ "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" - اور یہی وہ ادب ہے جو دنیا کے اور دوسرے عصری ادبیات کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے - ان لکھنے والوں میں اور بھی چند نام ہیں جن میں سجاد حیدر - سدرشن - اعظم کریوی افسر میرٹھی - علی عباس حسینی - حامد علی خاں - ام سلیم لعد عظیم بیگ چغتائی - قابل ذکر ہیں - ان افسانہ نگاروں نے طرح طرح کی جدتیں اور رنگینیاں پیدا کی ہیں اور کر رہے ہیں - محبت اور عورت کے دلکش نظریوں پر بحث کی جا رہی ہے ان کے دو گروہ ہو گئے ہیں - پہلے گروہ میں نیاز مجنوں - سجاد حیدر اور ل - احمد ہیں - ان لوگوں نے

---

[1] دنیائے افسانہ - [2] افسانہ (مجنوں) صفحہ ۱۲۴ - [3] مختصر تاریخ ادب اردو (اعجاز) صفحہ ۱۰۸

زنانہ ادب لطیف کی بنیاد ڈالی اور ان کے نزدیک عورت

"محترم ترین - مخلوق - ہم پر حکمرانی کرنے والی -
ایک لذت ہے مجسم ایک تسکین ہے متشکل ایک سحر
ہے مرئی ایک نور ہے مادی"

ان کے نزدیک عورت کا حسن صرف دیکھنے کے لیے ہے آزاد رمیدہ - آغوش سے دور - مجنوں کہتے ہیں محبت بلا ازدواج قایم رہ سکتی ہے اور اس میں مذہب و ملت کی تفریق بے قصد ہے - دوسرا گروہ عورتوں کو برائیوں کا مخزینہ قرار دیتا ہے[1]"

انہیں جھگڑوں سے تنگ آکر علامہ اقبال نے فرمایا تھا -

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

راشد الخیری - پریم چند - سدرشن اور سلطان حیدر جوش کے افسانوں کی عورتیں ہندستانی ہیں جن کا خاص جوہر نسائیت ہے جو شرم و حیا کے مجسمے ہیں - پریم چند - سدرشن - اعظم کریوی اور عظیم بیگ نے راجپوتنیوں کی عظمتیں بیان کرکے ہم پر ان کا سکہ بٹھا دیا - ان کا اپنی آن کے لیے سب کچھ قربان کر دینا - سب کچھ چھوڑ بیٹھنا لیکن بات کو بنائے رہنا اتنا موثر اور دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ ہم داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے - ان کی تکلیفوں میں ہم روتے ہیں اور ان کی خوشی کے موقع پر ہم بھی خوش ہوتے ہیں غرض ان کی تحریر پر ہم اس طرح چلتے ہیں گویا ایک گمراہ اندھیرے میں دور ٹمٹماتے دیے کی طرف چلا جاتا ہے -

پریم چند نے عورتوں اور دوسرے ہر نقطہ خیال کو اپنے افسانوں میں پیش کیا سدرشن نے ہندوؤں کے گھرانے کی حالت کا خاکہ کھینچا اور راشد الخیری اور فضل حق قریشی نے مسلمانوں کے گھرانوں کی - حامد اللہ افسر نے ہندستانیوں کے عام ذہنی رجحانات کو اپنے افسانوں کا پس منظر بنایا - اور پریم چند کے اصلاحی رنگ سے متاثر ہو کر سدرشن - اعظم کریوی - علی عباس حسینی اور پروفیسر مجیب نے کامیاب افسانے لکھے - افسر کا ڈالی کا جوگ علی عباس کا افسانہ آئی سی ایس اور پروفیسر مجیب کے افسانوں میں کیمیا گر - باغی اور تیتھر نہایت کامیاب ہیں - کیمیا گر میں حکیم مسیح کا جذبہ خدمت اور حب وطن - باغی میں بغاوت کے باریک نکات اور بڑے بابو کا کردار اور تیتھر میں ہندستانیوں کا تساہل بڑی خوبی کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے اور افسانے کا خاتمہ بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے - پروفیسر مجیب نے "روسی ادب" پر تفصیلی اور مبسوط تاریخ دو جلدوں میں لکھی ہے - روسی ادیبوں کا اثر بھی ان کے افسانوں پر نظر آتا ہے - پریم چند کی طرح وہ بھی واقعات بیان کرتے ہیں اور کرداروں کی سیرت نمایاں ہوتی جاتی ہے اور ان کی ساری زندگی پڑھنے والے کے سامنے آجاتی ہے - ان کے علاوہ اور بھی افسانہ نگار ہیں جن کا ذکر ہم نے اگلے باب میں کیا ہے - غرض اس طرح سارے ہندستان کی تہذیب و تمدن کا مجموعی خاکہ ہمارے افسانوی ادب میں پیدا ہو گیا -

ترقی پسند ادیب

پریم چند اور عظیم بیگ نے انتقال کیا اور ان کے بالکل آخری زمانے میں چند ایسے مصنفین منصہ شہود پر آئے جو عصری میلانات کو شدت کے ساتھ اپنے افسانوں میں پیش کرنے لگے

---

[1] ہمارے افسانے صفحہ ۹۵ اور دیباچہ رہگذار (مجموعہ ماخوذ نیالوگ)

ان کے گروہ کو ہم ترقی پسند مصنفین کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ دور اشتمالی حقیقت نگاری کا دور ہے جس میں زندگی بجلی کی طرح کوند رہی ہے اور سماج کی عمارت کی کڑیاں چٹخ رہی ہیں ..... اب زندگی پر پردہ کم پڑا دکھائی دیتا ہے اور سمجھنے والے اسے بھی اتحاد نے پرمعنی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں ہمیں بیک وقت مشین کی پوری پیچیدگی سے آشنا کر دیتے ہیں سماج میں افراد کی جنس اور معاشی کشمکش کو اس کے تعلقات کے ساتھ سمجھنا انھوں نے اپنا شعار بنا لیا ہے۔ لیکن ان کے بعض اراکین اپنے افسانوں میں سماج کی اتنی عریاں تصویریں پیش کرتے ہیں کہ انھیں دیکھنا ثقہ طبیعت گوارا نہیں کرتی۔ نئے زاویے کے بعض افسانے رشید جہاں کا افسانہ (آصف جہاں کی بہو) عصمت چغتائی کی (ضدی) اور (لحاف) مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں اس سے ہمارے ادب میں ترقی کے امکانات کم ہیں اور ہمیں تو یاسی ہی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

ترقی پسند ادیبوں میں سجاد ظہیر کا نام سرفہرست ہے اس لیے ہے کہ وہ انجمن کے پہلے معتمد ہیں۔ انھوں نے اپنے دوران قیام یورپ میں فرانس کے مزدوروں کی بیداری۔ آسٹریا کا ناکام مزدور انقلاب اور بلغاریہ کی کمیونسٹ پارٹی کے صدر دمیتروف کے مقدمے کے واقعات دیکھے اور سنے اور مغربی مصنفین کے ساتھ خود بھی دمیتروف کی جرات وہمت سے متاثر ہوئے اور اس طرح ترقی پسند مصنفین کی انجمن میں شریک ہو گئے (انگارے) کی کہانی کے بعد (بیمار) (ایک ایکٹ ڈرامہ) اور (لندن کی ایک رات) ایک طویل مختصر افسانہ لکھا۔ ان کے دوسرے ساتھی احمد علی ہیں جو اپنے کام میں سرگرمی کے لحاظ سے سجاد ظہیر کے بعد آتے ہیں۔ سجاد ظہیر نے ہندستان آکر ترقی پسند ادب کا پرچار کیا اور احمد علی کے علاوہ اور بھی ادیب اور شاعر انجمن کے مقاصد کی بلندیوں پر نظر رکھتے ہوئے رکن بن گئے۔ احمد علی کی تالیف (انگارے) ترقی پسند مصنفین کا پہلا کارنامہ ہے۔ (مہاوٹوں کی ایک رات) احمد علی کا افسانہ ہے جو بہت ادبیانہ شان کا حامل ہے۔ ڈاکٹر رشید جہاں اختر انصاری۔ حیات اللہ انصاری۔ علی سردار جعفری۔ عصمت چغتائی اختر حسین رائے پوری۔ سعادت حسن منٹو۔ کرشن چندر۔ اوپندر ناتھ اشک۔ راجندر سنگھ بیدی۔ ممتاز مفتی۔ ملک راج آنند۔ گوپال متل۔ فیاض محمود۔ علی عباس حسینی۔ پیرزادہ احمد ندیم قاسمی۔ احتشام حسین یہ سب اسی کشتی کے سوار ہیں اور اپنے حسب مقدور کام کیے جا رہے ہیں۔ ان میں اختر رائے پوری۔ اختر انصاری۔ عصمت چغتائی سعادت حسن منٹو۔ اشک۔ بیدی۔ حسینی اور قاسمی تیز نگار ہیں۔

افسانے کی فنی خصوصیات

افسانے کی ساخت
خارجی پہلو

اب ہم افسانے کی فنی خصوصیات سے بحث کریں گے

ساخت کے اعتبار سے افسانے کے دو پہلو ہیں ایک خارجی اور دوسرا داخلی۔ خارجی پہلو سے مراد افسانے کا سرسری خاکہ ہے جس پر افسانے کی بنیاد کھڑی کی جاتی ہے اور داخلی پہلو سے مراد اس کا خاکہ۔ کردار۔ اسلوب۔ زبان موضوع الفاظ کا استعمال اور ہر وہ خوبی جو افسانے کو موثر اور دلچسپ بنا سکے۔ اس کے بنیادی عناصر آغاز افسانہ۔ مقصد کی ایک نظری یا افسانہ نگار کا نقطہ خیال کشمکش

منتہا اور خاتمہ ہیں۔

افسانے کی ابتدا اور انتہا

افسانے کی ابتدا جتنی اچھی ہوگی پڑھنے کے لیے لوگ اسی قدر راغب ہوں گے اور پہلی سطر سے دوسری سطر کی طرف رغبت ہوگی۔ طول طویل تمہید یا موقع و محل کے مناظر اب افسانے کی ابتدا کے لیے سم قاتل کا حکم رکھتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ افسانہ نگار ابتدا کے بعد اپنا مقصد واضح کر دے کہ وہ اپنے کرداروں سے کیا کام لینا چاہتا ہے تیسری چیز کرداروں کے خیالات کا لحاظ اور پھر اس کی انتہا ہے جہاں پڑھنے والا یہ سمجھ سکتا ہے کہ اختتام کس طرح ہوگا اس کے بعد خاتمہ بھی اسی طرح اچانک ہوگا۔ اس لیے کہ جب قاری نے تصفیہ کر لیا ہے کہ آگے یہ انجام ہونے والا ہے تو اس کو زیادہ انتظار میں رکھنا افسانے کی خامی کے مرادف ہوگا۔ بعض اچھے افسانہ نگار اپنے افسانے اس طرح ختم کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اس شبہ میں رہتا ہے کہ ابھی افسانہ اور باقی ہے حالانکہ وہ اپنا مقصد اور نقطۂ نظر اپنے کرداروں کے ذریعے ظاہر کر چکتے ہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ بڑھتی ہوئی دلچسپی کے ساتھ باہمی ربط قایم رہے ورنہ جہاں سے لغزش ہوگی وہاں افسانہ خواں کی دلچسپی ختم ہو جائے گی۔

داخلی پہلو

داخلی حیثیت سے پلاٹ کا بہتر ہونا ضروری ہے اور اس کے لیے اکتساب سے زیادہ قابلیت کی ضرورت ہے جس کا مطالعہ وسیع اور جس کی نظر گہری ہوگی وہ آسانی سے پلاٹ بنا سکتا ہے۔ لیکن اس کو حسب موقع پھیلانا اور سنوارنا بھی ضروری ہے اور اس کے لیے خاص سلیقہ کی ضرورت ہے۔ دوسرا جز کردار نگاری ہے۔ "یہ کہدیا جاتا ہے کہ کرداروں کو جیتی جاگتی تصویریں ہونا چاہیے انسانی کردار کی صحیح نقلیں تو جیتی جاگتی تصویریں ہو سکتی ہیں۔ صاحب کمال کردار نویس وہی مصنف سمجھا جاتا ہے جو نقل کو اصل کر دکھائے۔ واقعات کردار کو ابھارتے ہیں یہ قانون فطرت ہے۔[۱] انسان کی نفسیاتی قسموں کی کردار کشی کرنے والے مصنف زیادہ کامیاب ہوتے ہیں کرداروں کا اعلیٰ خصوصیات کا حامل ہونا نہایت ضروری ہے پڑھنے والا کرداروں کے ساتھ ساتھ چلتا ہے بشرطیکہ کرداروں میں لے چلنے کی قوت ہو۔ اگر ان کی قوت زایل ہو جائے تو افسانہ شتر بے مہار بن جائے گا۔ افسانے کا ارتقا بھی تدریجی ہونا ضروری ہے۔ اس کی زبان میں حلاوت اور شیرینی ہونی چاہیے اسلوب بیان بھی افسانے میں خاص اہمیت رکھتا ہے اگر خداداد ملکہ ہو تو پھر افسانہ نگار کے وارے نیارے ہیں اور نہ ہو تو اکتساب سے کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔ "مثیلی رنگ یعنی ڈرامائی انداز بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔"[۲] لیکن لطیف الدین احمد اکبرآبادی اسکو غیر اہم سمجھتے ہیں۔[۳] ممکن ہے وہ اس سے گفتگو اور بحث و تمحیص مراد لیتے ہوں لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ قاری افسانہ پڑھتا ہے لیکن طرز تحریر اس کو ایسے مناظر بتاتی ہے جس کو وہ حقیقت سمجھتا ہے۔ عبارت پڑھ کر وہ ہنستا بھی ہے اور عبارت ہی پڑھ کر وہ اپنے رخساروں پر گنگا جمنا بہتے دیکھتا ہے یہی افسانہ نگار کی سحر کاری اور فسوں کاری ہوتی ہے۔ کم سے کم الفاظ کا استعمال بشرطیکہ مفہوم میں الجھن نہ ہو زور بیان اور طرز ادا میں زبان کی گھلاوٹ اور روانی الفاظ کا انتخاب اور فقروں کا دروبست افسانے کے

۱؎ سالنامہ ساقی سنہ۳۸ء ۔ ل احمد ۔ ۲؎ دنیائے افسانہ ۔ ۳؎ سالنامہ ساقی سنہ۳۸ء

حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ افسانہ نگار اپنے افسانے کو خواہ مختصر لکھے یا طویل اس کی طرزِ ادا اور زبان اس کی کامیابی اور ناکامی کی ذمہ دار رہتی ہے۔ اس سے کشش قائم رہتی ہے حقیقت نگاری اور مکالمہ بھی جزو لازم ہیں۔ اگر افسانہ نگار حقیقت سے دور ہو جائے تو پھر وہ مافوق الفطرت اشیا کا ذکر کرے گا جس کا زمانہ گزر چکا۔ مکالمہ سے تحریر میں دلکشی پیدا ہوتی ہے اور کردار کو سمجھنے میں بہت زیادہ سہولت ہوتی ہے۔ بہر حال افسانہ نویس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ایک کامیاب مقرر کی طرح پہلے ہی فقرے سے قاری کی توجہ کو اپنی گرفت میں لے لے اور پھر جوں جوں افسانے کو بڑھائے اپنے ناظر کی دلچسپی میں اضافہ کرتا جائے حتیٰ کہ کلائمکس پر پہنچ کر اس طرح افسانے کو ختم کر دے کہ جو اثر وہ قاری پر ڈالنا چاہتا ہے وہ تمام تر شدت کے ساتھ اس پر مسلط ہو جائے۔

اکبر الدین صدیقی ام۔اے (عثمانیہ)

سجاد حیدر یلدرم اور ترکی افسانے

پچیس تیس سال پہلے ہمارا ادب ایک نئی چیز سے روشناس ہوا یہ دور وہ تھا جب کہ انگریزی ادب میں ادب برائے ادب کی تحریک کا دور دورہ تھا اور اس زمانے کے انگریزی تعلیم یافتہ حضرات ہندستانی ادب کو بھی اسی چیز سے مالا مال کرنے میں کوشاں تھے چنانچہ نیاز فتح پوری۔ سجاد حیدر یلدرم اور لطیف احمد اکبرآبادی کے نام اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم پہلے شخص ہیں جنھوں نے ترکی افسانوں کو پہلے پہل ہندستانی میں منتقل کرنا شروع کیا۔ بعد اکثر دوسری زبانوں ہی کے ترجموں سے مالا مال ہوا ہے اور سجاد حیدر نے ترکی زبان سے جتنا ادب ہندستانی میں منتقل کیا ہے اس کی نظیر ہمارے ادب میں نہیں ملتی۔

سجاد حیدر ضلع بجنور کے رہنے والے تھے اور ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے فوقانی تعلیم علی گڑھ میں پائی اور الہ آباد یونیورسٹی سے گریجویٹ ہو کے آپ نے تین سال تک بغداد میں قیام کیا واپسی پر ڈپٹی کلکٹر ہوئے جب علی گڑھ یونیورسٹی میں پیچیدگیاں پیدا ہوئیں اور انتظامات وہاں بدل خراب ہوتے گئے تو ڈپٹی کلکٹری کے عہدے سے علی گڑھ یونیورسٹی کی رجسٹراری پر آ گئے اور ایک زمانے تک جامعہ کی خدمات انجام دیتے رہے۔

۳۱ جنوری ۱۹۲۶ء کو انھوں نے اس خدمت سے سبکدوشی حاصل کی اور ڈپٹی کلکٹری پر واپس ہو گئے اس سلسلے میں انھیں انڈمان جانے کا موقع ملا یہاں کے حالات انھوں نے اپنے اکثر دوستوں کو خطوط میں لکھے ہیں۔

۱۹۳۲ء میں یہ ہندستان واپس آئے اور پھر دوبارہ شام اور ترکی کا سفر کیا اور ....

۱۹۴۳ء میں انتقال کیا۔

علی گڑھ کے قیام کے دوران میں انھیں ادب کی خدمت کرنے کا بہت زیادہ موقع ملا اور آپ کے اکثر مضامین "مخزن علی گڑھ میگزین" "نگار" "ہمایوں" اور دوسرے رسالوں میں شایع ہوتے رہے ہیں آپ نے زیادہ تر ترکی افسانے ناول اور ڈرامے ترجمہ کیے ہیں ترکی افسانوں میں خارستان و گلستان صحبت ناجنس نگاہ ثانی۔ سودائے سنگین اور اس کے بعد حکایات و احساسات میں کے زیادہ افسانے ترکی ہی سے لیے گئے ہیں۔ ڈراموں میں جنگ و جدال۔ جلال الدین خوارزم شاہ اور فتح اندلس بھی ترکی زبان کی پیداوار ہیں "ثالث بالخیر" اور "زہرا" یہ دونوں ناول بھی ترکی زبان سے لیے گئے ہیں دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے آٹھ دس افسانوں کو چھوڑ کر باقی تمام ادبی پیداوار کا منبع ترکی ادب ہے اور انھوں نے اگر طبعزاد بھی لکھا ہے تو اس پر ترکی ادب کا اثر نمایاں ہے۔

ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ اس زمانے میں ادب برائے ادب کی تحریک بہت زوروں پر تھی یلدرم کے افسانے اس کا ثبوت ہیں۔ ہمیں ان افسانوں میں معاشرت اور سماج کی جھلکیں نظر نہیں آتیں وہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنی تحریر کو دل آویز، رنگین اور حسین عبارت سے

مرصع کریں اس سے زندگی کی تمام تلخ حقیقتوں پر پردہ پڑ جاتا ہے اور ذہنوں میں جمود کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

یلدرم نے ترکی ادب کو ہمارے ادب میں منتقل کر کے بہت بڑی خدمت انجام دی ہے اس سے ہم نہ صرف ایک اجنبی ادب سے روشناس ہو سکے بلکہ مترجم نے اپنی قابلیت کے زور سے ہر چیز کو اصلیت کے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس سے ان کی مرعوب کرنے والی انشاپردازی اپنے قارئین کے دلوں پر جادو کا سا اثر کر جاتی ہے انھوں نے نہ صرف اپنی عبارت ہی میں رنگینی پیدا کی ہے بلکہ اپنے افسانوں کے کرداروں کے نام رکھنے میں بھی اچھی قابلیت کے جوہر دکھائے ہیں مثلاً اپنے خیالستان کے پہلے افسانے میں ہمیں جو نام نظر آتے ہیں اس میں سے چند یہ ہیں۔ گل چکان ۔ زہرہ جبیں۔ ناز آفریں ۔ موج نور ۔ طاؤس خرام ۔ کبک ادا ۔ اس افسانے کے ہیرو ہیروین اسم با مسمّیٰ ہیں یعنی "نسرین نوش" اور "خارا" "نسرین نوش کا پرورش نسوانی ماحول میں کی گئی ہے اور خارا اس میں اور ان دونوں افسانوں کا اگر ہم تقابلی نظر سے مطالعہ کریں تو محو حیرت ہوتے ہیں مثلاً "نسرین نوش ان تمام نمونہ جات رقص و آہنگ کو ایک سہیلی صبح خندان کے زانوں پر سر رکھے ہوئے ایک بے پروا۔ لاابالیانہ انداز سے دیکھ رہی تھی"

یا "لذیذ شراب کے نشہ سے نسرین نوش ہنستی ہوئی ایک سہیلی کی گود میں گر پڑی اور اپنے ہونٹ چوس چوس کر نظر اس طرح دور دور دوڑانے لگی"

اس کے مقابلے میں سجاد حیدر نے خارا کی زندگی کا جو ماحول ہمارے سامنے پیش کیا ہے وہ اس کے بالکل متضاد ہے خارا کے متعلق وہ لکھتے ہیں۔

"خارا اسی آفتاب کے تلے اس کنیلی پتھریلی زمین پر ان درندوں حیوانوں میں پلا تھا اس کے ہاتھ سیکڑوں مرتبہ چھل چکے تھے سینے پر ہزاروں مرتبہ ٹھوکریں لگ چکی تھیں چہرہ تمتماتے تمتماتے تانبا ہو گیا تھا" "شیر نے سر اٹھا کر پھر اسے دیکھا اور اس پر کود پڑنے والا ہی تھا کہ خارا نے ایک سکنڈ رائیگاں نہ کر کے کمان کو پوری طاقت سے کھینچ کر تیر چھوڑا تیر ایک ہوا چاک سرسراہٹ سے اس کی طرف گیا اور گردن میں گھس گیا"

اس کے ساتھ ہم ان کے مشہور ناول "زہرا" سے ایک ٹکڑا پیش کرتے ہیں جو ہمارے اس خیال کی تصدیق کرے گا۔

"زہرا کے ہر خندہ میں رضا کو ایک صبح سعادت نظر آتی تھی اور رخسار کے ہر تبسم میں زہرا کو ایک بہار مسرت دکھائی دیتی تھی لیکن اگر یہ دونوں دلنواز کی فکر عمیق کو غور سے دیکھتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ ایک مجرمانہ خیال اس کے دل میں جاگزیں ہے مگر دونوں نے دلنواز کے تفکرات کو صرف اس بات پر محمول کیا کہ چونکہ اس کی شادی نہیں ہوئی اس لیے اکیلی ہونے کی وجہ سے اداس ہے۔ اور دونوں اس کے لیے ایک مناسب خاوند تلاش کرنے لگے"

اسی تقابلی مطالعے سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ سجاد حیدر نے نسوانی کرداروں کی زبان سے جو الفاظ کہلوائے ہیں یا ان کے متعلق جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ نہایت نازک حسین یا نہیں کے الفاظ میں بلوریں انداز میں تحریر کیے گئے ہیں اور اس کے برخلاف مردانہ کردار کے الفاظ جلال و صولت اور دبدبہ و شکوہ کے ساتھ نکلتے ہیں اور ایسے ہوتے ہیں جن سے پڑھنے والے پر گہرا اثر پڑتا ہے یہ سجاد حیدر کی خصوصیت ہے جو عام طور پر دوسرے مصنفین میں نظر نہیں آتی۔

ان کی تحریر کی دوسری خصوصیت ان کے الفاظ کی ہم آہنگی ہے ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں وہ نرمی سے کام

لینا چاہتے ہیں ان کے الفاظ میں بھی وہی ملائمت ہوتی ہے اور جہاں عظمت و جبروت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں ان کے الفاظ نہایت پرشکوہ ہو جاتے ہیں مثال کے طور پر انھوں نے آندھی چلنے کے واقعے کو اس طریقے سے بیان کیا ہے۔

"کسی دن آندھی کی شدت سے درخت ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کے تیھر اڑا کے طغیان انگیز سمندر میں گرتے تھے اور جزیرے کے درندوں کا شور سمندر کی لہروں کی چیخوں سے ایک محشر ہیجان پیدا کر رہا تھا"

یا حکایات و احساسات کے ایک افسانے "گمنام خطوط" میں غصے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

"جاؤ ہٹو اگر پورے قلعے کو ڈاکو لوٹ مار کر کے تباہ کر دیں تو بھی میں فی الحال ٹس سے مس ہونے والا نہیں ہوں۔ کرچ یہاں سے اٹھا دو اور وردی کو میرے سامنے سے ہٹا دو"

اوپر کے جملوں میں ہم نے دیکھ لیا کہ وہ جس قسم کے جذبات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں اسی طرح کے الفاظ استعمال کرتے ہیں غصے کے اظہار کے لیے جہاں انھوں نے ڈ۔ ٹ کا زیادہ استعمال کیا ہے اسی طرح طغیانی کا اظہار کرتے وقت ۔ ش ۔ ٹ ۔ ڑ ۔ ع کے استعمال سے اپنی قلمی تصویروں میں آندھی کی صورت دکھا دی ہے اس کی مثالیں ہم کو ان کے اور بہت افسانوں اور کتابوں میں مل سکیں۔

سجاد حیدر کے افسانوں میں اکثر نئی نئی ترکیبیں بھی نظر آتی ہیں ان میں اکثر ترکیبیں ایسی ہیں جنھیں قبول عام کا درجہ حاصل نہ ہو سکا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ انھوں نے جو ترکیبیں وضع کی ہیں وہ بے جان ہیں یہ کام ہر کس و ناکس کے بس کا نہیں ہوتا اس کے لیے کافی غور و خوض کی ضرورت ہوتی ہے اور ساتھ ہی ہر جستی قابلیت کی بھی چنانچہ ذیل کی ترکیبیں ہمارے دعوے کی دلیل ہیں۔

سبا نمائے وحشت ۔ زہرہ ریز گرج ۔ احتشام مجسم یعنی شیر ہوا چاک سرسراہٹ ۔ گرد و نہ گلگونہ آفتاب ۔ برق لمعان مسکراہٹ نظر محتشم ۔ رابطہ مناسبات ۔ ضربہ بوفائی ۔ آتشیں دورۂ عشق سجاد حیدر نے اپنی عبارت میں اکثر جگہ ایسے جملے لکھے ہیں جنھیں پڑھنے کے بعد ہم متحیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ان کی نگاہیں بہت دور رس ہیں انھوں نے حیات انسانی کی تحلیل کی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی جذبات کو انھوں نے جس باریک بینی اور جدت طرازی کے ساتھ منظر عام پر لایا ہے وہ ان کی افسانہ نویسی کا کمال ہے مثال کے طور پر ہم یہاں ان کے ایسے جملوں کو جو یک دقت ہمیں غور و فکر کا موقع بھی دیتے ہیں اور جذبات انسانی کا اظہار بھی کرتے ہیں پیش کریں گے۔

(۱) زہرا اس وقت مسرت سے زیادہ محبت سے کانپ رہی تھی (زہرا)

(۲) رضا کی آنکھوں سے آنسو کے چند قطرے گرے شاید یہ ندامت و جدائیہ کے پہلے قطرے تھے (زہرا)

(۳) اپنے حیات کو اپنے چہرے میں چھپائے لیکن دوسرے دل کی گہرائیوں تک پہنچ جانے کی کامل قدرت کے ساتھ وہ آگے بڑھی (حکایات و احساسات)

(۴) وہ اپنی قابلیت سے مطمئن و خاموش تھی میں اس کی مظفریت کے مقابلہ میں ایک عاجز و حقیر چیز کی طرح بندھا ہوا تھا۔

(۵) اس ضرب سے میری تمام قوت محاکمہ منجمد ہو کر رہ گئی (عورت کا انتقام)

یہ ہیں وہ چند اسباب جن کی بنیاد پر سجاد حیدر کی شہرت کا دار و مدار ہے انھوں نے ادب لطیف سے ہندستانی ادب کو نوازا۔ ان کا ادب نثر میں شاعری کا مرادف ہے اور ہم زمیندار کے نقاد کے ہم نوا ہو کر کہیں [illegible]

تامل نہیں کرتے کہ ہندستانی زبان کی ادبیات لطیف میں خیالستان سے بہتر کتاب نہیں اگر وہ صرف خیالستان کے بعد بھی تصنیف و تالیف کا مشغلہ ترک کر دیتے تو ان کا نام ہندستانی ادیبوں کی صف اول میں ہوتا۔ خیالستان کے بعد ان کا ناول زہرا ہے گو ترجمہ ہی سہی لیکن اصل تصنیف معلوم ہوتی ہے۔

ناصر الدین فاروقی

افسانہ نگاری کی تکنیک

قصوں اور کہانیوں کا وجود دنیا کی تمام زبانوں میں پہلے ہی سے چلا آرہا ہے۔ ڈرامہ ناول افسانے کے پیدا ہونے سے پہلے بھی ادب کا جزو اعظم تھے البتہ مختصر افسانہ ادب کی جدید ترین صنف ہے اور زمانہ حال کی پیداوار ہے۔

قصص کی مروجہ قسموں کو مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کیا جاسکتا ہے ناول، ناولچہ، ڈراما، مختصر افسانہ پہلے اور دوسرے میں صرف مقدار یا حجم کا فرق ہے نوع کا نہیں جدید رجحان یہ ہے کہ ناول کو مختصر کرکے ناولچہ میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس میں آرٹ ایک شدید مفہوم کے تحت کارفرما ہے یعنی بیان کے ایک محدود اور عمیق طریقے کو رواج دینا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ واقعات کو کم لفظوں میں اختصار کے ساتھ پیش کیا جائے اور ایسی تفصیلات کو حذف کر دیا جائے جو براہ راست پلاٹ اور تعمیر کردار پر اثر انداز نہیں ہوتے اور یہ خیال اس لیے پیدا ہوا کہ آج کل کی مصروف دنیا کا پڑھنے والا صرف حقیقی اور ضروری واقعات ہی سے واقف ہونا چاہتا ہے۔ بہرحال اس نظر کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ ناولچہ میں بھی ناول کی تمام خصوصیتیں موجود ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک مفصل ہے دوسرا مجمل۔

افسانہ حقیقی معنوں میں نہ تو ناول ہے نہ ناولچہ۔ یہاں اختصار کے رجحان نے شدت اختیار کر لی ہے لیکن اس سے یہ مقصد ہرگز نہیں ہوسکتا کہ افسانہ مختصر ناول ہے یا کسی ناول کا اختصار ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس اختصار کا مفہوم بالکل محدود بھی نہیں۔ کرشن چندر کا افسانہ "زندگی کے موڑ پر" احمد ندیم قاسمی کا افسانہ "طلوع و غروب" اور مغربی افسانہ نگار البرٹ ہیوبرٹ کا "شیب کا درخت" مختصر افسانے ہیں انہیں طویل مختصر افسانوں کا عنوان دیا جاسکتا ہے۔ مختصر افسانہ اپنے اس

وسیع مفہوم کے تحت نوعیت، مقصد اور نصب العین ہر حیثیت سے ناول سے جدا ہے۔ ناول کی فضا وسیع اور ہمہ گیر ہوتی ہے افسانہ نویس کو ناول نگار کی سی آزادی نہیں۔ کیرکٹروں کی زندگیوں کو ایک محدود جگہ میں بیان کرنا ہوتا ہے۔ جیتی جاگتی متعدد واقعات اور بیشتر حادثات کا مجموعہ ہے۔ ان تمام واقعات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا ناول نویس کا کام ہے افسانہ نگار ان میں سے صرف ایک واقعہ کا انتخاب کرتا ہے اور اسی کو افسانے کا بنیادی تھیم قرار دیتا ہے۔ وہ محدود خطہ کے اندر کسی ایک شخص کے کیرکٹر کی جھلک دکھاتا ہے اور یہ جھلک ایسی خیرہ کن ہوتی ہے کہ اس کے اثرات دل و دماغ پر دوامی طور پر مرتسم ہوجاتے ہیں۔ مختصر افسانہ کا امریکی علمبردار "ایڈگر ایلن پو" "ہاتھارن" کی کتاب "افسانے" پر تنقید کرتے ہوئے جب مختصر افسانے کی فنی خصوصیات بیان کرتا ہے تو سب سے زیادہ "مجموعیت" پر زور دیتا ہے اور مختصر افسانے کی تعریف یوں کرتا ہے "نثر کی وہ روداد ہے جو ایک نشست میں شروع سے آخر تک پڑھی جاسکے اور جس کے مطالعہ میں کم سے کم نصف اور زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے صرف ہوں"

ایڈگر ایلن پو کے مختصر افسانوں کا اثر بہت زیادہ ہوا خصوص فرانس میں لیکن اس کے تنقیدی نظریہ کو ساٹھ برس سال تک مقبولیت عام حاصل نہیں ہوئی تاوقتیکہ "میتھوز" نے اپنا بلند پایہ مقالہ "مختصر افسانوں کی فلاسفی" لکھ کر شائع نہ کردیا۔ اس مقالے کے دوسرے حصے میں وہ اپنے دلائل یوں بیان کرتا ہے "مختصر افسانہ کچھ اور ہی چیز ہے ہر چھوٹا قصہ مختصر افسانے کی تعریف میں نہیں آسکتا۔ ایک حقیقی مختصر افسانہ کی وہ انفرادی خصوصیت جو ناول

علیحدہ کرتی ہے اس کی اثر آفرینی اور تاثیر کی ذاتی یک رنگی ہے"
اس تعریف کو محدود اور معین طور پر یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ
مختصر افسانے کی یکسانیت اور وحدت ناول میں نہیں پائی جاتی
ناول میں یہ "یگانگی اثر" اس لیے پیدا نہیں ہو سکتا کہ اس میں
بوقت واحد کئی کیرکٹر زیر بحث لائے جاتے ہیں۔ تاثر کی وحدت
کی تعمیر اسی وقت ہوتی جب کہ خواہ مخواہ مختلف واقعات
کو ٹھونسنے کی کوشش نہ کی جائے اور صرف وہی واقعات بیان
کیے جائیں جن کا تعلق پلاٹ سے براہ راست ہو کیونکہ
وہی افسانہ کامیاب ہو سکتا ہے جس کو پڑھ کر قاری کے دل پر
ایک سے زیادہ اثرات مترتب ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات
بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مختصر افسانہ فرانسیسی قدیم ڈرامے
کی تین وحدتوں کی تکمیل کرتا ہے یعنی واقعات کو اس طرح ترتیب
دیتا کہ وہ ایک روز میں ایک ہی مقام پر واقع ہوں اور ان
میں ربط و وحدت بھی ہو۔ علاوہ ازیں مختصر افسانہ
عموماً ایک کردار ایک واقعہ ایک جذبہ یا جذبات کے
ایسے سلسلوں سے بحث کرتا ہے جو کسی ایک صورت حال کا نتیجہ ہوں۔

افسانہ اور ڈراما ۔۔۔ ڈراما بھی فن ادب کی ایک
صنف ہے جہاں تک تکنیک کا تعلق ہے ان دونوں میں
معمولی فرق ہے۔ ان کا ماحول بھی ایک ہی ہے یعنی دونوں
صورتوں میں تاثر کی وحدت اور ہم آہنگی دونوں کا جزو
لاینفک ہیں۔ ایک مغربی مصنف ڈرامے کی تعریف
یوں کرتا ہے "ڈراما انسانی ارادہ کی وہ نمود ہے جو بعض
پراسرار اور فطری طاقتوں کے مقابل، جو ہمیں محدود و مجبور
بناتی ہیں زور آزمائی کرتی نظر آتی ہے۔ ہم میں سے کسی شخص
کو سٹیج پر پھینک دیا جاتا ہے کہ وہ تقدیر، سماجی قوانین کے
اپنے ہم جنس یا خود اپنی ذات کے خلاف نبرد آزمائی کرے
اور اگر مجبور ہو تو اپنے اقربا کی مالی ہستی، مفاد، تعصبات
جہالت یا بدسگالی کے خلاف بھی نبرد آزما ہو" اس سے بات
ظاہر ہے کہ ڈراما دو مخالف قوتوں کے ایک دوسرے کے
خلاف صف آرا ہونے کی صورت میں پیدا ہوتا ہے اور یہ
مخالف قوتیں ایک شخص کی ذات میں بھی جمع ہو سکتی ہیں۔
ان قوتوں کی کشمکش سے جو واقعات کی کڑیاں تیار ہوں گی
اسے ہم داستان کہہ سکتے ہیں اور افسانے میں بھی داستان
ہوتی ہے۔ دونوں زندگی کے صرف ایک پہلو کو پیش کرتے
ہیں۔ افسانہ نگار اور ڈراما نویس دونوں کا عمل
محدود ہے دونوں غیر ضروری تفصیل کو نظر انداز کر کے صرف
اہم واقعات پر نگاہ ڈالتے ہیں البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ
ناول کی ہیئت ترکیبی ڈرامے کے مقابل میں ایک وسیع تر
کینوس پیش کرتی ہے۔ ناول نگار کے لیے گنجایش زیادہ
ہے اور ڈراما نویس کے لیے کم۔ افسانہ نگار غیب کی بات
کرے گا اور ڈراما نست شہود کی۔ یہ فرق اس کے کرداروں
میں ہوگا۔ افسانے کے کردار ایک طرح سے افسانہ نویس
خود بیان کرتا ہے۔ ڈرامے کے کردار اپنے آپ کو خود اپنے
کہے ہوئے الفاظ سے بیان کریں گے نیز یہ کہا جا سکتا ہے کہ
ڈرامے کا انداز زبانی ہے اور ناول افسانے کا بیانی۔
افسانے کی عام مقبولیت کے متعلق میں یہ کہوں گا کہ
[illegible] افسانوں [illegible] کرتا ہے۔ ریل، موٹر بس، دفتر
گھر، ہر جگہ جہاں تھوڑی دیر کو فرصت ملتی ہے اور اپنا وقت
اس فضا میں گزارنا چاہتا ہے جو محبت، سچائی، نیکی اور ہمدردی
کی نکہتوں سے بسی ہو غرض عوام اور خواص کا ایک وسیع
طبقہ مختصر افسانے پڑھنا اور لکھنا چاہتا ہے۔ متمدن ممالک میں
افسانہ نویسی روزی کمانے کا ایک مستقل اور معقول ذریعہ
بن گیا ہے۔ [illegible] کے بارے میں کہ یہ کتنے طویل ہوں
مختلف آرا ہیں اغلباً [illegible] لفظوں سے لے کر ۶۰۰۰
الفاظ تک بھی استعمال کیے جاتے ہیں جو عام طور پر ایک
نشست میں پڑھے جا سکتے ہیں۔ ان سے مختصر وہ افسانے ہیں

جن میں صرف ۵۰۰ الفاظ ہی پر اکتفا کیا گیا ہے۔ بعض خاص صورتوں میں ان کی طوالت دس ہزار الفاظ تک بھی پہونچ جاتی ہے۔ لیکن بالعموم ایسے مختصر افسانوں کی زیادہ مانگ ہے جو ان دونوں انتہاؤں کے بین بین ہوں۔

تاریخ زبان و ادب سے ہمیں اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ افسانے کے عناصر ڈراما، ناول سے پہلے بھی موجود تھے۔ بلکہ بعض کا خیال تو یہ ہے کہ کہانی کا وجود شاعری سے پہلے ہی دنیا میں موجود تھا۔ روم، یونان، ایران، عرب اور قدیم ہندستان کے ادبیات میں ان کا کافی مواد موجود ہے اس کا آغاز پریوں اور دیوؤں کی کہانیوں اور مافوق الفطرت واقعات کے کارناموں سے ہوا۔ یہ وقت کے انقلابات سے متاثر ہوتے گئے رفتہ رفتہ انھیں حقیقت آتی گئی اور یہ چیز پرانے زمانے سے آج تک بدستور قائم ہے۔ صرف فرق اتنا ہے کہ موجودہ نقطۂ خیال سے یہ افسانے محض پرانے نام ہیں اور یہ ان فنی خوبیوں سے بکلی معرا ہیں جو ان میں ہونی چاہیے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹ ویں صدی کے آخر آخر تک یہ اپنی اصلی حالت میں دنیا کے سامنے پیش ہوگیا۔ اس کا روپ اور رنگ بلکل ہی بدلا ہوا تھا۔ اور جو شکل مختصر افسانے نے عصر حاضر میں اختیار کی ہے وہ بلکل ہی حال ہی کی چیز ہے۔

مواد کی فراہمی —— افسانے کی بنیاد وہ موضوع یا وہ مسئلہ ہے جو نوجوان مصنف پیش کرنا چاہتا ہے۔ اس کا انتخاب روزمرہ کی زندگی کے واقعات اور اشیا سے ہوگا۔ ایسے واقعات جن میں غیر معمولی دلچسپی تعجب یا جدت کا عنصر موجود ہو۔ کائنات کی ہر شے ایک افسانہ ہے ہر ایک انسانی زندگی کئی کئی چھوٹی دلچسپ کہانیوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ قدم قدم پر رومانی فضا موجود ہے۔ ان واقعات، تجربات اور احساسات کو افسانے کا لباس پہنایا جا سکتا ہے ہر گاؤں ہر قصبہ اور ہر گھر ایسے ہزاروں واقعات سے معمور ہیں جنھیں افسانہ نگار کا قلم دنیا کے سامنے عریاں کر سکتا ہے۔ ایسے مادہ موضوع کی تلاش گرد و پیش کے افراد، اشیا سے کی جانی چاہیے۔ آپ کے دفتر میں ایک ایسا کریکٹر موجود ہو سکتا ہے جو اپنے مستقبل کے متعلق نہ جانے کیسے کیسے زرین خیالات رکھتا تھا لیکن اس وقت ایک حقیر ملازمت کرنے پر مجبور ہے ایسے موقع پر صرف ایک ذہنی زلزلہ کی ضرورت ہے جو اس حقیقت کو افسانوی انداز خیال میں ڈھال سکے۔ غرض ایسا تصور ہر جگہ پیدا ہو سکتا ہے جس پر افسانے کی عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے۔ کسی شخص نے کوئی خاص واقعہ بیان کیا۔ اخبار میں کوئی خبر پڑھی اور افسانہ نگار کا تخیل بیدار ہوگیا۔

دوسری چیز افسانے کا مقصد یا مطمح نظر ہے۔ افسانہ نگار کے لیے یہ بہت ہی اہم امر ہے کیونکہ افسانے میں واقعات اور باتوں سے زیادہ بحث کی جائے گی جن کا تعلق مطمح نظر سے ہے۔ صرف اسی پہلو کو اجاگر کیا جائے گا جس کا تعلق بالراست افسانے کے بنیادی تصور سے ہے کم سے کم کردار ہوں گے اور ان کے مخصوص افعال و حرکات ہی پر روشنی ڈالی جائے گی۔ پلاٹ کی تعمیر میں کوئی ایسا کیریکٹر حصہ نہ لیگا جس کے بغیر بھی پلاٹ مکمل ہو سکتا ہو۔ واقعات۔ مکالمے اور کردار سب کے سب مقصد افسانہ کے مرکز کے گرد چکر لگائیں گے۔ اور ان کا کام یہ ہوگا کہ زیر بحث تصور اور نقطۂ نگاہ کو وسعت دیں۔

ہر افسانہ کے لیے جسے معیار کی کسوٹی پر پورا اترنا ہے یہ ضروری ہے کہ وہ عام پسند اور مذاق کے مطابق اور وسیع مقبولیت عناصر رکھتا ہو۔ دوسرے لفظوں میں افسانوں کا مقصد پند و نصیحت یا وعظ نہ ہونا چاہیے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ افسانہ نگاری کو اخلاقیات سے تجاوز نہ کرنا چاہیے لیکن حقیقت یہ ہے کہ افسانوی ادب پہلے ادب ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے اندر کوئی خاص

مقصد بھی رکھتا ہے۔ بعضوں نے اپنے افسانوں کا ایک خاص مقصد ہی قرار دے لیا ہے۔ ہم اپنے بیان کی وضاحت کے لیے روس سے چخوف اور ہندستان سے پریم چند کا نام پیش کرتے ہیں۔ پریم چند کے پیش نظر ہمیشہ سماج اور معاشرت کی اصلاح رہی ہے اور یہی مقصد ان کے تمام افسانوں کی روح رواں ہے یعنی جوشش اصلاح جس میں دیہات سدھار کو کافی دخل تھا نیز مذہبی، دقیانوسی توہم پرستی کے خلاف جہاد لیکن جدید رجحانات اس بات کے مقتضی ہیں کہ اخلاقی اصلاحی خیال صرف پس منظر میں رکھا جائے مثلاً ادہنری کے افسانوں کے نتائج گو ہمیں بالراست کوئی سبق نہیں دیتے لیکن قاری پر جو اصلاحی، مذہبی اور اخلاقی اثرات غیر شعوری طور پر خود بخود مرتب ہوتے جاتے ہیں یہی افسانہ نویس کا کمال ہے۔ وہ افراد افسانہ کے کردار سے اپنا مقصد حاصل کرتا ہے۔

مختصر افسانہ نگاری کی تکنیک کا پہلا اصول افسانے کا بہترین آغاز ہے۔ بے لطف اور اداس ابتدا ایک اچھے افسانے کو بڑی آسانی سے ناکامیاب بنا دیتی ہے۔ ان میں سب سے بڑی غلطی مبہم بے جوڑ، غیر ضروری اور ادق تمہید ہے۔ پہلا جملہ ہی ایسا ہو کہ قاری توجہ کو بے ساختہ طور پر اپنی طرف متوجہ کرلے۔ چونکہ ناول کی بہ نسبت افسانہ کی جگہ محدود ہوتی ہے اس لیے افسانے کے آغاز میں غیر ضروری تفصیلات سے بچنا چاہیے مثلاً ایک مغربی افسانے کی تمہید دیکھیے۔

"جون کے مہینے کا آغاز تھا۔ گلاب کے پھول ہر طرف کھلے ہوئے تھے۔ ہوا ایسی ساکت تھی کہ درخت کا کوئی پتا ہلتا نہ تھا۔ سڑکیں ویران تھیں۔ کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی بجز اس کے کہ ...." اور اسی طرح بہت سے جملے۔ اس قسم کی ابتدا افسانہ شروع کرتے ہی ایک طرح کی بیزاری پیدا کرے گی کیونکہ قاری اس تمہید سے آنے والے واقعات نیز ہیرو اور ہیروئن کے متعلق کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا جیسے مثلاً کا یہ آغاز۔

"بھوری بھوری اداس پہاڑیاں، خاردار جھاڑیاں اور کوہستانی درختوں کے جھنڈ۔ کہنہ و شکستہ غیر پختہ بے ترتیب مٹے ہوئے کتبے۔ جھڑے ہوئے کنارے۔ کچھ ننھے ننھے ہوئے مزار پھولوں سے لدے ہوئے عود و عنبر کے زردی مائل دھوئیں کے حلقوں میں محیط۔ مردہ زمین، مردہ آسمان ہوا کی سسکتی ہوئی لہریں کبھی آہ بھرتی کبھی خاموش یہاں زندگی کی تمام قوتیں سرنگوں ہیں۔ مرتفع ٹیلوں اور ناگ پھنی کی وادی کی بائیں جانب کوہستانی جادہ شکستہ پر جھکے ہوئے بھاری بھاری قدموں کے غیر مربوط نقوش گزرنے والوں کے ذہنی انتشار کی عکاسی کتنی خوبی سے کر رہے ہیں۔ پیروں کے یہ نشان اس اندوہگین نوجوان کے ہیں ......" بعض افسانہ نویس بنیاد کے طور پر پہلے ایک امر مسلمہ پیش کرتے ہیں اور پھر اصل قصہ کا آغاز ہوتا ہے۔ ذیل کی تمہید پڑھیے:-

"مشیت نے مرد کی فطرت میں ایسے عناصر پنہاں رکھے ہیں کہ جب وہ بروئے کار آتے ہیں تو اس کی ہستی مرجع خلائق بن جاتی ہے۔ علیل و مریض قومیں اس کے نفس مسیحائی سے اوج ترقی پر گامزن ہو جاتی ہیں۔ ملکوں کے نقشے بدل جاتے ہیں۔ ملتوں کی قسمتیں پلٹ جاتی ہیں اور تاریخ میں ایک ایسے باب کا اضافہ ہوتا ہے جسے آنے والی نسلیں ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ مطالعہ کرتی ہیں۔ مگر عورت کی ذات میں کردگار حقیقی نے وہ جوہر چھپا رکھا ہے کہ مرد باوجود سطوت و جبروت کے اس کے سامنے اپنے تمام ہتھیار ڈال دیتا ہے مغرور سرکش انسانوں کے سر اپنی دہلیز پر جھکانے والا عورت کے آستانہ حسن پر سر بسجود ہو جاتا ہے ...."

اس طرح کے غیر ضروری طویل اور غیر دلچسپ تمہید قاری کی توجہ کو منتشر کر دینے کے لیے بہت کافی ہے۔ اب اس کا مقابلہ اس آغاز سے کیجیے۔ امین قمر قیصوری کی تادھوری کہانی کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

"کنہیا کے دل میں محبت کا دیا اجھلملایا۔ اس نے

بینا بانہ چمپی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے چہرے کے آثار چڑھاؤ نیتی ہوئی بھوؤں، ابھری ہوئی آنکھوں اور تمتماتے ہوئے رخساروں کو دیکھنے لگا۔

" تم کون ہو مجھے روکنے والے " چمپی مسکرا کر بولی
کنہیا کی دنیا میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

میں کون ہوں تمھیں بتاؤں
وہ کسر کو بل دیتی اچھلتی کودتی ہوئی دوڑ گئی اور پھر کواڑ کی اوٹ سے اس کو جھانکنے لگی۔

اس تمہید میں ہم دیکھتے ہیں کہ افسانہ اسی مقام سے آغاز ہوتا ہے جہاں سے اس کا تصور شروع ہوتا ہے۔ یا اختر اورینوی کے " کلیاں اور کانٹے " کی ابتدا :-

" وہ تعداد میں نو تھیں۔ گوری۔ سانولی، کالی۔ گوارا اور ناگوار۔ بعض ان میں دلکش کہی جا سکتی تھیں مگر خوبصورت کوئی نہیں سورج اسی طرف سے طلوع ہوتا تھا جس طرف سے وہ اپنی سفید ساڑیوں میں ملبوس ملبوس صبح کے پیچھوں کے ساتھ جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلتی دکھائی دیتی تھیں۔ ہر صبح اٹھ ادہر آتی تھیں اور ایک ٹوٹے ہوے تارے کی طرح مشرقی افق کی طرف سفر کر جاتی تھیں "

ایسی تمہیدیں اچانک ہمیں افسانے کے اندر پہونچا دیتی ہیں اور افسانے کے کردار ہمارے سامنے اپنی تمام انفرادی خصوصیتوں کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ افسانہ لکھنا شروع کرنے کا ایک موثر طریقہ یہ بھی ہے کہ ابتدائی جملوں ہی میں افسانے کی حقیقی فضا پیدا کر دی جائے تاکہ قاری افسانے کے " موڈ " کے متعلق فیصلہ کر سکے۔ ایک مغربی شاہکار کی تمہید ملاحظہ ہو۔

" جب انسان کا ایک حس بیکار کر دیا جاتا ہے تو دوسرے حس زیادہ تیز ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جب ڈگمور کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تو اس کے کان پہلے سے زیادہ حساس ہو گئے۔ باوجود اس کے اس نے نہ تو سامنے کے دروازے سے نہ ہی اپنے کمرے کے دروازے کے کھلنے کی آواز سنی۔ اور وہ پہلی آواز جو اس نے سنی ایک ایسے شخص کی تھی جو اس کے کمرے میں داخل ہو چکا تھا اور اس کے سامنے کھڑا بول رہا تھا۔

کیا تم دیکھ سکتے ہو ؟
ڈگمور تیزی سے آواز کی طرف پلٹا اور اس نے محسوس کیا کہ سامنے کا دروازہ کھل گیا ہے کیونکہ باہر کی سرد ہوا کے جھونکے اس کے گالوں کو نم کر رہے تھے۔

' تم کون ؟ ' اس نے چونک کر جواب دیا
' میں کیا کہہ رہا ہوں ؟ '
کچھ دیر خاموشی ــــ پھر ڈگمور بولا
' میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ تم کیا کر رہے ہو '
' بیشک ! کیا تم نہیں دیکھتے کہ میرے ہاتھ میں ایک پستول ہے اور اس کی نالی کا رخ ٹھیک تمھاری پیشانی کی طرف ہے '
ڈگمور نے اپنے سر کو خفیف جنبش دی
' میں سچ کہتا ہوں یہ پہلا وقت ہے کہ میں اس لیے خوش ہوں کہ میں دیکھ نہیں سکتا '

اس مثال سے ظاہر ہے کہ مکالمے سے آغاز نہ کرنے کے باوجود ایک اچھا افسانہ نگار حالات و واقعات کے ماہرانہ تجزیے سے قاری کی توجہ حاصل کر لیتا ہے۔

ایک اچھی تمہید کے بعد سب سے اہم چیز وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا تسلسل ہے۔ ایسا تسلسل جو افسانے میں بتدریج ترقی پیدا کرتا جائے اور اسے اپنی بلندی سے نہ گرنے دے۔ یہاں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ افسانہ نگار کو اس مناظر ماحول سے کامل واقفیت ہو جس میں اس کے کیرکٹر اپنی زندگی کا ڈرامہ پیش کریں گے۔

ایسے مقامات کے نام کو پلاٹ میں شامل کرنا جو افسانہ نگار کے لیے اجنبی ہوں نا تجربہ کاری [illegible]

کا موجب ہوگا۔ مثلاً جنوبی ہند کا رہنے والا افسانہ نویس جب شملہ کے کوہستانی علاقوں یا کشمیر کی بہاروں کا ذکر کریگا تو وہ بڑی حد تک حقیقت سے دور ہوں گے کیونکہ ایسی صورت میں افسانہ نگار محض تخیل سے کام لے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ افسانے میں واقعیت سب سے بڑی کسوٹی ہے۔ آرٹ اور واقعیت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ آرٹ وہی مفید اور کارآمد ہے جس کا تعلق زندگی کے کسی پہلو سے ہو دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ آرٹ کا کام فطرت اور انسانی جدوجہد میں ربط پیدا کرنا ہے۔ پس افسانہ نگاری کا بنیادی جز حقیقت نگاری ہے۔ تصنع اور محیر العقول واقعات افسانہ کی فنی خوبیوں کو زائل کر دیتے ہیں۔ افسانہ نویس کی فطرت انسانی سے واقفیت ہی افسانے میں حقیقت اور واقعیت پیدا کر سکتی ہے۔ گویا یوں کہا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگار کے لیے صداقت جذبات اور پر جوش اظہار کی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے۔ افسانہ نویس ایک دو واقعات سے پلاٹ تعمیر کرتا ہے اور انہیں واقعات سے رنگ بھر کر اسے اجاگر کرتا ہے۔ اس رنگ کی شوخی افسانہ نگار کے خلوص اور جوش پر منحصر ہے۔ صداقت احساس اور قوت اظہار دونوں مل کر جذبات و تخیل کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں۔

پلاٹ افسانے کے لیے ضروری چیز ہے یہ بتدریج آغاز ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ چوٹی پر پہونچ جاتا ہے۔ پلاٹ کے بغیر افسانے کی تشکیل نہیں ہو سکتی۔ پلاٹ ماجرا ضمنی واقعات اور حادثات کا وہ سلسلہ متواتر یا زنجیرہ ہے جو زندگی کی ایک صاف واضح اور منطقی تصویر پیش کرتا ہے۔ پلاٹ بناتے وقت انہیں افسانہ نگار اپنے ذہن میں رکھتا ہے۔ بعض افسانے ایسے بھی ملیں گے جو کوئی پلاٹ نہیں رکھتے۔ ان میں افراد افسانہ کے کردار ہی پر تفصیلی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ گویا کردار ہی پلاٹ کے قائم مقام ہوتے ہیں پلاٹ ترتیب دیتے وقت اصل مسئلہ زیر بحث کو پیش نظر رکھ کر واقعات اور حادثات کو اس طرح جوڑا جاتا ہے کہ مقصد [illegible] کو وسعت دیتے جاتے ہیں اور

اس طرح ترقی پاتے پاتے افسانہ اپنی انتہائی چوٹی پر پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ پلاٹ محض معمولی مسئلہ واقعات کا ایک تسلسل ہے روزمرہ زندگی کے طبعی واقعات کی تفصیلی روداد بیان کر دینا کوئی بات نہیں تاوقتیکہ ان میں غیر معمولی ندرت اور جاذبیت نہ ہو۔

پلاٹ کا ہر واقعہ ایک کڑی ہے جو زنجیر کو مکمل کرتی ہے

پلاٹ کو حسب ذیل اجزا میں تقسیم کیا جاتا ہے

۱۔ ابتدائی صورت حال یا عمل آغاز

۲۔ ابتدائی صورت حال کا پھیلاؤ

۳۔ تدریجی ترقی

۴۔ پلاٹ کا حل یا انجام

ان سب میں تسلسل پیدا کر کے غیر ضروری جزئیات کو نظرانداز کر دیا جائے گا کیونکہ یہ اصل پلاٹ کو پیچیدہ اور غیر دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ افسانہ پلاٹ کے سہارے ہی کامیاب ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں افسانے کے ضروری عناصر پلاٹ، مطمح نظر، آغاز اور مواد ہیں۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ اہم کردار نگاری ہے جو تمہید سے لے کر اختتام تک افسانہ کی دلچسپی کو برقرار رکھتی ہے۔ افسانہ نگار کا یہ کمال ہے کہ وہ اپنے زور قلم سے کردار کو جیتی جاگتی ہستی بنا دے۔ یہ کیرکٹر مصنف کے خیالات کا اعادہ کرنے کے علاوہ اپنی انفرادی حیثیت بھی رکھیں گے نیز افسانے کے مقصد کو بھی پورا کریں گے اس طرح کہ مقصد اور قصہ آپس میں ہم آہنگ ہو کر شیر و شکر ہو جائیں کیونکہ اگر مقصد کو زیادہ اہمیت دے دی گئی تو خوف ہے کہ افسانے نصیحت نامے اور اور کیرکٹر نصیحت و پند کا آلۂ کار بن جائیں گے۔ زبردستی کے اخلاق آموزی افسانوں کے لیے زہر ہے کیونکہ پیرایۂ بیان جہاں ناصحانہ ہوا کیرکٹر کا حقیقت سے دور ہو جاتا [illegible] ہے۔ بہرحال یہ نکتہ ہر وقت پیش نظر رہے گا کہ مطمح نظر یا مقصد کے

تک وہ کرکرداروں کا خون نہ ہو جائے۔ خوبی تو یہ ہے کہ مقصد بھی اپنی جگہ قائم رہے اور آرٹ کو بھی دھکا نہ لگے۔ افسانہ نویس کو چاہیے کہ افسانہ لکھنے سے قبل وہ اپنے کیرکٹروں سے اس قدر واقف ہو جائے کہ وہ زندہ مخلوق کی صورت میں اس کے سامنے چلنے پھرنے لگیں۔ تب ہی وہ انھیں زندہ ہستیوں کی صورت میں پیش کر سکے گا۔ افراد کے کردار کے حسن و قبح کا تصفیہ افسانہ نگار پہلے ہی کرے گا ـــ کیا کیا خصوصیات ہوں گی اور کس پہلو کو زیادہ واضح کیا جائے گا؟ نیز اس بات پر بھی نگاہ رکھنی ہوگی کہ افسانے کا نمایاں اصلی خاکہ جذباتی ہے یا واقعاتی عنصر غالب ہے تو افراد قصہ پلاٹ کے دوران میں خود اپنے افعال و حرکات سے اپنے کردار مرتب کرتے جائیں گے۔

اس طرح ہم نے دیکھا کہ کردار نگاری کی دو صورتیں ہیں پہلی یہ کہ کیرکٹروں کی خصوصیات و کیفیات خود ان کے حرکات و سکنات سے ظاہر کیے جائیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے حالات براہ راست بیان کر دیں۔ ان کے علاوہ کردار نگاری کا ایک طریقہ اور بھی ہے۔ کیرکٹروں کے مکالمے یا عمل کے ذریعہ۔ بہرحال جس طریقے سے بھی کیا جائے کردار نگاری کی اہمیت مسلم ہے اور افسانے کی مقبولیت اور کامیابی کا دارومدار اسی پر ہے کیونکہ پلاٹ کی تعمیر اور تسلسل بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر بغیر اس کے ممکن نہیں۔ برخلاف اس کے بحیثیت ایسے بلند پایہ افسانے بھی موجود ہیں جن میں کردار نگاری بہت کمزور ہے تاہم دلچسپ واقعات اور پلاٹ کا تسلسل پڑھنے والے کے اختتام تک حیرت انگیز طریقہ پر اپنی طرف متوجہ رکھتا ہے۔ گویا ایک اچھا افسانہ زوردار کردار نگاری کے فقدان کے باوجود مقبول ہو سکتا ہے لیکن ماجرا کے وجود کو کسی حال میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ماجرا کیا ہے۔ ماجرا افسانے کی ریڑھ کی ہڈی یا محور ہے۔ جس قصے کی تعمیر کردار سازی کا

ماجرا ہی کے سہارے اس طرح کی جا سکتی ہے۔ انھیں حرکت ہونی چاہیے سست حرکتیں اچھے افسانے کا خون کر دیتی ہیں۔ واقعات کا ٹھہراؤ نہایت خطرناک ہے۔ یہ ماجرا' حزنیہ' مذاحیہ یا محض عشقیہ ہو سکتا ہے اور اس کے ذریعہ حقیقی اور کم اصل دونوں قسم کے خیالات پیش کیے جا سکتے ہیں۔ یہ مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ اس کی حد بندی کرنا مشکل ہے۔

جہاں تک طرز نگارش کا تعلق ہے سادہ بے تکلف اور فطری ہونا چاہیے۔ الفاظ اظہار خیال کا ذریعہ ہیں۔ خیال جس قدر سادہ اور واضح ہوگا عبارت اسی قدر سادہ ہوگی۔ تحریر ایسی ہو گویا باتیں کر رہے ہیں۔ یہ اسلوب بیان بڑی حد تک موضوع کا بھی مانع ہوگا اور افراد افسانہ کے خیالات جذبات اور ماحول سے پوری پوری مناسبت رکھے گا۔ جہاں طرز نگارش میں تصنع پیدا کرنے کی کوشش کی گئی کہ افسانہ بے جان اور بے اثر ہوا کیونکہ ایسی زبان سے بنائے ہوئے چہرہ کے خدوخال بالکل نقلی معلوم ہوں گے۔ نیز الفاظ کے الٹ پھیر سے وضاحت میں جو ابہام واقع ہوگا وہ افسانے کے تسلسل اور روانی میں جمود پیدا کر دیگا۔

کردار نگاری پلاٹ اور طرز بیان کے علاوہ افسانے کی "سٹنگ" بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ افسانے کا اصلی جوہر نمایاں کرنے اور وہ کیفیت پیدا کرنے کے لیے اس عنصر کا وجود لازم ہے۔ واضح طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ اگر کسی افسانے کا پلاٹ ایشیا کے کسی دور پارینہ سے متعلق ہے تو کامیاب سٹنگ وہی ہوگی جو اس عہد رفتہ کے کل خصوصیات کو پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے ایک ایک کرکے بکھیر دے۔

اب میں ایک نئے موضوع کا ذکر کروں گا۔ یہ ہے افسانے کا عنوان۔ افسانے کی نصف کامیابی اس کا موزوں عنوان ہے۔ اس کی متعدد صورتیں ہیں۔ مغربی اور مشرقی افسانوں سے اس کی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ بعض میں ہیرو یا ہیروین کے نام پر سے کام لیا ہے [illegible]

اور بہترین آخر کا ہے۔ ہندستانی افسانوں میں راجندر سنگھ بیدی کا "بکی" میرزا ادیب کا "شیرو" اور ابو سعید قریشی کا "شیرگل" ہمارے بیان کی تائید میں ہیں۔ بیشک یہ ایک مؤثر طریقہ ہے لیکن اسے ایک عام اصول قرار دینا ہی بڑی غلطی ہے۔ اسے شخصی عنوان کہہ سکتے ہیں۔ یہ سب سے سادہ بے تکلف اور اس کا یاد رکھنا بھی بہت آسان ہے۔ باوجود اس کے ثانیہ عنوان کو زیادہ ترجیح ہے اور کیونکہ اس میں جدت پیدا کی جا سکتی ہے اور جاذب نظر بنایا جا سکتا ہے نیز افسانے کے تعین اور موضوع کی طرف بھی اشارہ کر سکتے ہیں۔ منٹو کا افسانہ "ڈرپوک" علی عباس حسینی کا افسانہ "بھوک اور ہم" ام۔ اسلم کا افسانہ "قاتل" — یہ عنوانات ایک ہی نظر میں افسانے کے متعلق بہت سے تصورات ہمارے دماغ میں پیدا کر دیتے ہیں۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک اچھا افسانہ برے عنوان کے باوجود مقبولیت عام حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن ایسا کیا ہی کیوں جائے۔ تھوڑی سی کوشش یقیناً کوئی جاذب نظر عنوان فراہم کر سکتی ہے مثلاً "پس منظر" "دوسرا کنارہ" "ہڈیاں اور پھول"۔ یہ نام دو طریقوں سے دیا جا سکتا ہے ایک تو یہ کہ پہلے ہی سے اس کا تعین کر کے افسانہ شروع کیا جائے دوسرے یہ کہ سرخی کے انتخاب کا فیصلہ افسانے کے ختم ہونے تک ملتوی رکھا جائے۔

آخر میں افسانے کے اختتام کے متعلق بھی کچھ کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ افسانہ نویس کے لیے یہ سب سے مشکل مقام ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ غیر فطری نہ ہو۔ فطرت کے عین مطابق ہو۔ پلاٹ میں واقعات کی رفتار اسی کشش نظر رکھی جائے گی۔ در اصل انجام افسانے کی ... جو پڑھنے والے کے دماغ پر دیر پا اور مستقل اثرات ترک کرتا ہے۔ افسانہ اسی وقت ختم کیا جائے جب کہ زیر بحث موضوع پر واضح اور منطقی طور پر کافی روشنی ڈالی جا چکی ہو کیونکہ قاری اس مقام پر پہنچ کر اپنی تمام توجہ قصہ کے آخری لمحات پر مرکوز کر دیتا ہے اس لیے خاتمہ وہی کامیاب ہوگا جو غیر معمولی طور پر انوکھا اور عجیب ہو۔ بعض صورتوں میں نتیجہ کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ کر دینا کافی ہوتا ہے اور قاری کچھ دیر کے لیے سوچنے لگتا ہے کسی حقیقت پر ختم کرنا کوئی پسندیدہ طریقہ نہیں مثلاً "گناہ کا بدلہ موت" اگر افسانے کا مقصد یہی ظاہر کرنا ہے تو شروع ہی سے اس موضوع کو اس پیرایہ میں پیش کیا جائے کہ قاری افسانہ ختم کرنے تک خود نتیجہ پر پہنچ سکے۔ خاتمہ صرف عنوان افسانہ کے تجربہ پر حرف آخر ہے۔

علی احمد بی۔ اے (عثمانیہ)

ہمارے افسانے

قصے کہانیوں کی پرانی کتابیں بادشاہوں شاہزادوں
شاہزادیوں اور بھوت پریت کے واقعات سے بھری پڑی ہیں
ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے کہانی لکھنے والوں کا تخیل
شاہی محلوں کے ارد گرد گھومتا رہتا تھا اور ان کو اس بات کا شاید
احساس تک نہ تھا کہ بادشاہوں اور امیروں کے علاوہ دنیا میں
اور لوگ بھی بستے ہیں اور ان کی زندگیاں بھی افسانوں کے
سانچے میں ڈھالی جا سکتی ہیں۔ قصر و ایوان سے خیال ہٹا
تو پھر جادو کی باتیں بیان ہونے لگیں بھوتوں، چھلاووں، دیوؤں
اور پریوں کے قصے کہ ایک دیو نے سیستان کا پہاڑ ایک انگلی
پر اٹھا کر رکھ لیا ایک چھلاوے نے اپنے جسم کو جو پھیلانا شروع
کیا تو اس کا ایک پیر چین کی دیوار پر تھا اور دوسرا اودیا
محل کے دہانے پر ایک پری کسی خوبصورت شاہزادے پر
عاشق ہو گئی اور اس نے جنوں کو حکم دیا کہ شاہزادے کو جیسے
بنے یہاں لے آؤ پری کا اشارہ پاتے ہی جو یہ جن اڑے ہیں تو
شاہزادے کو پورے محل سمیت آن کی آن میں اٹھا لائے۔
آرائش محفل ہو یا فسانۂ عجائب، قصہ گل بکاولی یا سحر البیان
غرض ہر جگہ یہی ٹھاٹ نظر آئے گا۔ اور قیامت تو یہ ہے کہ عوام
میں یہ کتابیں مقبول تھیں، عوام اپنی خودی کو کچھ ایسا بھول گئے تھے
ان میں کمتری کا احساس پیدا ہو گیا تھا انھوں نے ادیبوں سے
اس بات کا مطالبہ تک نہیں کیا کہ ہم غریبوں کی زندگیوں
میں بھی افسانویت موجود ہے اور ہمارے واقعات بھی دوسروں
کے لیے دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں، قصہ لکھنے والے بہت
دنوں تک عوام کو اسی قسم کی افیون کھلاتے رہے۔

جہاں تک میرا محدود مطالعہ میری رہبری کرتا ہے میں
عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ ڈپٹی نذیر احمد پہلے قصہ نویس ہیں
جنھوں نے ہندستانی زبان میں قصوں اور کہانیوں کے ذریعہ عوام سے
ربط پیدا کرنے کی کوشش کی۔ نذیر احمد نے اپنے قصوں میں عوام
کے کردار کو منظر عام پر پیش کر کے یہ بتایا کہ اصل زندگی قصر و ایوان
میں نہیں قصر و ایوان سے باہر ہے۔ نذیر احمد کردار نگاری کے
امام تھے مراۃ العروس میں ماما کا کیرکٹر جس انداز میں پیش
کیا ہے اس کی نظیر ہندستانی ادب میں مشکل ہی سے مل سکے گی پھر
زبان اتنی سہل آسان اور ٹکسالی ہے کہ بڑے اور چھوٹے سبھی
نذیر احمد فارسی اور عربی کے بہت بڑے عالم تھے وہ اگر چاہتے
تو ہندستانی ادب کو قاموس اور مقامات حریری بنا دیتے مگر انھوں
نے ایسا نہیں کیا اب سے نصف صدی قبل ان کے دماغ
پر یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ ہندستانی کو ہندستان گیر نہیں
عالمگیر زبان بننا ہے اس لیے اس کو انتہائی سہل عام فہم
اور آسان ہونا چاہیے۔

نذیر احمد کے بعد پنڈت رتن ناتھ سرشار کا درجہ ہے
جو کردار نگاری میں ید طولیٰ رکھتے تھے، سرشار کے یہاں کہیں کہیں
تکلف تو ضرور آ جاتا ہے لیکن ان کے کمال کا انکار نہیں ہو سکتا
سرشار کے یہاں کردار کی جزئیات تک پائی جاتی ہیں وہ جب
کسی کی زندگی بیان کرنے پر آتے ہیں تو ایک ایک بات کھول کر
رکھ دیتے ہیں۔ ان کی تحریر میں روانی اور سلاست ہی نہیں
دلچسپی بھی ہے۔ منشی پریم چند تک یہ جام آتے آتے اور
زیادہ شیریں اور صاف ہو جاتا ہے۔ پریم چند کی کتابیں
ہندستانی ادب کا گرانقدر سرمایہ ہیں یقین ہے کہ اس سرمایہ کی
ہر زمانہ میں قدر کی جائے گی۔

ہماری موجودہ افسانہ نگاری یقیناً حوصلہ افزا اور بہت
ستائش ہے۔ آج کا افسانہ نویس شاہی محلوں میں نہیں جھونپڑوں
اور بازاروں میں افسانے کی تلاش کرتا ہے اس کے بیت
قہقہے اور مسکراہٹیں نہیں وہی ہوتی جس اسکرین پر
جاتی ہیں۔ وہ زندگی کو اصلی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش
کرتا ہے تکلف بناوٹ اور [illegible]
افسانوں میں اب [illegible]

نہیں اصلاح ہوتا ہے تم ہندستانی افسانوں کی کتابوں میں قلم اور زور کو چلتا پھرتا دیکھ سکتے ہو تمھیں آسانی سے نظر آجائے گا کہ سرمایہ دار کا پنجہ کس بے دردی کے ساتھ غریب کا گلا گھونٹ رہا ہے فلک بوس ایوانوں کو اس لیے پیش کیا جاتا ہے کہ لوگ واقف اور آگاہ ہو جائیں کہ ان کی اینٹوں اور گارے میں غریبوں کی ہڈیوں اور لہو سے کام لیا گیا ہے۔

ہمارے افسانوں کا دوسرا رخ رومانی ہے اور مجھے تصویر کا یہی رخ آپ کے سامنے پیش کرنا ہے۔ کوئی شک نہیں جذبات اور رومان کا زندگی میں ایک مقام ہے مگر یہ مقام زندگی کی بنیاد اور حیات کا مقصد نہیں بن سکتا، وہ جو اقبال نے کہا:—

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

تو آج کل کی افسانہ نگاری عورت کے ارد گرد گھوم رہی ہے افسانوں میں کسی نہ کسی طرح غریب عورت کو کھینچ کر لایا جاتا ہے اور ذہنیتیں ان چٹخاروں کی خوگر ہوتی جا رہی ہیں۔ میں نے بہت سے اس قسم کے افسانوں کو پڑھا ہے جو چوڑیوں کی آواز سے شروع ہو کر مسہری کی چادر کی شکنوں پر ختم ہو جاتے ہیں ان میں شروع سے لے کر آخر تک ہوس ہی ہوس نظر آتی ہے۔

ہمارے افسانوں کے جب آیندہ نسلیں پڑھیں گی تو ان کو احساس ہوگا کہ ان کے آبا و اجداد کو عاشق ہونے کے سوا اور کوئی کام ہی نہ تھا اور ان سے پہلے زمانہ کے لوگ اپنی مٹھیوں میں دلوں کو دبائے ہوئے پھرتے تھے کہ جہاں کسی عورت نے دیکھا اور انھوں نے چپکے سے منھ کھول کر کہا کہ لیجیے یہ حقیر و شکستہ دل حاضر ہے پھر لطف یہ کہ ہمارے [illegible] نوجوان وقت واحد میں بیسیوں عورتوں پر عاشق ہو [illegible] تو ہونا تھا سے
[illegible] کے معدل نہیں ہوتے

مگر بیسویں صدی عیسوی کے نوجوانوں کو قدرت شاید دو دو درجن دل دے کر بھیجتی ہے وہ دل پہ دل نذر کیے جاتے ہیں۔!

غالباً ہمارے افسانہ نگار اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ عام زندگیوں کے بہت سے واقعات رومان سے خالی ہوتے ہیں، ہر حادثہ رومانی اور ہر واقعہ عشقیہ نہیں ہوتا زندگیوں کو صحیح طور پر پیش کیجیے کردار کی تحلیل اور اس کی حقیقی ترجمانی آپ کا فرض ہے صرف مخمور اور شعلہ بار نگاہوں کے پیچھے نہ دوڑیے دنیا میں بہت سی آنکھیں ایسی بھی ہیں جو بے کسی کے آنسو بہاتی ہیں اس بزم رنگ و بو میں بہت سی چہروں پر غم کی خراشیں اور بہت سے ہونٹوں پر تشنگی کے زخم بھی موجود ہیں افسانہ نگار کا فرض مسکراہٹوں ہی کی نہیں آنسوؤں کی ترجمانی بھی ہے۔!

مشرق کو غیرت، روحانیت اور تقدیس کردار پر ہمیشہ ناز رہا ہے ضرورت ہے کہ اس کے اس فخر و ناز کو باقی رکھا جائے ہر بات میں دوسروں کی تقلید اچھی نہیں یورپ سے صرف اچھی باتیں سیکھیے بری باتوں کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھیے ایسے افسانے لکھیے جو خیالات میں زیادہ سے زیادہ پاکیزگی پیدا کر سکیں۔ یورپ اپنی راحت پسندی اور ذوق تعیش کی سزا بھگت رہا ہے آپ کو اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے ——!
میں خود اسی قسم کی ادبی آسودگیوں میں مبتلا تھا اور اب ان کو چھوڑ رہا ہوں ——!

ماہر القادری

ہندستانی زبان
سیکھنا اور سکھانا ہر ہندستانی کا
وطنی فرض ہے

جدید افسانے اور عریانیت

ادا صاحبہ نے لکھا ہے کہ "...... لیکن قبل اس کے کہ میں ان فواحش پسندوں میں سے بعض سے مثال کے طور پر آپ کے سامنے پیش کروں۔ یہ بات صاف طور پر واضح کیے دیتی ہوں کہ اس فرض کو میں بہت تکلیف کے ساتھ انجام دے رہی ہوں۔ ہر چند یہ چیز اچھی نہیں۔ پر ناگزیر طور پر ان کو درج کرنا پڑ رہا ہے۔"

جب مضمون لکھنے والے کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ نمونے "فواحش کے پلندے" ہیں اور "ہر چند یہ چیز اچھی نہیں" نیز یہ کہ اس فرض کو وہ بہت تکلیف کے ساتھ انجام دے رہی ہیں تو ہم اپنے کسی ہمدرد کو تکلیف میں مبتلا ہوتے دیکھنا نہیں چاہتے اس لیے ہم بھی ناگزیر طور پر فواحش کے ان پلندوں کا منہ کالا کیے دیتے ہیں تاکہ ادا صاحبہ ایک برا کام انجام دینے سے بچ رہیں۔ اس لیے کہ بری چیز ہر حالت میں بری ہی ہوتی ہے چاہے وہ مضمون کو تقویت دینے کے لیے ثبوت اور نمونے کے طور پر ہی کیوں نہ پیش کی جائے۔

"فواحش کے پلندوں" کا بطور نمونہ درج کرنا اس لیے بھی ضروری نہیں کہ ان عریاں افسانوں سے ہر شخص واقف ہے۔ کسی عریاں افسانے کا نام لینا یا اس کی طرف ہلکا سا اشارہ کرنا یا اس کا کوئی حصہ نمونے کے طور پر پیش کر دینا کافی ہے ہر پڑھنے والا اُکتائے ہوئے لفظوں یا جملوں کو آسانی سے معلوم کر سکتا ہے۔ اس طرح لکھنے والے کا مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے۔

ہندستانی ادب ایک خالص علمی ادبی رسالہ ہے جس کو لاکھوں ہی عورت مرد پڑھا کرتے ہیں اس لیے تہذیب سے گرے ہوئے مضامین یا ان کے بعض حصوں کے پیش کرنے میں سخت مجبوری ہے۔ امید کہ ہندستانی ادب میں لکھنے والے اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھیں گے۔

ہندستانی ادب میں ترقی پسندی کی تحریک کوئی نئی چیز نہیں ہے اس کے دو اہم پہلو ہیں ایک رومانوی تحریک دوسری حقیقت یا واقعیت پسندی اس تحریک سے ادب کو فائدہ پہنچ رہا ہے یا نقصان اس کے متعلق مختلف خیالات کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ مشرق و مغرب کے اس امتزاج کی افادیت کے بارے میں جو شبہات پیدا ہو رہے ہیں وہ میرے خیال میں ایک حد تک بلکہ بڑی حد تک درست ہیں کیونکہ ان بے شمار پھولوں کے ساتھ ساتھ چند کانٹے بھی پیوستہ نظر آ رہے ہیں۔

گذشتہ دو ایک سال میں جس تحریک نے زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے وہ "عریانیت" ہے۔ یہی ترقی پسند ادب کا ایک نامناسب [illegible] کیونکہ ہر [illegible] ادبی تخلیق کو ترقی پسند سمجھا جاتا ہے

جو خیال اور مواد ذہنی اور جسمانی زندگی کے کسی شعبہ میں چند قدم آگے بڑھنے پر مجبور کرے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مغربی تہذیب و تمدن کی آندھی نے جب چہروں پر سے نقاب الٹ دی تو افسانہ نگاروں کے ایک طبقہ نے یہ محسوس کیا کہ ادب زندگی سے قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دور ہے۔ ادب کو زندگی کے قریب لانا چاہیے اور اتنا قریب کہ دونوں آپس میں مدغم ہو جائیں۔ ادب اور زندگی میں تمیز دشوار ہو جائے۔ چنانچہ رومانیت کو بھی واقعیت میں تبدیل کیا جانے لگا۔ لیکن میں دیکھتی ہوں کہ [illegible] صورت اختیار کر [illegible]
ادب [illegible]

نصوص افسانوی ادب میں مصور رہے ہیں۔ ان کا مقصد زندگی
کے داخلی و خارجی پہلو کے ساتھ وہ تاریک، پوشیدہ اور گھناؤنے
مناظر بھی پیش کرنا ہے جنہیں سماج کے لوگ سطح کی نظروں سے ہمیشہ
پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں یا پوشیدہ رکھنے کا رجحان رکھتے ہیں
ان میں احمد علی، سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے نام
سب سے زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔

آیئے ذرا ہم ایک قدم ماضی کی طرف چلیں جس زمانے
میں پریم چند ہندوستانی ادب میں مختصر افسانوں کی داغ بیل ڈال رہے
تھے ہندوستانی میں اخذ و ترجمہ کا دور شروع ہوا۔ مغربی زبانوں کے
بہترین شاہکار ہندوستانی میں منتقل کیے گئے اس طرح افسانہ نگاری کے
مذاق میں تنوع پیدا ہوتا گیا۔ غیر زبانوں کے یہ تراجم جن مصنفین
کی نمائندگی کرتے ہیں وہ موپاساں، چیخوف، گورکی، ٹالسٹائی
گالزوردی اور واشنگٹن ارونگ وغیرہ ہیں۔ اس میں شک
نہیں ان بلند پایہ افسانوں کے تراجم سے ہندوستانی افسانہ نگاری
کو فائدہ پہنچا لیکن بعض و شکن نقایص بھی پیدا ہوئے۔ مذکورہ
بالا تراجم میں سب سے زیادہ اور وسیع اثر جس مغربی مصنف
کا ہوا وہ فرانسیسی افسانہ نویس موپاساں کا تھا۔ اس کے
افسانوں کی عریانیت نے دھیرے دھیرے فروغ پانا
شروع کیا اور پھر تو نوجوانوں کے ایک طبقہ نے جو افسانوں
کے پارینہ مواد و ماحول سے بیزار آ چکا تھا اس تحریک کا سہارا
لیا اور بغیر یہ سوچے سمجھے کہ مشرقی معاشرت کی ایسی فضا
میں جہاں عورت نے اپنے مقدس رخ سے پورا نقاب بھی
نہیں الٹا۔ عریانیت سے کھلم کھلا کھیلنے لگے۔ مغربی
افسانوں کے اس جنسی پہلو کا بیان مشرقی اصول کی روشنی
میں ناقابل برداشت نظر آتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ
میں ان نوآموزوں کے پلندوں میں سے بعض حصے مثال کے
طور پر آپ کے سامنے پیش کروں یہ بات صاف طور پر
واضح کیے دیتی ہوں کہ اس غرض کو میں بہت تکلیف
کے ساتھ [illegible] ہوں۔ ہر چند یہ چیز [illegible] نہیں
ناگزیر طور پر ان کو درج کرنا پڑ رہا ہے موپاساں کے "پلنگ"
کا کچھ حصہ نقل کرتی ہوں۔

"ہم اسی پر پیدا ہوتے ہیں پھر زندگی کی بہار کو اسی پر
محسوس کرتے ہیں ۔ ان دو محب اور محبوب کا تصور
کرو جو زندگی کے اس معبد میں ۔ مسرت سے بیخود
ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
زندگی اور مسرت کی بے پناہ لہروں میں رہ رہ
کر اٹھ رہی ہیں کیوں کہ اس پر محبت کا جنون انگیز راز
شرمندہ تکمیل ہو رہا ہے آخر دنیا میں اس سے زیادہ
کونسی شے مکمل اور قابل ترجیح ہو سکتی ہے۔"

ایک دوسرے افسانے "بوڑھا" کا ایک منظر دیکھیے۔

"لڑکی نے کندھے اچکا کر کہا اے خدا کیا سب لوگ نہیں
جانتے کہ یہ بچہ وکٹر سے ہے یہ کونسی بری بات ہے
نے بداخلاقی کا کام
میں اس سے شادی کر لیتی اگر وہ موا ہمارا خادم نہ ہوتا۔"

ایک دوسرے مغربی افسانہ نگار سامرسٹ ماہم کے شاہکار "عزلہ" پر
نگاہ ڈالیے۔ رچرڈ ایک خوش باش انسان ہے۔ تنہا اکیلا انسان
بہت تلاش کے بعد اسے ایک ایسی خادمہ ملتی ہے جو گھر کا کام
چلا سکے۔ اس کا نام بیکرو ہے یہ حسین ہے، جوان ہے اور
خوش گفتار ہے اور ایک ذہن ــــ

"سیر و تفریح کے خیال سے وہ اسے سینما لے جانے کو تیار ہو گیا
وہ ہیٹ لینے کے بہانے سے اندر گئی اور پانچ ہی منٹ
میں اپنے کپڑے تبدیل کیے۔ نیلا فراک سیاہ قمیص اور
گردن پر اس نے لومڑی کی کھال لپیٹ رکھی تھی۔ رچرڈ کو
یقین تھا کہ اسے دیکھ کر کسی کو بھی یہ گمان نہ ہو گا کہ وہ
گھر کی ایک خادمہ کے ساتھ سینما جا رہا ہے۔"

اور جب وہ گھر آئے تو آسمان پر ستاروں کا ایک ہجوم مسکرا رہا تھا
وہ اسے کھانا کھلانے کے لیے ایک ریسٹورنٹ میں لے گیا [illegible]
شراب کا دور بھی چلا اور پھر کچھ دیر کے بعد وہ [illegible]

"شب بخیر جناب" اس نے کہا "بہت بہت شکریہ"
"شب بخیر ریچرڈ" وہ بولا ——
اس کے ہونٹھ بہت نرم تھے —— بڑھاپے میں
ایک تندرست عورت کا بوسہ — وہ بہت خوش تھا

———

اس کا معمول تھا کہ صبح جب ریچرڈ اس کی ڈاک لے کر
آتی تو وہ بستر سے اٹھتا۔ لیکن اگلے دن صبح ساڑھے
سات بجے ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے جسم پر ایک
کپکپی سی طاری تھی وہ روز دو تکیے سرہانے لگا کر سوتا
تھا لیکن آج ایک غایب تھا۔ اس نے پریشان نظروں سے
دیکھا دوسرا تکیہ اس کے قریب پڑا تھا اس پر کسی کا سر
نہ تھا لیکن ظاہر تھا کہ وہاں کوئی اور بھی رات بھر لیٹا رہا
تھا اس کا دل بیٹھنے لگا اور بے اختیار منہ سے نکلا۔
"میرے اللہ! میں کتنا احمق ہوں۔ خادمہ سے [illegible]"

آپ نے دیکھا مغربی افسانوں کی یہی وہ عریانیت ہے
جو ترقی پسندیت کا روپ لیے ہوئے ہمارے ادب پر چھا رہی ہے۔
ٹھیک ٹھیک طور پر تو یہ بتایا نہیں جا سکتا کہ اس فن کی ابتدا
کس نے کی لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ احمد علی کے افسانوں میں یہ
مواد ایک مدت سے یکسا نظر آ رہا تھا۔ جو "مارچ کی ایک رات"
میں یہ آتش فشاں اس طرح پھوٹتا ہے۔

"بصیر اپنے دل کی ویرانی کرائے کی عورتوں کے آنچل میں
ڈھونڈ رہا تھا اور اس کا دوست جگدیش ان بوسوں کے
مزے لوٹ رہا تھا جو سینکڑوں لبوں کے جھوٹے کیے ہوئے
گالوں پر دیے جاتے ہیں جن کا بوسہ لینے کے بعد دیر
تک محسوس ہوتا ہے کہ ہونٹھ کسی بے جان چیز سے مس ہو گئے
ہوں۔"

[illegible] یوں اٹھتا ہے جب بصیر اور جگدیش کرائے
کی عورتوں کی تلاش کرتے کرتے ان کی خوابگاہوں تک
جا پہنچتے ہیں۔

"بصیر نے اپنا ہاتھ اس کی بغل میں ڈال دیا ——
عورت نے جواب میں اس کی طرف ترستی ہوئی نظروں سے
دیکھا ——
جگدیش جو ایک اور عورت سے باتیں کر رہا تھا اندر
آیا اور انگریزی میں بولا "کیسی ہے؟"
بہت اچھی —— سب سے بڑی بات یہ ہے کہ
چنچل ہے ——
عورت ان کا منہ تک رہی تھی کیونکہ یہ دونوں
انگریزی باتیں کر رہے تھے۔ بصیر نے جگدیش سے پوچھا۔
"وہ کیا مانگتی ہے"
"پندرہ"
"بہت ہیں دس کہو۔ اس سے زیادہ نہیں"
بات دس پر طے ہو گئی۔ اور جگدیش بھی کوٹھری میں
بیٹھ گیا ——"

اس مختصر نمونے سے ظاہر ہے کہ مغربی افسانوں نے
عریانیت کے جو حدود اپنے لیے قایم کیے تھے ہندستانی
افسانہ نگاری اپنے ارتقائی مراحل ہی میں ان سے کئی قدم
آگے بڑھ چکی ہے اور خدا نہ کرے اس کی ترقی کی رفتار
یہی قایم رہے۔

لیکن ابھی آپ نے دیکھا کیا ہے۔ سعادت حسن
منٹو کی "کالی شلوار" والی بازاری طوایف کی بھی ایک
جھلک دیکھتے جایے۔ طرز بیان کس قدر مبتذل اور بھونڈا
لگتا ہے۔

"انبالہ چھاونی کا دھندا بہت اچھا چلتا تھا چھاونی
کے گورے شراب پی پی کر اس کے پاس آ جاتے تھے
اور وہ تین چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں سے
بیس تیس روپے پیدا کر لیا کرتی تھی —— یہاں
دہلی میں وہ جب سے آئی تھی ایک گورا بھی اس کے
یہاں نہ آیا تھا۔ تین مہینے [illegible]

ہوئے ہوگئے تھے مگر صرف چھ آدمی اس کے پاس آئے
تھے صرف چھ یعنی مہینے میں دو۔ ان چھ ——
سے اس نے خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ساڑھے اٹھارہ
روپے وصول کیے تھے

میں اس افسانے کے کلائی میکس تک آپ کو نہیں
لیجاؤں گی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اسے برداشت
نہیں کرسکیں گے۔ اسی ترقی پسند ادیب کی دوسری بیسوا
اپنی سیج پر یوں بے نقاب ہوتی ہے۔

"دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی
اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی
جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی ابھی ابھی
اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں
چور گھر کو واپس گیا تھا
وہ ساگوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ
لیٹی تھی۔ اس کی باہیں کندھوں تک ننگی تھیں۔ دائیں
بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا جو بار بار
مونڈنے کے باعث سیاہی مائل نیلی رنگت اختیار کر چکا
تھا۔ اس وقت سوگندھی (طوائف کا نام) تھکی ہاری
سو رہی تھی دروازے پر دستک ہوئی۔ رات کے دو بجے
یہ کون آیا تھا؟"

اب میں ایک تقابلی ٹکڑا پیش کرتی ہوں۔ یہ عاشق حسین
بٹالوی کے افسانے "میں ہوں اپنی شکست کی آواز" سے
ماخوذ ہے۔ منٹو گھر میں بستر استراحت پر ہے۔ وہی سین جسے
منٹو نے اپنے خاص بھونڈے انداز میں پیش کیا تھا عاشق حسین
کس لطیف اور سنجیدہ پیرائے میں اسی کیفیت کا اظہار
کرتے ہیں اسے کہتے ہیں افسانہ نگاری کا کمال۔

"روز آج بھی حسب معمول دیر سے اٹھی۔ صبح کبھی کا
طلوع ہو چکا تھا ..... روز مرہ کی طرح آج بھی
اس کی نیند پوری ہونے سے پہلے ہی [illegible] شمسو [illegible] کے تیور [illegible]

بارش شروع ہوگئی۔ اس کا جسم دکھ رہا تھا اور وہ تمام
اعضا میں ایک ناقابل بیان تشنگی ایک بعید از فہم خمول
محسوس کر رہی تھی سونیا کا باسی ہار کو گردن سے اتار کر الگنی
پر پھینک دیا تھا۔ روغن اور عطریات میں بسے ہوئے بالوں
کی ترتیب جو گزشتہ شام کی ایک پر از احتیاط مصروفیت
کا نتیجہ تھی اب برہم ہو گئی تھی۔ بالوں کی برہمی سے
بے خبر لباس حریر کی پریشانی سے بے نیاز نرم و گداز بستر
کی بغاوت سے غافل وہ آنکھیں کھولے لیٹی ہوئی تھی۔
تمازت آفتاب کی تیزی اب اسے اٹھنے پر مجبور کر رہی
تھی۔ وہ حرکت کرنا نہیں چاہتی تھی۔ حرکت کرنے سے
ڈرتی تھی کہ مبادا اس کا بند بند ٹوٹ جائے۔"

گویا ترقی پسند ادبیت نے مختصر افسانے کی ہیئت اور مواد
دونوں کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے۔ معاشرت کی ناہمواریوں
نے پیٹ اور جنس کی بھوک کو تیز کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ
ساتھ مشرقی عورت زمانہ قدیم کی بہ نسبت اب زیادہ آزاد
ہو چکی ہے۔ اسے اپنے شوہر اور بیٹے کے علاوہ اور مردوں سے
بھی سابقہ پڑنے لگا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سات سمندر پار کا
انقلابی طوفان شروع شروع میں جب ہمارے ادب پر
مسلط ہوا تو ادیبوں بالخصوص افسانہ نگاروں نے افسانوں
کے ماحول سے اس بازاری عورت یا کسبی کو نکال باہر کیا
جنھیں رسوا اور سعید وغیرہ نے اپنے ناولوں میں ضرورتاً یا
زبردستی جگہ دے رکھی تھی اور اب جب کہ ۔۔۔ سماجی زندگی
اور اس کے مختلف پہلو مضامین کی حد سے گزر کر تجربات میں
شامل ہوتے جا رہے ہیں اور حقیقی زندگی کی ترجمانی کا ضبط
اپنے "کلائی میکس" پر پہنچ چکا ہے احمد علی، منٹو، غلام عباس
اور [illegible] ساہنی وغیرہ اس شاہد بازاری کو پھر ایک مرتبہ
افسانے کے راج بھون میں پھولوں یا کانٹوں کی سیج پر بٹھانا
چاہتے ہیں۔ چنانچہ ایک تنقید نگار لکھتا ہے —— "ہمارے
ناولوں کی سرشت تو وہ شائستہ اطوار طوائف تھی جس کے

یہاں امیرزادے آداب محفل سیکھنے کے لیے بھیجے جاتے تھے مگر اب ہمارے ترقی یافتہ ادب میں اس کی جگہ کالی کوٹھری والی کسبی نے لے لی ہے۔

یہ ترقی پسندیت آخر کو رنگ لا کر رہی۔ مرد تو مرد تھے عورتیں ان کے کان کترنے لگیں۔ یہاں میری مراد خاص طور پر عصمت چغتائی سے ہے۔ ترقی پسند ادیب انہیں عورت کی نفسیاتی تحلیل کا ماہر مانتے ہیں۔ عصمت چغتائی کے اگلے افسانے میں ان کا آرٹ زندگی کی دشوار گذار گھاٹیوں کو عبور کرتے ہوئے کسی انوکھے معراج کی تلاش میں نظر آتا تھا لیکن زندگی نے آرٹ پر فتح پائی اور عصمت چغتائی جب سے عصمت شاہد لطیف ہوئیں ان کا آرٹ اپنی بلندیوں سے گزر کر نشیب میں آ رہا۔ ابتدا میں جب انہوں نے عریانیت کے عنصر کو اپنے افسانوں میں داخل کرنا شروع کیا تو ایک مشہور ادبی رسالے کے ایڈیٹر نے لکھا "ہمارا خیال ہے وہ اس سرحد پر آ پہنچی ہیں جہاں سے فی الحال ایک قدم بھی آگے نہ اٹھانا چاہیے اور اپنی رفتار کو ذرا سنبھالنا چاہیے" یہ اشارہ ذیل کے افسانے "تاریکی" کی طرف تھا۔ اس افسانے کے دو پلاٹ ہیں اور صرف دو ہی اصل کیرکٹر۔ ایک بھائی ایک بہن۔ انہیں دونوں کے گرد افسانے کا پلاٹ گھومتا ہے۔ بہن ایک نوجوان پڑوسی سے آشنائی پیدا کرتی ہے اور نتیجے کے طور پر اپنے پاؤں بھاری کر لیتی ہے۔ بھائی ایک نیچ ذات کی عورت سے جنسی تعلقات پیدا کرتا ہے۔

"آ گئے بابوجی" اس نے پلیا کے نیچے سے رینگ کر کہا "۔ کب سے ٹھہری ہوں"

وہ روٹھنے کے انداز میں بولی

میں نے سیکل کو پیڑ سے لگا کر ڈال دیا اور ایک راہب کی طرح پلیا پر بیٹھ گیا۔ وہ میرے گھٹنے پر ٹھوڑی ٹیک کر اندھیرے میں میری آنکھیں ڈھونڈنے لگی۔ گہری رات اندھیری تھی۔

"ارے تجھے ٹھنڈ نہیں لگتی" میں نے اندھیرے میں اسے ٹٹولا۔ وہ گرم پانی کی بوتل کی طرح گرم اور پسیجی ہوئی تھی۔ اس نے صرف ایک گہری سانس لی اور ہنس دیا "اونہوں!" میں نے پسینے اور خاک دھول میں بسے ہوئے بھبکے سے بولا کر کہا

"کارین بابو! ہی! ہی! ہی!" وہ ہنسی اور اپنے سر کو کھجانے کی کوشش کرنے لگی۔ بالوں کا جال خاک اور میل میں گندھے ہوئے سر پر ایک ٹوپی کی طرح منڈھا ہوا تھا۔ مگر پلیا کے نیچے سڑک والے پتوں کی کھٹک آم کے تازہ تازہ بور کی خوشبو خود اس کے جسم کی بو سے مل کر مجھے مدہوش کرنے لگی۔ اس کا بات بات پر کھلکھلانا کانسے کے کڑوں کی جھنکار — میں سب کچھ بھول گیا — دور سنسان فضا میں چمگادڑ نے قہقہہ مارا۔ ہوا دق کے مریض کی طرح لمبی لمبی سانس کھینچ رہی تھی۔ رات کی کالونچ اور گہری ہو گئی"

اس واقعے کو نو مہینے بیت گئے۔ اور پھر اسٹیج دوسرا رخ اٹھاتا ہے تو اس کا بھیانک انجام یوں سامنے آتا ہے۔

"جیسے ہی میں اور یوسف سیڑھیوں کے قریب پہنچے پیچھے سے کسی نے کہا بابوجی۔

اور یقین مانیے وہ سچ اپنی بساند بدبو کے ہمراہ تھی

"ای" اس نے اپنے گودڑ کی ایک پوٹلی کو کرید کے جوتے اشارہ کیا جیسے کسی نے مجھے پیچھے گھسیٹ لیا — جر — رن — ایک بہت حقیر انسانی کیڑے نے کلبلا کر سوکھی ہوئی انگلیاں ہوا میں اچھال دیں۔ وہ ننھا مسکراہٹ سے تکتی ... سے کو اور کبھی مجھے دیکھتا رہا"

یہ تھا پہلا قدم جو عصمت نے اٹھایا لیکن اس

بعد موصوف نے محسوس کیا کہ ترقی پسند ادب اب بھی ننگا اور عریاں نہیں ہے۔ اور تب حقیقت نگاری کے نام پر گھر لو زندگی کی ایسی عریاں تصویر پیش کی گئی کہ بے شرمی اور بے حیائی کی انتہا ہو گئی۔ یہ افسانہ "لحاف" سے شروع ہو کر لحاف ہی پر ختم ہوتا ہے۔ آغاز یوں ہوتا ہے

"مگر انہیں ایک نہایت عجیب و غریب شوق تھا۔
نواب صاحب کے یہاں نو بس طالب علم رہتے تھے۔
نوجوان گورے گورے پتلی کمروں کے لڑکے جن کا خرچ
وہ خود برداشت کرتے تھے۔ مگر بیگم جان سے شادی
کر کے تو وہ انہیں کل ساز و سامان کے ساتھ گھر ہی
میں رکھ کر بھول گئے اور وہ بیچاری دبلی پتلی نازک سی
بیگم تنہائی کے غم میں گھلنے لگیں بیگم جان
دیوان خانے کے دروازوں میں سے ان لچکیلی کمروں
والے لڑکوں کی چست پنڈلیاں اور معطر باریک شبنم
کے کرتے دیکھ دیکھ کر انگاروں پر لوٹنے لگیں..."

یہاں پہنچ کر ترقی پسند افسانہ نگار کا ذہن ایک عجیب و غریب بات بنا آتا ہے۔ سمجھنے کی کوشش کیجیے شاید آپ کا دماغ اس گہرائی تک پہنچ سکے۔ بیگم جان کے سوا دوسرا کردار جو اس افسانے کی جان ہے وہ "ربو" ہے۔ بیگم جان کی چہیتی الو خادمہ۔

"ربو نے انہیں نیچے گرتے گرتے سنبھال لیا....
ان کا سوکھا ہوا جسم بھرنا شروع ہوا۔ گال چمک
اٹھے اور حسن پھوٹ نکلا۔ ربو کو گھر کا کوئی اور کام
نہ تھا۔ بس وہ سارے وقت ان کی چھپر کھٹ پر
چڑھی کبھی پیر اور کبھی سر اور کبھی جسم کے دوسرے
حصے دبایا کرتی"

واضح رہے کہ یہ افسانہ ایک خام عمر لڑکی کی زبان سے بیان کیا گیا ہے جو آنکھوں پر بیگم جان کسی کے پاس رہتی ہے وہ انہیں کے کمرے میں سوتی ہے۔ اور ایک دن ——

"جب میں سوئی تو ربو ویسی ہی بیٹھی ان کی پیٹھ کھجا رہی تھی رات کو میری ایک دم سے آنکھ کھلی تو مجھے عجیب طرح کا ڈر لگنے لگا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا اور اس اندھیرے میں بیگم جان کا لحاف ایسا ہل رہا تھا جیسے اس میں ہاتھی بند ہو۔
"بیگم جان" میں نے ڈرتی ہوئی آواز نکالی
ہاتھی ہلنا بند ہو گیا۔ لحاف نیچے دب گیا۔ صبح کو
لحاف بالکل معصوم نظر آ رہا تھا۔
مگر دوسری رات

"——— بیگم جان کا لحاف اندھیرے میں پھر ہاتھی کی طرح جھوم رہا تھا" اللہ - آں" میں نے مری ہوئی آواز نکالی۔
لحاف میں ہاتھی پھدکا اور بیٹھ گیا۔ میں بھی چپ ہو گئی۔ ہاتھی نے پھر لوٹ مچائی۔ میرا رواں رواں کانپا۔ آج میں نے ٹھان لیا کہ ضرور ہمت کر کے سرہانے لگا ہوا بلب جلا دوں۔ ہاتھی پھر پھڑپھڑا رہا تھا ——— لحاف پھر امنڈنا شروع ہوا۔ میں نے بہتیرا چاہا چپکی پڑی رہوں اس لحاف نے تو ایسی ایسی شکلیں بنانی شروع کیں کہ میں لرز گئی ——— میں نے ڈرتے ڈرتے
پلنگ کی دوسری طرف پیر اتارے اور ٹٹول کر بجلی کا بٹن دبا دیا۔ ہاتھی نے لحاف کے نیچے ایک قلابازی لگائی اور پچک گیا قلابازی لگانے میں لحاف کا ——— اللہ! میں غڑاپ سے اپنے بچھونے میں۔
اگر مجھے کوئی لاکھ روپے دے تب بھی میں نہ بتلاؤں
——— میں نے کیا دیکھا"

تو یہ تو یہ بھی کوئی افسانہ ہے۔ دیدے ہیں ہو گئے ہیں۔ آنکھوں کا پانی ڈھل گیا ہے۔ کیا یہ فواحش کی اشتعال...

یہ اثرات محدود نہیں رہے۔ یہی کیفیت اس وقت نئی شاعری کی ہے جو حسن و عشق کے معاملات کو زندگی سے زیادہ قریب کھینچنے کی دعوت دے رہی ہے۔ اختر شیرانی نے اس کی داغ بیل ڈالی اور اب اس تتبع میں عریاں نظمیں لکھنے والوں کی تعداد کچھ کم نہیں۔

غرض زبان بگڑ رہی ہے اور فحش لٹریچر گھروں کی چار دیواری میں کام کر رہا ہے ترقی پسندی جنسی بھوک کے فن کارانہ اظہار کا دوسرا نام بن گئی ہے۔ یہ ادب جو اخلاق و کردار کو برباد کر رہا ہے ملیامیٹ کر دینے کے قابل ہے۔ یہ رجحان حد درجہ خطرناک ہے اور ہمارے فن کاروں کو زیادہ دیر تک غافل نہ رہنا چاہیے کیونکہ اس مغرب زدہ گمرہی سے عوام و خاص متاثر ہو رہے ہیں اور اس بے راہ روی کو اب زیادہ برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ میرے خیال میں اگر ہمارے افسانہ نگار مولانا نیاز فتحپوری کے حسب ذیل مقولے کو پیش نظر رکھیں تو اپنی رفتار کو بہت کچھ سنبھال سکتے ہیں۔

"عریانی بری چیز نہیں بشرطیکہ وہ نیم عریانی سے آگے نہ بڑھے بدن پر کرتے چلے جانے میں آستینہ نکال کر سامنے آجانے سے زیادہ لطف ہے۔"

ف بیگم ادا

افسانے

پھیرے

ب۔ کیتر

"چودھری کو کیا ہو گیا ہے دوسی"

"نظر ہی نہیں پہچانتی پگلی۔ دیوی کا پجاری ہے"

"کون دیوی۔؟"

"یہی جگو سنار کی بیوی اور کون"

"یہ بات ہے۔ جبھی کل نکمٹ پر منو کہہ رہی تھی کہ سارا دن چودھری نے زمین کا کام کاج چھوڑ رکھا ہے۔ تمام دن حقہ لیے منڈی والی گلی کے پھیرے کرتا ہے۔ لیکن تم نے کیسے پہچانا دوسی کہ چودھری کو دیوی سے محبت ہے"

"میں کوئی کچی گولیاں کھیلی ہوں بال سفید ہو چلے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے کم از کم دو سو آدمیوں سے تو ضرور آنکھ لڑائی ہو گی کیا پوچھتی ہو سدو محبت کی نظر ہی اور ہوتی ہے۔ جب مرد کسی عورت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نے عورت کے سینے میں بے حد و حساب آگ بھر دی ہے ـــ دولاگ جیسے آدم کا قصہ بس سمجھ نہ سکے تھے"

"اسی نکمٹ پر جب میں پہلی بار محبت کا شکار ہوئی تو اس وقت میری زندگی نے سولہویں انگڑائی لی تھی۔ میرے بھرپور شباب نے تمام گاؤں کو چوکنا کر دیا تھا۔ غور سے دیکھو ان میری پچکی ہوئی گالوں کے اندر اب بھی شباب کے ان جلووں کی ندامی روشنی موجود ہے۔ میں جب ہنستی تو میرے دونوں گالوں میں گڑھے پڑ جاتے تھے۔ کیا پوچھتی ہو گاؤں بھر کے چھوکرے تو کیا چھوکریاں بھی لٹو تھیں۔ میں ویسی تو نہ تھی جیسے آج دکھائی دے رہی ہوں۔ تمہارا سن تو اس وقت ہو گا کوئی ایک برس۔ آج سے ٹھیک چند سال پہلے۔ میرا وہ سن تمہارا آج کا سن تھا۔ ایک دن جب میں نکمٹ پر پانی بھرنے گئی تو آہستہ سے نزدیک سے آئی۔ یہ ادھر بیٹھا ہوا سے باتیں کر رہا تھا اسی چودھری کا بھائی کام سے واپس آ رہا تھا کہنے لگا دوسی ذرا ادھر بیٹا تو ٹھیک سے کر لو۔ میں شرما گئی لیکن وہ میرے قریب آ گیا بولا

کوئی چرا لے گا اسے ..... بہار کو یوں اکیلے نکمٹ پر پانی بھرنے مت آیا کرو۔ بیچارا ٹھیک بیس روز بعد مر گیا۔ کرنیل جوان کو پلیگ نے دس روز میں کھا لیا۔ دس ہی روز میں میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن تمہارا تحریف جیسا ہی ہو گا اس نے مجھے اپنے گلے سے لگایا تو میں تھک کر اس کی گود میں گر گئی لیکن بھلا دوسی میں کوئی ایسی غلطی نہیں کرنا چاہتا جو خدا اور پنچایت کے نزدیک جرم ہو ہم شادی کریں گے ـــــ"

"اس نے میری جوانی کو جگایا تو ضرور لیکن تڑپتا ہوا چھوڑ گیا۔ اس احساس نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ میری بھوکی نظریں ہر جوان لڑکے کی طرف اس طرح اٹھتیں جیسے کھا جائیں گی۔ ہر طرف چرچے شروع ہو گئے۔ گھر گھر میری کہانی سنائی جانے لگی۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ کوئی کہتا دوسی کتیا ہو گئی ہے۔ بدمعاش کہیں کی۔ اسے تو گاؤں کے پتھر ڈھیلے بھی ملے تو ان سے کھیل کھیلے میں جوانی کے نشہ میں چور سب پر تھوکتی چلی جا رہی تھی جس طرف سے گزرتی ہائے دوسی۔ ہائے دوسی۔ کی آوازیں آتیں۔ اسی جگو کے یہاں چاندی کا جوڑا بنوانے گئی۔ جوڑا چڑھاتے چڑھاتے اس نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ ذرا دیکھو اپنی بیوی کے سامنے کتنا بھگت بنا بیٹھا ہے۔ اب تو آنکھ بھی نہیں ملاتا۔ وہی جوڑا جو بھاگی کی شادی پر پہنا تھا۔ اسی نے تو بنایا تھا۔ لیکن ایک پیسہ نہیں چھوڑا۔ بلکہ دس روپے کم دیے تھے تو میرا انگوٹھا لگوا لیا اور دوسرے مہینے ڈھائی روپے سود کے ساتھ لے لیے۔ یہ اوچھی مٹی کی بکی [illegible] یونہی تو نہیں بن گئی ـــــ"

"میں بہت خوش ہوں کہ چودھری اس کی بیوی کو دیکھتا ہے۔ دیکھنا ذرا ان کی دوستی پکی ہو جائے تو کسی نہ کسی شام کو جب یہ کھیت جائے گی چودھری اسے ضرور پکڑ لے گا۔ ذرا یہ گنے ہاتھ بھر اونچے ہو لینے دو۔ بس اتنی ہی دیر معلوم ہوتی ہے۔ دیکھتی نہیں ہو سارا دن دکان کے تختے پر بیٹھی رہتی ہے۔ زیور میں آ گئے تو گھر کے اندر ہی بیٹھ کر ڈال سکتی تھی۔ اسی کو دل کی لگی کہتے ہیں۔ جگو کیا جانے عورت کے دل کی بات۔ اگر میری مرضی نہ ہوتی تو بھلا اس کے باپ کی بھی طاقت تھی کہ مجھے اپنی طرف کھینچ لیتا۔ میں تو مر گئی تھی اس کی انگریزی [illegible] اور لمبی لمبی زلفوں پر ـــــ پھر گاؤں کا سنار تھا سو جا [illegible] وقت بے وقت پھیر سو دو کے دو چار روپے دیتا [illegible]

تو بڑی ہوشیار ہوتی ہے۔ باپ کو بھی بنا کھوٹ ملائے سونا یا چاندی سدّو دے۔ بھلا وہ بھی بیچاری کس شمار و قطار میں تھی۔ وہ تو جوانی کی آندھی تھی دیر کے لیے چڑھی اور پھر اتر گئی۔ آندھی میں تو کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ ڈر ہوتا ہے کہ دھول دھپا آنکھوں میں نہ پڑ جائے۔ آنکھیں بند کیے انسان کھڑا رہتا ہے۔ ایسی میں جو کوئی دھکا مار کر گرا دے اس میں بھلا انسان کا کیا قصور۔ گرے ہوئے کو کون اٹھاتا ہے۔ گرا تو بس گرا۔ اگر اندھیری رات ہو تو لوگ روندتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ آندھی کے شور میں تو کوئی چیخ پکار بھی نہیں سنتا۔ لوگ بہرے بن جاتے ہیں اور سر منہ کپڑے سے ڈھانک لیتے ہیں اور جب آندھی تھمتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کیا ہو گیا۔"

سدّو کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ یوں تو وہ دوسری کی باتیں کان لگا کر سن رہی تھی لیکن اس کا خیال تو ملیے کی ٹمٹم کے ساتھ بھاگ رہا تھا جو گاؤں کی سواریاں شہر لے جاتا تھا۔ گاؤں بھر میں صرف ایک ٹمٹم تھی۔ ہر جوان اور بوڑھی عورت کو اسی ٹمٹم پر چڑھنا پڑتا۔ ملیا بھی آٹھ آٹھ سواریاں بھر کر لے جاتا۔ شہر کے تانگے گاؤں میں اس لیے نہیں آتے تھے کہ واپسی پر خالی جانا پڑتا تھا۔ کبھی کبھار تانگہ بھی نظر آتا تھا جب کبھی پٹواری، گرداور، تحصیلدار یا تھانے دار آنے جانے کا تانگہ شہر سے طے کر کے لاتے تھے۔

سدّو بھی مہینے میں ایک بار ملیے کی ٹمٹم پر شہر گھی بیچنے جایا کرتی تھی اور رامو کریانے والے کے پاس گھی بیچ کر چلی آتی تھی۔ گھی کا کھلا بھاؤ بازار میں ایک روپیہ سیر تھا لیکن رامو سدو سے دس آنے سیر گھی لیتا تھا اور تولنے میں بھی ہر سیر کے ساتھ آدھ پاؤ کی کسر رکھتا تھا۔ اتنا ضرور تھا کہ پیسے پورے دیتا تھا۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ سدو کو اس نے میٹھی سنگترے کی گولیاں بچوں کے لیے دیں۔ کبھی کبھار یا پھر گڑ بالکے کے لیے دیدیا۔ سدو اس میں بہت خوش تھی کہ رامو بہت اچھا آدمی ہے لیکن وہ اس کی کسر تول میں پوری کر لیتا تھا۔ وہ کپڑوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی رکھتا تھا۔ ایک دن رامو نے لال طوان کا آدھ گز کا ٹکڑا سدو کو دیا کہ لے تو بھی کیا یاد کرے گی جاکر اس کی چولی بنوا لینا لیکن مجھے ذرا پہن کر دکھا جانا۔ سدو نے [illegible] کو لال طوان کا ٹکڑا لا کر دیا کہ وہ اس کی ایک اچھی سی چولی بنا دو۔ بھلا وہ گاؤں والی چولی کیسے بناتی۔ اس نے کہا سدو شہر سے بنوا لا مجھے فرصت نہیں۔ سدو سے نہ رہا گیا دوسرے دن ہی ملیے کی ٹمٹم پر بیٹھ کر شہر چلی گئی۔ راستے میں ملیے نے پوچھا سدو آج بے خبری کے شہر کیوں جا رہی ہے اس نے فوراً لال طوان نکال کر دکھایا "اس کی چولی بنوانے جا رہی ہوں"۔ ملیا ہنسا اور اس نے کہا۔ "درزی کی دکان تمھیں معلوم ہے"؟ "ہیں تو رامو کو بولوں گی اسی نے یہ کپڑا دیا تھا اور کہتا تھا چولی بنوانا وہی سلوا دیگا"۔ ملیے نے قہقہہ لگایا اور کہا کہ "تیکی دروازے کے باہر والی گلی میں جو درزی بیٹھتا ہے میں تمھیں اس کے پاس لے جاتا ہوں وہ چولی بہت اچھی بناتا ہے"۔ ملیے نے تیکی دروازے پہنچ کر ٹمٹم کو تو اڈہ پر چھوڑا اور خود اسے گلی میں لے گیا۔ درزی وہاں بیٹھا تھا۔ ملیے نے اس سے کہا "بھیکو جرا سدو کی چولی بنا دو۔ ماپ لے لو اور دیکھو بابا پرسوں تک بنا دینا"۔ بھیکو فوراً ملیے کا مطلب سمجھ گیا اور سدو کو دکان کے اندر بلا لیا۔ بیچاری بدھی سادی چولی کو کیا سمجھتی۔ بھیکو نے خوب لے لے کر چولی کا ناپ لیا۔ ایک کاغذ پر جھوٹ موٹ پنسل سے ماپ لکھا پھر بولا "یار ملیے میں ذرا جرورت سے جاکر آؤں۔ تم ماپ اسی کاغج پر لکھ دینا۔ میرا انتظار مت کرو کاہیں تمھیں گاؤں جانے میں دیر نہ ہو جائے سورج ڈوبنے والا ہے"۔ بھیکو چلا گیا ملیے نے دوبارہ سدو کو پاس بلایا اور چولی کا ماپ لینے لگا۔ سدو نے پوچھا "ملیے وہ بھیکو نے جو ماپ لیا تھا پھر تم کیوں لے رہے ہو"۔ ملیا مسکرایا اور کہا "بدھی وہ بولتا تھا کہ مجھے شرم آتی ہے اور ماپ ٹھیک نہ لیا اور کل چولی ڈھیلی بنی تو سدو کی سہیلیاں کھاک اڑائیں گی کہ کرتے کے نیچے یہ کیا گول مٹول گھوڑے باندھ رکھے ہیں۔ پھر تم تو ملک کا کریا ہو اگر لال چولی اندر سے پھوٹ پھوٹ کر نکلی تو کیسے پتہ چلے گا کہ سدو نے چولی پہنی ہے۔ اگر اچھی بنی تو تمام گاؤں والیاں ایک ایک کر کے میرے ساتھ چولی بنوانے آئیں گی۔ لیکن پہلی تو ہو گی سدو کی۔ یہ گاؤں کی ناک بن جائے گی"۔ ملیا باتیں کر رہا تھا اور ماپ بھی لے رہا تھا لیکن سدو بے حال ہوئی جا رہی تھی

سدو اور ملیا واپس گاؤں آگئے۔ ٹمٹم سے اترتے ملیے نے سدو سے کہا۔ "سدو پھر بھی ملا کرو گی"؟ سدو نے [illegible] کہا۔

۔۔۔ رہ جانا ——"

چودھری کو نہ جانے دن بدن کیا ہو رہا تھا۔ اس نے کھیتی باڑی کا کام چھوڑ رکھا تھا۔ تمام دن مندر والی گلی کے پھیرے کرتا رہتا۔ ایک نظر دیوی کو دیکھ لیتا اور خاموش گزر جاتا۔ گاؤں بھر میں چرچا ہونے لگا۔ چودھری کی دو جوان بہنیں بھی تھیں۔ وہ رات دن روتیں کہ ان کے بھائی کو کیا ہو گیا ہے لیکن چودھری کسی سے بات نہ کرتا۔ تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ لوگ جان گئے کہ چودھری کے پھیرے بے مطلب نہیں اسے دیوی سے محبت ہو گئی ہے۔ یہ بات اڑتی اڑتی جگو سنار کے کانوں تک بھی پہنچی۔ پہلے تو بہت بھنایا کہ چودھری ہوتا کون میری بیوی سے محبت کرنے والا لیکن پھر اسے خیال آیا کہ گاؤں کا نمبردار ہے سب سے زیادہ زمین اسی کی ہے۔ اگر میں نے ذرا بھی سر اٹھایا تو گاؤں بھر لاٹھیوں سے میرا کچومر نکال دیگا۔ جگو نے بنیوں والی چال چلی اور چپکے سے شہر جا کر تھانے میں رپورٹ لکھوا آیا۔ اب جگو رات دن اسی تاک میں لگا رہا کہ کسی دن بھی چودھری اس کی بیوی کو چھیڑے اور وہ اسے بندھوا دے۔ سفید کپڑوں میں ایک پولیس کانسٹبل بیس روپے مہینے کی تنخواہ پر اس کام کے لیے دکان پر رکھ لیا۔ سپاہی کے بھی مزے ہو گئے۔ صبح سویرے چوکی جاتا اور اپنی حاضری لکھوا آتا۔ تھانیدار نے اسے اجازت دے رکھی تھی۔ روٹی اور دودھ بھی گھی سے تر مفت ملتی تھی مگر سرکاری تنخواہ اٹھارہ روپے اور جگو کے بیس روپے ملا کر اس کے لیے کافی رقم تھی۔ تھا بھی ذرا جوان۔ خوب مانگ وانگ نکال کر گاؤں میں پھرتا۔ کئی ایک چھوکریاں اس کے ہاتھ لگیں۔ گاؤں میں روپے کی شکل تو بہت کم نظر آتی ہے۔ جہاں اس نے دو چار چاندی کے روپے دکھائے ایک آدھ نین یا جوڑی ہاتھ لگ گئی۔

بڑی ذات والی تو پیسے کے لالچ میں نہیں آتی۔ البتہ بھنگی یا نائی قوم کی لڑکیاں جو گاؤں سے سودا سلف لاتی تھیں سبھی کو ایک ایک کر کے اس نے اپنے روپوں کی جھلک دکھائی تھی۔

گاؤں کی بوڑھیاں کہا کرتی تھیں کہ "جگو بھگتی اور اس کی بیوی کو دیکھو کیا چھوکری نکالی ہے چاند کا ٹکڑا۔ تھانیدار کا گھر کیا کوئی مسنہری تھوڑی ہے ——"

پولیس والے کو مسلسل چار ماہ ہو گئے لیکن اس نے ایک دن بھی چودھری کی کوئی حرکت بھی ایسی نہ دیکھی کہ وہ اسے پکڑے۔ تھانیدار کو روزانہ رپورٹ ملتی تھی اس لیے وہ بھی چپ تھا۔ چودھری یوں پھیرے تو تمام دن کرتا لیکن اس نے نہ تو کبھی دیوی کو آنکھ ماری۔ نہ اس پر آوازہ کسا۔ نہ کبھی کھنکھارا نہ خود بن سنور کر اس کے پاس گزرا۔ نہ کبھی تحفہ بھیجا نہ کبھی رنگین رومال سے اشارا کیا۔ اور نہ کبھی جلو بڑھیا کو اس کے گھر پر بھیجا کہ میرا اندیسہ لے جاوے۔ جلو بڑھیا بھی گاؤں بھر میں عجیب شے تھی۔ جہاں اس نے کسی کے گھر آنا جانا شروع کیا گاؤں بھر منہ جوڑنے لگتا۔ وہ اس کام میں زیادہ مشاق تھی اور بہت جلد لڑکیوں کو پٹا لیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کبھی کسی لڑکی سے شادی کی مرضی معلوم ہوتی تو اس کے ماں باپ جلو ہی کو بلاتے اس کا نام ضلع بھر میں مشہور تھا۔ کسی جگہ سے اغوا نہ ہوتا ہو تو وہ چند دنوں میں کروا دے۔ تھانیدار یا تحصیلدار کی تفریح کے لیے اگر کوئی حکیم "چوزیوں" کی یخنی تجویز کرے تو روزانہ افراط سے "چوزیاں" ڈاکرے بھر بھر کر ان کے بنگلہ پر پہنچا دے اور منہ بولا انعام پائے۔ ایک مرتبہ تو حد کر دی۔ ایک افسر کی لڑکی پٹا کر لاری والے کے ساتھ بھگوا دی۔ لیے ہوں گے کوئی پچیس پچاس اس کام کے لیے ——

جگو نے اپنی بیوی کو میکے بھیج دیا یہی کوئی دس کوس گاؤں سے پورب کی طرف۔ چودھری بھی بیلے کی ٹمٹم پر بیٹھ کر اسی شام وہاں چلا گیا۔ دیوی دو مہینے میکے رہی اور چودھری وہاں بھی گلی کے پھیرے کرتا رہا۔ آخر جگو نے تھانیدار کی امداد سے چودھری کو گرفتار کرا دیا۔ جب مقدمہ کورٹ میں گیا تو چودھری نے مجسٹریٹ سے [illegible] پہلی مرتبہ ایک سوال کیا کہ تمہارے [illegible]

...ہے۔ تم اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ کہ کبھی میں نے تمہیں کچھ
...ہے۔ دیوی نے کہا کچھ نہیں —— یہ سن کر مجسٹریٹ مسکرایا
...مقدمہ خارج کر دیا۔

چودھری گاؤں واپس آیا آتے ہی دونوں بہنوں کے نام
...لکھ دی اور ان کی مرضی کے مطابق گاؤں کے دو لڑکوں سے
...ی کر دی —— وہ اپنی اور دیوی کی رسوائی کا صدمہ برداشت
...سکا اس نے گاؤں کی سکونت ترک کر دی اور نہر کے کنارے ایک
...بنا کر رہنے لگا۔ اب اس نے ضرورت کی کل چیزیں بالکل چھوڑ دیں۔
...کی بہنیں ایک لوٹے میں لسی اور روٹی ایک وقت لیجاتیں جو
...کھا لیتا۔ اس نے بول چال سب سے ترک کر دی اور بالکل
...خاموش رہنے لگا۔

ایک روز نہر کا سپرنٹنڈنٹ کٹیا کے پاس گزرا تو اس نے
...دھری سے سوال کیا کہ تم نے کس کی اجازت سے یہ کٹیا یہاں
...بنائی ہے۔ چودھری بہت مدت کے بعد بولا۔
حضور کسی کی اجازت سے نہیں۔ فقیروں کو کسی کی اجازت
ضرورت نہیں ہے خدا کی زمین پر جہاں جی چاہا بسیرا کر لیا مجھے
اس نہر سے پیار سا ہو گیا ہے اس کی اور انسانی زندگی کی روانی
ایک سی ہے۔ میں یہاں رات کو اس چاند کی چاندنی میں بیٹھ کر یہی
سوچا کرتا ہوں کہ انسانی زندگی بھی اس پانی کی طرح بہہ رہی ہے
...مصیبتیں ہیں جو اس کی زندگی میں آتی ہیں۔ اگر حضور سے
...لیا تو پھر روانی کے ساتھ کچھ عرصہ بہتا گیا ورنہ اس میں پھنس کر
رہ گیا ہے۔

سپرنٹنڈنٹ خاموش چودھری کا منہ دیکھ رہا تھا۔ محبت
نے فلسفی بنا دیا تھا۔ اس نے چودھری کے کندھے پر ہاتھ
رکھ کر کہا چودھری صاحب زندگی تک تمہیں یہاں کوئی نہیں اٹھائیگا۔
وقت گزرتا گیا [illegible] گھڑیاں [illegible] گئے۔ دن
[illegible] کی طرف جا رہی تھی۔ چودھری کو
[illegible] خاموش محبت بھلا دیوی کو کیسے
[illegible] جب آسمان اپنی بلندیوں سے

ہلکے ہلکے بادل کے سفید ٹکڑوں کو پھاڑ کر زمین کی طرف دیکھ رہا تھا
اور چیلیں بلند پرواز کر رہی تھیں۔ دیوی نے کوٹھے سے چھلانگ لگا دی
تمام فضا اداس ہو گئی۔ عورت کتنی سخت ہو پھر بھی نازک ہوتی ہے وہ
گری اور بیہوش ہو گئی۔ گاؤں کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ سرد اور دوسری
اسے تکتی کھڑی رہ گئیں۔ گاؤں کا وید اس کے منہ میں ٹھنڈا پانی ڈال
رہا تھا۔ دیوی بہت دیر کے بعد ہوش میں آئی اور آنکھیں پھاڑ
پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ پہلا آدمی جو اسے نظر آیا وہ جگو تھا۔ وہ اٹھ کر
اس سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔ چودھری چودھری مجھے معاف
کر دو۔ سب لوگ اس کا منہ دیکھنے لگے اس نے رات پا کر نہر کی
طرف بھاگنا شروع کیا۔ سارا مجمع اس کے پیچھے تھا لیکن آج تو
دیوی کو خیال کے تیر لگ گئے تھے وہ کسی سے بھی نہ پکڑی گئی
اور جا کر چودھری کے قدموں پر گر پڑی۔ چودھری آنکھیں بند
کیے بیٹھا تھا گاؤں کے لوگ بھی پہنچ چکے تھے۔ چودھری نے
آنکھیں کھولیں اور پوچھا کون ——"

وہ بولی —— "تمہاری دیوی"

چودھری نے ایک آہ سرد کھینچ کر کہا —— "کون دیوی
ہم تو خود دیوتا ہیں"

جگو اور گاؤں کے لوگ سب ششدر کھڑے تھے۔ دیوی
رو رو کر جان دے رہی تھی۔ لیکن چودھری تو دیوی کو چھوڑ کر
اس کے بنانے والے سے محبت کرنے لگا تھا بھلا اصل پا کر
نقل کو کون چھوتا ہے۔

گاؤں والے واپس چلے گئے اور دیوی اس کٹیا کے
پھیرے کرنے لگی۔

شاہزادہ ایاز

آسمانی کھیل

"دیکھو ماں، چاند بادلوں کے پیچھے بھاگ رہا ہے" اسکی ماں سر نیوڑھائے سلائیوں سے کچھ بن رہی تھی، بیٹے کی بات جیسے اس نے ان سنی کر دی ہو، انگلیاں پھرتی سے چلا رہی تھی اور وہ انگلی اوپر اٹھائے آسمان کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ بہت دیر دیکھتا رہا، بادلوں کی اوٹ میں چھپتے اور نکلتے ہوئے چاند کو! جیسے یہ کھیل اسے بہت پسند تھا، ماں کو دیکھ کر بولا، "ماں تمہیں یہ کھیل آتا ہے"

"کیسا کھیل؟" چونک کر بولی،

"یہ جو آسمان پر ہو رہا ہے"

"کیا ہو رہا ہے پپّی" اوپر نظریں اٹھا کر بولی "ارے ہنس پڑی، "چاند بھاگ رہا ہے بادلوں میں"

"یہی تو میں پوچھ رہا ہوں" وہ ماں کے چہرے پر نظریں گاڑ کر بولا،

وہ اس کے گال تھپکا کر بولی "آسمانی کھیل زمین پر نہیں کھیلے جاتے"

"پتاجی بھی نہیں جانتے،"

وہ مسکرا دی، پپّی آج کیسی باتیں کر رہا تھا، اسے گود میں لے کر بولی، "اپنے پتاجی سے معلوم کرنا وہ بتائیں گے نہیں"

"ابھی تک آئے نہیں پتاجی!" ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولا،

ماں گھڑی پر نظر ڈال کر بولی۔ "ہاں! سات بج گئے، اب تک نہیں آئے"

"آئے تو تھے دوپہر کو؟" وہ بولا

ماں دھاگے کو سلجھاتے ہوئے بولی "آئے تھے پھر چلے گئے"

"اور اب کب آئیں گے"

"کیا خبر؟" بھویں سکیڑ کر بولی "کلب گئے ہیں رات سے پہلے کیا آئیں گے"

"چاند رات کو بھی کھیلتا ہے یہ کھیل؟"

"ہاں" وہ بولی "اگر بادل ہوئے تو"

"رات کو بادل کہاں جاتے ہیں ماں"

"کہیں نہیں" جھنجلا کر اور گود سے اتار کر بولی "جاؤ گیند سے کھیلو"

ننھا بال گیند اچھال کر بولا "یہ تو آسمان پر نہیں دوڑتی" ماں جیسے اس کی بے معنی باتوں سے اکتا گئی تھی، کام میں مصروف تھی،

"ماں" وہ گلا پھاڑ کر بولا، "یہ دوڑتا نہیں"

بے توجہی سے بولی "گھاس پر لڑھکاؤ دوڑے گا!"

وہ گیند اٹھا کر بولا "ابھی آؤٹ ہو جاتی"

وہ ریکٹ گھما کر بولی "ٹینس کھیلنی بھی آتی ہے آپ کو؟"

مسکرا کر بولا، "سمجھا فرماتی ہیں آپ یہ لیڈیز کا کھیل ہے"

کھلکھلا کر بولی، "جبھی آپ کا برا حال ہو رہا ہے مارے پسینے کے بیچارے"

وہ جھنجھلا کر بولا "سنبھالیے زمین پر جا رہی ہے"

اس نے اس پھرتی سے گیند ریکٹ پر لی کہ ستیش تعجب میں رہ گیا،

مسکرا کر بولی "یہ ہاکی نہیں ٹینس ہے مسٹر ستیش!"

وہ جو آج کئی تار کئی چھین ملا پھر کھیل رہا تھا بولا "تو آپ کے ساتھ کھیل رہا ہوں"

وہ سر کو دلکش انداز سے ایک جھٹکا دے کر بولی "ہاں تو مجھے بھی پسند ہے"

"شکریہ" گیند اچھال کر بولا

تیکھے قہقہے

وہ ڈرا۔ جھجکا لیکن بدرجہ مجبوری وہ اسکے سامنے جا ہی کھڑا ہوا سائل کی صورت ہی سوال ہوتی ہے۔ اس نے ہمت کی اور سوال پیش کر ہی دیا! "بائی جی۔ آج کچھ نہیں ملا"۔ "نہیں ملا" قہقہے لگاتے ہوئے بائی جی نے کہا۔ "میں کیا کروں"؟ اس نے رعونت آمیز آنکھوں کو اسکی طرف گھماتے ہوئے جواب دیا "دیکھو اے بڈھے کھوسٹ میں نے تجھے کتنی مرتبہ سمجھا دیا کہ تو میرے پاس نہ آیا کر مگر تو نہیں مانتا اگر تو اپنی ان حرکات سے باز نہ آیا تو آیندہ سے تجھے کوٹھے پر نہیں آنے دونگی"۔!

وہ خاموش کھڑا رہا۔ اسکے جھریاں بھرے ہوئے چہرے کی دھنسی ہوئی بے نور آنکھیں اپنے ہی آپ جھک گئیں۔ شاید دنیا کی بھیانک اور ناقابل برداشت مناظر کی تاب دید نہ لاکر!!

"تو جاتا کیوں نہیں؟"

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مگر پھر بھی خاموش کھڑا رہا۔ اسکے تن بجان کے اندر سوکھی ہڈیوں میں بس کٹ کٹا ہوا ایک گوشت کا لوتھڑا کہہ رہا تھا کہ آج تو اور تیری زندگی کیا کھائیگی..!

وہ بڈھا جس کا کام تھا۔ بائی جی کے یہاں آنے جانے والے مہمانوں کے جوتے اتار کر سلیقے سے رکھنا اور جاتے وقت تمیز کے ساتھ پہنانا۔ ایک یا دو پیسے اور بعض وقت ایک آنہ بائی جی کے ان قدر دانوں کا جوانمردی جا کھولا کر دو پیسے صرف کرنے کے بعد بھی یہی خیال کرتے کہ کچھ بھی صرف نہیں کیا چلتے وقت بوڑھے کھوسٹ کو جوان کے جوتے اتارتا اور پہناتا دیکھا بلند ہو گئے تھے۔ لیکن پھر بھی جوتوں میں پڑی ہوئی سوندی ہوئی ٹھکرائی ہوئی زندگی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے وہ لوگ بائی جی کے خیال سے اسے کچھ نہ کچھ دے ہی دیتے تھے۔ لیکن آج اسے کچھ نہ ملا پیٹ میں لگی ہوئی آگ۔ معدہ کو جھلسائے ہوئے تھی بڈھے کو پکڑ کر وہ مجبوراً بائی جی کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔ اسے جھڑکیاں سنا پڑیں لیکن وہ ہمیں اور بھی [illegible] کھڑا رہا! بائی جی کمرے میں چلی گئیں۔

بے شرم لیکن بھوک کا مارا ہوا اُلّو بڈھا پھر بھی وہیں کھڑا رہا بلکہ سہارا لیے ہوئے "ارے تو گیا نہیں" بائی جی نے کمرے سے باہر آتے ہوئے کہا۔ لیکن پھر بھی وہ خاموش کھڑا رہا۔ اسنے سوکھی شیر کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ بڈھے کی امیدیں چمکنے لگیں۔ اس وقت وہ طوائف کی مذاق کا متحاج تھا اس نے خیال کیا کہ شاید طوائف ہی خدا کے روپ میں جلوہ گر ہے۔ کیونکہ مفلس "خدا" اور "طوائف" دونوں کے گھروں سے ٹھکرایا جاتا ہے۔ غریب اور مفلس کے ہاتھوں ٹھکرائے ہوئے جیا۔۔ بڑھاپے کے متعلق خیالات کی رو اس کے ذہن اور دماغ میں تیزی سے بہہ رہی تھی۔۔ اس نے اپنے بڑھتے ہوئے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ دنیا والے کہتے ہیں کہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا عیب ہے۔ برا ہے! ہو سکتا ہے کہ یہ روایات ان کے اپنے زاویہ نگاہ سے درست ہوں۔ مگر میں یہ کبھی ماننے کیلیے تیار نہیں ہوں۔۔ دنیا کے تمام واقعات اور تمام قیدیں۔ تمام سماجی بندھن سب وقت اور ضرورت کے باعث پیدا کیے گئے۔ اگر دنیا والوں کا دم بھوک کی وجہ سے لبوں پر آتا ہو تو وہ ہر چیز کو روا ٹھہرا سکتے ہیں۔ اور ان کا ہر چیز کو روا ٹھہرانا حق بجانب ہے۔ خدا کے وجود کی طرح قابل تسلیم۔!!

کیا دنیا اسی کا نام ہے۔ غریب اور امیر پہلو بہ پہلو رہیں لیکن ہمدردی سے بیگانہ محض اور پھر بھی رحم دل اور اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ محض!

اس نے سامنے کھڑی ہوئی طوائف پر نظر ڈالی اور پھر رفتہ رفتہ پورے کمرے پر نظر دوڑائی۔ یہ آرائشی سامان یہ زیبائشی لوازمات کیوں۔؟ اور کس طرح حاصل ہوئے محض گناہ کی بدولت۔!!

وہ ہنسا۔ دل کھول کر۔ بے ساختہ۔ اس کی بھی ایک لڑکی تھی جوان خوبصورت۔ کیوں نہ وہ بھی اس کے نقش قدم پر چلے۔ پھر تو عزت شہرت اور امارت اسکے قدم چومےگی۔ وہ ہنسا اور ہنستا ہوا چلا گیا۔

دوسرے دن! ایک نئی طوائف کی آمد تھی بازار میں ایک ہجان سا برپا تھا۔ مگر کہیں فضاؤں میں شیطانی قہقہے گونج رہے تھے۔ اور غلط بالا بڈھا پیامبر۔ خاموشی طاری تھی۔!!!

جلیل [illegible]

سپاہی کی واپسی

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا پگڈنڈی پر
چل رہا تھا۔ جسم نڈھال اور آنکھیں ویران تھیں، لیکن
اس ویرانی میں بھی ایک چمک تھی ــــ ایسی چمک جو پچھلے پہر
ڈوبتے ہوئے ستاروں میں نظر آتی ہے۔ وہ سوچ رہا
تھا ــــ سات سال پہلے جب وہ فوج میں بھرتی ہو کر گاؤں
چھوڑ رہا تھا، راگنی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا تھا "میں
تمہارا انتظار کروں گی" ــــ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے
نظر دھندلا گئی۔ وہ رک گیا۔ آستین سے آنسو پونچھے اور پھر
چلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر سوچ رہا تھا ــــ راگنی اس
سے کتنی محبت کرتی تھی۔ اس نے [illegible] روکنے کی کتنی کوشش
کی تھی لیکن وہ راضی نہ ہوا ــــ اس کا غمگین چہرا، بکھرے
بال، ملتجی آنکھیں، ایک ایک کرکے سب آنکھوں کے سامنے پھر گئے
لیکن کیا وہ اب بھی اس کا انتظار کرتی ہوگی ــ شاید مر چکی ہو
نہیں نہیں وہ زندہ ہوگی ــــ اس کا شوہر ہوگا اور بچے ــــ
اور اس کا سینہ آفتاب سے جلتی ہوئی چٹان کی طرح پھٹنے لگا۔

شام کا تھکا ہوا آفتاب مغرب کے کناروں پر سرخ
ہو رہا تھا۔ اس نے ایک راہگیر سے پوچھا۔

"بھئی! کیا تم بتا سکتے ہو۔ گاؤں یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"تھوڑا ہی دور ہے بھیا ــــ بس ایک کوس"

تھکان سے اس کے پاؤں بھاری ہو رہے تھے، باوجود
اس کے وہ جلدی جلدی چلنے لگا۔ لیکن وہ کہاں اور کیوں
جا رہا تھا اسے خود معلوم نہ تھا۔ گاؤں میں تو اس کا کوئی بھی
نہ تھا۔ جاننے پہچاننے والوں میں سے کچھ تو مر چکے ہوں گے
اور کچھ جو زندہ ہوں گے وہ اسے پہچانتے بھی نہ
پھر بھی وہ اپنے سفر کو جلد سے جلد ختم کر دینا چاہتا
ابھی اس نے نصف ہی راستہ طے کیا تھا کہ بادل
کالے دیو آسمان پر چھا گئے۔ ہواؤں کا نیم تاریک
درختوں کو جھنجھوڑنے لگا۔ چاند طوفان میں کشتی کی
طرح بادلوں کے سمندر میں ہچکولے کھاتا ہوا ڈوب
گیا، ستارے ایک ایک کرکے بجھ گئے۔ ہوا تھم گئی اور
موسلا دھار بارش۔ وہ قریب ہی بیری کے ایک
کے نیچے بیٹھ گیا۔

پانی برستا رہا، بجلی چمکتی رہی اور اس ماحول
اس نے ماحول کا جائزہ لیا۔ وہ جگہ اسے مانوس سی معلوم
ہوئی۔ ایک مرتبہ جب بجلی ایک کڑک کے ساتھ چمکی تو
زیر پھیلے ہوئے درخت کو غور سے دیکھا۔ ماضی
گہرے ہوتے گئے اور اسے یاد آ گیا ــ یہ وہی درخ
وہ اور راگنی چھپ چھپ کر راتوں کو ملا کرتے تھے
زندگی کی ایک روشن رات یاد آگئی ــ بہار کے
تھا۔ فضائیں خودرو جنگلی پھولوں کی مہک سے
ــــ دور افق کے قریب پانی تالاب میں جا
موجیں مار رہا تھا۔ درخت پر بیٹھی ہوئی کویل
چلا رہی تھی۔ طلائی ستارے اپنے مدار پر گردش
تھے۔ وقت لنگڑاتا ہوا آہستہ آہستہ گزر رہا تھا
زندگی کے رنگین واقعات سنا رہی تھی، وہ سن رہا تھا
آنکھیں اس کے نازک تن کی [illegible] کو گھورنے لگیں

ہوگئی تھیں۔ تھک گئی تھیں اور وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا
کاش ان کا مستقبل اس سے زیادہ خوشگوار اور سہانا ہو سکتا
—— وہ سوچتا چلا گیا —— یہ وہی درخت تھا جس کی چھاؤں
میں اس نے راگنی کو آخری مرتبہ الوداع کہی تھی اور راگنی نے
اپنے دل کی دھڑکنوں کو چھپاتے ہوئے کہا تھا "میں تمہارا
انتظار کروں گی" —— کتنا درد تھا اس کی آواز میں ——
کتنی المناک تھی وہ رات اور آج کی رات —— وہ چونک
پڑا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا پانی تھم
چکا تھا۔ چھٹتے ہوئے بادلوں میں سے کہیں کہیں تارے جھانک
رہے تھے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور تاریکی میں نیم دھندلی
پگڈنڈی پر تیز تیز چلنے لگا۔ وہ مسلسل ایک گھنٹہ چلتا رہا ——
اب گاؤں قریب آ گیا تھا۔ دور جھونپڑیوں میں ننھے ننھے دیا
ٹمٹما رہے تھے۔ وہ بستی کی سب سے پہلی جھونپڑی کے قریب
رک گیا۔ شاید یہاں رات بھر کیلئے پناہ مل سکے۔ اچانک اندر
سے ایک کراہ کی آواز آئی۔ وہ چاہتا تھا کہ آگے بڑھ چلے
لیکن بیمار نے چلایا۔ "پانی —— پانی" اسے بڑی زور سے
کھانسی آئی اور اب کی اس نے بہت ہی کرب آواز میں پکارا
"راگنی۔ راگنی" مسافر کا بڑھا ہوا قدم رک گیا، پاؤں لڑکھڑا
گئے۔ "راگنی" اس نے زیر لب کئی دفعہ دہرایا —— یہ تو وہی نام تھا جو
اس کی نس نس میں بسا ہوا تھا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین
نہ آیا۔ وہ غیر ارادی طور پر جھونپڑی کے قریب آ گیا اور
اس نے پھر وہی نام سنا "راگنی"
مریض نے قدموں کی آہٹ سن کر کہا "کون —— آہ
—— پانی —— پانی" اور وہ اندر چلا گیا۔ مریض بستر پر دراز تھا
آنکھیں بند تھیں اور اسی طرح آنکھیں بند کیے ہوئے اس نے کہا
"راگنی، راگنی —— تو آگئی"

"نہیں میں" وہ بولا "ایک پردیسی مسافر ہوں"
بیمار نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور چونک کر کہا "کون
—— پردیسی"

"نہیں میرے دوست" اس نے جلدی سے جواب دیا۔
"میں ایک راہی مسافر ہوں۔ کیا میں تمہاری کوئی خدمت
کر سکتا ہوں؟"
وہ پھر کھانسنے لگا اور جب کھانسی رک گئی تو ایک طرف
اشارہ کر کے کہا "پانی" اس نے پانی دیا اور جب مریض پی کر
لیٹ گیا تو مسافر نے اس کے سرہانے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
"لیکن —— شاید تم کسی کو پکار رہے تھے۔ کیا تمہاری
دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں"
مریض نے آنکھیں کھولیں۔ اب وہ زیادہ مطمئن معلوم
ہوتا تھا۔ پانی نے جیسے اس میں نئی روح پھونک دی تھی۔
کھانسی بھی ختم ہو گئی تھی۔ اس نے کہنا شروع کیا۔
"راگنی بیچاری بڑی دکھیا ہے —— میری جیون ساتھی"
پردیسی کا دل سینے میں اس زور سے دھڑکا کہ وہ آگے
کچھ سن نہ سکا۔ اس کے کان جیسے سن ہو گئے تھے اور جب وہ
تھوڑی دیر بعد چونکا تو اس نے سنا، بیمار کہے جا رہا تھا۔
"ہمارے بیاہ کو دو سال ہوئے لیکن —— لیکن اس
بیچاری کو میں نے کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا —— (وہ کھانسا)
—— شاید اسے کوئی دکھ ہے، بہت بڑا دکھ۔ میں نے اس
سے بہت پوچھا پردیسی! لیکن اس نے کچھ نہ بتایا۔ وہ بتانا
نہیں چاہتی۔ وہ اس کے دل کا بھید ہے جس کے سہارے
وہ جی رہی ہے —— وہ روز اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر
جھونپڑی کے دروازے کے سامنے جا بیٹھتی ہے اور خاموش
گاؤں کی راہ کو تکا کرتی ہے —— جیسے اسے کسی کا انتظار
ہو۔ (وہ پھر کھانسا) —— انتظار اور اس انتظار سے وہ تھکتی
نہیں، گھبراتی نہیں"
مریض خاموش ہو گیا۔ اس کی سانس زور زور سے
چلنے لگی۔ لیکن کچھ دم لیکر وہ پھر بولا۔
"راگنی میرا کتنا خیال کرتی ہے۔ رات رات
میرے سرہانے بیٹھی رہتی ہے آج میری حالت غیر دیکھ

وہ ندالانے جا رہی تھی۔ میں نے کہا بجلی کڑک رہی ہے، پانی برس رہا ہے، اس طوفان میں میں تمھیں جانے نہ دونگا — میں نے بہت روکا مسافر! لیکن وہ نہ مانی —"

بیچارے نے زور سے کھانسا۔ اس کی آواز حلق میں اٹک گئی دم رک رک کر آنے لگا اور اس نے ہکلاتے ہوئے مشکل سے کہا۔

"مسافر! وہ ابھی تک نہیں آئی۔ اب میرے پاس وقت نہیں ہے — لیکن میرے دوست تم کیوں رو تے ہو — کیوں دکھی ہو تے ہو — آہ تم کتنے ہمدرد ہو اجنبی مسافر — شاید تم بھی دکھی ہو، دوسروں کا دکھ جانتے ہو — میری تم سے ایک التجا ہے، راگنی کو میرا آخری پیام پہنچا دینا — اس سے کہنا، تم دوسرا بیاہ کر لینا۔ تمہارے دکھ کا سکھ اسی میں ہے —"

"لیکن دوست! میں یہ پیام اسے نہ پہنچا سکوں گا" — مسافر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا!

"تمھیں پہنچانا ہوگا پردیسی! تم جانتے ہو یہ ایک مرنے والے کی تمنا ہے"

اور ایک آخری ہچکی سے اس کا سر ایک جانب ڈھل گیا ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور سرہانے رکھے ہوئے دیا کی لو تھرتھرا رہی تھی۔ عین اسی وقت جھونپڑی کے دروازے سے آہٹ ہوئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔

راگنی ہاتھ میں دوا کی شیشی لیے کھڑی تھی۔

علی احمد بی اے (عثمانیہ)

پردیسی

برسات کا موسم شروع ہوگیا تھا۔ سینی ٹوریم کی سرخ دیواریں گھنی بیلوں کے عنابی پھولوں سے لدگئی تھیں۔ سامنے منگرو کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں جو خودرو گھاس اور جنگلی کھجور سے ڈھکی جا رہی تھیں۔ بارشوں میں نہا کر نئی دلہن کی طرح شرمائی شرمائی نظروں سے وادی میں جھانک رہی تھیں، وادی کے عین وسط میں پہاڑی نالہ نہایت تیزی اور گرج سے بہہ رہا تھا۔ جیسے وہ اپنے بہاؤ میں حائل چٹانوں کو پاش پاش کر دینا چاہتا ہو۔ سینی ٹوریم کے نیچے بے شمار پہاڑی بکرے شاہی کے پودوں میں سینگ الجھا الجھا کر جھروں میں سے کھجور کے بیج چن چن کر کھا رہے تھے۔ ٹینس لان کے کنارے پہاڑی نالہ سسکیاں بھرتا ہوا، بلوریں سانپ کی طرح پتھروں میں جھینکتا رہا تھا اور پیلی پیلی ابابیلیں غوطے لگا لگا کر گھاٹی کی سرد و نم ہواؤں میں غسل کر رہی تھیں۔ سینی ٹوریم کو آنے والی بڑی سڑک پر کوئی پہاڑی گڈریا اپنی بھیڑوں کے پیچھے بنسی بجاتا ہوا جا رہا تھا۔ اور بنسی کی آواز وادی کے جگر سے کانپتی ہوئی منگرو کی تمام پہاڑیوں میں گونج رہی تھی۔ ننھی ننھی بھیڑیں بادلوں کے ٹکڑوں کی طرح کولتار کی سڑک پر ایک دوسرے کے پیچھے اچھل کود رہی تھیں۔

شام کی سیاہی منگرو کی سب سے بڑی پہاڑی کی اوٹ سے ابھرتی ہوئی فضاؤں میں تحلیل ہوتی جا رہی تھی۔ آسمان پر کالے بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ [illegible] کلیان پور کی سنہری مسجد کے [illegible] تھے۔ [illegible] سینی ٹوریم کے باہر سرد ہوا کھڑکیوں کے [illegible] زور سے سر پٹخ رہی تھی اور سپردہ روشندانوں کے راستے چیختی ہوئی ہال میں داخل ہوتی اور اچانک کمرے کی محبوس فضا میں نڈھال ہو کر گر پڑتی۔ سینی ٹوریم کے ہال میں نمبر بیس پلنگ تھے ــــ ہال کے دائیں طرف دو کمرے تھے جن میں سے ایک میں سرجری کے آلات رکھے تھے اور دوسرا آپریشن روم تھا۔ سینی ٹوریم کے باہر بلوط کی لکڑی کا ایک سیاہ بنگلہ تھا جس میں سینی ٹوریم کا سول سرجن رہتا تھا۔ بنگلے کے باہر دائیں طرف تین الگ کمرے بنے ہوئے تھے جن میں سے ایک سینی ٹوریم کے باورچی خانے کے کام میں لایا جاتا تھا اور باقی دو کمرے ملازمین کے لیے وقف تھے۔ آخری کمرہ سینی ٹوریم کے دربان بابا عبداللہ کے لیے مخصوص تھا جہاں وہ گذشتہ سات برسوں سے اپنی اکلوتی پوتی "جوہی" کے ساتھ مقیم تھا ــــ جوہی کے ماں باپ کلیان پور کے ہیضہ میں مر چکے تھے اور بابا عبداللہ جوہی کو جو اس وقت صرف آٹھ برس کی تھی اپنے پاس لے آیا تھا۔ جوہی کا بچپن کا نام کچھ اور تھا۔ لیکن بابا عبداللہ اسے جوہی کے نام سے پکارتا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس کی ننھی پوتی جوہی کے پھول کی طرح ہے۔

بابا عبداللہ کی عمر اس وقت ساٹھ پینسٹھ کے لگ بھگ تھی لیکن وہ نہایت مضبوطی سے اپنی لٹکتی ہوئی عمر کو پنجوں میں دبوچے ہوئے تھا۔ اس کا جسم گٹھیلا اور قد لمبا تھا۔ اس کی داڑھی اور سر کے بال، دھوپ میں چمکتی ہوئی شفاف برف کی طرح سفید تھے وہ ہمیشہ رات کو اپنا لوہے کا ڈنڈا ہاتھوں میں مضبوطی سے تھامے سینی ٹوریم کے چاروں طرف چکر لگاتا رہتا۔ اور کبھی کبھی سینی ٹوریم کے پیچھے ٹینس لان کے کنارے منگرو کی سب سے بڑی چٹان پر بیٹھ کر پہاڑی سرود میں گنگناتا:

"خدا سب کچھ دیکھتا ہے ــــ ہر وقت جاگتا ہے [illegible]

ــــ رات کی [illegible] ــــ [illegible]

[illegible]

منگرو کی پہاڑیاں اس کے گرجدار نعرے کی صدائے بازگشت
سے گونج اٹھتیں اور بہت دیر تک اس کا نعرہ وادی کی
نم فضاؤں میں رقص کرتا تھا۔ لیکن بابا عبداللہ اپنا یہ نعرہ
رات بھر میں صرف ایک آدھ مرتبہ لگاتا کیونکہ وہ سینی ٹوریم
کے مریضوں کی نیند میں مخل ہونا نہ چاہتا تھا۔

کبھی کبھی جب آدھی رات کو بابا عبداللہ گنگنا رہا
ہوتا۔ جوہی بھی آنکھیں مسلتی ہوئی اپنے کمرے کے باہر آ جاتی
اور ٹینس لانس کی ہری ہری شبنم آلود گھاس پر وہ ٹکٹکیاں
لگاتی رہتی۔ جوہی کی نیلی آنکھیں چاندنی راتوں میں تاروں
کی طرح چمکتیں اور اس کے بھورے گھونگریالے بال ہوا میں
سانپوں کی طرح لہراتے۔ جوہی کو منگرو کی پہاڑیاں بے حد
پسند تھیں اور وہ اپنے بچے وقت کا اکثر حصہ کسی نہ کسی
مریض کے ساتھ جھرنے کے کنارے گزار دیتی۔ بابا عبداللہ
نے اسے بتایا کہ مریضوں کی خدمت سب سے بڑی عبادت
ہے اور جوہی کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے وقت کو بیکار
ضائع کرنے کی بجائے مریضوں کی خدمت میں صرف کرے
انہیں دونوں وقت کا کھانا سینی ٹوریم سے مل جاتا تھا
اور جوہی پکانے کے جھنجھٹ سے بے نیاز تھی۔ دن بھر
وہ کسی نہ کسی مریض کا ہاتھ تھامے منگرو کی پگڈنڈیوں پر
پہاڑی بھیڑ کی طرح اچھلتی کودتی رہتی تھی۔ اسے بے شمار پہاڑی
گیت یاد تھے۔ گو وہ ان کا مطلب نہیں سمجھتی تھی۔ لیکن جب
وہ جھرنے کے کنارے، جھرنے کے ساز دل کے ساتھ بیٹھی
گنگناتی تو ہوا ساکن ہو جاتی اور جوہی کے بول فضا پر چکر کاٹتے
ہوئے زمین پر گرنے لگتے۔

ایک دن تو اس کے گانے پر ایک مریض سسکیاں بھر بھر کر
رونے لگا تھا۔ جوہی نے گانا بند کر دیا اور قریب آ کر حیرت
سے اس کا چہرہ تکنے لگی۔ مریض کے گھونگریالے بال اسکے
ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے اور بھولی بھولی نیلی آنکھیں آنسوؤں
سے بھری ہوئی تھیں وہ اپنی ٹھوڑی ہتھیلی پر ٹیکے بہت
دیر تک وادی میں جھانکتا رہا۔ جیسے وہ وادی کی نم جوانی
میں کچھ پڑھ رہا ہو۔ جوہی اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور اس
کے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر بولی "پردیسی تم کیوں
رو رہے ہو؟"

جوہی ہر مریض کو پردیسی کہہ کر پکارا کرتی تھی۔ کیونکہ
اس نے اپنی پندرہ سالہ زندگی میں بے شمار مریضوں کو منگرو کی
چراگاہوں اور پگڈنڈیوں کی سیریں کرائی تھیں اور پھر وہ
اچانک سینی ٹوریم سے غائب ہو جاتے۔ جوہی کی آنکھیں پرنم
ہو جاتیں اور بابا عبداللہ اس کا سر سہلاتے ہوئے کہتا۔
"جوہی" میری بچی۔ وہ چلے گئے۔ انہیں جانا تھا۔
وہ جانے کے لیے ہی تو آئے تھے"

اور جوہی گھنٹوں ٹینس لانس میں گلمہر کے پودوں
کے پاس کہنیوں کے بل لیٹی ہوئی سوچا کرتی۔ وہ سب کیوں
آئے تھے؟ اگر آئے تھے تو چلے کیوں گئے؟ وہ مجھے کتنا
پیار کرتے تھے۔ میرے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے اور بچوں
کی طرح میرے ساتھ ہری ہری گھاس پر قلابازیاں کھاتے
جیسے وہ میرے ہم عمر ہی تو تھے۔ پہلے وہ انہیں "ابا"
اور "جی" کہہ کر پکارا کرتی تھی۔ لیکن جب عمر کے ساتھ ساتھ
اس کا شعور بھی جوان ہوتا گیا وہ انہیں "پردیسی" پکارنے
لگی۔ کیونکہ "ابا" اور "جی" میں جو روحانی لگاؤ ہے وہ
پردیسی اس سے خالی ہے۔ کسی کو پردیسی کہہ کر پکارنے سے
دل کو یہ یقین ہوتا ہے کہ اس کے [illegible] اور تعلقات
عارضی اور مصنوعی ہیں۔ اور اب وہ مریضوں کو پردیسی کہہ کر [illegible]
میں ایک حظ سا محسوس کرتی تھی جیسے وہ ان سے [illegible]
مریضوں کا انتقام لے رہی ہو یا انہیں جتلا دینا چاہتی ہو کہ
میں جانتی ہوں۔ تم کیا لینے کے لیے آئے ہو۔ تم [illegible]
لیکن تم بھی جان رکھو کہ میں بھی تمہیں [illegible]

لیکن جس دن وہ پردیسی [illegible]
بھرنے لگا۔ جوہی چونک اٹھی۔ جیسے [illegible]

تحت الشعور سے ابھر کر ذہن کی وسعتوں میں دیوانہ وار دوڑتا پھرتا ہو۔ اس نے پردیسی کے کندھوں پر پیار سے ہاتھ رکھا اور غور سے اس کا چہرہ تکتی رہی۔ پردیسی خاموشی سے اداس کی تم فضاؤں میں اپنی نم ناک آنکھوں سے گھورتا رہا۔ اور وہ پردیسی کی آنکھوں کو گھورتی رہی۔ اس کی نیلی آنکھوں کے گرد ہلکی سی سیاہ لکیریں تھیں۔ اور ان سیاہ لکیروں میں آنسوؤں کی ہلکی سی چادر تیر رہی تھی اور پھر جب سیاہ لکیروں کا ساحل اس سیلاب کو نہ روک سکتا۔ دو موٹے موٹے آنسو اس کی لمبی لمبی پلکوں پر لٹکنے لگتے۔ اور پھر اس کے زرد رخساروں پر سے رینگتے ہوئے سینے کے بالوں میں جذب ہو جاتے۔

جوہی بہت دیر تک یوں ہی اسے تکتی رہی۔ اور پھر یکایک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ پردیسی کو پہچانتی ہے جیسے اس نے اس پردیسی کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے —— لیکن وہ اسے نہ پہچان سکی۔ پردیسی کا ملول چہرہ۔ نیلی نیلی اداس آنکھیں اور سیاہ گھونگریالے بال اس کے ذہن کے باریک پردوں سے بار بار ٹکراتے رہے۔ لیکن وہ اسے نہ پہچان سکی۔ پردیسی نے ایک بار کنکھیوں سے جوہی کی طرف دیکھا۔ اور پھر مسکرا کر اپنے کرتے کی آستین سے آنسو پونچھنے لگا۔ جوہی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"تم رونے کیوں لگے پردیسی؟" اور پردیسی نے مسکرا کر اس کے عنابی گالوں کو آہستہ سے انگلی سے چھوا "کچھ نہیں جوہی! —— یوں ہی —— تم کتنا اچھا گاتی ہو —— اور پھر تمہارا گیت کتنا انوکھا تھا —— مجھے ایک بار پھر وہی گیت سناؤ گی؟" جوہی بچوں کی طرح ہونٹ لٹکا کر بولی۔ "مگر —— تم پھر تو نہ رونے لگو گے پردیسی؟" پردیسی مسکرانے لگا۔ اور پھر اس نے آگے سرک کر اپنی بانہیں جوہی کی گردن میں حمائل کر دیں اور اس کے گالوں پر ہونٹوں سے اپنے ہونٹ مس کیے جوہی حیرت سے [illegible] دیکھنے لگی۔ منگرو کی پہاڑیاں اس کی نظروں سے غائب [illegible]۔ پہاڑی نالہ اچانک منجمد ہو گیا۔ اور

ابابیلیں فضا میں معلق ہو کر ساکن رہ گئیں۔ اور پھر اسے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے اس کے ہونٹ جل رہے ہوں اور ان سے آگ کی لپٹیں نکل رہی ہوں اور ان کی تپش سے اس کے جسم کا ہر عضو اینٹھنے لگا —— مگر یہ کیفیت عارضی تھی اس کے محسوسات ابھی مکمل طور پر جوان نہیں ہوئے تھے۔ اس نے ایک نڈھال انگڑائی لی اور پتھر پر کہنیاں ٹیک کر آہستہ آہستہ گنگنانے لگی۔

زرد راتیں بہت تاریک ہیں —— ہوا خاموش ہے —— جھرنا سسک سسک کر رو رہا ہے —— میں تنہا ہوں —— میرا کوئی نہیں۔ آہ! تم اس وقت کہاں ہو؟ —— تم جو میرے تصور میں سمائے ہوئے ہو —— میری روح پر چھائے ہوئے ہو —— آہ! تم اس وقت کہاں ہو؟" یکایک پردیسی نے زور سے ایک چیخ ماری، اور تڑپ کر چٹان کے نیچے گر گیا۔ اس کے زرد ماتھے پر نیلی نیلی رگیں ابھر آئیں اور وہ پتھریلی زمین پر زخمی بسمل کی طرح کروٹیں لینے لگا۔ جوہی چونک کر کھڑی ہو گئی۔ "پردیسی۔ پردیسی" لیکن پردیسی نہایت بے تابی سے تلملا رہا تھا۔ اس کے منہ سے سرخی مائل جھاگ بہ رہی تھی اور وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر زور زور سے کراہ رہا تھا۔ جوہی تیزی سے اچھل کر چٹان پر چڑھ گئی اور پھر اس نے سینی ٹوریم کی طرف منہ کر کے زور سے آواز دی —— "بابا ——" اس کی آواز چند لمحوں تک منگرو کی پہاڑیوں سے ٹکرا ٹکرا کر گونجتی رہی اور پھر ٹینس لان کے پیچھے مہندی کے پودوں کی اوٹ سے بابا عبداللہ نے پکارا "جوہی ——" "جلدی آؤ بابا" —— پردیسی کو کچھ ہو گیا ہے بابا عبداللہ تیزی سے مہندی کے پودے اندر چٹانیں پھلانگتا ہوا آیا۔ "تم جاؤ جوہی! دوڑو۔ ڈاکٹر صاحب کو فوراً خبر دو" یہ کہہ کر اس نے پردیسی کو آہستہ سے اپنی گود میں اٹھا لیا۔ اور سینی ٹوریم کی طرف تیز تیز قدموں سے چل پڑا۔ جوہی خم دار پگڈنڈی کا سا طویل راستہ چھوڑ کر نوکیلے پتھروں کا سہارا

لیٹی ہوئی اوپر چڑھ گئی۔ اور ڈاکٹر کو پردیسی کی حالت خراب
ہو جانے کی خبر دی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اور خوف
کے مارے چہرے کا رنگ زرد تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد
بابا عبداللہ اپنے کمرے کی طرف لوٹا۔ جوہی پلنگ پر لیٹی ہوئی
لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں،
اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اس کے بھورے
گھونگریالے بال آنسوؤں کے ساتھ گالوں پر چپک گئے تھے
اس نے ایک بار سر اٹھا کر ملتجی نظروں سے بابا عبداللہ کی
طرف دیکھا اور پھر تکیے پر سر ڈال کر سسکیاں بھرنے لگی۔
بابا عبداللہ چند لمحوں تک خاموشی سے جوہی کی
طرف تکتا رہا اور پھر اس کے قریب بیٹھ کر اس کا سر سہلانے لگا
"نہ رو — نہ رو۔ میری بچی — میری ننھی جوہی نہ رو
— پردیسی بچ جائے گا۔ ڈاکٹر کہتا ہے اسے دل کا
روگ ہے" اور پھر اس نے جوہی کا سر اٹھا کر اپنے سینے
سے لگا لیا۔ اور اس کے گیلے گالوں پر اپنی ملائم داڑھی
رگڑتے ہوئے بولا۔ "اسے یہی تو روگ ہے جوہی رانی!
— تو تو نری پاگل ہے۔ وہ بہت کمزور دل کا آدمی ہے
لیکن خطرے کی کوئی بات نہیں۔ ڈاکٹر کہتا ہے وہ بہت جلد
اچھا ہو جائے گا" اور جوہی کی سسکیاں آہستہ آہستہ
مدھم ہو گئیں۔ جیسے ٹوٹے ہوئے پنیڈے سے پانی کے آخری
قطرے رس رہے ہوں

اس رات جوہی بہت دیر تک جاگتی رہی۔ بابا
عبداللہ سینی ٹوریم کے باہر گشت کر رہا تھا۔ اور ایک بار
گشت کرتے ہوئے وہ کھڑکی کے پاس آ کر کمرے کے
اندر جھانکتے ہوئے بولا۔ "ارے — ابھی تک جاگ
رہی ہو ننھی جوہی؟"
اور جوہی ایک اداس انگڑائی لے کر بولی "نہیں تو بابا"
بابا عبداللہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ "ارے تو جاگ
نہیں رہی۔ تو کیا میں جاگ رہا ہوں"

جوہی جمائی لے کر بولی "ہاں — تم تو سو رہے ہو بابا" اور
بابا عبداللہ سر کھجاتا ہوا ٹینس لان کی طرف بڑھ گیا۔ اور
پھر وہ چٹان پر بیٹھ کر اپنا پہاڑی گیت گنگنانے لگا۔
"ستارے اونگھ رہے ہیں۔ چاندنی وادی کی نم
فضاؤں میں غسل کر رہی ہے — میں نے گلاب کی پنکھڑیوں
پر لیلائے شب کے آنسو دیکھے ہیں — اور جھرنے کی
سسکیوں کی آواز سنی ہے — ماضی کی پگڈنڈیوں
سے کوئی مجھے زور زور سے پکار رہا ہے — یہ کون
ہے۔ آہ! یہ کون ہے؟" اور کمرے کی کھڑکی کے پاس
کہنیوں کے بل بیٹھی ہوئی جوہی فضاؤں کے پار آسمان کی
نیلاہٹ میں ننھے ننھے روشن تاروں کو گننے لگی۔ اور پھر
یکایک آسمان کے تمام تارے سمٹ کر فضاؤں پر پرواز کرتے
ہوئے اس کھڑکی کے قریب آ گئے۔ اور اسے ان کی
آنکھوں کو چکا چوند کر دینے والی روشنی میں پردیسی کا زرد
چہرہ نظر آنے لگا۔ اس وقت ہوا تیز ہو گئی۔ کمرے کے باہر
پھیلے ہوئے بلوط کی شاخیں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگیں
پہاڑی نالہ ساون کے بادلوں کی طرح گرجنے لگا — اور
بابا عبداللہ زور سے پکارا۔ "ہو — خبردار ہو" اس کی
بھاری بھرکم ملتجی آواز اس تمام ہنگامے پر غالب آ گئی
تارے منتشر ہو کر پلک جھپکنے میں آسمان پر ابھر گئے۔ ہوا
ساکن ہو گئی۔ بلوط کی شاخیں سہم کر خاموش ہو گئیں۔ اور
پہاڑی نالہ سسکاری کی سی آواز کے ساتھ پتھروں میں
رینگنے لگا۔ جوہی نے سوچا۔ "آہ اسے کیا ہو گیا ہے
— یہ انوکھا پردیسی اتنا یاد کیوں آ رہا ہے؟"
اور پھر اسے احساس ہونے لگا جیسے پردیسی کے گرم
اور کپکپاتے ہوئے ہونٹ ابھی تک اس کے سرد ہونٹوں
کے ساتھ چپکے ہیں۔ اس کے سارے جسم میں ایک برقی
سی دوڑ گئی۔ اور پھر شاید اس کا دل [illegible]
سے لبریز ہو گیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ [illegible]

مانند کر پردیسی کے پاس چلی جائے اور اس کی بالوں بھری
چوڑی چھاتی پر اپنے سرد گال ٹیک کر کہے۔
"مجھے جی بھر کر پیار کر پردیسی! میری روح نے
تجھے پہچان لیا ہے۔ میں تیری ہی تو ہوں۔ مجھے بیاہ لے
پردیسی! میں تیرے ساتھ شہر جاؤں گی۔ وہاں تو میرے
ہونٹ چومے گا۔ اور میں تجھے پہاڑی گیت سناؤں گی
مجھے بیاہ لے پردیسی! میں تیرے ساتھ جاؤں گی۔ تو تنہا ہے
اور تیرا دل کمزور ہے۔ میں تیرا دل بہلایا کروں گی۔ تو مجھے
ساتھ لے چل پردیسی"
دور سے بابا عبداللہ کے گنگنانے کی آواز آئی۔
"پردیسی! تو جانے کے لیے آیا ہے — شکر کی
پہاڑیاں سخت ہیں — اور میرے پاؤں نازک ہیں —
شاہی کے پھولوں سے میرے تلوے چھل جاتے ہیں —
مجھے محبت بھری نظروں سے نہ دیکھ — میرا دل بہت کمزور
ہے — ابھی لوٹ جا پردیسی! — میں جانتی ہوں
تو جانے کے لیے آیا ہے۔" اور جوہی کے ذہن پر
غنودگی سی طاری ہو گئی۔ آسمان صاف تھا۔ رات بھر
چاند بلوط کی ٹہنیوں سے لٹکتا رہا۔ تارے آنکھ مچولی
کھیلتے رہے۔ اور ننھی جوہی لطیف خواب دیکھتی رہی۔
صبح کی اولین کرن کے ساتھ جوہی نے آنکھیں کھولیں
اور ایک نڈھال انگڑائی لے کر کھڑکی کے پاس جا نکلا۔ باہر
آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ سرد ہوا چل رہی تھی
لیکن زرد اور نیلا سورج کلیان پور کی سنہری مسجد کے سفید
مینار کی اوٹ سے آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا۔ جوہی نے
اپنے کندھوں کو خفیف سی جنبش دی۔ اس کا سارا جسم
درد کر رہا تھا۔ جیسے رات بھر کوئی سخت کام کرتی رہی ہو
بابا عبداللہ [illegible] پاؤں پھیلائے زور زور سے
خراٹے لے رہا تھا۔ جوہی اچھل کر چارپائی سے نیچے اتری
اور دروازہ کھول کر جھونپڑی سے باہر نکل گئی۔ ٹینس لانس کی
تراشیدہ گھاس پر شبنم موتیوں کی طرح بکھری ہوئی تھی
اور ڈاکٹر کی بھوری بکری کے لیلے گھاس پر کلیلیں کر رہے
تھے۔ جوہی نے لپک کر ایک لیلے کو گود میں اٹھا لیا اور
اس کی مخملیں کھال پر محبت سے ہاتھ پھیرتی ہوئی جھرنے کی
طرف بڑھی اور پھر اچانک اس کے ہونٹوں سے مسرت کی
ایک دبی ہوئی چیخ نکل گئی۔ لیلا اس کے ہاتھوں سے
چھوٹ کر ہری ہری گھاس پر گر گیا۔
جھرنے کی بڑی چٹان پر پردیسی بلوط کے تنے سے
ٹیک لگائے کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ جوہی خوشی سے
چٹانیں پھلانگتی ہوئی اس کی طرف دوڑی۔ "پردیسی! —
پردیسی!" اور پردیسی کتاب بند کر کے جوہی کی طرف دیکھ کر
مسکرانے لگا۔ جوہی تیزی سے جا کر اس کے سینے سے
لپٹ گئی۔ "تم بہت برے آدمی ہو پردیسی! کل تم نے مجھے
ڈرا دیا۔ میں رات بھر جاگتی رہی۔" اور پردیسی اپنی دلفریب
مسکراہٹ کے ساتھ پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ سہلانے لگا۔
"تم اچھے تو ہو پردیسی!"
پردیسی نے چند لمحوں تک اپنی موٹی موٹی نیلی آنکھوں
سے جوہی کی آنکھوں میں جھانکا۔ اور پھر جیسے وہ سب کچھ جان
گیا۔ اس نے ان حسین اور مشتعل کھڑکیوں سے جوہی کی
بے تاب روح کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی آہ
بھری اور پھر آہستہ آہستہ اپنے ہونٹ جوہی کے ہونٹوں
کے قریب لے گیا۔ لیکن اس نے انہیں چوما نہیں۔ وہ بہت
دیر تک صرف اپنے گہرے تنفس سے انہیں سینکتا رہا۔ جوہی
کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے ہونٹوں پر پیپڑیاں جم گئی
ہوں۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور وہ
پردیسی سے قریب تر ہو گئی۔ پردیسی خاموشی سے اس کی
آنکھوں میں گھورتا رہا۔ جیسے وہ اس کی آنکھوں کے ان
ننھے ننھے تاروں کو نوچ لینا چاہتا ہو۔ اور — اور
پھر یکایک اس نے اپنے ہونٹوں میں جوہی کے [illegible]

گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نازک ہونٹوں کو جکڑ لیا جوہی بے بس ہوگئی۔ "تم بڑے اچھے ہو پردیسی! — مجھے آج تک کسی پردیسی نے اس طرح پیار نہیں کیا!" اور پھر اس نے وادی کے پار سنگرو کی سب سے اونچی پہاڑی کی طرف دیکھا اور بولی۔ "پردیسی! تم چلے تو نہیں جاؤ گے؟"

پردیسی بولا "یہاں ہر پردیسی جانے کے لیے آتا ہے جوہی! — اس دن تم خود ہی تو کہہ رہی تھیں!"

جوہی نے تیزی سے مڑ کر دونوں ہاتھوں سے پردیسی کے کندھے تھام لیے۔ اور انہیں جھنجوڑ کر بولی "مجھے بیاہ لے پردیسی! — میں تیرے ساتھ جاؤں گی — تو تنہا ہے اور تیرا دل کمزور ہے — میں تیرے ساتھ رہوں گی — تو مجھے اپنے ساتھ شہر لے جا — وہاں تو مجھ سے محبت کرے گا اور میں تجھے پہاڑی گیت سناؤں گی۔"

پردیسی کی پلکیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ "ہاں تم ٹھیک کہتی ہو جوہی! — میں تنہا ہوں اور میرا دل بہت کمزور ہے۔ میں تجھے ضرور ساتھ لے جاؤں گا" جوہی اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے چہرے پر مسرت کی لہریں دوڑنے لگیں۔ اور پھر وہ بلوط کی شاخوں سے لٹک کر دیوانہ وار جھولنے لگی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے سنگرو کی تمام پہاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہوں۔ جھرنا زور زور سے نغمے الاپ رہا ہو۔ اور بیلی ابابیلیں ننھے ننھے پروں سے تالیاں بجاتی ہوئی اس کے چاروں طرف چکر کاٹ رہی ہوں — بلوط کی شاخوں پر ایک پہاڑی پرندہ زور سے چیخا اور پھر ایک ہولناک چیخ کے ساتھ وادی میں پرواز کر گیا۔ جوہی سہم گئی۔ پردیسی چٹان پر بیٹھا انگلیوں کے ناخنوں سے چٹان کی گیلی مٹی کرید رہا تھا لیکن لانس سے بھوری بکری کے سارے میلے ہم آواز ہو کر چلائے۔ "ہاں — ہاں" اور پردیسی سر اٹھا کر جوہی کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔ "ہم کل یہاں سے چلے جائیں گے جوہی!"

جوہی حیرت سے پلکیں جھپکا کر بولی "کل؟"

پردیسی بولا "ہاں — اب میرا دل یہاں سے اچاٹ ہو گیا ہے۔ میں نے اپنا علاج ڈھونڈ لیا ہے جوہی! اب میں زیادہ دنوں تک بے کار سینی ٹوریم کی اداس فضا میں سسکنا نہیں چاہتا۔ ہم کل صبح یہاں سے چل دیں گے۔"

جوہی پردیسی کے قریب سرک آئی۔ اور اس کے سینے پر سر رکھ کر لجاجت آمیز لہجہ میں بولی "تم مجھے بیاہ لو گے نا پردیسی! — تم سچ کہتے ہو نا؟"

"ہوں" پردیسی اس کا سر سہلاتے ہوئے پیار سے بولا "کل صبح میری موٹر شہر سے آجائے گی تم صبح مجھ سے سنگنی کی سڑک پر جبل کے اس سرخ نشان کے قریب ملنا۔ اور ہم منہ اندھیرے یہاں سے نکل جائیں گے۔" اتنے میں بادل زور سے گرجا۔ اور پھر موٹے موٹے اولے برسنے لگے۔ سنگرو کی تمام پہاڑیاں دہشت سے چیخ اٹھیں اور پردیسی جوہی کا ہاتھ تھامے تیزی سے سینی ٹوریم کی طرف بھاگنے لگا۔ لانس کے قریب پہنچ کر دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوگئے جوہی اپنے کمرے میں گھس گئی۔ اور پردیسی سینی ٹوریم کا بڑا پھاٹک ڈھکیل کر اندر داخل ہوگیا۔

دن بھر بادل گرجتے رہے۔ جھکڑ چلتا رہا۔ اور چھوٹے موٹے اولے برستے رہے۔ بلوط کا بڑا درخت اپنی شاخیں ہلا ہلا کر کراہتا رہا۔ اور جوہی تکیے پر کہنیاں ٹیکے سینی ٹوریم کی طرف کھلی باندھے تکتی رہی۔ اس کا لاڈلا پردیسی دوسرے پردیسیوں کے ساتھ سینی ٹوریم کے برآمدے میں بیٹھا سگریٹ پی پی کر قہقہے لگا رہا تھا۔ پردیسی اس روز بہت خوش تھا اور اپنی بھاتی تان کر بیچ تالی سے برآمدے کے چکر کاٹتا اور کبھی کبھی برآمدے کے کھمبے کی اوٹ میں سگریٹ سلگانے کے بہانے دزدیدہ نظروں سے بابا عبداللہ کے کمرے کی طرف دیکھتا۔ جوہی مسکرا کر اپنے گلابی ہاتھ ہلاتی اور پردیسی مسکرا دیتا۔ شام کو جب سینی ٹوریم کی بتیاں جل گئیں۔ پردیسی ہال میں چلا گیا — بابا عبداللہ

مکارتا ہوا اٹھا۔ "شام ہوگئی جوہی بٹیا!"

اور جوہی ہنس کر بولی "ابھی کہاں بابا۔ سو و تم ــ ابھی تو دوپہر بھی نہیں ہوئی" اور بابا عبداللہ مصنوعی غصہ سے واول پڑے۔ "تم مجھے نوکری سے نکلواؤ گی"۔ جوہی زور سے قہقہہ لگاکر ہنس پڑی۔ "مگر باہر بارش ہو رہی ہے بابا!"

بابا عبداللہ مٹی کے آفتابے سے ہاتھ منہ دھوتے ہوئے بولا۔ "میں نے سردیوں کی بارش میں پہرے دیئے ہیں ــ تم کیا جانو!" اور جوہی ہنستی ہوئی دروازہ کھول کر باورچی خانہ سے کھانا لینے چلی گئی۔

امام بخش باورچی اپنی خضابی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ "کیوں جوہی بٹیا آج تو تو بہت کھِس کھِس کھائی دیتی ہے۔ کیا بات ہے؟" اور جوہی ناک سکیڑ کر چوڑیاں کھنکھناتے ہوئے بولی "ہاں بابا جوہا! آج میں بہت خوش ہوں" اور پھر قہقہہ لگاکر ہنس پڑی۔ امام بخش باورچی دیگچی میں چمچ ہلاتے ہوئے، جوہی کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر پنجابی زبان میں گیت گنگنانے لگا۔ ؎

کتّے گیوں پردیسیا وے
نین لگا کے ــ ہائے میت بنا کے۔
کتّے گیوں پردیسیا وے

کھانا کھانے کے بعد بابا عبداللہ اپنا پرانا سمور کا کوٹ اوڑھ کر اور سر پر ٹاٹ لپیٹ کر لکڑی کے فرش پر ڈنڈا بجاتا ہوا باہر چلا گیا اور جوہی اپنے بال گوندھ کر بستر پر لیٹ گئی۔ ابھی اسے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے وہ قطعی خالی الذہن ہے۔ اس کے تمام محسوسات دلوں میں دب کر رہ گئے ہوں۔ اسے اپنی آنکھوں میں دھواں دھواں سا محسوس ہونے لگا اس کی سانسیں شدت سے دھڑک رہی تھیں۔ اور وہ بہت جلد نیند کی گہری وادیوں میں کھو گئی ــ

[illegible] مسجد کے سفید مینار کے پیچھے صبح صادق [illegible] پھوٹ رہی تھی کہ ایک بھیانک آواز جوہی کے

سرہانے کھڑکی کے ساتھ اپنے پر پھڑپھڑا کر زور سے چیخا۔ "ہو ہو۔ ہو ہو"۔ جوہی چیخ کر اٹھ بیٹھی۔ جیسے کسی نے اس کے سر پر زور سے لاٹھی رسید کر دی ہو۔ اس کا جسم خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ برسات کی نم آلود سرد ہوا کے باوجود اس کی گردن پسینے سے تر بتر ہو گئی۔

"بابا!" اس نے زور سے چلا کر کہا۔ کمرے کی دیواریں اس کی آواز سے گونج اٹھیں۔ بغل کے کمرے سے امام بخش باورچی اپنے بھیانک خراٹوں کے درمیان آہستہ سے زیر لب بڑبڑایا۔ جوہی نے کھڑکی کے شیشوں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ مطلع صاف تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر بے شمار ننھے ننھے تارے جگمگا رہے تھے۔ چاند بلوط کی شاخوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ اور افق کے پار صبح کی مدھم روشنی آہستہ آہستہ ابھر رہی تھی جوہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی! اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور برامدے میں کھڑے ہو کر بغور چاروں طرف دیکھا۔ سامنے جھرنے کی بڑی چٹان پر بابا عبداللہ ٹاٹ اوڑھے سویا ہوا تھا۔ جوہی نے ایک نظر سڑک پر ڈالی۔ جیل کا سرخ نشان چاندنی میں صاف نظر آ رہا تھا۔ جوہی نے کمرے میں لوٹ کر اپنی پرانی چادر اٹھائی۔ اور اسے احتیاط سے سر کے گرد لپیٹ کر باہر نکل آئی۔ اس کے پاؤں تھر تھر کانپ رہے تھے۔ اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا جب وہ سینی ٹوریم کے دروازہ پر پہنچی۔ اس کے پاؤں ٹھٹھک کر رہ گئے۔ پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ اور ہال میں روشنی تھی۔ بہت سے آدمی دواؤں کی شیشیاں اور سرجری کے آلات ہاتھوں میں لئے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ جوہی نے سوچا کہیں کوئی آدمی پھاٹک کی طرف نہ آ نکلے۔ اور اس احساس کے ساتھ ہی وہ پھاٹک سے ہٹ کر نہایت سرعت سے سڑک پر قدم بڑھانے لگی۔

جیل کے سرخ نشان کے قریب پہنچ کر اس نے

ایک بار چادر سر سے اتار کر سینی ٹوریم کی طرف بغور دیکھا اور پھر میل کے نشان سے ٹیک لگا کر سرد شبنم آلود سڑک پر بیٹھ گئی۔ معاً ہوا زور زور سے چیخنے لگی۔ افق کے پار صبح صادق کی سفیدی یکسر غائب ہو گئی اور کالے کالے بادل مینار کی اوٹ سے ابھرنے لگے۔ دور ___ سینی ٹوریم کی چھت سے پہاڑی الو زور سے چیخا۔ ہو ہو۔ ہو ہو۔ اور پھر کلیان پور کے میدان سے بے شمار گیدڑوں کے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ جوہی نے سہم کر چادر کو مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹ دیا۔ اور منتظر نظروں سے سینی ٹوریم کے پھاٹک کی طرف تکنے لگی۔ ہر لمحے اسے یقین تھا کہ اب پھاٹک کا دروازہ اپنی ہولناک کرکراہٹ کے ساتھ کھلے گا۔ اور پردیسی کی موٹر نہایت تیزی سے پگڈنڈی کے چکر کاٹتی ہوئی بڑی سڑک پر میل کے اس سرخ نشان کے قریب آ کر رکے گی۔ پردیسی اپنی اسی سحر آفریں مسکراہٹ کے ساتھ اپنی موٹی موٹی نیلی آنکھوں سے گھور کر دیکھے گا اور پھر وہ اچھل کر پردیسی کے قریب موٹر پر بیٹھ جائے گی۔ پردیسی ایک بار اسے زور سے بھینچ کر اس کے ہونٹوں کو محبت سے چومے گا۔ اور پھر موٹر گرجتی ہوئی شہر کے سیدھے دوڑنے لگے گی۔

لیکن آسمان پر چاروں طرف کالے کالے بادل چھا گئے۔ چاند چھپ گیا۔ ہوائیں سائیں سائیں کرنے لگیں اور ___ اور پھر دن کی اجلی روشنی کالے بادلوں میں سے چھن چھن کر تمام پہاڑیوں پر پھیل گئی۔ سینی ٹوریم کے باہر گھاس پر بکریاں ممیانے لگیں۔ مرغ بانگ دینے لگے۔ اور بابا عبداللہ جھرنے کی بڑی چٹان پر کھڑا ہو کر زور سے پکارا "جو ___ ہی" جوہی کے ذہن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

اس کا دل اندر ہی اندر بیٹھنے لگا۔ بابا بھی جاگ اٹھا۔ اور پردیسی ___ اس کا اکھڑا پردیسی ابھی تک نہیں آیا تھا سینی ٹوریم کی پچھلی طرف سے بابا عبداللہ کے پھر پکارنے کی آواز آئی۔ "جو ___ ہی" اور جوہی ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کھڑی ہو گئی۔ اور پھر اسے خیال آیا۔ شاید پردیسی نے آج شہر جانا ملتوی کر دیا ہو۔ اس کی موٹر شہر سے نہ آئی ہو اور یہ بھی ممکن ہے۔ ڈاکٹر نے اسے شہر جانے کی اجازت نہ دی ہو۔ کہیں پردیسی جھرنے کے پاس اس کا انتظار تو نہیں کر رہا۔ اور اس خیال کے آتے ہی وہ زور زور سے سڑک پر بھاگنے لگی۔

سینی ٹوریم کے پھاٹک پر امام بخش باورچی۔ ڈاکٹر رائے کمپونڈر رکھنہ اور ہسپتال کے تمام ملازمین جمع تھے۔ لیکن جوہی ان کی طرف توجہ کیے بغیر ٹینس لان کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ جھرنے کے پاس بابا عبداللہ لاٹھی ہاتھوں میں تھامے مضطرب نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا اور پھر جوہی کو آتے دیکھ کر اس نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا۔ "تم صبح کہاں چلی گئی تھیں۔ بیٹیا" اور جوہی بابا عبداللہ سے لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ ایک عجیب اضطراب اس کے لاشعور سے ابھر کر کبھی کے پھل کی طرح رفتہ رفتہ ابھر رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا۔ کہ بابا عبداللہ اسے بری طرح ڈانٹے۔ اس کے نرم گالوں پر اپنے بھاری بھرکم ہاتھوں سے ان گنت طمانچے لگائے اور پھر اسے نہایت بے دردی کے ساتھ چٹیا سے گھسیٹتا ہوا وادی میں دھکیل دے ___ لیکن بابا عبداللہ خلاف معمول پیار سے اس کا سر سہلانے لگا۔ "ڈرو ___ نہیں جوہی! ___ نہ ڈرو۔ تو جانتی ہے پردیسی جانے کے لیے آتا ہے تو یہی سمجھ وہ بھی چلا گیا۔ دور ___ بہت دور" اور پھر وہ مغموم نظروں سے افق کی گہرائیوں میں کسی چیز کو گھورنے لگا۔

جوہی نے سر اٹھا کر بھیگی بھیگی آنکھوں سے بابا عبداللہ کا چہرہ دیکھا۔ اور پھر [illegible] بولی۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو بابا! [illegible]

آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ "میں جانتا ہوں جوہی بچی! وہ بہت اچھا تھا۔ لیکن تو یہی سمجھ، وہ چلا گیا۔ دور ۔۔ بہت دور ۔۔ وہ جانے کے لیے ہی تو آیا تھا۔" اور پھر اس نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا۔ اور اپنے انگوٹھے سے پلکوں کے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ "وہ کل شام تک وہ بالکل بھلا چنگا تھا۔ بیچارہ"

جوہی کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔ اور دانتوں سے ہونٹ کاٹنے لگی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے بابا عبداللہ دیوانہ ہوگیا ہو۔ آخر وہ کیوں ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے؟؟؟

بابا عبداللہ جوہی کا ہاتھ تھام کر کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے غم آلود لہجے میں بولا۔ "اچھا کیا تم نے ۔ تم منہ اندھیرے ہی دور چلی گئیں۔ ورنہ اس کا چیخنا تم سے نہ سنا جاتا ۔ اور پھر تم نے آج تک اپنے ہوش میں کسی کو مرتے ہوئے بھی تو نہیں دیکھا"

مگا جوہی نے زور سے ایک چیخ ماری۔ "پردیسی" اور تیورا کر زمین پر گر پڑی۔ اس کے دانت لگ گئے۔ اور منہ سے سرخی مائل جھاگ نکلنے لگی۔

نیچے وادی کی پگڈنڈی پر کوئی گڈریا نہایت پرسوز آواز میں پہاڑی گیت گانے لگا۔

"او پردیسی! مجھے محبت بھری نظروں سے نہ دیکھ میں وہ تتلی ہوں جو جلنے کے لیے آئی ہے ۔۔ آرزو کی پاڑیاں سخت ہیں اور میرے پاؤں نازک ہیں ۔۔ شاخ کے پھولوں سے پہلے تو سے چھل جاتے ہیں ۔ مجھے محبت بھری نظروں سے نہ دیکھ۔

"پردیسی! اگر تو مجھ سے محبت کرتا ہے ۔ تو مجھے ۔۔ میری ماں نے مجھے بہت دکھوں سے پالا ہے مجھے شہر کے پھول اور کہسار کے نظارے بہت عزیز ہیں ۔ مگر میں تیری خاطر سب کچھ چھوڑ دوں گی ۔ پردیسی اگر تو مجھے چاہتا ہے ۔ تو مجھے بیاہ ۔۔۔ مجھے اپنے ساتھ لے جا"

شوکت ہاشمی

فرخ آباد ایک پرانا بادشاہی شہر ہے ۔ اونچے اونچے محلات، بڑی بڑی مسجدیں، چوڑے چوڑے تالاب چھوٹی چھوٹی سڑکیں۔ گلیاں کم ۔ باغ زیادہ ۔ باغیچے جن میں پھلوں سے لدے ہوئے گھنے درخت ہر وقت کھڑے سائیں سائیں کیا کرتے ہیں۔ کسی سمت نکل جایئے آپ کو بڑے بڑے دروازے ملیں گے، تالاب نظر آئیں گے ۔ جن میں مچھیرے سنگھاڑے بوتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ شام ہوتے ہی مسجدوں سے اذانوں کی آواز کان میں آئی ۔ مندروں سے گھنٹیوں کی سریلی آواز نے فضا میں ارتعاش پیدا کرنا شروع کر دیا۔ دور پہاڑی پر پرانا قلعہ دیکھ لیجیے۔ لال پتھر کی مضبوط فصیلیں جو کہ سالہا سال کے باد و باراں کے اثر سے کالی ہو چکی ہیں۔ شہر چونکہ اونچی سطح زمین پر واقع ہے اس لیے گرمی میں سخت گرمی ہوتی ہے اور سردی میں سردی اپنا پورا شباب دکھلاتی ہے ۔ لیکن اب اس پرانے شہر میں نئی تہذیب بھی چپکے چپکے داخل ہو گئی ہے ۔ عالیشان مسجدوں کے سامنے میں اب تم پتھر سمنٹ کانکریٹ کے بنگلے دکھائی دیں گے۔ اسی طرح جیسے بارش میں پرانے پیپل کے آس پاس نئی جھاڑیاں اگ آتی ہیں۔ نئی جھاڑیاں سرسبز اور لہلہاتی ہوئی ضرور ہوتی ہیں لیکن پیپل کی شان نرالی ہی ہوتی ہے ان میں سارے دن تبدیلی ہوتی رہتی ہے ۔ لیکن پیپل ہمیشہ اپنی پچھلی صورت پر قائم رہتا ہے ۔ جب آندھی چلتی ہے تو اس کی شاخیں خوشی سے جھومنے لگتی ہیں۔ بارش میں پانی کی بوندیں ٹپ ٹپ اس کے پتوں پر ساز بجاتی ہیں۔ یہی حال میرے اس شہر فرخ آباد کا ہے ، ادھر نئی ایجادات کی نمائش ۔ ادھر تہذیب دیرینہ کا وقار ۔ ایک طرف اونچی اونچی دیواروں کے پرانے شاہی محلات دوسری طرف رزیڈنٹ کا ننھا سا بنگلہ ۔ حالانکہ شاہی محل سے اب رزیڈنٹ کے اصطبل اور نوکروں کے رہنے کے گھروں کا کام لیا جاتا ہے لیکن اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو اسی سمنٹ کے چھوٹے سے بنگلے کے مقابلہ میں قدیم محل آرٹ کا نمونہ ہے سنگ تراشی کے کاموں میں اپنی نظیر نہیں رکھتا مگر اسی طرح رزیڈنٹ کا بنگلہ بھی نئے آرٹ کی شان دوبالا کر رہا ہے چاندنی رات میں جس وقت یہ بنگلا اپنے چبوترے سے باغیچے کے درمیان دور سے جھلمل جھلمل کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے زمین پر دوسرا چاند اتر آیا ہے ۔

غرض کہ فرخ آباد پرانی اور نئی تہذیب کا سنگم ہے یہاں جس طرح قدیم محلوں اور مسجدوں کے برابر برابر ہمیں نئے آرٹ کے نمونے نظر آتے ہیں اسی طرح جبوں اور سلیم شاہی جوتوں کے ساتھ ساتھ ۔ سوٹ ٹائی اور بوٹ کھٹ کھٹ کرتے ہوئے سڑکوں پر چلتے پھرتے دکھلائی دیتے ہیں ۔ یہی نہیں پنڈت اور مولویوں کی برادری میں پادری بھی شامل ہو گئے ہیں پردہ دار رتھوں اور بگھیوں کی بجائے اب سائیکلوں پر فراٹے بھرتے ہوئے سائے جو لڑکیاں اور ساڑیاں نظر آتی ہیں [illegible] کے پردے میں سے جھانکتی ہوئی نرگسی آنکھوں [illegible] اب پیار کرنا ایسا [illegible] ہم چشم [illegible]

ہیں کہ ایک لمحے کیلیے دیکھنے والے کی نظر پر جو ایک کرہ بیانی [illegible]

ایسے شہر میں رہنے کی وجہ سے میں قدیم و جدید، دونوں تہذیبوں سے متاثر ہوں اس کا سبب یہ بھی ہے کہ میرے والد ڈاڑھی رکھتے ہیں لیکن انگریزی سوٹ پہنتے ہیں۔ میری بہنیں پردے میں رہتی ہیں لیکن انگریزی تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ میں نماز پڑھتا ہوں لیکن سینما بھی دیکھنے جاتا ہوں عام طور پر ترکی ٹوپی استعمال کرتا ہوں لیکن دھوپ سے بچنے کے لیے ہیٹ بھی پہنا کرتا ہوں۔ میرے پاس ایک سوٹ بھی ہے اور دو پتلون اس کے علاوہ ہیں لیکن یہ لباس زیادہ تر اس وقت استعمال میں آتا ہے۔ جب میں فرخ آباد سے دو سو میل دور ایک شہر میں رہتا ہوں جہاں کہ میں پروفیسر ہوں۔ جب میں فرخ آباد میں ہوتا ہوں تو گرمی زیادہ پڑنے کی وجہ سے اپنے مکان سے قریب کے ایک تالاب پر نہانے جاتا ہوں۔ اس سے مجھے دو فایدے ہیں۔ یہ ایک کہ گرمی میں نلوں میں پانی کم آنے کی وجہ سے گھر پر نہانا مشکل ہوتا ہے دوسرے یہ کہ میرا چھوٹا بھائی بھی میرے ساتھ نہا لیتا ہے۔ احد اسی طرح اس کو صبح جلدی اٹھنے کی عادت ہو جاتی ہے، اور اس کی صحت بھی اچھی رہتی ہے۔

صبح کا وقت کتنا سہانا ہوتا ہے۔ اسی کی خوبیاں ہر علی الصبح بیدار ہونے والا جانتا ہے۔ چاہے گرمی ہو یا سردی صبح ہوا میں ایک دلفریب و روح پرور خنکی ہوتی ہے ہلکی ہلکی ہوا چلتی ہے جو اس موسم کو بہت ہی اچھی معلوم ہوتی ہے سورج کا نکلنا اور شفق کا پھوٹنا دل کو بہت ہی خوش کرنے والے منظر ہوتے ہیں۔ سڑکیں سونی ہوتی ہیں۔ موٹر کاروں کا کوئی خوف نہیں۔ سڑکوں کی دھول نہایت ساکن اور دبی ہوئی۔ آپ کو ہوا میں دھول کا ایک بھی ذرہ شامل نظر نہیں آئیگا۔ اس وقت سڑکوں کی دھول اسی طرح نظروں سے پوشیدہ ہوتی ہے جس طرح کہ ایک خاموش و سنجیدہ انسان کے ذہنی و قلبی تاثرات اس کے چہرے سے اندازہ لگانا سخت مشکل ہے۔

لیکن تالاب پر پہنچتے ہی دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہتی۔ وسیع تالاب اس کی سطح پر ننھی ننھی تڑپتی ہوئی لہریں سطح آب پر تیرتی ہوئی صاف شفاف لگتی ہیں۔ میرے بھائی امجد کو تالاب میں پتھر پھینکنے کا بہت شوق ہے۔ پتھر تو ڈوب جاتا ہے لیکن تالاب کی سطح پر چھوٹے چھوٹے دایرے بن جاتے ہیں یہ چھوٹے دایرے آہستہ آہستہ بڑے بڑے دایرے بنتے ہیں اور پھر کنارے کے قریب آتے آتے غایب ہو جاتے ہیں۔ امجد مجھ سے سوال کرتا ہے یہ چھوٹے چھوٹے دایرے کیوں بنتے ہیں اور پھر غایب کیوں ہو جاتے ہیں۔ وہ ابھی سے بہت بڑا فلسفی ہے۔ جب تک وہ اپنے سوالات کا اطمینان بخش جواب نہیں پاتا سوالات کی بوچھار کم نہیں کرتا

صبح کے وقت تالاب کی سیڑھیاں خالی ہوتی ہیں، دور اس کنارے پر دھوبیوں کی بھٹیاں چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ دھوبیوں کی چھیوں رام، چھیوں رام کی صدائیں فضائے بسیط میں گونجتی ہوئی سنائی دیتی ہیں۔ یہ تالاب اصل میں "فخر المساجد" کے حوض کا کام دینے کے لیے بنوایا گیا تھا۔ یہ مسجد تالاب کے جانب جنوب واقع ہے لیکن افسوس والی سلطنت کی موت واقع ہو جانے کی وجہ سے نہ تو "فخر المساجد" ہی مکمل ہو سکی نہ اس تالاب نے اس کے حوض کا کام دیا۔ نئے والیان سلطنت کو اپنے بنگلوں اور نئی نئی تفریح گاہوں کے تعمیر کرانے سے فرصت نہ ملی جو اس مسجد کی جانب بھی نظر ڈالتے بہرحال اس مسجد کے ادھورے مگر خوبصورت میناروں کا عکس تالاب میں بہت ہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ تالاب کے شمال کی جانب سراج محل ہے۔ یہ محل چھ یا سات منزلہ ایک سنگین عمارت ہے۔ گول اور سنہری کلس والے گنبد اس کی شان کو دوبالا کرتے رہتے ہیں۔ تالاب کی جانب اس کے دریچے اور جھروکے کھلتے ہیں۔

جس وقت میں اور امجد نہانے جاتے تھے ابھی [illegible] تالاب سونا ہوتا تھا۔ امجد کنارے کی سیڑھیوں پر [illegible]

میں تیرتا ہوا دور نکل جاتا۔ مجھے تیرنے کا شوق زیادہ یوں بھی ہو گیا تھا کہ میں جس کالج میں پروفیسر تھا اس میں اسی سال ایک حوض طلبا کے تیرنے کے لیے تعمیر ہوا تھا۔ مجھے زیادہ تیرنا نہیں آتا تھا اور پھر یہ کہ چھلانگ لگانے میں مجھے بہت ڈر لگتا تھا۔ اس لیے چھٹیوں میں میں اس تالاب میں زیادہ تیرنے کی کوشش کرتا۔ ساتھ ہی ساتھ چھلانگ لگانے کی بھی مشق کرتا اور امجد میری ہمت بڑھاتا۔ حالانکہ جب میں اس سے تیرنا سیکھنے کو کہتا تو انکار کر دیتا۔ لیکن کچھ دن سے ہم دونوں کے پہنچنے کے وقت چند لڑکے ایک نوکر کے ساتھ نہانے آتے۔ ریشمی قمیص زیب تن کیے ہوئے۔ ہر ایک کے پاس ایک ایک تولیہ اور نیکر۔ حسین و خوبصورت چہرے تندرستی اور خوش حالی کی نشانی۔ وہ بہت ہی شریر لڑکے تھے۔ اتنا شور مچاتے اتنا پانی اڑاتے کہ نوکر بیچارا پریشان ہو جاتا۔ امجد بھی ان لڑکوں کے ساتھ کھیل و شرارت میں مصروف ہو جاتا میں ادھر چھلانگ لگانے کی مشق کرتا۔ کبھی میرا پاؤں سیڑھی پر پھسل جاتا اور میں زور سے سینے کے بل پانی پر گرتا جس سے اتنی سخت چوٹ آتی کہ میں پھر چھلانگ لگانے سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لیتا۔ مگر دوسرے روز جب کالج کے خوبصورت حوض کا خیال آتا تو میں پھر ہمت کر کے چھلانگ لگانے کی کوشش کرتا اور پھر سینے کے بل گرتا۔

یہ لڑکے روزانہ بلاناغہ اس وقت آتے اور نہاتے وقت اتنا شور مچاتے کہ اس کنارے پر سے دھوبی بھی تھوڑی دیر کے لیے اپنا کام روک کر ہماری طرف دیکھنے لگتے۔ تیرنا ان لڑکوں میں سے ایک کو بھی نہیں آتا تھا۔ یہ لوگ خوب ایک دوسرے پر پانی پھینکتے اور ہنستے۔ کچھ تیرنے کی کوشش کرتے تھے۔ سرائے محل کا ایک دریچہ جو کہ پہلے بند رہتا تھا اب کھلا رہتا۔ اور اس کا زریں پردہ ہٹا کر ایک نوجوان لڑکی جھانکا کرتی۔ پہلے روز جب یہ لڑکے گئے اور انہوں نے دور زور سے کسی سے باتیں کرنا شروع کیں تو میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ یہ کس سے باتیں کر رہے ہیں۔ ایک ہلکی سی آواز فضا میں تیرتی ہوئی اس کے جواب میں سنائی دے رہی تھی۔ سب سے چھوٹا لڑکا پکار کر کہتا ــ

"آپ جھوٹ بول رہی ہیں آپا"

اس سے بڑا کہتا

"رشید آپا سے کہنا آپ بھی آ جایئے نہانے۔ کوئی نہیں ہے یہاں پر!"

"آپا کھڑکی سے چھلانگ لگایئے نا! دیکھیں آپ کیسی تیراک ہیں؟"

"ظفر بھائی آپ نے سنا آپا کیا کہہ رہی ہیں؟"

"کہتی ہیں جلد نہا کر واپس لوٹو امی جان ناراض ہوں گی نہیں تو"

"ہم لوگ ابھی آ رہے ہیں کیوں ناراحت؟" چھوٹا لڑکا اپنے ملازم سے کہتا۔ اس کے بعد وہ لڑکے غوطے لگانے میں مصروف ہو جاتے۔

روزانہ لڑکے آتے اور اس طرح اپنی آپا سے جو کہ دریچہ میں کھڑی ہوتی باتیں کرتے۔ امجد ان کی شرارتوں میں شامل ہو جاتا۔ کسی دن اگر ہوا ساکن ہوتی تو میں بھی ان کی گفتگو سے لطف اندوز ہو لیتا۔ لیکن ہوا چل رہی ہوتی اور لہریں زور سے آ کر کنارے سے ٹکراتیں تو میں صرف دریچہ میں کھڑی حسین لڑکی کو دیکھا کرتا۔ اور جوش میں آ کر کئی چھلانگیں لگاتا اور کوشش کرتا کہ دریچے والی حسین میری چھلانگوں کو دیکھے۔ یہ لڑکے اکثر ایسی دلچسپ باتیں اپنی آپا سے کرتے کہ میرے سینے میں گدگدی سی ہونے لگتی۔ اور میں بھی اس دلچسپ گفتگو میں حصہ لینے کی کوشش کرتا۔ ایک دن ان لڑکوں نے آتے ہی نہانا چھوڑ کر پیڑ پھولوں [illegible] کا ناشتہ شروع کر دیا۔ اور اتنا کھیل کھیلنے میں مصروف ہو گئے۔ [illegible] نے بہت شور کیا مگر کون سنتا ہے۔

"رشید میاں جلدی سے نہا لیجیے [illegible]

دل لگی ۔"

"نہانے ہی تو آئے ہیں نہالیں گے بڈھے ۔ جلدی کیوں
ادکھی ہے ۔"

"حضور پچاڑ ولوگ بھی تو تالاب پر آنا شروع ہو جائیں گے
و کیا کہیں گے ۔"

"کیا کہیں گے ؟" رشید نے بھاگتے ہوئے کہا ۔
یہی نا کہ ہم نہانے سے قبل کھیل رہے ہیں ۔"

"نہیں حضور یہ کہیں گے کہ نواب حشمت بہادر کے بچے
ہی اس تالاب نہانے تھے ۔"

"کیوں تو کیا تالاب ان معصوموں کیلئے نہیں ہے ۔"
ں نے راحت سے پوچھا ۔

"نہیں میاں ۔ آپ نہیں سمجھے ۔ یہ بچے شاہی خاندان
سے تعلق رکھتے ہیں ۔ لیکن جو کچھ رہ گیا ہے وہ صرف خاندانی
زت ہے ۔ اب کیا دھرا ہے ۔ پہلے کیا شان تھی ان لوگوں
آپ کو نہیں معلوم ۔ اب محل کا حوض خشک ہوئے ایک برس کے
ریب ہو گیا لیکن یہ ہمت نہیں کہ اسے درست کروائیں ۔ مجبور
با چوری چھپے بچوں کو اس وقت یہاں نہانے لے آتا ہوں
س پر بھی آپ دیکھتے ہیں شہزادی صاحبہ دریچہ میں سے
جھانکتی ہی رہتی ہیں ۔ وہ دیکھیے اس وقت بھی کھڑی ہوئی
یں ۔"

راحت کے کہتے ہی میں مڑ کر دریچے کی طرف دیکھنے لگا

ہزادی صاحبہ !

وہ تو آج عجیب خوب سی معلوم ہو رہی تھیں وہ دریچہ
جالی سے چہرا لیے کھڑی تھیں ۔ ان کا سبز ڈوپٹہ ہوا میں
ہرا رہا تھا ۔ آہ وہ دریچہ مجھ سے کتنی دور تھا ۔ اور کتنی بلندی
۔ پر راحت نے بچوں کو اشارہ کر دیا ۔ اور وہ ایک جگہ جمع ہو کر
ریچے کی طرف ... نظروں سے دیکھنے لگے ۔ آج انہیں
ہت دیر ہو گئی تھی ۔
... ابھی آتے ہیں ۔" ... نے

لڑکے نے ڈرتے ڈرتے کہا ۔

"تم سب بہت شریر ہو ۔ ابھی تک کیا کر رہے تھے ۔"
میں نے چپکے سے رشید سے کہا ۔ "کہنا ۔ ہم آپ کا
انتظار کر رہے تھے ۔"

"اوہو ! مگر کیوں کر رہے تھے آپ میرا انتظار ؟"
میں نے پھر کہا "کہہ دو ۔ آپ سامنے ہوتی ہیں تو نہانے میں
دل لگتا ہے ۔"

"یہ بھی خوب رہی !"

رشید نے پھر میری طرف دیکھا ۔ اس سے کوئی جواب
نہ بن پڑا ۔

"ایک ہی بات کیوں ہو لی ۔ آپ کو دیکھ کر ہماری ہمت
بندھی رہتی ہے اور خوب نڈر ہو کر تیرتے ہیں ۔"

"تیرتے ہیں !" جلکے سے قہقہے کی آواز آئی "اجی
منے میاں تیرنا سیکھتے ہیں کہیے ۔"

"آپ دریچے میں کھڑی کھڑی باتیں کیا بنا رہی ہیں
ذرا تالاب پر آ کر دیکھیے یہ مردوں کا ہی کام ہے کہ پانی کی لہروں
سے کھیلتے ہیں ۔"

"ابھی تم چھوٹے ہو ۔ تمہیں نہیں معلوم کہ زندگی کی لہروں
سے کھیلنا پانی کی لہروں کے مقابلہ میں کتنا مشکل ہے ۔"

"زندگی کی لہریں !" آہ میں اتنے عرصے سے صرف
پانی کی لہروں کے تھپیڑوں سے ڈرتا تھا ۔ میں نے زور سے
ایک چھلانگ لگائی اور تیرتا ہوا اتنی دور چلا گیا کہ دریچہ
میری نظروں سے اوجھل ہو گیا ۔ اور میرا سانس اکھڑنے لگا
جب میں واپس ہوا ہوں تو رشید اور اس کے بھائی جا چکے
تھے ۔ میرا بھائی بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا ۔ اس نے کہا ۔

"بھائی صاحب ۔ اتنی دور نہ جایا کیجیے ۔ مجھے
ڈر لگنے لگتا ہے اور پھر آج لہریں بھی بہت زور زور کی
اٹھ رہی ہیں ۔"

"اجی یہ لہریں کچھ بھی نہیں بالکل کچھ نہیں ـــ ..."

پانی کی لہریں ہیں ۔ کتنی حقیر!"

"لیکن بھائی صاحب یہ چھوٹی چھوٹی اور حقیر لہریں ہی تو آپ کہتے ہیں بڑے بڑے جہاز غرق کر دیا کرتی ہیں۔"

"لیکن ان کے مقابلے میں زندگی کی لہریں ۔۔۔ نہیں امجد تو نہیں سمجھ سکتا ۔۔۔"

"واہ سمجھ کیسے نہیں سکتا ۔ یوں کہیے آپ سمجھا نہیں سکتے"

اس دن کیا معلوم کیوں "شہزادی صاحبہ" میرے تصور میں گھومتی رہیں ان کے چہرے کا دھندلا سا عکس میرے ذہن لاشعور پر چھایا رہا ۔ میں اپنے دل میں عجیب عجیب منصوبے باندھتا رہا ۔ عجیب وغریب مضحکہ خیز اسکیمیں بنائیں ۔ کبھی میں نے خیال کیا کہ میں کسی ترکیب سے رشید کا ٹیوٹر ہو جاؤں اور اس طرح "شہزادی صاحبہ" تک میری پہنچ ہو سکے ۔ میں نے سوچا راحت کے ذریعے یہ کام آسان ہو جائے گا کیونکہ وہ ان کا پڑھانا لازم ہے ۔ اور اسے بچوں کی تعلیم کا بھی خیال ہے ۔ لیکن یہ سب کیوں ؟ مجھے شہزادی صاحبہ تک پہنچنے کی اتنی خواہش کیوں تھی ؟ میں شہزادی صاحبہ کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا ۔ ان سے گفتگو کرنا چاہتا تھا ۔ وہ مجھے بہت اچھی معلوم ہوتی تھیں ۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا کہ ان سے شناسائی حاصل ہو جانے پر میری زندگی میں تبدیلی ہو جائے گی ۔ اور جو یہ موجودہ بے کیفی سی طاری ہے ختم ہو جائے گی ۔ میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوگا اور یہ نئی زندگی دلچسپ ، پرکیف ، اور شاعرانہ ہوگی ۔ یہ موجودہ جمود اور یہ روحانی خستگی کے سارے بادل جو عرصے سے چھائے ہوئے ہیں چھٹ جائیں گے اور آفتاب تازہ میری افق حیات کو منور کر دے گا ۔ میں اپنی اور دوسروں کی زندگی کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کے لائق ہو سکوں گا ۔

رات بڑی بے کلی سے بسر ہوئی دوسرے روز میں بہت جلد ہی امجد کو ساتھ لے کر تالاب پہ پہنچ گیا ۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا اور مشرق میں نیلے اور سرخ رنگ کی آمیزش تھی ۔ ہلکی ہلکی ہوا جسم کو گدگدا رہی تھی ۔ تالاب کی لہریں نیم خفتہ انداز میں امڈ رہی تھیں ۔ جن پر فخرالمساجد کا عکس بہتر نظر آ رہا تھا ۔ جسے دیکھ دل و دماغ پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی تھی ۔ اس کے ادھورے مناسب صبح کے گہرے نیلے آسمان پر عجیب پرخوف تصویر پیش کر رہے تھے ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کوئی سرکٹا دیوا اپنے خون آلود جسم سمیت کے تعاقب سے تھک کر اپنی زندگی کا آخری سانس لے رہا ہو ۔ میں دو تین مرتبہ تیر کر واپس آ گیا ۔ لیکن رشید اور ان کے بھائی ابھی تک نہیں آئے ۔ سراج محل کے دریچوں میں آویزاں پردے ہوا میں ہل رہے تھے ۔ سورج کی کرنیں کو جگمگا رہی تھیں ۔ آہستہ آہستہ دھوپ کی سرخی سفید تبدیل ہو گئی ۔ تالاب پر فخرالمساجد کا عکس ڈگمگانے لگا ۔ محل کے گنبدوں کے سنہری کلس روشنی میں چمکنے لگے ۔ صبح کی خنکی حدت میں تبدیل ہو گئی ۔ امجد ناشتے کے لیے بے چین ہونے لگا ۔ مگر رشید وغیرہ نہیں آئے ۔ نہ ہی سراج محل کے اس خاص دریچے کے کٹہرے سے سہارا لیے کھڑا ہوا کوئی نظر آیا ۔ مگر سراج محل ایک سنتری کی طرح رعب داب انداز میں کھڑا ہوا مجھے گھور رہا تھا ۔

دوسرا دن بھی اسی طرح گزرا ۔ تیسرا ، چوتھا ۔ ایک ہفتہ گزر گیا ۔ میں اب زیادہ دیر تک نہیں تیر سکتا تھا سانس جلد ہی اکھڑ جاتا ۔ اگر چھلانگ لگاتا تو پہلے کی بہ نسبت سینے کے بل زور سے گرتا ۔ بہ نسبت اس کے امجد اب تھوڑا تیرنا سیکھ گیا تھا ۔ میں سوچتا کہ اب سراج محل کا یہ دریچہ ہمیشہ کے لیے بند رہے گا ۔ میری تاریک زندگی میں تھوڑی دیر کے لیے ایک پرنور کرن داخل ہوتی تھی لیکن وہ مجھ سے چھین لی گئی ۔ اور میں پہلے سے زیادہ [illegible] پھینک دیا گیا ۔ شہزادی صاحبہ سے مجھے بہت [illegible] ان کے بغیر اب میں اپنی زندگی میں ایک [illegible] محسوس ہونے لگا [illegible]

لوگ آ گئے! وہی شرارت! وہی پانی کے چھینٹے۔ وہی لڑائی جھگڑا! اور میل ملاپ۔ بوڑھا راحت بیٹھا ہوا انہیں دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

"ان ننھے سرکاروں کو خوش و خرم دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ بابو صاحب۔" اس نے مجھ سے کہا۔

"سچ ہے راحت۔ بچپن کا زمانہ واقعی ——"

"کچھ دن بعد یہ لوگ جوان ہو جائیں گے۔ اور راحت سے چھین لیے جائیں گے۔ یہ راحت کو بھول جائیں گے کوئی حسین شہزادی ان کے دلوں پر قبضہ کر لے گی۔"

"راحت تم ان بچوں سے بہت محبت کرتے ہو؟"

"کیوں نہ کروں صاحب۔ میں نے ان کا نمک کھایا ہے نمک!"

میں نے دریچے کی طرف نظریں اٹھائیں۔ دریچہ بند تھا۔ میں نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور تیرنے میں مشغول ہو گیا میری ہمت نہ ہوئی کہ راحت سے کچھ پوچھوں۔ اور پھر راحت آج کچھ چپ بھی تھا۔ آخر میں نے رشید سے پوچھ ہی لیا،

"اتنے دن کہاں غائب رہے رشید؟"

"لکھنؤ گئے تھے یہ لوگ بھائی جان" امجد نے مجھ سے کہا۔

"کیوں کس غرض سے؟"

"ان کی آپا کی شادی تھی۔"

یہ سنتے ہی میرے جسم میں ایک پھریری سی دوڑ گئی۔ لیکن میں نے ہمت کر کے کہا۔

"کیوں رشید میاں ہمیں اور اپنے چھوٹے دوست کو بھول ہی گئے آپ لوگ"، یہ کہہ کر میں نے جلدی سے اپنے چہرے کو دوسری طرف پھیر لیا۔ مجھے اپنی آنکھوں میں کچھ نمی اور سینے میں جلن سی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن رشید دوڑ کر اس طرح کہا۔

"آپ جھوٹ ہیں بھائی صاحب!" اس نے کہا۔

"نہیں تو۔ ابھی پانی سے نکلا ہوں نا۔ اسی کی کچھ نمی آنکھوں میں رہ گئی ہے۔"

"آپ جھوٹ کیوں بولتے ہیں بھائی صاحب۔ یقین مانیے ہمیں بھی آپا کی شادی کے وقت رونا آ گیا تھا۔ ریل میں ہم خوشی خوشی وہاں سے گئے۔ خوب خوب شرارتیں ہم سب بھائیوں نے مل کر سوچیں کہ اس طرح ہم دولہا میاں کو تنگ کریں گے۔ یوں ان کے جوتے چھپا دیں گے۔ لیکن وہاں جا کر جب دولہا کو ہم نے اپنے ابا جان کے برابر پایا تو ہماری خوشی کافور ہو گئی۔ بھائی صاحب آپا کا جوڑا ان سے بالکل نہیں ملتا تھا۔ ہم نے ابا جان سے شکایت کی تو انہوں نے ہمیں ڈانٹ کر خاموش کر دیا اور عمر میں اپنے سے بڑے داماد سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔ آپا جان مسلسل روتی ہی رہیں ان کی یہ حالت دیکھ کر میری بھی گھگھی بندھ گئی جب وہ تھک گئیں تو کہنے لگیں۔ "رشید یاد ہے مجھے وہ لہروں والی بات۔ تو نے کہا تھا کہ پانی کی لہروں سے کھیلنا مردوں کا ہی کام ہے۔ میں نے جواب دیا تھا کہ زندگی کی لہریں اس سے زیادہ خوفناک ہوتی ہیں۔ تو نے بھی دیکھ لیا کہ زندگی کی ایک ہلکی سی لہر نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔"

میں آپا سے لپٹ کر خوب رویا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر میری ہمت بڑھائی۔ "رشید تو مرد ہے۔ تجھے سینہ سپر ہو کر زندگی کی لہروں کا مقابلہ کرنا چاہیے مجھ کو دیکھ عورت ذات ہو کر خوشی سے اپنے خاندان کی عزت قائم رکھنے کے لیے اپنی خوشیوں کو قربان کر رہی ہوں۔"

رشید یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ اس کی معصوم آنکھوں میں چند آنسو موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ ایسے میں راحت نے آواز دی اور وہ سلام کر کے چلے گئے۔ میں بیٹھا تالاب کی لہروں کو دیکھتا رہا۔ آہ! ان لہروں میں اور زندگی کی لہروں میں کتنا بڑا فرق ہے۔ یہ لہریں اسی طرح اٹھتی بیٹھتی ہیں مگر زندگی کی لہریں ہم کو زندہ درگور کر دیتی ہیں۔

شوکت حسین

وہ کون ہے؟ یہ جاننے کے لیے میرا دل آج بھی بڑی دیر سے مضطرب ہے۔ پہلی مرتبہ میں نے اسے شہر کے ایک بہترین سینما ہال میں اتنا قریب سے دیکھا تھا کہ میرا ہاتھ اس کے چھونے کے لیے پہنچ سکتا تھا۔ وہ اپنی ہمجولیوں کے ساتھ درجہ خاص کی نشستوں پر بیٹھی ہوئی "مرمریں مجسمہ" دکھائی دے رہی تھی۔ نورانی پیکر، حسن و شباب کا مکمل نمونہ، بڑی بڑی بادہ فروش آنکھیں جو معصومیت اور دوشیزگی کا جذبہ لیے ہوئے، لمبی لمبی گھنی پلکوں کے سائے میں ایک عجیب پرکیف دعوت کی حامل تھیں۔ گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ جو بعض وقت اپنے ساتھیوں کی پر مذاق گفتگو سے متاثر ہو کر مسکراہٹ سے نیم وا ہو جاتے، چہرے کی شگفتگی اور تازگی بعض وقت ظرافت و سنجیدگی کے اثرات لیے ہوئے، بڑی حد تک دلکشی کی شان پیدا کر دیتی۔ گل و عطر میں بسی ہوئی لباس کی مہکتیں دل و دماغ کو مدہوش کیے دیتی تھیں۔ میں عالم کیف و سرور میں اپنے ہمنشیں کے کندھوں کا سہارا لیے ہوئے ان حسین نقش و نگار کو اپنے دل پر نقش کر رہا تھا۔ تماشے کے شروع اور ختم ہونے کا مجھے احساس تو ہے، اگر کوئی مجھ سے کھیل کے کردار اور ان کی اداکاری کے متعلق کچھ دریافت کرتا تو میں اس کے جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکتا تھا۔ تماشائیوں کے ہجوم نے مجھے دیر سے باہر نکلنے دیا، اس عرصے میں وہ لڑکیاں باہر نکل کر اپنی کار میں بیٹھ چکی تھیں اور کار حرکت میں آ چکی تھی [illegible] تصویر کا ناکام تعاقب کر کے مایوسانہ لوٹ آیا۔

اس واقعے کو زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ میں دلی جا رہا تھا ٹرین ایک اسٹیشن پر رکی۔ میں کسی ضرورت سے پلیٹ فارم پر اتر پڑا۔ دفعتاً میری نظریں اپنے ہی قریب کے ایک حسین و جمیل منظر کو دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گئیں۔ تعجب کا کلمہ میری زبان سے نکلا۔ "ارے! سینما کی تصویر!" وہی شگفتگی لیا ہوا حسین چہرہ، آنکھوں میں کیف آور شباب، اور ہونٹوں پر دلآویز تبسم۔ میں نے لڑکی کو بہترین فاخرہ لباس میں۔ ایک خوش رو خوش پوش نوجوان کے پہلو میں دیکھا — ایک ناتمام آہ فضا میں گم ہو کر رہ گئی۔ اس نے غلط انداز نظروں سے مجھے دیکھا۔ غالباً پہچانا نہیں — لیکن میں نے تو — ایک کیف اور بہار کا جھونکا، عطر آگیں جنت بدوش، ہوا کی لہر میری آنکھوں کی راہ سے ہو کر دل و دماغ تک پہنچ گئی — وہ دونوں بالکل میرے قریب سے ہو کر گذر رہے۔ میں تحیر کی حالت میں حیرت کا مجسمہ بنا ہوا وہیں کا وہیں کھڑا رہا — انجن کی سیٹی کے ساتھ ٹرین نے حرکت کی۔ اور میں اپنی ضروریات کی تکمیل کیے بغیر ٹرین میں سوار ہو گیا —

اتفاق کی بات ہے، اسی سال کامیابی کے بعد میری تعیناتی دلی کے جنرل ہسپتال میں ہو گئی۔ ہفتے میں دو مرتبہ مجھے "نائٹ ڈیوٹی" بھی انجام دینی پڑتی تھی۔ ایک رات ایک نیا مریض کمرے کے وارڈ نمبر ۳ میں آ کر شریک ہوا۔ نرس کے ساتھ جب میں اس کے کمرے میں پہنچا۔ اندر داخل ہو کر میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ مریض کوچ پر لیٹا ہوا تھا۔ اور اس کے قریب لڑکی — "ارے — آپ! اوہ! آپ ڈاکٹر"؟ —

"جی" — وہی حسین شگفتگی اور دلکشی لیے ہوئے چہرہ، آنکھوں میں معصومیت اور دوشیزگی کی جھلک لیے ہوئے۔

"ڈاکٹر صاحب" لڑکی نے انتہائی سادگی اور التجا آمیز لہجے میں کہا "براہ کرم آپ انہیں دیکھ کر بتائیے کہ کیا ہو گیا ہے" مریض کا معائنہ اور سینے کی حالت دیکھنے کے بعد میں نے لڑکی کو

اطمینان دلایا کہ بخار تو ہے، اور سینہ کچھ متاثر معلوم ہوتا ہے۔
"کھانسی ہے آپ کو" — میں نے مریض سے استفسار کیا۔
"ہاں ڈاکٹر صاحب! کھانستے ہوئے سانس زیادہ پھولتی ہے"
"آپ آرام کریں —" نسخہ لکھ کر میں نے نرس کے حوالے کیا
اور لڑکی کو تسلی دیکر اپنے کمرے میں چلا آیا — تقریباً ہر روز
مجھے لڑکی سے ملنے کا اتفاق ہوتا، وہ پوری طرح مریض
کی دیکھ بھال اور نگہداشت میں مصروف رہتی — ایک ہفتے
کے علاج کے بعد وہ کسی قدر تندرست ہو کر اپنے گھر چلا گیا۔

ایک سال کے بعد میں ایک ہفتہ کی چھٹی لیکر اپنے
وطن چلا گیا۔ میرے ایک مصور دوست نے جو اسی سال مصوری
کی اعلیٰ ڈگری حاصل کر کے حیدرآباد آئے ہوئے تھے۔ ایک شام
اپنے اسٹوڈیو میں مجھے چائے پر مدعو کیا۔ چائے سے فارغ
ہو کر میں مصور دوست کے ساتھ اسٹوڈیو کا معاینہ کر رہا تھا۔
اور میرا دوست مصوری کے متعلق اپنی بصیرت افروز معلومات
بہم پہنچا رہا تھا، — اس اثنا میں ملازم نے آ کر اطلاع دی،
"کوئی لڑکی آپ سے ملنا چاہتی ہے" — "ملاقاتی کمرے میں
بٹھاؤ" مصور نے کہا — اور میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا۔
دیکھیے یہ میرا ایک نیا شاہکار ہے جو ایک لڑکی مجھ سے
بنوا رہی ہے — واللہ بڑی حسین اور عجیب و غریب ہے
وہ — میں نے غور سے تصویر دیکھی — ارے —
اس تصویر والی کو تو میں نے کہیں دیکھا ہے "دیکھا ہے!
کہاں" مصور نے دریافت کیا۔
"جی ہاں!" میں نے کہا "شاید ہسپتال میں"
"آج تصویر دینے کا وعدہ ہے" مصور نے کہا —
"شاید وہی لڑکی آئی ہو" — "چلو چلے اس سے مل لیں" — میں نے
کہا۔ لڑکی سفید لباس میں ہماری جانب پیٹھ کیے بیٹھی تھی، پیروں
کی آہٹ سنکر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "آپ ہی ہیں نا" میں نے
مسرت کے ساتھ کہا — "مگر آپ کے ساتھی —"
"وہ اب اس دنیا میں نہیں —" کہہ کر وہ انتہائی [illegible]

لمبی گھنی گھنی پلکیں نم آلود سی ہو گئیں — افسوس کہ گلاب پژمردہ
پھول ٹہنی سے جدا ہو کر بھی عارضی طور پر دلکشی ضرور رکھتا ہے — مگر
اس کے حسین چہرے سے شگفتگی و شادابی زائل ہو کر ایک حد تک
سنجیدگی اور غم آلود اثرات لیے ہوئے تھی — اب اس کی آنکھوں
میں مسرت کا جذبہ مفقود ہو کر غم آلود معصومیت کار فرما تھی — اس کا
بیحد سادہ لباس رنگینیوں اور زینتوں سے بالکل مبرا تھا۔
"آپ کب سے یہاں مقیم ہیں"—
"کچھ ٹھیک نہیں بتا سکتی —" جواب مایوس کن تھا —
"کوئی عزیز بھی ہے آپ کا"
"یہ سب کیوں دریافت کرتے ہیں آپ"؟
"اس لیے کہ مجھے آپ سے قدرے ہمدردی ہو چلی ہے"
"شکریہ! — حالانکہ میں اس ہمدردی کی مستحق نہیں"—
"آپ کا خیال ہے — بہتر ہے کہیں ملازمت کر لیں" —
"عورت اور ملازمت! عجیب ٹیڑھا سوال ہے"—
"ملازمت کوئی گناہ نہیں — آپ قبول کریں تو کوئی معلمی کی
نوکری آپ کے لیے تلاش کریں — آپ نے کوئی امتحان بھی پاس کیا"
"ایف اے تک تعلیم پائی ہے"
"پھر تو کوئی مشکل بات نہیں۔ رہنے کو ایسے میرا مکان حاضر ہے
آپ چاہیں تو آباد کر سکتی ہیں" لڑکی چونک پڑی — "آپکا مطلب"
"میرا مطلب یہ ہے کہ آپ اسے کرایہ پر لے سکتی ہیں"
وہ فوراً کھڑی ہو گئی اور تصویر کی اجرت ادا کر کے چلی گئی۔
"وہ اب میرے مکان کے ایک علیحدہ حصے میں کرایہ سے
مقیم ہے — ہم دونوں ہر روز ایک ہی دروازے سے باہر
نکلتے ہیں۔ نہ تو وہ کچھ کہتی ہے اور نہ مجھے کچھ پوچھنے کی جرأت
ہوتی ہے — یہاں تک کہ میں اس کے نام و حالات سے
بھی واقف نہیں ہوں — میرے لیے یہی غنیمت ہے کہ ہر روز
اس کا دیدار ہو جاتا ہے۔ [illegible]
کی چند تصویریں رہ گئی ہیں۔ جو میں نے [illegible]
مصور دوست سے بنوائی ہیں۔"

پہلی تصویر ــــ سینما کے واقعے کا اظہار کرتی ہے ــــ
دوسری ــــ اسٹیشن کے منظر کی یاد دلاتی ہے ــــ
تیسری ــــ دو انسانے کا افسانہ دہراتی ہے ــــ
چوتھی ــــ اور آخری ــــ معصوم دوست کے گھر کی
ملاقات ــــ پانچویں ــــ وہ متحرک تصویر ہے۔
جو ہر روز میری نگاہوں کے سامنے سے گذرتی ہے۔
مگر بولتی نہیں ــــ !!

صابر کوسگوی

خوش باش کلب

کوئی بارہ کا وقت ہو گا میں سینما دیکھ کر گھر واپس آ رہا تھا. رات اندھیری تھی. آسمان پر بادل چھائے تھے کچھ بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ بازار تقریباً سنسان پڑے تھے کہیں کہیں کسی تنبولی یا دودھ والے کی دکان کھلی تھی۔ میں بڑے بازار سے نکل کر ایک گلی کو ہو لیا۔ پتلی سی گلی تھی اور روشنی کا انتظام بھی کچھ ایسا ہی تھا. لیکن میرا مکان یہاں سے نزدیک پڑتا تھا. میں نے ابھی نصف راستہ ہی طے کیا تھا کہ اچانک ایک مکان کا دروازہ کھلا اور ایک عورت گھبرائی ہوئی باہر نکلی اور مجھے دیکھتے ہی عاجزی سے بولی

"خدا کے لیے بچا لو مجھے یا رحم کرو مجھ پر"

میرے ہاتھ میں ٹارچ تھا۔ میں نے ٹارچ روشن کیا۔ اس نے گڑگڑا کر اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ مجھے ظالموں سے بچا لو"

"کون ہو تم؟" میں نے پوچھا۔

اس نے پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا

"پہلے یہاں سے کہیں لے چلو مجھے"۔

وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی لیکن خوف اور ہراس کے باعث اس کا قدم مجھ سے کچھ آگے ہی پڑتا تھا۔ کبھی چلتے چلتے پیچھے پلٹ کر بھی دیکھ لیتی۔ عورت جوان تھی لیکن نہ سر پر دوپٹہ نہ اوڑھنی۔ نہ پاؤں میں جوتا۔ صرف قمیص اور شلوار پہنے ہوئے تھی

"کہاں جانا ہے تمہیں"۔ میں نے چلتے چلتے پوچھا۔

"جہاں لے چلیں آپ" اس نے کچھ خوفزدہ سی آواز سے کہا

"لیکن اس گلی سے جلدی نکل چلیے"

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ میں حیران تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے

چلتے چلتے بارش ہونے لگی۔ میں نے اپنا کوٹ اتارا اور اسے دیتے ہوئے کہا

"یہ اوڑھ لو"

اس نے کوٹ لے کر سر اور شانوں پر ڈال لیا۔ ہم دونوں خاموش چل رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔

"تم گھر سے بھاگ کر آئی ہو"

"میرا کوئی گھر نہیں"۔ اس نے جواب دیا۔

میں سوچ رہا تھا کہ اسے کہاں لے جاؤں. گھر لے جاؤں وہاں میری بیوی تھی۔ اور جب بیوی اپنے شوہر کے ساتھ دوسری عورت کو دیکھے تو پہلی نظر میں اس کا گمان نیک نہیں ہوتا۔ اصل واقعات سننے اور سمجھنے سے پیشتر جو رائے قایم کر لیتی ہے، مرد کے لیے اس کا بدلنا کچھ ایسا آسان نہیں ہوتا اور بے لطفی کے پیدا ہو جانے کا ہر وقت امکان رہتا ہے گو میری بیوی ایک تعلیم یافتہ عورت تھی اور میری گھریلو زندگی بہت خوشگوار تھی۔ تاہم جو لوگ بیوی کے جذبات اور احساسات کا احترام نہیں کرتے انہیں اس قسم کی مشکل سے کبھی نہ کبھی دو چار ہونا ہی پڑتا ہے۔ ایک عورت اپنے شوہر کی سبھی خطائیں لغزشیں معاف کر سکتی ہے لیکن سوکن اس کے لیے ناقابل برداشت چیز ہے مجھے خیال آیا کہ کیا اس عورت کو پولیس کی چوکی پر کیوں نہ لے جاؤں۔ ممکن ہے کہ یہ شوہر سے لڑ کر بھاگ کر آئی ہو۔ اور میں کہیں خدمت یا مدد کرنے میں نہ پھنس جاؤں۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ میں تمہیں پولیس کی چوکی پر لے چلوں وہاں تم ہر طرح سے محفوظ ہوگی"

لیکن اس نے بڑی عاجزی سے کہا

"خدا کے لیے ایسا نہ کیجیے! مجھے اپنے گھر لے چلیے!"

تو خیر! میں اسے اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ میری بیوی جو اس وقت جاگ رہی تھی۔ ایک عورت کو میرے ساتھ دیکھ کر بہت حیران ہوئی۔ میں نے انگریزی میں کہا۔

"بلقیس! یہ ایک مصیبت زدہ عورت ہے۔ رات کی رات ہمارے پاس ٹھیرے گی!"

"کیا ہرج ہے!" بلقیس نے کہا "لیکن آپ تو بالکل بھیگے ہوے ہیں۔ پیدل ہی آرہے ہیں کیا!"

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔ "پیدل ہی آرہا تھا جو یہ غریب بھی مل گئی!"

"تو آیئے"۔ بلقیس نے کہا "آپ یہ کپڑے اتاریے میں ماما کو کھانا لانے کو کہتی ہوں"

"ہاں! ہاں!" بلقیس نے کہا۔ "آپ جایئے! ابھی اسے بھی کپڑے دیتی ہوں!"

میں جب لباس بدل کر آیا تو وہ عورت میری بیوی کا ایک جوڑا پہنے کچھ سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ کھانے والے کمرے سے بلقیس آئی اور بولی۔

"آجایئے! کھانا تیار ہے!"

میں کرسی سے اٹھا لیکن وہ عورت بیٹھی رہی۔ بلقیس نے کہا "تم بھی آجاؤ نا!"

وہ عورت بولی مجھے معاف کیجیے۔ آپ لوگوں کے ساتھ بیٹھوں، میں اس قابل نہیں۔

"ہمارے ساتھ کھانے میں کچھ ہرج نہیں"۔ بلقیس نے اس سے کہا "آؤ!"

اور اسے ہاتھ سے پکڑ کر کھانے والے کمرے میں لے آئی، لیکن وہ کرسی پر بیٹھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بلقیس نے کہا۔

"[illegible] کھانا کھاؤ ہم سے جو خدمت ہوسکے گی ہم کریں گے"

بلقیس کے تسلی دینے سے اس کی کچھ ڈھارس بندھی۔ بلقیس نے مجھ سے انگریزی میں پوچھا۔

"یہ ہے کون؟ ساتھ کیسے آگئی؟"

جتنا مجھے معلوم تھا میں نے بھی انگریزی میں بلقیس کو بتلا دیا وہ عورت بولی۔

"معاف فرمایئے! انگریزی میں بھی کچھ سمجھ سکتی ہوں"

اس کی آنکھوں سے پھر آنسو گرنے لگے۔ وہ کہنے لگی۔

"میں ایک گنہگار عورت ہوں۔ اور اس قابل نہیں کہ آپ کے پاس بیٹھ سکوں مجھے خوف ہے کہ آپ جب میری سرگزشت سنیں گے تو شاید مجھ پر لعنت بھیجیں گے"

"خیر!" میں نے کہا۔ "تم کھانا تو کھاؤ۔ تمہارا قصہ بھی سن لیں گے"

اور بلقیس نے کہا۔

"بھوکے رہنے سے نہ غم غلط ہوسکتا ہے اور نہ تلافی مافات ہوسکتی ہے!"

وہ میز پر تو ہمارے ساتھ بیٹھی رہی لیکن کھایا کچھ برائے نام ہی، جب کھانا کھا چکے تو بلقیس نے ماما سے کہا کہ وہ بازو کے کمرے میں مہمان کے لیے بھی بستر لگا دے۔

جب دن چڑھا اور ہم چاے پینے بیٹھے تو ماما اس رات والی عورت کو بھی لے آئی۔ اس کی عمر کوئی بیس اکیس کے لگ بھگ ہوگی۔ ہر نقطۂ نظر سے خوبصورت تھی۔ اور گفتگو سے یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ ہے بھی کسی اچھے گھرانے کی۔ بلقیس نے چاے بنائی اور ایک پیالی اس کے آگے بھی رکھ دی، وہ کہنے لگی۔

میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے پناہ دی۔ ورنہ ممکن تھا کہ اس وقت تک میں زندہ نہ ہوتی۔ یا تو میں نے خودکشی کرلی ہوتی یا دوسروں نے مجھے ذبح کر ڈالا ہوتا!"

ہم دونوں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کہنے لگی "آپ کی اس [illegible] اور مہربانی کا شکریہ [illegible]

زیادہ کچھ نہیں کہ میں اپنی سرگذشت بے کم وکاست آپ کو سنا دوں۔ میرا نام زہرہ ہے۔ میں نے ایف اے تک تعلیم پائی ہے۔ میں اسی شہر کی رہنے والی ہوں۔ میرے والدین کو اس دنیا سے کوچ کیے تقریبا دو سال ہو چکے ہیں۔

میں ایف اے کے امتحان کی تیاری کر رہی تھی کہ ایک روز میرے باپ نے مجھ سے میری شادی کے متعلق کچھ بات چیت کی۔ میں نے کہا کہ ابا جان آپ مجھے بی۔ اے پاس کر لینے دیجیے۔ اس کے بعد یہ باتیں دیکھی جائینگی وہ کہنے لگے کہ مجھے کوئی نوکری تو کرنی نہیں جو تو بی۔ اے پاس کر لیگی۔ میں نے بہت اصرار کیا لیکن وہ اپنی بات پر قایم رہے۔ اور کہنے لگے کہ بیٹی! دنیا میں عزت اور توقیر اسی کی ہے جس کے پاس چار پیسے ہوں۔ میں نے جس شخص کو تمہارے لیے پسند کیا ہے وہ گو عمر میں تو تم سے کچھ بڑا ہی ہے لیکن اس وقت اس کا شہر کے بڑے بڑے دولتمندوں میں شمار ہے۔ اس کی پہلی دو بیویاں مر چکی ہیں۔ لیکن اولاد دونوں سے بھی نہیں۔ خدا نے چاہا تو بڑی عزت اور آرام سے زندگی بسر کروگی۔ تمہاری ماں کی بھی خدا اسے جنت نصیب کرے یہی تمنا تھی کہ تمہاری شادی کسی امیر آدمی سے ہو۔ شادی کی تاریخ بھی میں نے مقرر کر لی ہے۔ بس آج سے بیس روز بعد تم اپنے گھر والی ہو جاوگی۔ تمہارے ہونے والے شوہر کی یہ خواہش ہے کہ کسی قسم کا جہیز تیار نہ کیا جائے۔ زیورات پارچہ جات سب کچھ ادھر ہی سے تیار ہو کر آ جائینگے اور تم دیکھوگی کہ ایک دنیا تم پر رشک کرے گی تو خیر! ماں ہوتی تو شاید میں اسے اپنا ہم خیال بنا سکتی لیکن اب خاموشی کے سوا اور کچھ چارہ نہ تھا۔ اماں جان کے مرنے کے بعد گھر میاں اللہ داد ہی رہتے تھے۔ کھانا ماما پکاتی تھی۔ جب شادی میں دو چار روز رہ گئے تو ہمارے کنبے کی دو چار اور عورتیں بھی آ گئیں۔ ڈھولک بجا کی اور رسماً تو رسومات بھی ادا ہوتی رہیں۔ میری برات رات کے وقت آئی۔ برات کے آنے سے کچھ دیر پہلے باجا نواز آ گئے تھے۔ برات کے آنے پر باجا بجانے لگے۔ براتی دو موٹروں میں تھے۔ مل کر چھ سات آدمی ہوں گے۔ بہت قیمتی زیورات اور بڑے خوبصورت ملبوسات میرے لیے لائے تھے۔ برات آتے ہی نکاح کی رسم ادا کی گئی۔ پھر برات کو کھانا دیا گیا اور مجھے دس بجے کے قریب رخصت کر دیا گیا۔

میرا شوہر کوٹھی میں رہتا تھا۔ لیکن میرے شوہر کے خود اس کے سوا میری پیشوائی کے لیے اور کوئی نہ تھا۔ کوٹھی کا سامان بہت عمدہ تھا۔ ڈرائینگ روم یا گول کمرہ بہت سجا ہوا تھا۔ اور زمانے کی ضرورت کے مطابق موجود تھی۔ میرا شوہر مجھے گول کمرے میں لے گیا اور ایک پر بٹھا دیا۔ اور خود باہر چلا گیا۔ ایک ماما میرے پاس آئی۔ ماما کچھ تعجب کی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ پھر "خدا کا شکر ہے آج یہ گھر پھر ایک بار آباد نظر آ رہا ہے۔"

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

"اب تو امید ہے میاں مرزا صاحب کو ایک بیٹا عنایت کرے۔ بس سمجھو ہی سکھ ہے۔"

پھر آپ ہی آپ ہنسنے لگی۔

"زہرہ بیگم! میں ان کا بیس سال سے نمک کھا رہی ہوں۔ نام تو نفیسن ہے۔ لیکن سب مجھے کہتے سب ماما جی ہیں۔"

"تم ہی کرائی ہو کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں بیٹی!" ماما نے جواب دیا۔ "خدا کا شکر ہے کہ مبارک دلہن کی زیارت مجھے بھی نصیب ہوئی۔ خدا [illegible] نصیب کرے۔"

پھر وہ اپنے سفر کے حالات سنانے لگی۔ [illegible] مرزا صاحب بھی آ گئے۔ ماما [illegible] چلی گئی۔ مرزا صاحب میرے پاس کرسی پر [illegible] بیٹھ گئے۔ [illegible] بے تکلفانہ انداز سے بولے۔

"زہرہ! خدا کا شکر ہے کہ تم آگئیں۔ اب تم جانو اور تمہارا گھر
کرو۔ یہاں ایک تو یہ مہاجن ہے اور ایک باورچی۔ ایک باہر
کے کام کو نوکر ہے۔ ایک مالی اور ایک شوفر۔" پھر مسکرا کر
کہنے لگے۔ ایک ہمیں بھی گن لو۔ نوکر چاکر تو تمہاری خدمت
کریں گے۔ اور ہم ناز برداریاں۔ یہ کہکر انہوں نے میرا ہاتھ
اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ہنسکر پوچھا۔

"سچ کہنا یہ زیور پسند بھی آئے تمہیں؟"

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ پھر کہنے لگے۔

"زہرہ! میں تمہیں کسی مغالطے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ یہ تو
شاید تم سن چکی ہوگی کہ میری پہلی دو بیویاں مر چکی ہیں۔ ۔ ۔
اور۔ ۔ ۔ ۔"

"اور" میں نے ہولے سے کہا۔ "اب میری باری ہے"
انہیں یہ سنکر کچھ دھچکا سا لگا۔ اور میں یہ آپ سے ابھی
کہدوں کہ مجھے شوہر کی شکل دیکھتے ہی اس سے نفرت ہو گئی
تھی وہ کچھ درمیانہ قد کے تھے۔ چلتے بھی ذرا جھک کر۔ دانت
جتنے تھے مصنوعی تھے۔ چندیا صاف تھی نہ داڑھی تھی نہ
مونچھ۔ سر کے بچے کچھے بال اور بھنویں ہیر ڈائی سے کالی
ہو رہی تھیں۔ چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ آنکھوں
کا بھی یہی حال تھا۔ چشمہ لگاتے تھے۔ انگریزی لباس
پہنتے تھے۔ تو خیر! جیسے کہ میں ابھی ابھی عرض کر چکی ہوں
انہیں میری بات سنکر بہت تعجب ہوا۔ کچھ دیر تو خاموش
بیٹھے میری طرف دیکھتے رہے پھر ذرا مسکرا کر بولے

"یہ سب تعلیم کے کرشمے ہیں۔ ابھی ہمارا بیاہ ہوئے مشکل
سے تین چار گھنٹے ہوئے ہوں گے لیکن تمہاری آزاد خیالی
قابل داد ہے۔ اور میں بہت خوش نصیب ہوں کہ تم ایسی
آزاد خیال عورت مجھے ملی۔ اور شاید تم بھی یہ سن کر خوش
ہوگی کہ میں بھی ایک آزاد خیال آدمی ہوں۔ میں بیوی کو گھر کا
مالک سمجھتا ہوں۔ اور تم دیکھو گی کہ میں تمہارے کسی کام میں
[illegible]

اور کوئی تکلیف نہ ہوگی کہ گھر میں تم اکیلی رہو گی۔ میرا کاروبار
ادھر ادھر بہت پھیلا ہوا ہے۔ ایک وقت میں دو کام نہیں
ہو سکتے۔ تم اپنا گھر سنبھالو میں کاروبار کی نگرانی کروں گا۔"

وہ بول رہے تھے میں سن رہی تھی۔ کوئی بارہ بجے تک
میں بالکل خاموش بیٹھی ان کی باتیں جو میرے لیے بالکل
بے کیف تھیں سنتی رہی۔

میری شادی ہوئے بیس پچیس روز ہو چکے تھے۔
اس تمام عرصے میں میرے والد دو یا تین بار مجھ سے ملنے
آئے۔ اور میں سمجھ چکی تھی کہ اب اس گھر سے میرا جنازہ
ہی نکلے گا۔"

"لیکن" بلقیس نے پوچھا۔ "ایک بوڑھے آدمی سے تمہاری
شادی ہوئی کیوں؟"

زہرہ نے جواب دیا۔

"میرے والد کو روپے کی ضرورت تھی۔ اور مرزا کو ایک جوان
لڑکی کی۔ بس سودا ہو گیا۔"

اور میں نے کہا

"خدا جانے اس لعنت سے ملک کبھی آزاد بھی ہوگا۔ سینکڑوں
لڑکیوں کی زندگی ہر سال یوں ہی تباہ ہو رہی ہے۔"

زہرہ بولی!

"آپ پہلے میری سرگذشت سن لیں۔ میں کب تک آپ کے دروازے
پڑی رہوں گی۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ کو میرے متعلق جو کچھ
فیصلہ کرنا ہو آج ہی ہو جائے۔"

بلقیس نے کہا۔

"اگر تم چاہو تو یہ قصہ بیان کرنے کی کچھ ایسی ضرورت بھی
نہیں۔ تم ایک مظلوم عورت ہو ہم ہر طرح تمہاری مدد کریں گے۔"

"نہیں! نہیں!" زہرہ نے کہا۔ "مجھے مظلوم مت کہیے۔ میں
بہت گنہگار عورت ہوں۔ میں ہرگز اس قابل نہیں کہ آپ
[illegible]

میں نے کہا۔
"انسان کو خدا کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے، گناہ تو واقعی ایک بہت بری چیز ہے۔ لیکن گناہ کا احساس بھی ایک ایسی چیز ہے کہ انسان بالعموم اس سے محفوظ ہی رہتا ہے، اور اشک ندامت سے عصیاں کے داغ بھی دھل جاتے ہیں۔
"لیکن" زہرہ نے آبدیدہ ہو کر کہا "کلنک کا ٹیکہ تو مٹائے نہیں مٹ سکتا"۔
"تو کیا گناہ ہوا ایسا تم سے" بلقیس نے پوچھا۔ "جو تم اتنی پریشان ہو رہی ہو"۔
"آپ سنیں تو میں کچھ کہوں بھی"۔ زہرہ نے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ "میری داستان ایک دکھیا کی داستان ہوتی تو شاید کسی کو کچھ ترس بھی آتا لیکن یہ تو ایک گنہگار کا قصہ ہے۔"
"میں نے تو محض اس خیال سے کہا تھا کہ غم کی داستان دہرانے سے ہمیں اور صدمہ ہوگا۔ کوئی گنہگار ہو یا دکھیا۔ انسان کے درد کا علاج انسان ہی کرتا ہے۔ ورنہ سننے سے تو ہمیں کچھ انکار نہیں"۔
زہرہ بولی۔
"تو جیسے کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں میری شادی ہوئے بیس پچیس روز ہو چکے تھے۔ مرزا صاحب تو واقعی میری دلداریوں اور نازبرداریوں میں لگے رہتے لیکن مجھے دن بدن ان سے نفرت ہی ہوتی گئی۔ اور میں ہر وقت ان سے کھنچی کھنچی رہتی، ایک روز پھر اس قسم کی گفتگو ہو رہی تھی وہ بری بے رخی اور بے اعتنائیوں کا شکوہ کر رہے تھے۔ باتوں باتوں میں انہوں کہا۔ زہرہ اسے

تو طوطی و ما و من مشتاق
دل بہ طوطی اعد چہ حالی استیں؟

"آپ کو معلوم نہیں" میں نے پوچھا۔

معلوم ہوتا تو پوچھتا ہی کیوں"۔ انہوں نے جواب دیا۔ میں نے کہا۔
"آپ خدا کے سامنے کس منہ سے جائینگے۔ دو بیویاں تو آپ کی مر چکیں۔ اب یہ پھندا میرے گلے میں کیوں ڈالا عمر میں آپ میرے باپ سے بھی بڑے ہیں اگر آپ کی کوئی بیٹی ہوتی تو شاید وہ بھی مجھ سے عمر میں بڑی ہی ہوتی۔ میرا آپ کا جوڑ کیسا؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کا یہ مال و زر بیش قیمتی زیورات اور خوبصورت ملبوسات میرے دل میں کچھ وقعت پیدا کر سکتے ہیں۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں آپ کے گھر میں چین اور سکھ سے ہوں۔ تو! آپ کی سمجھ کی غلطی ہے۔ میں ایک جوان لڑکی ہوں۔ اور آپ ذرا آئینہ لے کر اپنی صورت دیکھیے۔ بس! اس سے زیادہ میں کیا کہوں"
وہ ہنس کر بولے۔
"میرا تو خیال ہے کہ عورت مال و زر کی دیوانی ہوتی ہے۔ اور مال و زر کی مجھے تمہارے پاس کوئی کمی نظر نہیں آتی"
میں نے جواب دیا کہ یہ آپ کی بھول ہے۔ مال و زر تو محض اس لیے ہوتا ہے کہ انسان مشقت اور تکلیف کے بغیر زندگی بسر کر سکے اور لوگ اس کی عزت کریں۔ اس سے بہتر تھا کہ میری شادی کسی غریب آدمی سے ہوتی۔ ہم دونوں محنت مزدوری اور مشقت کرتے اور میں حقیقی مسرتوں سے محروم نہ ہوتی۔ آپ خدا را ذرا سوچیے تو سہی کہ اگر کسی جوان آدمی کی کسی بوڑھی کھوسٹ سے شادی کر دی جائے تو کیا وہ مرد اپنے آپ کو خوش سمجھے گا۔ وہ کہنے لگے کہ اگر وہ کسی جوان مرد کا کسی مالدار بڑھی عورت سے شادی ہو جائے تو مجھے تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ وہ آزردہ خاطر ہو۔ روپے جیب میں ہوں تو خوشی اور مسرت کی سب راہیں کھلی ہیں۔ کون روکنے والا ہے جس طرح چاہے دل خوش کرو۔
میں نے پوچھا کہ اگر ایک جوان عورت کا اس کا خاوند بوڑھے تو پھر؟ اگر دل خوش کرنے کا سوال ہے تو پھر حق آپ

[illegible] دیتے ہیں وہی آپ کو عورت کو بھی دینا چاہیے۔ وہ مسکرا کر بولے۔ عورت کو یہ حق دینا تو کچھ برا نہیں۔ لیکن سوال صرف مرد کی عزت کا ہے اور غالب یہ عزت ہی وہ چیز ہے جو عورت کو قابو میں رکھتی ہے۔ بہرکیف اتنا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ تمہیں مجھ سے صرف یہ شکوہ ہے کہ میں تم سے عمر میں چونکہ بڑا ہوں اس لیے تم ایک عورت کی حقیقی مسرتوں سے اپنے آپ کو محروم سمجھتی ہو گویا میرا ایثار، میری محبت، میری نازبرداریاں میری خاطرداریاں تمہاری نگاہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتیں لیکن اس کے لیے [illegible] نہیں۔ میں نے تمہارے باپ کو مجبور نہیں کیا تھا کوئی دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ ہاں سودا ضرور کیا تھا انہیں روپے کی ضرورت تھی بس روپیہ مل گیا مجھے جوان بیوی کی خواہش تھی، میری خواہش بھی پوری ہو گئی۔ نہیں اگر کچھ شکوہ ہے تو باپ سے ہونا چاہیے۔ میں تو بالکل بے گناہ ہوں۔ میں چپ ہو رہی۔ لیکن اس روز کے بعد ان کی عنایات پہلے سے بھی زیادہ ہونے لگیں۔ سال چھ مہینے اس طرح گذر گئے۔

باپ کے ہاں تو میں پردہ کرتی تھی اور یہاں مرزا صاحب کے گھر آ کر بھی کچھ عرصہ پردے ہی میں رہی۔ لیکن آخر یہ بھی ترک کیا مرزا صاحب عموماً سرِشام مجھے موٹر میں بٹھا کر سیر کے لیے ساتھ لے جاتے تھے اور ان کے اصرار سے میں ان کے ساتھ سیر کو جاتی تو بہت خوبصورت لباس پہن کر جاتی اس طرح جب ہم سینما جاتے تھے اس موقع پر بھی میرا لباس بہت اچھا ہوتا۔ مرزا صاحب کے اس شوق کی اس کے سوا مجھے اور کوئی وجہ نظر نہ آئی کہ ایک دنیا کی مجھ پر نظر پڑے اور غالب اس نقطہ نظر سے مرزا صاحب بہت خوش قسمت تھے۔ صبح چونکہ انہیں فرصت نہ ہوتی اس لیے میں شوفر کے ساتھ اکیلی بیٹھ کر سیر کو چلی جاتی۔

[illegible] کبھی باغات میں گھومتی۔ ایک روز میں باغ میں [illegible] کہ ایک نوجوان میرے پاس سائیکل پر [illegible] سائیکل سے اترا اور مجھ سے پاس آ کر بڑے

مودبانہ طریق سے بولا۔

"یہاں آپ نے کوئی لڑکی تو گھومتے نہیں دیکھی؟"

"نہیں!" میں نے جواب دیا۔

"آپ کب سے یہاں سیر کر رہی ہیں" اس نے پوچھا۔

"یہی کوئی آدھ گھنٹے سے" میں نے جواب دیا۔

وہ کچھ فکرمندانہ انداز سے بولا۔

"صبح سے پریشان ہو رہا ہوں۔ خدا جانے کہاں چلی گئی کم بخت"۔

اب میں نے پوچھا۔

"کون تھی؟"

"میرے عزیزوں کی لڑکی ہے۔ سہیلیوں کے ساتھ یہاں [illegible] کرنے آئی تھی۔ معلوم نہیں کدھر چلی گئی" اس نے جواب دیا۔

"اس کی سہیلیاں کہاں ہیں" میں نے کہا۔ "ان سے پوچھا ہوتا"

"ہاں!" اس نے سائیکل کے پیڈل پر پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔ "اب ان ہی جا کر پوچھوں گا"۔ "معاف فرمایئے! میں نے آپ کا وقت تو ضائع نہیں کیا۔

یہ کہکر وہ سوار ہو کر چلا گیا۔ میں بھی کچھ دیر گھوم گھام کر واپس چلی آئی۔ لیکن اگلے روز جب میں ہوا خوری کے بعد موٹر کی طرف آ رہی تھی تو وہی نوجوان سائیکل پر آتا ہوا نظر آیا۔ میں اسے دیکھ کر بلا ارادہ ہی رک گئی وہ بھی سائیکل پر سے اترا اور پاس آ کر مجھے سلام کیا۔ میں نے پوچھا کہ لڑکی ملی کہ نہیں! اس نے جواب دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ لڑکی کی عمر نو دس کے لگ بھگ تھی۔ وہ اپنی سہیلیوں اور نوکرانی کے ساتھ سیر کرنے آئی تھی۔ لڑکیاں باغ میں آنکھ مچولی کھیلنے لگیں۔ لیکن وہ لڑکی کہیں ایسی گم ہوئی کہ ابھی تک اس کا سراغ نہیں لگا۔ پانچ ایک منٹ ہم دونوں اسی قسم کی باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ سائیکل پر سوار ہو کر چلا گیا۔ میں موٹر میں بیٹھ کر گھر آ گئی۔ [illegible] وہ سائیکل والا نوجوان پھر دو [illegible] مجھ سے ملا اور ہم دونوں اسی لڑکی ہی کے متعلق باتیں کر [illegible]

اور وہ بھی کھڑا سے کھڑا ہے۔ لیکن جانے کیا بات تھی کہ میں جب واپس آ جاتی تو مجھے کچھ افسوس سا ہونے لگتا کہ میں کیوں نہ اس سے دیر تک باتیں کرتی رہی۔ تو میرا پانچ سات روز اسی طرح ہوتا رہا۔ میں عموماً سڑک کے ساتھ ساتھ ادھر ادھر گھوما کرتی تھی۔

ایک روز جو میں نے اسے آتے دیکھا تو میں سڑک سے ہٹ کر گلاب کی کیاریوں کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے غالباً مجھے متوجہ کرنے کے لیے سائیکل کی دو بار گھنٹی بجائی لیکن میں نے کچھ توجہ نہ کی۔ وہ سائیکل سے اترا اور سائیکل ایک درخت سے لگا کر میری طرف آیا اور حسب دستور مسکرا کر مجھے سلام کیا۔ میں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور پوچھا۔

"زنا سیئے لڑکی کی کچھ خبر ملی ؟"

"لڑکی تو شاید اب قسمت ہی سے ملے گی۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے کہا

"معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا خیال یہ ہے کہ اگر ملی تو یہیں کہیں ملے گی۔"

"کیسے ؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"آپ ہر روز صبح صبح جو اسے یہاں تلاش کرنے آتے ہیں" میں نے جواب دیا۔

"واقعی !" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ "آتا تو میں تلاش ہی کرنے کو ہوں لیکن ضروری نہیں کہ کھوئی ہوئی چیز لڑکی ہی ہو"

"او ہو !" میں نے ہنس کر کہا۔ "تو کچھ اور بھی کھو بیٹھے ہیں آپ ؟"

"جی ہاں !" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"کیا ؟" میں نے پوچھا۔

"جس کے ملنے کی امید نہیں" اس نے ایک ایسے انداز سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ میرا دل خود بخود دھڑکنے لگا۔

"ہاں !" میں نے اس ہاں کو ذرا لمبا کر کے کہا۔ "اس جگہ اکثر لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ کوئی کچھ اٹھا کر لے جائے تو پتا مشکل ہوتا ہے"

"میری چیز جس کے پاس ہے مجھے معلوم ہے"۔ اس نے جواب دیا۔ "لیکن مشکل یہ ہے کہ مانگ نہیں سکتا !"

"ہاں" میں نے کہا۔ "کچھ ثبوت بھی تو چاہیے آخر۔ کسی کو ایسے ہی الزام دینا بھی تو ٹھیک نہیں ہوتا۔"

اور اس نے ایک آہ بھر کر کہا ع

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

یہ کہہ کر اس نے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ میں نے اپنی رسٹ واچ کی طرف دیکھا اور کہا۔

"او ہو ! بہت دیر ہو گئی۔ شوفر انتظار کرتا ہوگا"۔

یہ کہہ کر میں واپس لوٹی۔ سڑک پر پہنچ کر میں نے ذرا پلٹ کر دیکھا وہ نوجوان ابھی تک وہیں کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں سوار ہو کر گھر آ گئی۔ لیکن آج دن بھر چین نہ آیا۔ کسی کام میں دل نہ لگتا۔ تصور کے سامنے وہ نوجوان سائیکل والا تھا اور زبان پر اس کی باتیں تھیں۔ "جس کے ملنے کی امید نہیں" "اور میری چیز جس کے پاس ہے مجھے معلوم ہے۔" "لیکن مشکل یہ ہے کہ مانگ نہیں سکتا"۔ ان سب باتوں کا اس کی نگاہوں کا اور اس کے مسکرانے کا خوب مطلب سمجھتی تھی۔

اس قصے کو کہاں تک طول دوں۔ مختصر یہ کہ اور دو چار ملاقاتوں میں محبت کے قول قرار بھی ہو گئے۔ اس نے مجھے اپنا نام عباس بتایا۔ اور کہا کہ وہ کالج میں پڑھتا ہے اور ہوسٹل میں رہتا ہے۔ اور وہ لڑکی کے گم ہونے کا قصہ محض رسم و راہ پیدا کرنے کا بہانہ تھا۔

آخر صلاح یہ قرار پائی کہ عباس شہر میں کہیں کوئی مکان لے لے اور میں اس کے پاس چلی آؤں۔ اور ہم دونوں ملکر رہیں۔ ممکن تھا کہ عباس اتنی جلدی ان باتوں کے لیے خود بخود آمادہ نہ ہوتا۔ لیکن مجھے قفس سے چھوٹنے کی راہ نظر آ رہی تھی۔ اور جیسے سے نکلنے کی صورت کھلتا ہوا معلوم ہوتا تھا میں نے ہی عباس کو ان باتوں کے لیے آمادہ کر لیا۔ چنانچہ ایک روز نصف رات گئے میں کچھ نقدی و زیور لے کر چلی آئی

زیورات لے کر مرزا صاحب کے گھر سے نکلی۔ عباس سڑک پر
میرا منتظر تھا اور وہ مجھے اس مکان پر لے آیا۔ ایک نئی
خوشی کے احساس نے مجھے بالکل اندھا بنا دیا تھا۔ میں نے
روپیہ بھی اور زیورات بھی عباس کے حوالے کر دیے۔ دو روز
بہت مسرت سے گزرے۔ عباس ہر وقت میرے پاس رہتا
دونوں وقت کا کھانا وہ بازار سے لے آتا تھا۔ تیسرے
روز جو وہ کھانا لے کر آیا تو اس کے ساتھ دو نوجوان لڑکے
اور بھی تھے۔ اس نے بتایا کہ یہ اس کے عزیز دوست
ہیں۔ اور اب جو کچھ ہوگا ان ہی کی مدد سے ہوگا۔ تینوں
ایک دوسرے سے اتنا گندا مذاق کرتے کہ مجھے نفرت
بھی آئی اور غصہ بھی۔ لیکن میں چپکی بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد
یہ دونوں اٹھے۔ عباس ان کو نیچے چھوڑنے گیا۔ میں آس
میں بیٹھی تھی کہ عباس جب اوپر آئے گا تو اس سے صاف
صاف کہہ دوں گی کہ مجھے اس کے دوستوں سے ملنا جلنا پسند
نہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ عباس
کی بجائے وہی دونوں اوپر آئے۔
"عباس کہاں ہے" میں نے پوچھا۔ اس میں سے ایک
نے ہنس کر کہا۔
"معلوم ہوتا ہے تمہیں دو چار روز میں عباس سے محبت
ہو گئی ہے۔ لیکن ہمارا بھی کچھ حق ہے۔ ہم بھی عباس کے
دوست ہیں۔"
میں نے غصہ سے کہا۔
"آپ مہربانی کر کے نیچے چلے جائیے۔"
دوسرے نے ہنس کر کہا۔
"گھبراؤ نہیں! ابھی چلے جائیں گے۔ لو اب ذرا تم پلنگ پر
آ جاؤ۔"
میں بے بسی کے غصہ سے کانپنے لگی۔ ان میں سے ایک نے جیب سے
ایک چاقو نکالا اور کہا
"اگر تم نے انکار کیا تو تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں گا۔"

میں نے ان ظالموں کی منتیں بھی کیں اور روئی بھی۔ لیکن
بے اثر۔ دن بھر ان موذیوں کے ہاتھوں میری مٹی
پلید ہوئی۔ اس مکان کی جو کھڑکیاں تھیں ان سب میں
تالے پڑے ہوئے تھے محلہ بھی بالکل غیر آباد تھا۔ نہ داد نہ
فریاد۔ میں حیران تھی کہ عباس گیا کہاں۔ جب رات ہوئی
کسی نے نیچے کے دروازے پر دستک دی۔ میں نے
کہا کہ عباس آیا ہوگا۔ وہ دونوں اٹھ کر نیچے چلے گئے
لیکن عباس کی بجائے دو اور نوجوان اوپر آ گئے
یہ میرے لیے کھانا بھی لائے تھے۔ دونوں اوپر آ کر بیٹھ گئے
"کھانا کھا لو" ان میں سے ایک نے کہا۔
"عباس کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔
"عباس!" ان میں سے ایک نے جو سیاہ فام سا تھا کہا
"اب عباس کا یہاں کیا کام۔"
"لیکن وہ ہے کہاں؟" میں نے پوچھا
"معلوم نہیں اس وقت کہاں ہے" اس نے جواب دیا۔
"تم کھانا تو کھاؤ"۔
دوسرا بولا۔
"معلوم ہوتا ہے اس غریب کو ابھی تک کچھ معلوم نہیں"
"تم بتا دو نا"۔ اس سیاہ فام نے کہا "میرا خیال تھا اسے
معلوم ہو چکا ہوگا"
"صبح بتا دیں گے۔" دوسرے نے جواب دیا۔
میں چپکی بیٹھی رو رہی تھی۔ وہ سیاہ فام بولا۔
"اجی واہ! یہ رونا کیسا؟ کچھ کھاؤ پیو۔ ہنسو۔ بولو
رات بھر کے تو ہم مہمان ہیں"
"مجھ پر رحم کرو" میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا "خدا کا خوف کرو"
"رحم! خدا کا خوف!" اس سیاہ فام نے جواب دیا۔
"ہم تم پر ظلم تو نہیں کر رہے ہیں۔ ہم چور نہیں، ڈاکو نہیں
جن نہیں، بھوت نہیں۔ تم جیسے انسان ہی ہیں۔ [illegible]
کہیں سے [illegible] چلے جائیں گے۔ تم اتنی خوفزدہ کیوں

ہو رہی ہو۔ کسی نے مارا ہے تمہیں "؟

"اس سے بہتر ہے کہ مجھے تم مار ہی ڈالو" میں نے روتے ہوئے کہا

"توبہ کرو کیا کہہ رہی ہو" اس نے کہا۔ کھانا تو کھا و ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

"تم مجھے خدا کے لیے عباس کے پاس پہنچا دو"۔ میں نے روتے ہوئے کہا۔

"سنو!" اس نے کہا عباس کو اب بھول جاؤ۔ اس کلب کا کوئی ممبر تم سے دوبارہ نہیں مل سکتا "؟

"کلب!" میں نے حیرت سے کہا۔ "کیسا کلب!"

"خوشباش کلب!" اس نے جواب دیا۔ "اس کے چھ سات ممبر ہیں "؟ ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ تم جیسی خوبصورت لڑکیاں پھانس کر لائیں اور زندگی کا لطف اٹھا کر انہیں ... تم تو مفت میں پریشان ہو رہی ہو۔ کل شام تک آزاد ہو جاؤ گی۔ پھر تم جانو اور تمہارا کام "؟

یہ سنکر میں خوف سے کانپنے لگی۔ وہ مجھے کھانے کو کہہ رہے تھے لیکن جو خون جگر پی رہا ہو اسے بھوک پیاس کہاں انھوں نے شراب کی بوتل نکالی۔ دونوں شراب پینے لگے اور جلدی ہی بدمست ہو گئے۔ اور لگے مجھ سے دست درازی کرنے۔ سیاہ فام مجھے اپنی طرف کھینچتا تھا اور دوسرا اپنی طرف بس اس بات پر دونوں میں تو تو میں میں ہونے لگی پھر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ اور میں موقع پاکر نیچے بھاگ آئی۔ اور اس وقت آپ کے پاس بیٹھی ہوں "

زہرہ یہ داستان ستم کہنے کے بعد کچھ اس طرح رونے لگی کہ بلقیس کے بھی آنسو نکل آئے۔ میں بھی خاموش بیٹھا تھا۔ زہرہ روتے روتے بولی۔

"کاش! اس وقت سے پہلے مجھے موت ہی آجاتی۔ اب کیا ہو گا میرا!"

"خدا کارساز ہے" میں نے کہا۔

بلقیس دوپٹے سے آنسو پونچھ کر مجھ سے کہنے لگی۔

"میرے خیال میں تو آپ ابھی پولیس میں جاکر اطلاع کر دیجئے ایسے ظالموں کو تو ضرور سزا ملنی چاہیے "؟

"سزا تو واقعی ملنی چاہیے "؟ میں نے جواب دیا۔ "لیکن کسی کا کچھ پتہ نشان بھی تو معلوم ہو"

"مکان تو آپ کو معلوم ہی ہوگا؟" بلقیس نے کہا۔

"تو کیا تمہارے خیال میں مکان پر کوئی ابھی تک بیٹھا ہوگا" میں نے کہا۔ "خدا جانے یہ شہدے کون تھے "؟

"لیکن" بلقیس نے کہا۔ "بہ مشکل سے آپ اس حرامزادے عباس کو گرفتار کروا سکیں گے"

میں نے کہا۔

بھلا اس کا کیا ثبوت کہ عباس نے اپنا ٹھیک پتہ نشان بتایا ہوگا۔ "مجھے تو وہ بھی کوئی بدمعاش ہی معلوم ہوتا ہے"

اور پاس سے زہرہ نے کہا

"میرا اپنا بھی یہی خیال ہے "؟

اور بلقیس نے کہا

"اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ اب کچھ کوشش نہیں کرنی چاہیے "

"کوشش تو میں ضرور کروں گا۔ لیکن کامیابی کی صورت نظر نہیں آتی "؟ میں نے جواب دیا۔

بلقیس نے زہرہ کو بہت تسلی دی اور کہا کہ جب تک خدا کوئی دوسری صورت پیدا نہ کر دے وہ اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھے۔

سب سے پہلے میں اس مکان پر گیا جہاں زہرہ کو رکھا گیا تھا۔ مکان خالی پڑا تھا۔ پھر میں مکان کے مالک سے ملا اس سے معلوم ہوا کہ کوئی آٹھ دس روز ہوئے کسی کریم خاں پٹھان نے اس سے یہ مکان کرایہ پر لیا تھا۔ اور ایک ماہ کا کرایہ پیشگی ادا کر دیا تھا۔ میں پھر شہر بھر میں جو وہ چار ہوٹل تھے ان میں گیا لیکن زہرہ نے جو حلیہ عباس یا اس کے ساتھیوں کا بتلایا تھا کوئی بھی اس حلیہ کا ... [illegible]

ا پورا دن اسی ادھیڑ بن میں گذرا ۔ اب ایک ہی صورت تھی
ا زہرہ کے شوہر سے جا کر ملوں اور سب حالات ان سے بالکل
ت بتا دوں مجھے امید تھی کہ اگر اسے واقعی زہرہ سے محبت
ا تو وہ اس کی خطا ضرور معاف کر دے گا ۔
گھر آ کر جب میں نے زہرہ سے یہ ذکر کیا تو اس نے اس تجویز کی سخت
غت کی ۔ اسی رات زہرہ کو سخت بخار آ گیا اور بخار کے ساتھ
نسی بھی آنے لگی ۔
بلقیس نے اس کی چارپائی اپنے کمرے میں بچھوالی ، اور رات بھر
تیمار داری کرتی رہی ۔ صبح ہوئی تو ڈاکٹر سے آ کر مریضہ کو
ھا اور نسخہ لکھ کر دے گیا ۔ لیکن بات وہی ہوئی کہ "مرض بڑھتا
یوں جوں دوا کی" زہرہ کو پہلے تو صرف بخار اور کھانسی ہی تھی
کھانسی کے ساتھ خون بھی آنے لگا ۔ ڈاکٹر علاج کرتا تھا اور
یس تیمار داری ۔

ون کے دن تھے ۔ اودی اودی ! کالی کالی گھٹائیں جھوم جھوم کر
تھیں ۔ برق منتظر کی جال ہرائیاں ۔ بادلوں کی ہلکی ہلکی گرج
ی بھیگی ہوائیں کبھی بوندا باندی ہونے لگی کبھی ہلکی ہلکی پھوار
بھی پڑنے لگے ۔
ہرہ برآمدے میں چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی ایک طرف بلقیس کرسی پر
ی تھی دوسری جانب میں بیٹھا ایک اخبار دیکھ رہا تھا ۔ ہمارے
سامنے آم کا ایک پیڑ تھا ۔ ہرے ہرے پتے ۔ لچکتی ہوئی ڈالیاں
کوئل کی پرسوز کو کو بہت پر لطف منظر تھا ۔ بچاروں نے پیڑ پر
جھولا ڈال رکھا تھا ۔ باری باری جھولا جھولتی تھیں اور ملکر گاتی تھیں :
"نی نی بوندیا لے پھوار ! (ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے)
بچھڑے ملن کیسے ہو سکے ۔ (جو محبوب کے پاس نہیں رہتے)
وہ کیا جانیں وچھوڑیاں دی سار (وہ جدائی کی کیفیت کیا جانیں)
نی نی بوندیا لے پھوار (ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے)
اس گیت میں کچھ ایسا سوز تھا کیا درد تھا کہ زہرہ کی آنکھوں سے
آنسو ٹپک پڑے ۔ بلقیس نے اپنے دوپٹے سے اسکے آنسو پونچھا اور کہا

"کیوں روتی ہو ۔ اللہ رحم کریگا ۔ فضل کریگا اپنا" ۔
"اللہ اگر مجھے اس دنیا سے اٹھالے تو میرے لیے اس کا یہی سب سے بڑا
فضل ہے" ۔ زہرہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ۔ "میں نے آپ کو
بھی مصیبت میں ڈال رکھا ہے" ۔
"تم تو پاگل ہو ایسے ہی جیلا کر رہی ہو" ۔ بلقیس نے جواب دیا ۔ "میں تو
تمہیں اپنی بہن سمجھتی ہوں" ۔
"نہیں ، نہیں" ! زہرہ نے روتے ہوئے کہا "ایسا مت کہو ۔ میں بہت
گنہگار ہوں" ۔
"بس" ! بلقیس نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا "یہ دکھ ہی تو تمہارے گناہ کا
کفارہ ہوگا" ۔
"انشاء اللہ" میں نے کہا ۔
زہرہ ایک آہ بھر کر رہ گئی ۔
"جب زندگی میں مجھے یہ سزا ملی ہے تو جانے مرنے کے بعد کیا حشر ہوگا"
میں نے کہا ۔
"زہرہ ! توبہ استغفار کیا کرو ۔ خدا رحم کریگا ۔ جو کچھ ہوا ہے اسے
اب بھول جانے کی کوشش کرو ۔ انشاء اللہ جلد ہی اچھی ہو جاؤ گی" ۔
زہرہ نے آبدیدہ ہو کر کہا ۔
"لیکن میں زندہ رہ کر کروں گی کیا ۔ کون منہ لگائے گا مجھ سے
میں سمجھتی ہوں کہ اس دنیا میں میرے لیے اب کوئی نجات کا راستہ نہیں
سماج میرا گناہ کبھی معاف نہ کریگی ۔ لیکن کتنا ستم ہے کہ جو لوگ اس
گناہ کے محرک ہوئے جنہوں نے مجھے جان بوجھ کر اس جہنم میں
جھونکا ۔ ان سے پوچھنے والا کوئی نہیں" ۔
"خدا تو ہے" بلقیس نے کہا ۔
"ہاں" ! زہرہ نے ایک آہ بھر کر کہا ۔ "خدا تو ہے لیکن خدا ۔ ۔ ۔"
"لیکن" کے ساتھ ہی اسے زور سے کھانسی آئی اور کھانسی کے ساتھ بہت سا
خون بھی آ گیا ۔ اسی رات زہرہ غریب اس دنیا کے دکھ سے چھوٹ گئی ۔

ام - اسلم

پالا ہے جس میں مینوں کا وہ تانا دنوں میں اور دنوں کا گھنٹوں میں ہوا۔ ایسے میں جب واحد آہیں بھرتا میں بھی ہمدردی کرتا۔ بات یہ ہے کہ دنیا ہنستوں کے ساتھ ہنستی ہے، روتوں کے ساتھ آبدیدہ ہونا بھی نہیں چاہتی۔ جہاں یہ بات نہ ہو، ہمدردی ہو، وہاں دکھیارا آپ کو اپنا سمجھ لیتا ہے۔ کچھ اسی طرح واحد نے بھی مجھ سے اپنی بیتا سنائی۔ اور بڑے دکھوں سے سنائی۔ ابھی وحشت، ابھی حسرت ابھی غم، ابھی غصہ، بیسیوں تیور تھے جن سے وہ اپنا ماجرا سناتا تھا۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ پوری پوری وہ کیفیتیں آئیں اور کوئی اس کا بیان دہرائے۔ سیدھے سیدھے قصہ بیان کر دیتا ہوں۔

(۴)

واحد نے کہا کہ جیسا ہمارا یہ ایک جتھا ہے، ایسے ہی ہم رنگوں کے اور جتھے بھی ہیں۔ ہر جتھا اپنی ایک دنیا ہوتا ہے اس کا مرنا، جینا، ہنسنا، بولنا، کھانا، پینا، اٹھنا، بیٹھنا دوسرے سے الگ ہے۔ برس سے اوپر ہوتا ہے کہ کرشنا ندی کے کنارے ہم بھی اترے، دوسرے کنارے پر ایک اور جتھا اترا۔ ایک دفعہ دوپہر کا وقت تھا، گرمی کے دن میں کرشنا میں تیرنے گیا۔ اور تیرتے تیرتے دوسرے کنارے تک آ گیا۔ مگر اس جگہ سے ذرا دور تھا، جہاں دوسرا جتھا اترا تھا۔ وہاں دیکھا کہ اس جتھے کی ایک لڑکی کھڑی بکریوں کے پیچھے بیتا توڑ رہی ہے۔ ہاتھ میں لانبا بانس ہے، اس پر درانتی لگی، دھوپ سے گال گلابی ہیں، اور ماتھے پر پسینہ آ گیا ہے۔ میں اس وقت دھارے پر تیرتا ہوا جا رہا تھا۔ اسے دیکھا تو دھارے کو کاٹ کے ایسا تیرنے لگا جیسے تیر تیرتا ہو۔ یہ لڑکی بھی ہمارے ہاں کی اور لڑکیوں جیسی کڑیل تھی، ذہین، ہیرا سے گرتا پانی تھی۔ میں نے اسے دیکھا، اس نے مجھے دیکھا وہ بانس کو کندھے پر رکھے کھڑی ہو گئی اور میری نظروں میں بہت پیاری ہو گئی۔ اتنی کیں دیکھیں تو یہ چاہا کون ہے تو؟ میں کیا بتاتا کہ کون ہوں۔ یہ بتا سکا کہ وہ کون ہے بے اختیار زبان سے نکلا کہ۔

شہ شمشاد قداں خسرو شیریں سخناں!

یہ سنکر وہ لال پیلی ہو گئی، ایک جھڑکی دی، اور مارنے کے لیے پتھر اٹھایا۔ میں غوطہ لگا کے دور ہو گیا اور واپس چلا آیا دو تین دن تک ادھر نہیں گیا۔ دل روز چاہتا کہ جاؤں گیا تو اس کے سامنے آنے کا ہرواں نہ ہوا۔ ایک گھنیرے درخت پر ہو بیٹھتا، پہروں بیٹھا رہتا۔ وہ آتی تو چھپ چھپا کر دیکھ لیتا اور سمجھ لا نہیں سماتا پھر چلا آتا۔ لیکن ایک دن آئی تو یہ دیکھا کہ ساتھ ایک لڑکی اور ہے۔ دونوں کے ہاتھوں میں لانبے لانبے بانس ہیں، جن میں چمکیلی درانتیاں لگی ہیں اور بیتا توڑنے اسی طرف آ رہی ہیں، جدھر میں تھا ہوں۔ اب میں نہ کہیں جا سکتا ہوں نہ آ سکتا ہوں۔ طرفہ الجھن میں ہوں۔ آخر ساتھ والی لڑکی نے مجھے دیکھ کر پوچھا۔ "کون ہے یہ جو چغد کی طرح درخت پر بیٹھا ہے" "ارے یہ تو وہی موا ہے" شیریں نے لاپروائی کے ساتھ کہا۔

اس وقت میں ایسا ہو گیا جیسے بھبکے کو دیکھ کر بندر چھپکے سے ایک ڈالی تھامی اور نیچے آ رہا۔ اف، وہ مردہ جلاد، میں ایک مجرم! دم سادھے کھڑا تھا کہ شیریں نے ساتھ والی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بگڑ کے چلی گئی۔ اس دن سے میں بھی نہیں گیا۔ شیریں کے جتھے کے لوگ بھی وہاں سے چلے گئے۔ ہم بھی بیسیوں جگہ جا اترے۔ اب مجھے اپنے آپ یہ شوق ہوا کہ کسرت کروں۔ دل میں یہ خیال گذرتا کہ جو کوئی بھی شیریں کا منگیتر ہو، اس سے سوایا ہو جاؤں، اسے کشتی لڑ کے پچھاڑ دوں۔ اس خیال سے رات دن کسرت کرتا۔ جوں جوں مجھ میں دم آتا، میری خوشیاں بڑھتی جاتی تھیں۔

کچھ دن ایسے گذرے تھے کہ دل پھر دیوانہ بنا۔ چاہا کہ شیریں کو دیکھوں۔ بارے پتا چلا کہ ہم سے تین چار کوس پر

آتری ہوئی ہے۔ میں پھر جانے لگا۔ چھپ چھپا کے اسے دیکھ لیتا تو چین آتا۔ ہزار چاہتا کہ اسکے روبرو جاؤں۔ بہترا سوچتا کہ یوں سامنے جاؤنگا، یوں بات کرونگا مگر اسے دیکھتا تو سہم جاتا، سن ہو جاتا سب بھول جاتا تھا۔

۴

ایکدن ایسا ہوا کہ عید تھی، میں نے اچھے اچھے کپڑے پہنے۔ کسرت سے جسم میں توانائی تھی، رعنائی تھی، خیال ہوا کہ نماز عید پڑھ کر شیریں کو دیکھنے جاؤنگا مگر اس خیال میں ایسا گم ہوا کہ بے نماز پڑھے چلا گیا۔ آج اسکے بیاہ کی شاہراہ دیکھنی پڑی۔ آخر آئی تو قیامت بن کے آئی — سر پہ نارنجی رنگ کا ریشمی کسا ہوا تھا جو اسکے گورے گورے رنگ پر پڑا کھل رہا تھا۔ دو چوٹیاں گندھی تھیں، جو سینے پر ادھر ادھر پڑی تھیں۔ سرخ قمیص اور اودا گھگرا تھا، ہاتھ میں وہی لانبا بانس اور وہی ٹھیکی وانتی، مگر سب سے بڑی بات جو آج مجھے بھائی یہ تھی کہ چہرے پر بے شکن الطاف سے دکھائی دیتے تھے جیسے ہی وہ آئی آج اپنے آپ میں بھی درخت کے نیچے کو دوڑا۔ وہ مجھے دیکھ کر پہلے حیران ہوئی، جیسے سمجھتی ہو کہ میں نے آنا چھوڑ دیا تھا۔ پھر کہا "وہ بڑا بے غیرت ہے تو"! پھر بگڑ کے جانے لگی تو اچانک میری زبان بھی کھل گئی اور کہا۔

"شیریں جب سے تجھے دیکھا ہے دل کو بیتابی سی لگ آئی ہے
روئیں روئیں میں ایک دکھ ہے۔ نہ جانے تو ایسی کیوں ہے
جوان؛ خدا مہربان! عید دن! مجھے دیکھ! میں اچھا نہیں تو
برا بھی نہیں۔ سن! مجھ سے منہ موڑ کے نہ جا! مجھے خانہ
خراب ہونے سے بچا لے!!"

کہنے کو تو میں نے یہ کہدیا۔ مگر جب خیال کرتا ایک لحاظ آتا۔ یوں دو دن تک شیریں کو دیکھنے نہ جا سکا۔ تیسرے دن گیا تو وہ نہ آئی۔ تین چار لوگ آئے انہوں نے مجھے گھیر لیا اور مجھ پر لاٹھیاں برسانی شروع کیں۔ میں نے کوئی روک نہیں کی چپکا کھڑا رہا۔ جانتا تھا کہ یہ کس کی مہربانی ہے۔ آنکھیں بند کریں۔ پے بہ پے لاٹھیاں پڑیں اور میں خون میں نہا گیا۔ جب تک ہوش رہا مجھے معلوم ہوتا کہ ایک لاٹھی کی بیٹی پڑ رہی ہے۔ میں خیال کرتا یہ شیریں کے منگیتر کی ہوگی، آخر میں بے ہوش ہو گیا۔ دیر تک وہیں پڑا رہا۔ ہوش آیا تو اٹھا، بڑی کر [illegible] گرتا پڑتا گھر آیا۔ ماں یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔ پوچھا کیا ہوا کس نے مارا؟ میں نے کہا لڑائی ہو گئی تھی۔

کئی دن مرہم پٹی میں لگے۔ ابھی زخم آدھے ہی تھے کہ میں پھر وہاں گیا۔ شیریں نے سچ کہا کہ ان معنوں میں بے غیرت ہو گیا تھا۔ شام تک ٹھہرا رہا مگر اسے نہ دیکھ سکا۔ بہت وہم آئے، بہت جی گھبرایا۔ یوں ہی بیٹھے بیٹھے اندھیرا ہونے لگا تو میں نے سوچا چاہے کچھ ہو رات کو راؤلی میں جا کر اسے دیکھوں گا۔ رات بھی ہو گئی مگر جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ دل کہتا آج نہیں کل دیکھیں گے مگر ایک خیال آیا تو دل اچانک فولاد بن گیا۔

خیال یہ آیا کہ شیریں کسی اور کی بن رہی ہے۔ اور دنیا میری نظروں میں اندھیر ہو گئی۔ بار بار یہ خیال آتا، بار بار دل بے قابو ہو جاتا۔ اس خیال میں گم ہو کے اٹھا اور شیریں کی راؤلی کا رخ کیا۔ رات کا کوئی ایک پہر گذر چکا ہوگا۔ چاند نے کمیت کیا تھا کہ میں اسکی راؤلی کے پاس جا کر رکا اور ایک درخت کی آڑ میں بت بن کے کھڑا ہو گیا۔ پھر اس خیال میں شدت ہوئی کہ شیریں کسی اور کی بن رہی ہے، قدم خود بخود اٹھے اور میں اسکی راؤلی میں تھا۔ دیکھا کہ شیریں سو رہی ہے اور اسکی دو چوٹیاں اسوقت ایسی پڑی تھیں، جیسے دو ناگنیں اور مجھے ڈسنا چاہتی ہوں۔

شیریں کو جیسے ہی دیکھا پہلے تو کانپنے لگا پھر سن ہو گیا، پھر ایسا معلوم ہوا جیسے پہاڑ، زمین، آسمان ہنستے جلتے ہیں اور مجھے جتاتے ہیں کہ شیریں کسی اور کی بن رہی ہے۔ اس وقت میرا جی چاہا کہ میں بھی زور زور سے ہنسوں اور رو دوں، پھر بے اختیار ہو کے کہا۔ نہیں! شیریں میری ہے اور کسی اور کی نہیں ہو گی۔ یہاں اچانک دل دماغ میں ایک اینٹھن ہوئی اور ہاتھوں نے شیریں کی دونوں چوٹیوں کا پھندا بنا کے اسکے گلے میں ڈالا۔ اور اس طاقت سے کھینچا کہ ہمیشہ کو وہ میری ہو گئی!

[illegible]

افسانہ نویس

کلیم روزانہ پوسٹ آفس جاتا مگر کبھی اس کے نام کی
کوئی چیز نہ آتی۔ کوئی چیز آتی کہاں سے ؟ ایک تو لفافے
کارڈ کی قیمت میں اضافہ ہو جانے کے باعث لوگوں نے
ہی خط و کتابت کے سلسلہ کو کم کر دیا تھا۔ پھر کلیم کا تو کہیں کوئی
یا قلبی عزیز یا دوست بھی نہ تھا جو اس اقتصادی مصائب
زمانے میں تین پیسے خرچ کر کے اسے ایک کارڈ لکھنے جاتا
لفافے میں خط آنا تو کلیم کے لیے خواب خیال ہو چکا تھا
دی کے بعد جب اس کی بیوی میکے میں تھی تو اس کے نام دو
لفافے آ جاتے تھے مگر چونکہ اب وہ بھی اسی کے گھر تھی اسی
لفافے والے خط کے آنے کی امید اور بھی کم ہو چکی تھی،
خط کے شوق میں کرائی ہمیشہ بیوی کو میکے میں تو چھوڑ نہیں
۔ ساس اور خسر بہت پہلے ہی انتقال کر چکے تھے۔ صرف
بیوہ سالی رہ گئی تھی۔ وہ کبھی بھول کر بھی بہن بہنوئی کو یاد
تی تھی۔ ان حالات کے باوجود کلیم بڑی پابندی کے ساتھ
ٹ آفس جاتا۔ اور ڈھیر کے ڈھیر پڑے ہوئے کارڈ،
فے، بک پیکٹ، پارسل اور اخبارات و رسائل کی طرف حسرت
دل سے دیکھتا رہتا وہ بک پیکٹ کو دیکھتے ہی مضطرب سا
ہو جاتا مگر جب پتے کی چٹ پر کسی اور کا نام دیکھتا تو اس
دل کا اضطراب سکون سے بدل جاتا۔ مڑے ہوئے
وشتے بک پیکٹوں سے کلیم کو بالخصوص نفرت تھی۔ وہ
ل کھلنے جانے لگتا تو دل ہی دل میں دعا کرتا جاتا کہ
اس کے نام کا کوئی بک پیکٹ واپس آیا ہو کیونکہ کئی بار اس کے نام
پیکٹ آ چکے تھے۔ اور ان سے اسے شدید ذہنی صدمہ
پہنچا تھا۔

وہ ایک روز پوسٹ آفس سے خالی ہاتھ گھر واپس ہوتے ہوئے
اپنے دل میں سوچنے لگا۔ دو مہینے سے زیادہ کا عرصہ ہوا اب
تک نہ کوئی اطلاع ہی آئی نہ فسانہ ہی واپس ملا۔ ممکن ہے اس
بار ایڈیٹر کو فسانہ پسند آ گیا ہو اب ایک ہفتہ تک اور انتظار
کرنے کے بعد جوابی کارڈ لکھوں گا جب تک صحیح اطلاع نہ
ملجائے دل کو تسکین نہیں ہوتی — — — "

" ارے صاحب پٹری سے چلیے نہیں تو دب جائیں گے"
کلیم کے بدن کو مس کرتا ہوا ایک تانگہ نکل گیا۔
کلیم نے کہا۔ اُف، خوب بچا۔ اگر فسانہ کھٹک جاتا تو
بد معاش نے پیس ہی دیا تھا۔ وہ سڑک سے ہٹ کر پٹری
پر چلنے لگا۔ اس کا سلسلہ خیالات منقطع ہو چکا تھا۔

(۲)

کلیم کی بیوی خدیجہ ایک خوش خلق اور نیک مزاج عورت
تھی۔ مگر کلیم نے اس کی عافیت تنگ کر رکھی تھی وہ بیچاری تمام
دن گھر گرہستی کے کاموں میں مصروف رہتی۔ شام کو کھانے
وغیرہ سے فارغ ہو کر بچے کو سلانے کے بعد کہیں اسے تھوڑے
سکون و اطمینان کا سانس لینا نصیب ہوتا۔ مگر کلیم اس وقت
بھلا سے چین نہ لینے دیتا۔ وہ لالٹین کے سامنے اپنی کاپی
لے کر بیٹھ جاتا اور فسانہ سنانے لگتا۔ خدیجہ خاموش لیٹی ہوئی
فسانہ سنتی رہتی کچھ دیر کے بعد اس کی پلکیں جھپکنے لگتیں لیکن کلیم
کو یہ دیکھ کر غصہ آ جاتا وہ بگڑ کر کہتا "ابھی سنتی رہو سو گئیں کیا ہوا؟"
خدیجہ خواب آلود آنکھوں سے کلیم کی طرف دیکھ کر کہتی۔
"ہاں ہاں سن رہی ہوں بہت اچھا فسانہ ہے۔" یہ کہتے کہتے
اس کی آنکھیں پھر بند ہو جاتیں اور وہ خراٹے لینے لگتی۔
"یہ تو اچھا مذاق رہا میں بیٹھا بکتا رہوں اور تم مزے سے
خراٹے لو۔" وہ ایک دھکا دیکر خدیجہ کو جگا دیتا اور پھر فسانہ
پڑھنے لگتا۔ لیکن ماں کے ہلنے سے ادھر بچہ بھی جاگ جاتا
اور ہاتھ پاؤں مار مار کر رونے لگتا۔ خدیجہ بچے کو لپٹا کر تھپکتی
اسے سلانے کی کوشش کرتی۔ [illegible]

یا نئی کل سنانا۔"

کلیم اس کا کوئی جواب نہ دیتا اور مشغلے میں خلل انداز ہونے والے بچے کی طرف ایک آتش آلود نگاہ ڈال کر چلا جاتا لیٹ جاتا مگر گھنٹوں گذر جانے کے بعد بھی اسے نیند نہ آتی اس کے دماغ کے گوشے گوشے میں فسانے کے کردار چلتے پھرتے رہتے تھے اور اگر اسے ذرا سی جھپکی بھی آتی تو وہ افسانے سے متعلق خوابوں سے لبریز ہوتی۔

خدیجہ کی طرح کلیم کے محلے اور پاس پڑوس کے لوگ بھی اس کی کاپی کے خوف سے اس سے دور ہی دور رہتے یہاں تک کہ اس کے دوستوں نے اس کے مکان کے سامنے سے گذرنا چھوڑ دیا تھا۔ کلیم کی عادت تھی کہ وہ جہاں کسی کو گلی سے گذرتے دیکھتا خواہ مخواہ اسے بلا کر فسانہ سنانے بیٹھ جاتا۔ مگر ایسا کون تھا جو اپنے کام کا حرج کر کے فسانہ سنتا دو چار منٹ کے بعد لوگ کوئی نہ کوئی حیلہ کر کے کھسک جاتے پھر دوبارہ اس کی گلی کا رخ نہ کرتے۔

اس طرح جب کلیم کو کوئی فسانہ سننے والا نہ ملتا تو وہ کاپی کھول کر خود ہی فسانہ پڑھتے بیٹھ جاتا۔

اس کے پہلے اس نے جتنے فسانے پرچوں میں اشاعت کیلیے بھیجے تھے۔ سب "شکریہ" کے ساتھ واپس آچکے تھے لیکن ان کی واپسی سے وہ بددل نہیں ہوا تھا۔ اور مایوسی تو جیسے اس کی فطرت میں تھی ہی نہیں اس کو یقین تھا کہ کبھی نہ کبھی وہ دن ضرور آئے گا جب مدیران جراید ورسائل اس کے فسانوں کی اشاعت پر فخر محسوس کریں گے۔ اور دنیا ئے ادب قدر و منزلت کے ساتھ اسکے فسانے پڑھے گی۔

اب سے دو ہفتے قبل اس نے "حسینۂ صحرا" کے عنوان سے ایک فسانہ "مدیر جہانگیر" کے پاس بھیجا تھا۔ وہ آج تک اس کا نتیجہ معلوم کرنے کے لیے روزانہ پوسٹ آفس جاتا تھا۔ غیر معمولی وقفہ گذر جانے کے باعث اس کے دل میں یہ امید پیدا ہوگئی تھی کہ شاید ایڈیٹر کو فسانہ پسند آگیا ہے

لیکن کوئی اطلاع نہ ملنے کے سبب اس کی طبیعت مطمئن نہ تھی اور خط لکھنے کا بھی اسے حوصلہ نہ ہوتا تھا کہ مبادا نفی میں اطلاع آجائے۔ یا برہم ہو کر ایڈیٹر خط کے ساتھ فسانہ واپس کردے۔ وہ عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ یاس و امید کے تلاطم میں اس کے خیالات کی کشتی ڈانواڈول ہو رہی تھی۔ وہ روزانہ سوچتا کل کوئی نہ کوئی اطلاع ضرور آجائے گی مگر پھر اسے مایوس ہونا پڑتا۔ آخر بہت غور و خوض کرنے کے بعد اس نے چھ پیسے خرچ کر کے ایک جوابی کارڈ ایڈیٹر کے نام لکھا

محترمی، تسلیم! مزاج گرامی؟

۔ جون کو میں نے آپ کے موقر ماہنامہ "جہانگیر" کیلیے بعنوان "حسینۂ صحرا" ایک فسانہ ارسال کیا تھا مگر مجھے نہایت افسوس ہے کہ ٹکٹ بھیجنے کے باوجود مجھے اس کے متعلق کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی جوابی کارڈ حاضر خدمت ہے والسلام ڈاک سے افسانے کے بارے میں اپنی پسندیدگی سے مطلع فرما کر منت پذیر بنائیے۔

زیادہ نیازمند

کلیم ہاشمی

کارڈ کو لیٹر بکس کے حوالے کر دینے کے بعد کلیم کو کچھ اطمینان ہوا کہ تین چار روز کے اندر جواب آجائے گا۔ اور اگر امید ہے فسانے کی پسندیدگی ہی کی اطلاع آئے گی وہ "جہانگیر" میں شائع شدہ فسانہ خدیجہ کو دکھا کر اسے بتادے گا کہ وہ کاپی کے صفحات پر محض افسانہ نویسی کی مشق ہی نہیں کرتا بلکہ واقعی وہ ایک ہونہار اور ترقی پسند افسانہ نگار ہے جس کے فسانے آج "جہانگیر" کے صفحات میں معمولی فسانہ نگاروں کے فسانوں کو جگہ نہیں ملا کرتی۔ فسانہ نگاری ایک فطری عطیہ ہے۔ اور یہ اسی کو ملتا ہے جس پر اس کا خاص فضل ہو۔

پانچ چھ روز کے بعد ایڈیٹر کا جواب آگیا لکھا تھا۔

محترمی! تسلیم!

گرامی نامہ نظر نواز ہوا۔ یاد فرمائی کے لیے شکر گذار ہوا

آپ کا افسانہ جون کے خاص نمبر میں شایع ہو رہا ہے حسب معمول تین، چار جون تک رسالہ ارسال خدمت کردیا جائیگا آیندہ اگر آپ کوئی افسانہ لکھیں تو ازراہ کرم اسے بھی "جہانگیر" کے لیے بھیجدیں۔ امید ہے آپ میں اخیر تو "جہانگیر" کو بلکل اپنا پرچہ سمجھیں۔

نیاز کیش
شمسی بی-کام
ایڈیٹر "جہانگیر"

پہلے جب پوسٹ مین نے کلیم کو یہ خط دیا اور کلیم نے ہاتھ میں لیکر اسے جلد جلد پڑھا تو ایسے محسوس ہوا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے مگر جب اس نے دوبارہ بغور پڑھا تو اس کا شبہ دور ہوگیا۔ اور اس نے سمجھا کہ واقعی اس کا افسانہ "حسینۂ صحرا" پسند کرلیا گیا ہے۔ فخر و انبساط سے اس کا سینہ پھول اٹھا۔ او، کتنے دنوں کے بعد اس کے رنگین، خواب نے آج تعبیر کی صورت اختیار کی ہے۔

پوسٹ آفس سے تقریباً دوڑتے ہوئے گھر آکر کلیم نے خدیجہ کو پکارا۔ "ارے سنتی ہو بیگم!"

"دو کیا ہے؟" خدیجہ باورچی خانے میں سے بولی۔

"آؤ تمہیں ایک خوشخبری سنائیں!"

"کیسی خوشخبری؟" خدیجہ نے قریب آکر پوچھا۔

کلیم نے کارڈ کو اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "تم خود ہی پڑھ لو اسے!"

خدیجہ نے خط پڑھ کر کہا "تم بھی عجیب آدمی ہو۔ بھلا یہ کونسی خوشخبری ہے؟ ہاں اگر افسانہ چھپ کر آیا ہوتا تو ایک بات بھی تھی!" یہ کہہ کر خدیجہ پھر باورچی خانہ میں چلی گئی۔ اور چٹائی پر بیٹھ کر ترکاری کاٹنے لگی۔

کلیم لپکا ہوا باورچی خانے کے دروازے پر گیا۔ اور بسترا کہیں انہوں نے پوچھا۔ "تمہیں کاپی لاکر ایک بار پھر تمہیں وہ افسانہ سناؤں؟"

خدیجہ نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا "دیکھو ابھی مجھے سننے کی فرصت کہاں ہے؟"

کلیم کو اس بات سے بڑا صدمہ ہوا کہ ایک اتنی غیر معمولی بات کی اطلاع کو خدیجہ نے کوئی اہمیت نہ دی وہ سوچنے لگا۔ نئی روشنی کی تعلیم یافتہ عورت ہونے ہوئے بھی آخر خدیجہ اس قدر خشک مزاج کیوں ہے؟ اسے ادبیات سے دلچسپی کیوں نہیں! کیا وہ ادبی ذوق سے قطعی محروم ہے؟ آخر اس نے اس اہم خبر کو اتنا قدر غیر اہم کیوں سمجھا؟ جیسے اس کے لیے یہ روزانہ کی معمولی بات ہو۔ اس لئے اس امر پر ذرا بھی توجہ نہ کی کہ اس کا شوہر کس قدر بلند فطری صلاحیتوں اور ادبی قابلیتوں کا مالک ہے۔

اس نے پھر سوچ کر اپنے دل کو تسکین دے لی کہ وہ "جہانگیر" میں شایع شدہ افسانہ سنا کر خدیجہ کی خوابیدہ ذہنیت کو بیدار کردے گا۔ اور اس وقت اس کا بے کیف دل آسانی افسانے کی لطافت و رنگینی کے باعث ادب کی جانب مائل ہو جائے گا۔ پھر تو وہ خود ہی تقاضے کرکے اس سے افسانے سنا کرے گی۔ اس وقت اس کے طرز عمل پر افسوس کرنا فضول ہے۔

ایڈیٹر کا خط آنے کے بعد سے کلیم کی ڈاک خانے کی آمد و رفت کم ہوگئی اس نے سوچا اب تو چند روز میں افسانہ شایع ہو کر آہی جائے گا پھر ڈاک خانہ کا طواف کرنے سے کیا فائدہ؟

ایڈیٹر کا خط آنے کے بعد سے کلیم کی حالت یہ ہوگئی تھی کہ وہ جسے بھی پاتا خط سنانے لگتا۔ یہاں تک کہ رنگریز بھی اس کی اس حرکت سے تنگ آگئے تھے۔ مگر جب خدیجہ نے اس بات کی سخت مخالفت کی تو اس نے یہ سلسلہ موقوف کردیا۔

کلیم کے لیے جیسے اس بار مئی کا مہینہ ختم ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ ایک ایک دن ایک ایک سال معلوم ہو رہا تھا وہ سوچتا کب جون آئے گا اور اس کا افسانہ "حسینۂ صحرا" کو

آغوش میں لیے "جہانگیر" نظر نواز ہوگا وہ دل ہی دل میں اس مبارک
دن کا انتظار کر رہا تھا جب سالنامہ "جہانگیر" کے صفحات پر اپنا شائع
شدہ افسانہ دکھا کر وہ ایک بار سب کو متحیر کر دے گا۔
ایڈیٹر کا خط آنے کے بعد سے کلیم پانچ سات بار خدیجہ کو افسانہ سنا چکا تھا
اور بار بار کے سنتے سنتے خدیجہ کو افسانہ ازبر سا ہو گیا تھا۔
کلیم "جہانگیر" کا پرانا خریدار تھا۔ ایک بار افسانہ واپس کر دینے کے باعث
اس نے پرچہ کی خریداری ترک کر دی تھی مگر ایک سال سے وہ پھر خریدار بن گیا
تھا چنانچہ کلیم سوچتا تھا اب تک وہ جس پرچے کے خریداروں میں شمار ہوتا
تھا اب وہ اس کا مضمون نگار ہو جائیگا۔ ترقی اسے کہتے ہیں؟
خریدار سے ایک مضمون نگار بن جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔
کلیم نے طے کیا کہ افسانے کی اشاعت کے بعد وہ ایک روپیہ خرچ کر کے
مشکل کشا کی نیاز دلائیگا اس نے ابھی سے نیاز کا روپیہ الگ رکھ دیا تھا

(۳)

آخر خدا خدا کر کے مئی کا مہینہ ختم ہوا اور جون کی سات تاریخ آئی۔ کلیم امیدوں سے
لبریز دل لیے ہوئے پوسٹ آفس جا کر دیکھا اسکے نام کا "جہانگیر" اور اسکے ساتھ
ہی ایک بک پیکٹ آیا ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگا اب یہ بک پیکٹ کیسا؟ اسکی
امید و آرزو کی شمع جھلملانے لگی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے "جہانگیر"
اور بک پیکٹ اٹھا لیا اسکے چہرے کی طرف دیکھکر پوسٹ ماسٹر نے کہا
"کیوں کلیم صاحب! آپ بھی مضمون نگاری کے خبط میں مبتلا ہیں؟"
کلیم کچھ جھینپ سا گیا۔ اس نے رک رک کر کہا "ہاں کبھی کبھی... کچھ لکھ لیا تو
ہوا اور بھیج دیا" یہ کہکر پوسٹ ماسٹر نے ایک طنزیہ قہقہہ لگایا اور اپنے
کام میں مصروف ہو گیا۔
گھر آنے کے بعد کلیم نے اپنے کمرے میں بک پیکٹ کھولکر دیکھا اس کا افسانہ "حسینۂ صحرا"
واپس آیا تھا آخری صفحے کے گوشہ پر سرخ روشنائی سے لکھا تھا "نامنظور"
کلیم کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اسپر ایک بڑی چٹان دے ماری! اسے
یکایک پوسٹ ماسٹر کا طنزیہ قہقہہ یاد آ گیا اور وہ تڑپ اٹھا۔ اف
اسکی تمام امیدوں اور آرزوؤں پر پانی پھر چکا تھا وہ محزون و غم زدہ
بستر پر پڑا دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ جب ایڈیٹر کو افسانہ
پسند نہ تھا تو اسنے پسندیدگی اور اشاعت کی اطلاع کیوں دی؟ آخر اس
ستم ظریفی کے معنی؟ اس مذاق کا مطلب؟... اسے یقین نہ آتا تھا کہ دنیائے
صحافت کا نامور اور ممتاز مدیر اس کے ساتھ اس طرح مذاق کرے گا... تو
کیا اسنے غلطی سے وہ کارڈ لکھ دیا تھا؟
کلیم نے پیکٹ سے "جہانگیر" کا خاص نمبر نکالا اور سب سے پہلے فہرست پر نظر
ڈالی یکایک اسکی آنکھیں فرط مسرت سے چمک اٹھیں۔ اوہ - وہ فضول
پریشان ہو رہا تھا۔ اس کا فسانہ "حسینۂ صحرا" تو پرچے میں موجود ہے۔
مگر دوسرے ہی لمحہ فسانہ نگار کا نام دیکھکر کلیم کا مسرور دل پھر افسردہ ہو گیا
اس فسانہ "حسینۂ صحرا" کا مصنف ہندستانی کا مشہور و ممتاز فسانہ نگار علیم ہاشمی تھا
اب تمام صورت حال کلیم کے سامنے عیاں تھی۔ ایڈیٹر نے کتنی ستم ظریفی کا کام لیا تھا!
دونوں فسانوں کا عنوان ایک تھا اور فسانہ نگاروں کے نام کلیم ہاشمی
و علیم ہاشمی بھی ملتے ہوئے تھے اسلیے کلیم کے خط کو ایڈیٹر نے علیم کا خط سمجھا
اور لکھ دیا کہ آپکا فسانہ جون کے خاص نمبر میں شائع ہو رہا ہے۔ خاص نمبر میں
ہی ہو۔ جوابی کارڈ نہ ہوتا تو ممکن تھا پتہ لکھتے وقت ایڈیٹر اپنی غلط فہمی پر
مطلع ہو جاتا مگر کارڈ پر پتہ پہلے ہی سے تحریر تھا۔ اس نے صرف جواب لکھکر
کارڈ کو اپنے ڈاک چپراسی کے حوالے کر دیا۔
کلیم نے طے کیا اس بار وہ "آغوش فطرت" کے عنوان سے فسانہ لکھیگا اور
اس میں ایک چھوٹے سے خوبصورت گاؤں، دھان کے کھیت، ندی کا کنارہ
کشتی، پنگھٹ، سرکنڈوں کے جنگل، بانس کی جھاڑیاں اور پرندوں کے دلکش
گیت، کھلے میدان، پکا کنواں، برگد کے درخت اور بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیوں کا
وغیرہ کا ذکر کرے گا۔
مشکل کشا کی نیاز کا روپیہ اب تک محفوظ رکھا ہوا ہے۔
معلوم نہیں خدیجہ کو ساری باتیں معلوم ہوئیں یا نہیں مگر اتنا تو
مجھے علم ہے کہ اس نے اس کے متعلق کلیم سے کچھ نہیں پوچھا۔ اور
کلیم نے بھی اس سے "حسینۂ صحرا" کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ ہاں جون کا
"جہانگیر" جس روز آیا اسی روز سے غائب ہے۔ کلیم نے بہت
تلاش کیا مگر نہ ملا۔

ابو محمد قمر الدین رام نگری

پھواروں کے ساتھ

اس دفعہ ذرا نظر بھر کر دیکھا۔ کاجل بھری سیاہ آنکھیں اور روشن ہو گئیں۔ ہنستے ہوئے ستاروں کی سی تابشیں ان میں جھلکنے لگیں !!!

کافی ہاؤس میں اس وقت بہت بھیڑ تھی۔ خوب گہما گہمی ہو رہی تھی، دھیمے دھیمے قہقہے، ہلکی ہلکی سرسراہٹ، تیز خوشبوؤں کی مہک، مسکراتے ہوئے پھول سے چہرے کتنا رومان پرور ماحول تھا۔ زندگی کی تمام رعنائیاں عریاں نظر آ رہی تھیں۔ باہر دھیمی دھیمی بارش ہو رہی تھی۔ ہوا بھی نم تھی۔ دروازے کی راہ سے ابھرتے ہوئے نرم نرم جھونکے ایک سہمی ہوئی کپکپاہٹ پیدا کر دیتے ایسی ایک سنسناہٹ کا احساس جو صرف جوانی کے نشاموں میں سما جانے کے لیے بیتاب ہو۔ سامنے والی کرسی پر کوشل بیٹھا تھا۔ اس وقت صرف ہم ہی دونوں وہاں تھے !! کافی کا ایک دور ہو چکا تھا مگر اس نے اور آرڈر دیدیا۔ سچ تو یہ ہے کہ جب فضا اس قدر سہانی ہو اور تمنا دل میں جان پڑتی نظر آ رہی ہو تو وہاں سے کیونکر اٹھنے کو دل چاہتا۔ وہ اس وقت بھی اپنی دھن میں مگن تھا۔ وہی شادی کا تذکرہ۔ اسی مہینے کی آخری تاریخوں میں اس کا بیاہ ہونے والا تھا۔ ان دنوں، گفتگو کے لیے اس پاس صرف یہی موضوع تھا۔ ہر وقت وہی باتیں۔ اور پھر مسکراہٹ تھی کہ پھوٹی پڑتی اور وہ اس کو دبانے کی کوشش کرتا مگر جب قابو نہ چلتا تو پھر کھلکھلا کے ہنس دیتا اور مجھے بانہوں میں کھینچ کر شانے سے چمٹ جاتا "یار، اب تو یہ دن کاٹے نہیں کٹتے۔ ذرا یہ موسم دیکھو، کیا بہار ہے۔ برسات ہے ہائے رے !!" اور وہ زور سے قہقہہ مار کر ہنستا اور جو کہیں میں بھی مسکرا دیتا تو وہ ہنستے ہنستے بالکل سنجیدہ ہو جاتا اور اسی خاموشی کی خاطر مجھے پھر اسے چھیڑنا پڑتا اور پھر وہی باتیں ہوتیں وہی خوشیاں۔ وہ نوجوان جو وہاں کے لیے

ہاتھ پاؤں مارتے مارتے تھک جاتے ہیں اور نتیجہ کچھ نہیں نکلتا شادی ان کے لیے زندگی کا ایک نیا پیغام ہوتی ہے۔ وہ وہ سہانا سپنا ہیں کی پنہائیوں میں تمام کھلے ہوئے ارمان یکجا نظر آنے لگتے ہیں۔ کوشل بھی ایسا ہی تشنہ کام نوجوان تھا۔ وہ برابر اپنی ہی ہانکے جا رہا تھا۔ ادھر میں سوچ رہا تھا۔ یہ کافی ہاؤس بھی کتنی اچھی جگہ ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے دنیا کتنی حسین نظر آتی ہے۔ زندگی کی تلخیاں فنا ہو جاتی ہیں۔ وہ دھانی ساڑی میں لپٹی ہوئی یہ دبلی پتلی کامنی سی لڑکی بھی کتنی اچھی ہے جی چاہتا ہے کہ بس اس کو دیکھتا ہی رہوں وہ کوشل کی پشت پر بیٹھی ہوئی تھی اس کے ہمراہ دو لڑکیاں اور تھیں۔ کیسی تھیں اچھی ہی ہوں گی۔ جوان تھیں نا !! بھئی، کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ دونوں پیٹھ موڑے بیٹھی تھیں اور پھر ان سے واسطہ بھی کیا، یوں تو یہاں اور بھی بہت سی لڑکیاں تھیں مگر وہ کامنی سی ؟ اس کے لیے تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بس اتنا جانتا ہوں وہ مجھے بہت پیاری معلوم ہو رہی تھی اور کیوں نہ پیاری معلوم ہوتی۔ اتنی اچھی تھی اور پھر باتیں کرتے میں مسکرانے لگتی۔ ساڑی کا آنچل انگلیوں میں لپیٹ منہ میں رکھ لیتی۔ پھر نگاہیں اٹھیں گردوپیش بھٹکتی رہتیں۔ اسی طرح دیکھتے دیکھتے آنکھوں میں آنکھیں الجھتیں بس لحظہ بھر کے لیے اور گردن جھک جاتی جیسے گیہوں کی کوئی پکی بالی ہوا سے لہرا کے لچک جائے۔

اب کی اس نے نظر بھر کر دیکھا۔ کھلی ہوئی سیپی کی طرح شفاف آنکھیں کچھ کہتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں کیا ؟ یہ تو ایک معمہ سا میری سمجھ میں نہ آیا۔ ہاں !! لمحہ کے لیے سانس کچھ الجھ گئی اور نظریں منجمد۔ کوشل بات کہتے کہتے رک گیا اور پلٹ کر پشت کی جانب دیکھا، میرا دم باولا لیا۔ سینہ کے پاس ایک غبار سا تھرتھرا گیا اور میں اس کی طرف جھک گیا۔

"ہاں! پھر کیا ہوا؟ اب کتنے دن رہ گئے ہیں"
وہ مسکرانے لگا۔ "کیوں؟" میں انجان بن گیا۔
"لیں؟"
"یہ ٹھاٹھ ہیں" اور ان سے ایک آنکھ دبا کر کرسی ذرا ترچھی کر لی "اکیلے ہی اکیلے"
"تمہاری تو شادی ہو رہی ہے"
میں مسکرا دیا اور وہ کھلکھلا کے ہنسنے لگا، جیسے میں نے اس کے دل کی بات کہدی۔ اس وقت پھر اس نے ادھر دیکھا اور کرسی کو ادھ تھوڑا سا سرکایا، وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میرے گال جیسے سنسنے لگے اور نگاہیں نڈھال ہو گئیں، مگر کوشل سے نظر ملتی رہی، آنکھوں میں جلن سی ابھرنے لگی، اور یہی جلن پھیلتے پھیلتے تمام جسم میں رچ گئی اور سینے میں تو اس نے پھڑپھڑانا شروع کر دیا۔ مگر وہ ہنستا ہی رہا۔
"اب بیٹھے کیوں ہو، چلتے کیوں نہیں"
"کہاں؟"
اس نے جھک کر دیکھا "بارش بھی بند ہو گئی ہے" اور ایک انگڑائی لیکر کرسی پر کھسکا "وہ لو وہ باہر بھی چلی گئیں"
"تو میں کیا کروں؟"
"کیا کروں؟" وہ چونک پڑا، میرے بگڑتے ہوئے تیور دیکھے تو ہنسی بند کر دی "نہ جانے میرا کیا ہے؟"
مجھے خیال آ گیا وہ سچ تو کہہ رہا ہے۔ نہ جانے سے اس کا کیا بگڑتا ہے اور میرا؟ نظروں میں وہ کاجل بھری سیاہ آنکھیں بس گئیں۔ ہنستے ہوئے ستاروں کی طرح روشن اور کھلی ہوئی سیپی کی طرح شفاف مگر دونوں ہی خاموش تھے، ماحول کی شورشوں سے الگ تھلگ۔ کچھ ناموم، کچھ جلی کچھ جھنجھلائے ہوئے اور اس انتظار میں کہ کون پہلے گفتگو چھیڑے کوشل کرسی کی پشت پر سر ٹکائے چپ چاپ سگریٹ پیتا رہا۔ وقت کی دھڑکن تیز ہوتی گئی۔ مگر اسے مطلق احساس نہ تھا اور ہوتا بھی کیوں، اس کی بلا سے۔ آخر آیا کس لیے تھا۔ پھر مجھ کو بھی جھک کر سڑک کی طرف دیکھنا پڑا۔
"بارش تو اب بند ہے"
"ہوں" اور وہ پھر ایک سہمی ہوئی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ابھر آئی "لیکن باہر نکلتے ہی پھر شروع ہو جائیگی۔"
"دیکھا جائے گا"
وہ کرسی کے بازوؤں پر ہاتھ رکھے گم سم بیٹھا رہا لیکن میں اٹھ کھڑا ہوا "چلتے ہو کہ نہیں" وہ بھی کھڑا ہو گیا۔
"اچھا چلو"
دونوں باہر آ گئے مگر چپ چاپ، میری نظریں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ کوشل نے پیٹھ پر زور سے ایک ہاتھ جمایا "ہائے رے دل" اور پھر ہنسنے لگا، میری نظریں جھٹ سے مڑکر یوں ہی سامنے والی دوکان پر جا کر جذب ہو گئیں "کہاں بھٹک رہے ہو، دیکھو وہ کھڑی ہیں" اور میں ادھر دیکھنے بھی لگا۔ ہاں وہ پکچر گیلری کے پاس کھڑی کچھ دیکھ رہی تھیں اور میں لپک کر سائیکل اسٹینڈ کے پاس آیا۔ تالا کھولا اور سائیکل الگ نکال لی وہ بھی پاس آ گیا۔
"ایسی جلدی کاہے کی ہے۔ یا تو آ نہیں رہے تھے یا اب یہ حالت کہ پیچھے پڑے ہو" مگر میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسنے بھی سائیکل نکالی اور کہنے لگا "تو اب کدھر چلوں؟" اور میں نے مخالف سمت سائیکل کا رخ کر کے کہا۔
"ادھر"
"سچ؟"
"چلتے ہو کہ نہیں"
اور پیڈل پر پیر رکھ کر سائیکل پر سوار ہو گیا۔ چند قدم چلکر پیچھے مڑکر دیکھا وہ وہیں کھڑا مسکرا رہا تھا۔
"چلے ہی جاؤ گے"
"آتے ہو کہ نہیں"
"بات تو سنو"
اور میں غیر شعوری طور پر اتر پڑا۔ وہ نزدیک آ گیا میرے چہرے کو

نظر بھر دیکھا اور زور سے ہنس دیا۔ میں نے بھی منہ بگاڑ دیا

"بس رو دیے"

"اونہہ، چلو گے کہ نہیں"

"ہاں! ہاں! مگر سائیکل ادھر موڑو"۔ اور وہ ہینڈل پکڑ کر گھمانے لگا۔ مگر میں نہ مانا "میں ادھر نہ جاؤں گا"

"ابھی تک دماغ میں وہی ہوا بھری ہے"

"تمہارا دل چاہ رہا ہو تو تم جا سکتے ہو"

"مجھے کیا پڑی ہے، چلو ادھر ہی چلو"

اور ہم دونوں سائیکل تھامے پیدل ہی چلنے لگے۔ وہ اب بالکل خاموش تھا مگر میں اب اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کرتا۔ مگر وہ خاموش ہی چلتا رہا۔ بارش اب بند ہو گئی تھی مگر آسمان پر بدلیاں گھری ہوئی تھیں۔ سڑک پر رونق تھی مگر حبس بہت تھا۔ دم گھٹا جا رہا تھا راستے میں کتنی لڑکیاں چل رہی تھیں سینے ابھارے۔ لہراتی، مسکراتی، بل کھاتی، لیکن میں جیسے اکتایا ہوا سا تھا۔ اور وہ بھی جیسے ہم لوگوں سے بیزار نظر آ رہی تھیں کسی نے نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا مگر انہیں دیکھ کر دو سیاہ آنکھیں نظروں میں گردش کرنے لگتیں اور پھر ایک طویل سانس سینے میں منڈلا کر وہیں دم توڑ دیتی۔ کوشل خاموشی سے ساتھ چل رہا تھا میرا جی چاہ رہا تھا کہ اگر یہ ہمراہ نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ پھر یہ الجھن مٹ جاتی اور سڑک پر اٹھلاتی ہوئی یہ جوانیاں اتنی بیزار نظر آتیں۔ اور میں اس سے پیچھا چھڑانے لگا۔

"تم تو اب گھر جاؤ گے، ہاں بدلی بھی تو کیسی گھر آئی ہے لیکن میں ساتھ نہ جا سکوں گا۔ ابھی ڈاکٹر سے ملنا ہے"

اس نے روکنے کی مطلق کوشش نہ کی "ہاں! میں تو اب سیدھا گھر جاؤں گا، اچھا!" اور وہ سائیکل پر بیٹھ کر چل دیا۔ اور میں چلتا رہا مگر چال سست ہو گئی، مڑ کر دیکھا وہ ایک موڑ پر مڑ رہا تھا۔ میں اسے دیکھتا رہا اور جب وہ غایب ہو گیا تو ٹھہر گیا ہو کر بس اسی طرف دیکھتا رہا۔ پھر سائیکل کا رخ پھیرا اور کافی ہاؤس کے سامنے موجود تھا۔ نظریں پھر بھٹک رہی تھیں اور بھٹکتی رہیں اور بھٹکتے بھٹکتے دور ایک اجلی کونپل سی لہراتی نظر آئی اور پھر سائیکل پر بیٹھ کر اسی طرف چل دیا۔

وہ اب بالکل تنہا تھی وہ دونوں نہ جانے کہاں چلی گئی تھیں۔ سڑک کا یہ حصہ کچھ ایسا آباد نہ تھا۔ اکا دکا آدمی چل رہا تھا۔ دونوں جانب اونچی اونچی عمارتیں تھیں۔ کہیں کہیں ریڈیو بج رہا تھا۔ موسیقی کی دھیمی دھیمی لرزشیں شہری ہنگاموں کی ڈوبتی ہوئی آوازیں اور سامنے چلتی ہوئی ایک لڑکی کتنی سہانی فضا تھی۔ ہوا تیز تھی اور ہلکے ہلکے بادل کے ٹکڑے آگے پیچھے بھاگے چلے جا رہے تھے۔ اور ان سے بہت دور ایک اودی گھٹا ابھرتی چلی آ رہی تھی۔

ہم یوں ہی چلتے رہے کہ یکایک بوندا باندی شروع ہو گئی۔ بارش سے بچنے کے لیے وہ بالکنی کے نیچے آ گئی اور میں بھی۔ لیکن قدم کچھ ٹھٹک سے رہے تھے۔ مجھے کوشل یاد آنے لگا وہ ہوتا تو اتنی جھجک نہ ہوتی۔ ذرا اندھیرا سا ہی ہو چلا تھا۔ حالانکہ بات اس وقت بھی وہی ہوتی مگر جب دل چور ہو تو ہر اٹھنے والی نظر بدگمان سی معلوم ہوتی ہے آخر چلتے چلتے عمارتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ دور تک ایک پارک پھیلا ہوا تھا۔ مجبوراً ٹھہرنا پڑا، بارش اب تیز ہو گئی تھی۔

سامنے دیکھتے ہی دیکھتے نہ جانے کس خیال سے اس نے پلٹ کر دیکھا اور اس کی نظریں ٹھٹک کر رہ گئیں اور پھر وہ بالکل نکڑ پر جا کر رک گئی اور گھوم کر نظر تک نہ ڈالی۔ حالانکہ کافی ہاؤس سے زیادہ سکون تھا، اور کچھ ایسا ہی سوچ کر میں اس کے اور نزدیک چلا گیا مگر اس نے کوئی توجہ نہ دی، ہوا کے جھونکے بوجھل اور سیلے ہوئے تھے مگر وہ ان ہی کے رخ پر کھمبے سے لگی کھڑی رہی۔ بجلی بادلوں میں دھیمے دھیمے کڑک رہی تھی، ایک نازک سے سونے کے تار کی طرح روشنی تلملا کے رہ جاتی مگر یہ تلملاہٹ اور کڑک بڑھتی ہی رہی ہوا کا ایک بڑا سا جھونکا آیا اور میں نے اسے مخاطب کیا "بارش تو

...چکھ لیا۔ تماشہ دیکھ کر بیچ بیچ اسے ایک دو مرتبہ ہنسی آئی لیکن ہنسی ---!

— اور تماشا ختم ہونے پر اس بھیانک درسگاہ سے چھٹکارا پانے پر ذرا اطمینان سا ہوا۔ وہ اب چلنے ہی والا تھا کہ "کیا سینما آئے تھے اماں؟" کسی کی کرخت آواز سنائی دی، فہیم تھا وہ! لیکن فہیم سے زیادہ اس کی ساتھ والی عورت پر اس کے خیالات مرکوز ہو گئے۔

"ہاں بھئی، تعارف کرانا تو بھول ہی گیا" فہیم ہنستے ہوئے بولا۔ "یہ میری بیوی انجم — اور یہ میرے دوست ماجد ...."

ماجد نے ہاتھ ملایا —

اسے محسوس ہوا کہ فہیم کتنا خوش نصیب ہے! — زہرہ اور میں — ماجد نے سوچا! دور رہنے والی چیزوں کا انسان کو بڑا اشتیاق ہوتا ہے اور وہ اسے عزت اور حسرت کی نگاہوں سے دیکھتا بھی ہے! چاند کتنا خوبصورت اور دلکش معلوم ہوتا ہے لیکن ہر شخص کو اس میں رہنے کا موقع مل جائے تو! —

"کیا بھئی ماجد — ہمیں دعوت دینا بھی بھول گئے؟"

"نہیں، بھولا تو نہیں" ماجد نے گھبرا کر کہا۔ "ہاں بلایا تو ہوتا مگر بیوی یہاں نہیں ہے"

"اچھا تو آپ نے پرمٹ بھولا — اچھا آداب عرض" فہیم چلا گیا۔

ماجد نے ایک ٹھنڈی سانس چھوڑی اور گھر کی راہ لی۔

زہرہ چولہے کی طرف منہ کیے بیٹھی تھی۔ ماجد کا کھانا ڈھانپ دیا تھا ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔

"بھر لیا ہوگا اپنا پیٹ" ماجد کو خیال آیا۔ "عورتیں بھی خود غرض [illegible] لیکن نہ جانے آج اس کی نیند کہاں چلی گئی [illegible] حیرت ہے! جب کوئی کام نہیں ہوتا ہے تو آدمی [illegible] ہے!

— [illegible] کا بدلہ ہی لے اس سے لیا۔ [illegible] بھلا اس کو کیا حق ہے؟ یوں ہی چلی گئی [illegible] آنکھ لگ گئی ہوگی "بہت مغرور"

— اف! میں نے تو خواہ مخواہ ڈانٹ دیا!"

ماجد بے چین ہو گیا! اس نے کمرے کی کھڑکی کھولی۔

یکایک سرد ہوا کا جھونکا اندر آیا!

آخر کار اس نے ایک بات کا تہیہ کر لیا — وہ دروازہ کھولنا ہی چاہتا تھا کہ — دروازہ کھلا!

ہاتھ میں قندیل اور کھانا لیے زہرہ اندر آئی — "اب کبھی نہ جاؤں گی، غلطی ہو گئی" وہ نیچی نظریں کیے ہوئے بولی — "آپ کھانا تو کھا لیجیے"

"ارے میں نے ویسے ہی کہہ دیا" ماجد کہنے لگا "اتنا اثر لینے کی بات ہی کیا تھی؟ تم تو جانتی ہی ہو میرا مزاج؟ لیکن تم نے کھانا کھا لیا؟"

زہرہ چپ تھی! اس نے کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دونوں تاروں کے درمیان کا فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

اس رات دونوں نے ایک ہی برتن میں کھانا کھایا، نہ معلوم گھڑیال کو کیا سوجھی! بڑے ہی جوش سے اس نے بارہ کا گھنٹہ بجایا

"ہاں تو کیوں گئی تھیں حامد کے گھر؟"

"وہ آپ کہتے تھے نا کہ صدر صاحب اچھے نہیں؟ حامد کے یہاں کے مدرسے میں ایک مدرس کی ضرورت ہے، ان کی بہن کہتی تھیں کہ حامد کے ابا آپ کو لینے تیار ہیں"

دونوں تارے دکھائی نہیں دے رہے — شاید ایک ہو گئے تھے!

عبدالقادر فاروقی

جواب

منگوانا ہو تو ہمیشہ جوابی کارڈ یا ٹکٹ لگا ہوا لفافہ بھیجئے ورنہ جواب کی کوئی توقع نہ رکھئے۔ — منیجر

شرمیلے

گھر میں سب سے زیادہ شرمیلے ولی بھائی تھے کم سخن جھینپو اور گوشہ نشین۔ گھر میں رہتے ہوئے ان کے وجود کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ بات چیت کرنا تو درکنار، ولی بھائی گھر والوں کے سامنے آتے ہوئے گھبراتے تھے اگر کبھی آ بھی جاتے نیچی نگاہیں کیے بیٹھے رہتے، نہ بولتے نہ بات کرتے، کسی نے بات کی تو ہاں ہوں کر کے ٹال دیا۔ گھر میں کوئی مہمان آ جائے تو گویا ولی بھائی کی موت آ گئی ——!

روزانہ کی زندگی میں بہت کھرے تھے، ہمیشہ تخت پر سوتے، عمدہ کھانا یا اچھے کپڑے کبھی نہیں استعمال کرتے تھے ہر وقت نماز یا وظیفہ پڑھتے رہتے تھے۔ شریعت کے سختی سے پابند تھے۔ بس اسم با مسمیٰ تھے، ان کے نام کا ان کی شخصیت پر بہت اثر پڑا تھا۔

گھر میں الگ تھلگ ایک کوٹھری میں پڑے رہتے تھے۔ کوٹھری میں ایک تخت جس پر جانماز پڑی رہتی تھی۔ ایک لوٹے میں پانی بھرا رہتا تھا، پاس ہی تسبیح اور کلام پاک رکھا رہتا۔ ایک ٹوٹی ہوئی الماری میں مذہبی کتابیں رہتیں۔ دن بھر کوٹھری میں رہتے اور کسی کا سکّہ آنے کے روادار نہ تھے، گھر والوں سے بڑی حد تک بے اعتنائی برتتے تھے ——!

گھر کی کوئی ماما، یا لونڈی ان کی کوٹھری میں نہیں جا سکتی تھی، چاہے کام کا کتنی ضرورت کیوں نہ ہو، سب کام خود ہی کرتے تھے [illegible] تو بھائی [illegible] کوئی [illegible] کام [illegible] آنکھ [illegible] بہت شرمیلے تھے

عورت کو دیکھ کر وہ شرما جاتے تھے، وہ [illegible] کو دنیا کی تمام خرابیوں کی جڑ سمجھتے تھے وہ کہتے "دنیا کی ہر بربادی کی تہہ میں کسی عورت کا ہاتھ ضرور ہوتا ہے" ان کے خیال میں برائی عورت ذات ہی سے پھیلتی ہے، عورتوں میں وہ صرف "ماں" کو معصوم سمجھتے تھے ——!

وہ دن بھائی جان کے لیے بہت کٹھن ہوتا تھا جب خاندان کی کوئی رشتہ دار عورت ملنے آتی تھی، سب بھائی جان کو بلاتے، بلاتے تھک جاتے لیکن بھائی جان کوٹھری سے باہر ہی نہیں نکلتے تھے بلکہ خود پوچھتے "بھئی کس لیے بلایا ہے"؟

"دیکھنے کے لیے۔"

"دیکھنے کے لیے۔ آخر کیوں"؟

"جی چاہتا ہے، بہت دنوں سے دیکھا نہیں"

"میں نہیں آ دل لگا، میں کوئی عجائب گھر کا جانور ہوں"

اس پر سب گھر والے ہنسنے لگتے تھے اور بھائی جان شرما جاتے

اگر رشتہ کی بہن، بھانجی، بھتیجی، یا خاندان کی کوئی اور لڑکی بھائی جان کی کوٹھری میں خود سے چلی جاتی تو ولی بھائی کا برا حال ہو جاتا، آنکھیں نیچی رہتیں، پیشانی پسینے میں تر ہو جاتی، گالوں پر سرخی چھا جاتی۔ اور ان کا [illegible] تھے، بات کرنا تو بھول جاتے بس مسکراتے ہی رہتے تھے۔ [illegible] جب انھیں تنہائی ملتی تو دیر تک وہ تخت پر بیٹھے رہتے، ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے اور دیر تک وظیفہ پڑھ کر اپنے اوپر پھونکتے رہتے تھے۔

اسی لیے امی تو بھائی جان کو پاگل [illegible] اور بھائی صاحب سنکی، لیکن خاندان کے [illegible] کو [illegible] ورت کرتے تھے، اور انھیں [illegible] شخصیت پر بھائی جان سے [illegible] فاتحہ [illegible] کے لیے [illegible]

[illegible]

بھیا [illegible] پہ ہنسا کرتی تھیں جب بھائی جان کوٹھری سے نکلتے تو وہ ایک دوسرے کو ٹہوکے دیتیں ایک دن تو میں نے خود چمپا کو کہتے سنا وہ دوسری لونڈی سے کہہ رہی تھی ۔

"بھیا تو بالکل کاٹھ کے الو معلوم ہوتے ہیں"

دوسری نے چمپا کے چٹکی لیتے ہوئے کہا ۔

"چپ ہو، کسی نے سن لیا تو زبان کاٹ لی جائیگی"

لیکن چمپا کب ماننے والی تھی کہنے لگی ۔

"بھیا کی بیوی سے کیسے بنیگی ۔"

"اری تجھے کاہے کی فکر ہے ۔" دوسری نے کہا ۔

"میں سوچتی ہوں بھیا سے بیاہ کریگا کون ؟

بالکل بچے تو ہیں، ڈھیلے ڈھالے آدمی ہیں، بوڑھے معلوم ہوتے ہیں ۔ بیوی کیسے خوش رہے گی ۔"

لونڈی کے نقطۂ نظر سے بھائی جان آدمی ہی نہ تھے وہ بےحس اور بےجان تھے ۔ ان میں زندگی ہی نہ تھی کیونکہ اگر ان میں کچھ حرارت ہوتی وہ چمپا اور دوسری لونڈیوں کو کیوں نہ چھیڑا کرتے ۔ اور یہ اسی لیے تھا کہ بھائی جان بہت شرمیلے تھے اور اسی لیے لونڈیاں انھیں بےجان سمجھنے لگی تھیں ۔

خاندان کا نوجوان طبقہ بھی بھائی جان سے خوش نہ تھا وہ بھائی جان پہ پھبتیاں کستا، طعنے دیتا اور انھیں چھیڑا کرتا تھا ۔ بھائی جان کے ہم عمر ان سے کہتے، تم بےجان ہو جذبات سے خالی ہو ۔ تمہاری زندگی میں نہ چہل پہل ہے اور نہ رنگینی ہے ۔ اور خاندان کے بچے، بڑوں کی دیکھا دیکھی بھائی جان کو تفریح کی چیز سمجھنے لگے تھے ۔ صرف ضعیف طبقہ بھائی جان کی [illegible] اور بے روح زندگی سے خوش تھا ۔ ان کا [illegible] خاندان میں بھائی جان کی طرح اور کوئی معصوم [illegible]

[illegible] اس لیے نفرت تھی کہ مجھے وہ بہت [illegible] بات پہ ٹوکا کرتے تھے ۔ [illegible] ہاں دکھانا چاہیے ۔

لڑکیوں کو بھانا نہیں چاہیے ۔ وہ [illegible] برا ہے ۔ تن کر چلنا چاہیے، اور یہ لکچر سنتے سنتے کان پک گئے تھے ۔

اس کا میں بدلہ بھی لے لیتی تھی، جب جب ثریا آتی میں اس کے ذریعے بھائی جان کو بہت ستاتی تھی ۔ بھائی جان ثریا سے بہت گھبراتے تھے، ثریا کو دیکھ کر وہ کتابوں میں منہ چھپانے لگتے تھے، بھائی جان سے کچھ بنائے نہ بنتی تھی ۔

آج کل پھر ثریا آئی ہوئی تھی، بڑی دیر سے ہم دونوں الگ کمرے میں بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے کہ مجھے بھائی جان یاد آ گئے ۔ بدلہ لینے کا اچھا موقع تھا ۔ ہم دونوں بھائی جان کی کوٹھری تک آئے، اور دروازوں سے اندر جھانکنے لگے ۔ بھائی جان شاید وظیفہ پڑھ رہے تھے ۔ زرد زرد چہرہ چمک رہا تھا آنکھوں میں سرمہ کی کالی کالی لکیریں کھنچی تھیں، دوپلی ٹوپی بڑی احتیاط سے سر پہ رکھی تھی اور بھائی جان تخت پہ بیٹھے کچھ بڑبڑا رہے تھے ۔

میں نے ثریا کو ٹہوکا دیا ۔ ثریا نے دھکا دیا، دروازے کھل گئے ۔ اور ثریا اندر چلی گئی قریب پہنچ کر کہنے لگی ۔

"بھائی جان آداب ۔" بھائی جان چونک پڑے ۔

"آپ کی تنہائی میں مخل ہونے پر ناراض تو نہ ہوں گا ۔"

"جی ہاں وظیفہ پڑھ رہا ہوں ۔" بھائی جان ثریا کو دیکھ کر بہت ہی گھبرا گئے تھے ۔ ثریا تخت کے قریب کھڑی ہو گئی بھائی جان منہ چھپانے کی فکر میں تھے ۔ ثریا کہنے لگی ۔

"کونسا وظیفہ پڑھ رہے ہیں مجھے بھی سکھا دیجیے آپ کو تو بہت سے وظیفے معلوم ہوں گے ۔" جواب میں بھائی جان صرف مسکرا دیے، مونچھیں پھیل گئیں، لیکن جب [illegible] ثریا تخت کے کونے پر بیٹھ گئی تو بھائی جان [illegible] گئے، اور پیشانی پونچھ کر کہنے لگے ۔

"جی ہاں بہت سے وظیفے مجھے یاد ہیں ۔" [illegible] یہ مصرعہ پڑھا ۔

[illegible] کا سبب اس کی [illegible]

"لیکن آپ کونسا وظیفہ سیکھنا چاہتی ہیں"؟

"ایسا وظیفہ بتا دیجیے جو ہر مصیبت کے وقت کام آ جائے"

"بہت اچھا" یہ کہہ کر بھائی جان نے پسینہ پونچھا اور المماری کی طرف چلے، ثریا نے ہنس کر کہا

"آپ کو تو زبانی یاد ہو گا" ثریا نے چٹکی لی۔

"جی ہاں یاد تو ہے لیکن ایک لفظ بھول تا ہوں۔"

بھائی جان جھینپ گئے، اور ثریا نے دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے میں جھانک رہی تھی۔ اور بھائی جان آیتیں پڑھنے لگے۔ پھر لکھ دینے لگے، ثریا ہنستی رہی لیکن اس دوران میں انہوں نے ایک مرتبہ بھی ثریا کی طرف نہ دیکھا جب گھبراہٹ میں بھائی جان کچھ بھول جاتے تو ثریا ہنسنے لگتی تھی وہ اور جھینپ جاتے تھے۔ آخر میں ثریا نے پوچھا۔

"بھائی جان آپکے چہرے پر اتنا پسینہ کیوں نکلتا ہے۔"

بھائی جان نے جلدی سے کہا "گرمی کی وجہ سے۔"

پھر ثریا زور زور سے ہنسنے لگی بھائی جان جھینپ گئے کیونکہ انھیں یاد نہیں رہا کہ جاڑوں میں گرمی کا کیا سوال۔ اور جب بھائی جان نے دیکھا کہ ثریا پیچھا نہیں چھوڑ رہی ہے تو لکھنے لگے۔

"اب اجازت دیجیے ابھی کئی وظیفے پڑھنا ہیں۔"

پھر ثریا چلی آئی اور ہم دونوں نے دیکھا کہ بھائی جان رومال سے پسینہ پونچھ رہے ہیں۔ جو شرم کی وجہ سے نکل آیا تھا۔

ہم دونوں صحن میں جاکر خوب ہنسے ثریا کہنے لگی،

"شرم کی وجہ سے پسینے پر پسینے آ رہے تھے لیکن میں [illegible] کا [illegible] ہی نہیں [illegible]" میں نے کہا۔

"اگر تم پسینے نکلنے کی وجہ نہ پوچھتیں تو ابھی اور [illegible] [illegible] تھے [illegible] ہو [illegible] آپ چکے ہیں دیکھے نہ معلوم [illegible] کہ [illegible] بھائی جان میں کہاں سے آ گئی ہے۔"

[illegible] سے شرم کی [illegible] ہو گئی بھائی جان کی [illegible]

وصمت اور فطرت تو لڑکیوں کی سی ہے لیکن اللہ میاں نے انہیں مرد بنا دیا۔

"بھئی ہاں جلدی میں اللہ میاں سے غلطی ہو گئی لڑکی سے انہیں لڑکا بنا دیا — اور ہم اللہ میاں کی جلد بازی پر دیر تک ہنستے رہے۔"

ثریا جب بھی بھائی جان کی کوٹھری میں جاتی تو کچھ نہ کچھ دریافت کرنے کے بہانے سے کبھی کسی آیت کا مطلب پوچھا کرتی تو کبھی کسی آیت کی تشریح چاہتی۔ وہ بھائی جان کی فطرت سے واقف تھی لیکن دراصل ثریا کا مقصد کچھ اور ہی ہوتا تھا، وہ کوٹھری میں اس لیے جاتی تھی کہ بھائی جان کی تنہائی میں مخل ہو، انہیں ستائے۔ چھیڑے، ان کی نگاہوں کو مقید کر لے انہیں پسینہ میں شرابور کر دے اور ان کی شرم کو چونکا دے اور اس مقصد میں وہ کامیاب ہوتی تھی، جن جن باتوں کو بھائی جان میرے لیے برا سمجھتے تھے وہی ثریا ان کے سامنے کرتی تھی، مثلاً پان کھا کر جاتی، سرمہ لگا کر، سر کھول کر، چوڑیاں بجا کر وہ بھائی جان سے باتیں کرتی، اور دانت کھول کر ہنستی، اور اس طرح بھائی جان کے جذبہ شرم اور ان کی نظر پر ضرب لگاتی، جس سے بھائی جان تڑپ جاتے تھے، لیکن شرم انہیں کچھ کہنے نہ دیتی تھی —!

اکثر ہم دونوں شرمیلے مردوں کی نفسیات کا جائزہ بھی لیتے تھے ثریا کہتی تھی مرد جتنا شرمیلا ہوتا ہے اتنے ہی اس کے ہیٹ میں دانت ہوتے ہیں اور ثبوت میں کئی مردوں کے قصے سنائی جو بھائی جان کی طرح شرمیلے تھے لیکن حقیقت میں وہ بہت زیادہ مکار تھے انھوں نے [illegible] شرم کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ وہ بھائی جان کو بھی [illegible] کہا کرتی، اور کہتی کہ بھائی جان [illegible] ہیں۔ لیکن میں [illegible] سے اس سلسلے [illegible] اور [illegible] کہ بھائی جان [illegible] تعصب کی بنا پر تھا [illegible] اور

ملتے بھی بھولے بھالے تھے، ان کی نیت پر مجھے کبھی شبہ نہیں ہوتا تھا۔ رہی ثریا کی بات تو وہ شاید جلن کی وجہ سے کہتی تھی یا پھر بدگمانی کی وجہ سے — بھائی جان معصوم تھے اور میں انہیں معصوم ہی سمجھتی تھی —!

لیکن جلد ہی ایک واقعے نے تمام گرے ہوئے پردے اٹھا دیے، اور حقیقت آشکارا ہو گئی۔ بھائی جان کی شادی ہونے والی تھی گھر میں بہت مہمان جمع تھے ثریا بھی موجود تھی [illegible] کی شرارتوں میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ بھائی جان کو [illegible] زیادہ بنانے لگی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ ان کھلی کھلی شرارتوں کے باوجود بھی کوٹھری کے دروازے ثریا کیلئے کھلے رہتے تھے [illegible] ایسے موقعوں پر کوٹھری کے دروازے ہمیشہ بند رہتے پائے گئے تھیں۔

شادی میں صرف تین دن رہ گئے تھے۔ آجکل ثریا بہت ٹھاٹ سے رہتی تھی نئے نئے ریشمی لباس پہنتی تھی لمبے لمبے [illegible] لگاتی اور نئے انداز سے بال بناتی تھی — اپنے کو ہر طرح سجا کے رکھتی تھی۔ میں تو نہانے چلی گئی اور ثریا بھائی جان کے کمرے میں یہ کہہ کر چلی گئی کہ بھائی جان کو جا کر ستاؤں گی — جب میں نہا کر نکلی تو دیکھا دروازہ بند ہے اور ثریا رو رہی ہے۔ بڑی مشکل سے ثریا نے کمرے کا دروازہ کھولا اس وقت اس کی عجیب حالت تھی۔ جن بالوں کو ثریا نے بڑی محنت سے بنایا تھا وہ بے طرح بکھرے تھے۔ جن چوڑیوں پر ثریا کی [illegible] وہ ٹوٹ گئی تھیں، جس دوپٹے پر ثریا نے بہت [illegible] گیا تھا۔ قمیص ایک [illegible] آدھ جگہ سے [illegible] کی آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت روئی [illegible] سب ڈھل گیا تھا۔ چہرہ سرخ تھا جیسے [illegible] خوب رو چکی تو اس نے وہ سب کچھ [illegible] زہر اگل دیے مجھے — [illegible] لیکن مجھے یقین نہیں آتا تھا

آخر ثریا نے کہا۔ "بھائی جان انتہا سے زیادہ بدمعاش اور بے حیا ہیں دیکھنے میں فرشتہ لیکن حقیقت میں شیطان ہیں لڑکیوں کو دیکھ کر جھینپ جانا، ان کی پیشانی کا عرق آلود ہو جانا، شرما جانا۔ نگاہیں نیچی کر لینا یہ سب دھوکا ہے مکاری ہے، بھائی جان کی شرم شرمیلی اور بناوٹی ہے۔ وہ چھپے رستم ہیں۔ ان کے پیٹ میں دانت ہیں" ثریا کے یہ الفاظ آج تک مجھے یاد ہیں اور کانوں میں گونجا کرتے ہیں۔

اس واقعہ کے بعد سے بھائی جان کی وقعت میری دل میں کم ہو گئی، ان کا گردن جھکا کر چلنا، ہر وقت کوٹھری میں بند رہنا، نماز اور وظیفہ پڑھنا، تسبیح کھٹکھٹانا ان سب باتوں کی میری نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں ہے بلکہ یہ سب دھوکا نظر آتی ہیں۔

اور جب بھی جب کوئی بھائی جان کو شرمیلا، معصوم اور فرشتہ کہتا ہے تو میرے بدن میں آگ لگ جاتی ہے، دماغ سنسنانے لگتا ہے۔ اور میں سوچنے لگتی ہوں یہی شرمیلے بھائی جان ہی تو ہیں جو لڑکیوں کو دیکھ کر جھینپ جاتے ہیں جنکی آنکھیں لڑکیوں کے سامنے جھک جاتی ہیں — یہی شرمیلے بھائی جان ہی تو ہیں جنہوں نے ثریا کو کوٹھری میں ہنستے ہی ہاتھوں کی گرفت میں جکڑ لیا تھا۔ اور جب ثریا نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی تو بھائی جان نے ثریا کو بھینچ لیا۔ بھوکے کتے کی طرح ثریا پر جھپٹ پڑے۔ اس کے کپڑے نوچ ڈالے، اس کی چوڑیاں توڑ ڈالیں بال بکھیر دیے۔ جنسی بھوک کے جذبے نے بھائی جان کو اندھا بنا دیا تھا اور وہ حرکتیں کیں جو بھائی جان جیسے فرشتہ نما آدمی کو زیب نہیں دیتی تھیں اور ان حرکتوں نے ثریا کے دل میں گہرے زخم ڈال دیے — ثریا کی حالت آج تک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ بھائی جان نے اپنی شرم کا جو [illegible] پاکیزگی اور معصومیت کے [illegible]

جیون آشا

ایک سندر وادی کے کنارے ———
گھنی جھاڑیوں میں چھپی ہوئی ایک ننھی سی کٹیا —
خودرو پھولوں کی مہک میں بسی ہوئی ——— اونچے اونچے
پیڑوں سے لٹک کر بہتے جل کو چومنے کی کوشش کرتی ہوئی
پھولوں سے لدی بیلیں۔ ان پر چہچہاتے ہوئے پیارے
پیارے پنچھی ——— اپنے پربھو کی یاد میں بھانت بھانت کی
مدھر راگنیاں گاتے تھے ——— نرم کے تڑکے دو پجاری اس
مندر کی طرف جاتے دکھائی پڑتے جو جھیل کی دائیں جانب
مادھو جی کے عقیدت مندوں کا بنایا ہوا تھا۔ آگے آگے بوڑھا
جسونت ہوتا اور اس کے پیچھے ہاتھ میں پوجا کی تھال لیے
اس حسین دنیا کی رانی آشا ——— جگ کی آنکھوں نے اسے بچپن
ہی میں ودھوا بنا دیا تھا وہ اب صرف اپنے دکھی جیون پر آنسو
بہانے کے لیے زندہ تھی۔ اس کی روح کو لگے ہوئے
زخموں کا کہیں مرہم نہ تھا، پوجا پاٹ اور اپنے پتا کی سیوا
اس کا کام تھا۔ اس سے فارغ ہوتی تو اپنے ننھے سے
پنچھیوں سے باتیں کرنے لگتی۔ اسے لیکر جھیل کے [illegible]
مندر کی سیڑھیوں پہ بیٹھ کر بھجن گانے لگتی۔ وہ اپنی زندگی
کی [illegible] منزلیں طے کر چکی تھی ———

آج اس کا جنم دن تھا ———

پتا نے اس کے لیے نئی سفید ساڑی لا دی تھی۔ اس
[illegible] جیسے پانی سے جھانکتا ہوا
[illegible] مندر کی سیڑھیوں پر اپنے چرن کو لیے
[illegible] لا دی

اس نے خیال کیا کہ شاید اس کے پتا جی آئے ہیں ———
آواز نزدیک ہوتی گئی اور آخر اس کے پیچھے آکر رک گئی
اس نے بھجن ختم کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ پلٹ کر دیکھا تو
کوئی اور ہی شخص تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی نظر [illegible]
بنی ہوئی اپنی تصویر پر پڑی۔

"یہ تو آپ نے بہت ہی برا کیا" آشا نے جھجکتے ہوئے
کہا "مندر کی دیوار کو گندہ نہ کیجیے" "گندہ کون کہتا ہے
دیویوں کے چتر کاروں سے مندر گندے نہیں ہوا کرتے" [illegible]
جواب ملا۔

"لیکن ودھواؤں کے چتر تو ہوا کرتے ہیں" ———

"ودھوا! ——— کیسی ودھوا؟" اجنبی ٹھٹھک کر رہ گیا۔
آشا کے ہونٹ کانپ گئے لیکن اس نے فوراً [illegible]
دکھ اور سکھ کے اس ملاپ نے ایک لمحے کے لیے [illegible]
چیزوں کو ملانے کی کوشش کی۔ فضا بالکل ساکت تھی۔
جھیل کا پانی آسمانی دنیا کا آئینہ بنا ہوا تھا۔ [illegible]
اس اجنبی کو دیکھتا ہوا کٹیا کی طرف چل دیا۔ کچھ دیر تک
آشا کی نظروں نے اس کا تعاقب کیا اور پھر لوٹ کر
مندر کی مورت پر جا پڑیں۔

"آپ! ——— لیکن آپ ہیں کون؟" ———

"[illegible] پجاری۔"

"یعنی!" آشا نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے [illegible]
دریافت کیا۔

"یعنی ——— یعنی آپ کے [illegible]"

"پجارن! ــــ پجارن ــــ خوب!" آشا نے آہستہ آہستہ لفظ "پجارن" کئی بار دہرایا۔ "اچھا آپ پوجا کیجیے دیر ہو جائے گی۔" اس نے سیڑھیوں سے اترتے ہوئے کہا۔

"مگر آپ نے تو اپنا نام بتایا ہی نہیں؟"

"میں ایک پرانی پجارن آشا۔ اس کٹیا میں رہتی ہوں" آشا نے انگلی سے بتایا اور آگے قدم بڑھا لیے۔

پجاری نے جیب سے وہ تصویر نکالی جو کچھ دن پیشتر اس نے بنائی تھی۔ اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ خوشی سے بوکھلا گیا۔ ہو بہو آشا کی تصویر۔ اپنے تصور میں بسنے والی حسینہ کو اس نے آج مندر میں دیکھ لیا۔ "آشا یا تصویر ــــ تصویر یا آشا؟" اس کی زبان سے یکایک نکل گیا "تصویر" میرے تخیل کی نگری میں بسنے والی آشا سے پہلے تصویر تھی۔ اسی نے مجھے یہاں کھینچ لایا" "تصویر"۔ چڑیاں چہک اٹھیں۔ جھیل میں لہریں پیدا ہو گئیں۔ ہوا چلی ــ بادل گھر آئے ــــ پانی برسنے لگا۔ پجاری اپنی تصویر کو بھیگنے سے بچانے کی ناکام کوشش کرتا ہوا گھر پہنچا ــ پاس ہی کسی شہر میں وہ رہتا تھا۔ شاید اس جگہ کا منظر اتارنے آیا تھا۔ غرض وہ گھر پہنچا اور جیب میں صرف بھیگا ہوا کاغذ پایا۔ "تصویر دھل گئی۔ اب تصویر کہاں؟ اصل کے سامنے نقل کی کوئی حیثیت نہیں ــــ آشا کے سامنے تصویر!؟"

وہ اب روز مندر میں آتا اور آشا بھی آتی۔ آشا کا باپ جسونت ان دنوں بہت بیمار پڑ گیا۔ وہ پریشان سی رہتی۔ پجاری اس سے [illegible] کرنا چاہتا تھا لیکن وہ بہت

کانپتی ہوئی آواز میں کہا "آشا! آج تک تجھ سے تیرا راز چھپایا گیا۔ لیکن سن تو بیوہ نہیں ہے۔" آشا نے حیرت سے اپنا سر اٹھا لیا اور باپ کے چہرے کو گھورنے لگی۔ باپ نے مسکراتے ہوئے کہا "ہاں تو بیوہ نہیں ہے پیاری بچی ــ تیرے بیاہ کے بعد تیرے پتی کو لیکر اس کا باپ نہ جانے کس شہر میں چلا گیا۔ تو اس وقت تین سال کی تھی اور تیرا دولہا جیون کوئی سات آٹھ سال کا۔ وہ شاید اسلیے چلے گئے کہ تیری ماں ــ اچھوت تھی۔"

"ماں اچھوت تھی اسلیے؟ لیکن اس میں بچی کا کیا قصور ــ پتاجی کیا اچھوت انسان نہیں ہوتے؟!" آشا نے معصومیت کے ساتھ کہا۔ اس کا چہرہ غم و اضطراب سے سرخ ہو جاتا تھا۔ جسونت نے ان سوالوں کا کوئی جواب دیے بغیر آگے کہنا شروع کیا "اور سنتے ہیں کہ وہ لڑکا ابھی اسی دھوکے میں رکھا گیا ہے کہ بن بیاہا ہے۔" یہ کہنے نہ پایا تھا کہ کسی نے دستک دی۔ آشا نے دروازہ کھولا۔ پجاری کو دیکھ کر کچھ گھبرا سی گئی کہ نہ جانے پتا کیا خیال کریں۔ اور فوراً واپس آکر چارپائی کے بازو بیٹھ گئی۔

پجاری اندر داخل ہوا ــــ

"کون ہے؟" بوڑھے نے رکتے ہوئے پوچھا۔

"جی ــــ میں ــ!"

"میں کون؟"

پجاری آگے بڑھا اور جسونت کے پلنگ پر جھک گیا [illegible] نہیں کچھ کہا۔

"میرے جیون!" بیمار نے چیخ ماری۔ آشا [illegible]
کہنے لگی پتاجی یہ جیون نہیں پجاری ہے [illegible]
"جی ہاں شریمتی جی [illegible]
[illegible]

آفس سپرنٹنڈنٹ نے گھنٹی بجائی اور بوڑھا چپراسی "جی سرکار" کہتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

— وی پی کی رسید ہے اور یہ تیس روپے کے نوٹ ہیں، پوسٹ آفس جا کر وی۔ پی لے آؤ — سپرنٹنڈنٹ نے کہا چپراسی نے رسید اور نوٹ ہاتھ میں لیے ہی تھے کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب فرمانے لگے۔

خدا بخش! اس وقت بارہ بجنے میں دس منٹ باقی ہیں تمہیں ایک بجے تک واپس آجانا چاہیے۔ اور ہاں! دیکھو بڑے بازار میں پشن جی کے یہاں ہوتے آنا۔ میری کلائی کی گھڑی غالباً درست ہو گئی ہوگی اگر نہ ہوئی تو تاکید کے ساتھ کہہ دینا کہ اس اتوار تک گھڑی درست ہو جانی چاہیے۔ کلاتھ ہاؤس میں میرا سوٹ سل رہا ہے وہاں جا کر کہہ دینا کہ اسی تیل کے دو پتلون اور تیار کر دیں! اور ہاں لوٹتے جاتے مسٹر فرنیڈ کے بنگلے پر ان کے چھوٹے بھائی کی خیریت بھی دریافت کرتے آنا اور کہنا کہ آج شام کو میں وہاں آؤں گا۔۔۔! خدا بخش! دیکھو پھر کہے دیتا ہوں کہ ایک بجے تک ضرور واپس آجانا —!

"... سائیکل پر جا رہے ہو —! دیکھیے —!"

... خدا بخش نے سر کو جنبش دی کہ آپ جو ... کی تعمیل کی جائے گی! میری اس جنبش میں ...

اور معمولی حکم سمجھا جاتا ہے۔

خدا بخش سائیکل پر سوار ہو کر روانہ ہوا — اس سائیکل کے متعلق سپرنٹنڈنٹ صاحب نے خاص طور پر زور دے کر فرمایا تھا کہ تم پیدل نہیں سائیکل پر جا رہے ہو، یہ سائیکل دفتر کے ہیڈ کلرک کی سائیکل نہیں غریب چپراسی کی سائیکل تھی جس کی ایک بھی کل سیدھی نہ تھی، پیڈل گھسے ہوئے، بریک ٹوٹا ہوا۔ زنگ آلود زنجیر اور تاروں میں تو نہ جانے کتنی گٹھلیاں لگی ہوئی تھیں، اس سائیکل پر ایسا ہی شخص بازار میں چڑھ سکتا تھا جسے اپنی زندگی سے کوئی محبت نہ ہو اور جو موٹر اور تانگے کی ٹکر کے لیے پہلے سے تیار ہو۔

خدا بخش نے سائیکل کو تیز تیز چلانا شروع کیا، جلدی کا کام یوں بھی شیطان کا کام ہوتا ہے۔ اور غریبوں کو تو یہ شیطان اور زیادہ دق کرتا ہے، تھوڑی دور چلنے کے بعد سائیکل کی زنجیر اتر گئی۔ خدا بخش نے سائیکل سے اتر کر زنجیر چڑھائی اور پھر روانہ ہو گیا بازار کے نکڑ پر پہنچ کر سائیکل کے پچھلے پہیے میں پنکچر ہو گیا۔ قریب ہی سائیکل والے کی دکان تھی خدا بخش سائیکل اٹھائے ہوئے وہاں پہنچا۔

"اس سائیکل میں پنکچر ہو گیا ہے ۔۔۔! ذرا جلدی جوڑ دیجیے —" خدا بخش نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"کیا کہنے ہیں تمہاری اس سائیکل کے — سبحان اللہ! معلوم ہوتا ہے یہ سائیکل تمہارے خاندان میں کئی پشتوں سے چلی آ رہی ہے —! مگر بھائی! اسے تبرک کے طور پر غلاف میں لپیٹ کر رکھ دو تو اچھا ہے —" سائیکل والے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

— "یہ ہمارے دفتر کی سائیکل ہے ..."

[illegible] جا سکتی — ’’مجبوراً اسی سے کام لینا پڑتا ہے‘‘ اس دنیا میں غریبوں کی بڑی مشکل ہے‘ غریب بیچتے کیا ہیں زندگی کے دن پورے کرتے ہیں —‘‘ خدابخش ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ سائیکل والے نے ٹیوب میں پانی بھر کر پنکچر تلاش کرنا شروع کیا۔

’’اس ٹیوب میں دو پنکچر ہیں اور ایک جگہ سے ٹوٹا بالکل گھس گیا ہے اس جگہ کی بھی درستی کرنی ہوگی — یہ سب کام پانچ آنے میں ہوگا‘‘ — سائیکل والے نے کہا۔

’’پانچ آنے میں —‘‘ خدابخش گھبرا کر بولا —

’’مہنگائی کا زمانہ ہے۔ ہر چیز کا مول بڑھ گیا ہے۔ پیسہ کا مال ایک آنے میں بکتا ہے، میں نے تو واجبی دام بتائے ہیں۔ دوسرا سائیکل والا اتنے کام کے آٹھ آنے سے کم نہیں لے گا —‘‘ سائیکل والے نے جواب دیا اور خدابخش یہ کہتے ہوئے کہ آپ سائیکل درست کیجیے میں ابھی آتا ہوں، وہاں سے چلا گیا۔

خدابخش کی جیب میں کل تین آنے تھے۔ دو آنے کی کمی تھی اس کے لیے وہ دوڑتا ہوا مکان پہنچا اور وہاں سے دو آنے کے پیسے لیکر سائیکل والے کے یہاں آیا پانچ آنے دے کر سائیکل لی اور سائیکل پر سوار ہوتے وقت سائیکل شاپ کی گھڑی پر نگاہ کی تو غریب کا دل دھک سے ہو کر رہ گیا گھڑی ایک کے قریب بجا رہی تھی اور ابھی اتنے بہت سے کام باقی تھے سپرنٹنڈنٹ صاحب کا یہ حکم اس کے کانوں میں گونج رہا تھا کہ ’’دیکھو ایک بجے تک ضرور واپس آجانا۔‘‘

خدابخش نے انتہائی تیزی کے ساتھ سائیکل چلائی [illegible] کی کئی جگہ تو راہگیروں سے ٹکر ہوتے ہوتے رہ گئی سپرنٹنڈنٹ صاحب نے جہاں جہاں جانے کے لیے کہا تھا خدابخش وہاں جاتا ہوا ڈاک خانے پہنچا اور ڈاک خانے [illegible] رسید کلرک کو پکڑا دی۔ [illegible]

میں زمین پر گر پڑے کھڑکی کے قریب ہی ایک نوجوان کھڑا ہوا تھا اس نے زمین پر گرے ہوئے نوٹوں کو للچائی نگاہوں سے دیکھا اور ان پر جوتا رکھ دیا [illegible] ڈاک خانے کے کلرک نے وی پی کا رجسٹر دیکھ کر کہا کہ ’’یہ وی پی آج پوسٹ مین کو تقسیم کرنے کے لیے دیا جا چکا ہے۔‘‘ خدابخش رسید لیکر ڈاک خانے سے تیز تیز روانہ ہوا۔

خدابخش کے جانے کے بعد نوجوان نے نوٹ اٹھا کر جیب میں رکھ لیے وہ خوشی خوشی ڈاک خانے کی عمارت سے باہر آیا اور قریب کے ہوٹل میں گھس گیا۔ نوجوان نے ہوٹل کی کرسی پر بیٹھ کر ہوٹل کے ملازم کو آواز دی —

’’حضور! کیا چاہیے —‘‘ ملازم نے دریافت کیا۔

’’چائے اور بسکٹ —‘‘ نوجوان نے جواب دیا اور وہ گہری سوچ میں پڑ گیا وہ سوچ رہا تھا اور اس کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا، ضمیر کی ملامت چٹکیاں لے رہی تھی اور ہر چٹکی پر وہ تڑپ تڑپ اٹھتا تھا۔

— یہ میں نے کیا کیا — چوری بری بھی بری چیز ہے اور یہ تو ایک غریب شخص کا مال تھا۔ اس بیچارے پر نہ جانے کیا گذری ہوگی — مجھے اس کو تلاش کرنا چاہیے۔

نوجوان دل ہی دل میں یہ کہتے اور سوچتے ہوئے ہوٹل کی کرسی سے اٹھ بیٹھا وہ کرسی سے اٹھ ہی رہا تھا کہ اتنے میں ہوٹل کا ملازم کشتی میں چائے اور بسکٹ لیکر آگیا۔

’’حضور! آپ کہاں جا رہے ہیں! چائے اور بسکٹ حاضر ہیں —‘‘ ملازم نے کہا۔

’’مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا میں چائے نہیں پیوں گا —‘‘ نوجوان نے جواب دیا۔

’’حضور بسکٹ تو واپس ہو سکتے ہیں چائے تو [illegible] ہے اس کی قیمت ضرور دینا ہوگی —‘‘ [illegible] کشتی میز پر رکھتے ہوئے کہا اور نوجوان [illegible] ہاتھ میں پکڑا کر وہاں سے [illegible]

کھنے تک شہر کی گلیوں میں گھومتا رہا مگر وہ بوڑھا
سے نظر نہ آیا۔ نوجوان اپنی مجرمانہ غلطی پر انتہائی
م اعد افسوس تھا اسے خود اپنے پر غصہ آ رہا تھا
خیر تو اس کے جی میں آئی کہ اپنے کو پولیس کے حوالے
ے کہ اس جرم کی اس کو سزا تو مل جائے مگر وہ رک
- ہر انسان کو چاہے وہ کتنا ہی بڑا مجرم کیوں نہ ہو اپنی
نت سے بہرحال محبت ہوتی ہے۔

خدا بخش دفتر پہنچا ہے تو دو بج چکے تھے، چپراسیوں
اس سے کہا کہ صاحب بہت خفا ہیں اور وہ تم کو اب
کئی مرتبہ دریافت کر چکے ہیں، خدا بخش ڈرتے ڈرتے
پہنچا اور سپرنٹنڈنٹ صاحب اس پر برس ہی تو پڑے
تی، خدا بخش کو وہ وہ صلواتیں سنائیں کہ غریب کی
آنکھوں میں آنسو آ کر رہ گئے۔ اس کے منہ سے اتنا نکل گیا
"سائیکل میں پنکچر ہو گیا تھا" —
سن کر سپرنٹنڈنٹ صاحب دیوانے کتے کی طرح بھونکنے لگے۔
"ارے تم چپراسیوں کو بہانہ سازی کے سوا اور آتا
کیا ہے۔ سائیکل میں پنکچر ہو گیا، طوفان آ گیا، اور
ے لگے، بیٹی بیمار ہے، باپ مر گیا۔ ہر غلطی پر ایسے ہی
گھڑت عذر کیے جاتے ہیں۔ دنیا کے تمام حادثے اور
تیں تم لوگوں کے لیے ہی وقف ہیں۔ یہ بیچارے
م پوسٹ لیڈر کہتے ہیں کہ غریبوں کی مدد کرو۔ مگر یہ
یب۔ کو کوئی مدد دینے کے قابل ہیں ان کے ساتھ
[illegible] کو بھلائی کرنی ہی نہیں چاہیے"
[illegible] سنتا رہا، غریبی اور نوکری نے اس کے
[illegible] گالیاں کس انسان کو اچھی لگتی ہیں
[illegible] میں سیکڑوں خلاف طبیعت باتیں
[illegible] ہیں

[illegible] نہیں لاتے — سپرنٹنڈنٹ نے کہا
[illegible] کہا تھا کر دی — بی

پوسٹ مین کو تقسیم کرنے کے لیے دے دیا گیا —"
خدا بخش جواب دیتے ہوئے اوپر کی جیب میں ہاتھ ڈالا
نوٹ غائب تھے۔ اس نے گھبرا کر دوسری جیبوں کو ٹٹولنا
شروع کیا —

"کیا ہوا — گھبرا کیوں رہے ہو —" سپرنٹنڈنٹ
نے دریافت کیا۔

"حضور! نوٹ کہیں گر گئے —" خدا بخش نے جواب دیا
اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس پر
سپرنٹنڈنٹ نے ڈانٹ کر کہا —

"روپے ہضم کرنے کی یہ اچھی ترکیب نکالی — اور
دیدہ دلیری تو دیکھیے کہ آنسو ٹپکا کر بے گناہی ثابت کی
جاتی ہے۔ ارے ہم نے تم جیسوں کو تو چرایا ہے —
یہ چال کہیں اور جا کر چلنا۔ دیکھو خدا بخش! میں تمہیں
جیل خانے بھجوا دوں گا نہیں تو آج شام تک میرا روپیہ
مجھے واپس کر دو — یہ میرا آخری اور قطعی فیصلہ ہے"

خدا بخش نے کچھ روپیے قرض لیے اور باقی روپیوں
کے لیے اپنی چھوٹی بچی کا زیور فروخت کیا۔
خدا بخش کی بیوی نے جب اپنی بچی کے ہاتھوں سے چاندی
کے کڑے اتارے ہیں تو وہ رونے لگی اور بولی۔

"امی! مجھے آج شام کو اپنی سہیلی کے یہاں جانا ہے
اس کی گڑیا کا بیاہ ہے، میں ننگے ہاتھ وہاں کیسے جاؤں گی"
خدا بخش کی بیوی نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"بیٹی تمہارے ابا اس سے اچھے کڑے بنوا کر لا دیں گے
تم اپنا دل تھوڑا مت کرو — دو چار دن ایسے ہی
گزار دو کسی کے پاس زیور نہ ہو تو اس میں شرم کی کیا بات ہے"
خدا بخش نے جیسے تیسے تیس روپیوں کا انتظام کیا۔

اس واقعہ کو دس سال گزر گئے اور اس عرصہ میں بہت
سے انقلابات آئے کتنے ہی افسر بدل گئے [illegible]
ہو کر کہ پائے [illegible] ان کی تنخواہیں [illegible]

مگر خدا بخش جیسے کا ویسا ہی رہا اس کی تنخواہ میں صرف تین
روپے کا اضافہ ہوا لیکن اس کے گھر میں چار عدد بچے پیدا
ہو گئے۔ اضافے اور ترقیاں تو کھاتے پیتے لوگوں کے
لیے ہیں غریبوں کو کون پوچھتا ہے۔ ان کے متعلق تو یہ طے
کر لیا گیا ہے کہ ان کو سدا اسی حالت میں رہنا ہے اور
یہ دکھ اٹھانے اور سختیاں جھیلنے کے لیے ہی پیدا ہوئے ہیں
خدا بخش جس دفتر میں نوکر تھا اس میں ایک نوجوان
سپرنٹنڈنٹ بدل کر آئے یہ بہت خلیق اور ملنسار آدمی تھے
چپراسیوں اور ماتحتوں کے ساتھ ان کا سلوک بہت اچھا
ہوتا، انھوں نے ایک دن خدا بخش کو بلایا اور منی آرڈر
اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔
"یہ لو پچاس روپے کا منی آرڈر جا کر کرا دو ۔"
خدا بخش اس پر خاموش ہو گیا، سپرنٹنڈنٹ صاحب نے اس سے
کہا ۔
"ارے بھئی منی آرڈر کا نام سن کر چپ کیوں ہو گئے"۔
خدا بخش نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا ۔
"حضور حکم دیں تو میں دریا میں کود پڑوں، جلتی
آگ سے گذر جاؤں مگر اس کام سے مجھے معاف رکھیے
ایسی ہی بات ہے ۔
نئے آئے ہوئے سپرنٹنڈنٹ نے حیرت کے ساتھ دریافت کیا۔
"تمھاری باتوں نے تو مجھے الجھن میں ڈال دیا۔
منی آرڈر کرنے سے آخر اتنا گھبراتے کیوں ہو"
خدا بخش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا
"ارے میاں! صاف صاف کہو ۔ یہ کیا معاملہ ہے ـــــ"
سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔
"حضور کوئی دس سال کی بات ہے کہ آپ کی جگہ جو سپرنٹنڈنٹ صاحب تھے
انھوں نے مجھے تیس روپے کے نوٹ دیے منی آرڈر کرانے کیلیے
[illegible] جا کر [illegible] تو نوٹ جیب
[illegible] غائب تھے ۔ [illegible]

بیچ کر تیس روپے سپرنٹنڈنٹ صاحب کو واپس دیے ورنہ وہ
تو مجھے جیل خانے بھجوا کر چھوڑتے ۔ اس دن سے میں نے پیسے
پیسے کا کام کرنے کی قسم کھائی ہے"۔
سپرنٹنڈنٹ صاحب نے خدا بخش کو خوب غور سے دیکھنا شروع
کیا انکے حافظے نے ایک ورق الٹ دیا وہ ندامت اور مسرت
کے ملے جلے جذبات کے ساتھ بولے۔
"اچھا خدا بخش تمھارے وہ نوٹ جس شخص نے اٹھا لیے تھے اگر
تمھارے سامنے آ کر تم سے معافی چاہے تو کیا تم اسے معاف
کر دو گے"۔
خدا بخش نے اس پہ کہا ۔۔
"حضور! وہ آدمی میرے پاس آنے ہی کیوں لگا ۔ دس سال
میں تو دنیا ادھر کی ادھر ہو جاتی ہے"۔
سپرنٹنڈنٹ نے جواب دیا۔
"فرض کر لو وہ آدمی میں ہی ہوں ۔۔ تو کیا تم معاف نہ کرو گے"
خدا بخش نے اس پر کہا "حضور! مجھے شرمندہ نہ کیجیے ۔ میں
بہت غریب آدمی ہوں حضور کی ایسی باتوں سے میں تو بہت زیادہ گھبرا رہا ہوں"
سپرنٹنڈنٹ نے جیب سے روپیوں کا بٹوا نکالا اور خدا بخش کو پکڑا دیا۔
خدا بخش نے روپیوں کا بٹوا لے تو لیا مگر وہ حیران تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔
"ارے خدا بخش! یہ تو دنیا ہے، بڑے بڑوں سے بھول چوک
ہو جاتی ہے، آدمی کی نیت بدلتے کچھ دیر نہیں لگتی ۔ مگر [illegible] اپنی غلطی پر
پشیمان نہیں ہوتا [illegible] تو تصور کر کے ادھر سے [illegible]
کو دس سال سے یہ خلش بے چین کر رہی تھی خدا کا شکر ہے [illegible]
آج نکل گئی" "خدا بخش خدا کیلیے اپنی زبان سے اتنا کہہ دو کہ میں نے
تمھیں معاف کیا" "یہ [illegible] بڑا احسان [illegible]
نے انتہائی لجاجت آمیز لہجے میں کہا [illegible]
"میں نے [illegible]
[illegible]
[illegible]

"ویسٹرن چائنیا ریلوے" تعمیر ہو رہی تھی جو گریٹ
فیجورین ریلوے کے نام سے مشہور ہے اسی تعمیر کے سلسلے میں
میں جنوب مشرقی حصے میں کام کر رہا تھا، میرا تعلق بالراست
"ہان ما ڈ" سے تھا۔ جہاں گودام، کارخانے، سامان رسد
وغیرہ تمام چیزیں موجود تھیں، میں ایک تجربہ کار انجینیر ہوں مگر
مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میں باوجود محنت پسند ہونے کے
اپنے فرائض انجام دینے کے بعد اس قدر تھک جاتا تھا کہ
بے تحاشا لوگوں میں بیٹھ کر گپ شپ کرنے کی خواہش میرے
دل میں پیدا ہوتی تھی۔ میں جسمانی کلفت اور دماغی اذیت
کو دور کرنے کا واحد علاج اسی کو سمجھتا تھا۔ مگر میری خوش
نصیبی سمجھو یا بدنصیبی کہ سوا ہوٹل کے مالک کی ایک خورد سال
شریکیں بچی کے اور کوئی میرے تفکرات اور پریشانیوں
کو دور کرنے والا نہ تھا اسی معصوم بچی سے میں بات چیت
ہنسی مذاق کرتا اور وقت گزارتا تھا۔

چند روز کے بعد مجھے ٹیپاکاو جانا پڑا کیونکہ وہاں
کے [illegible] کے آلات کا جائزہ مجھے لینا تھا یہ
مقام [illegible] نہایت غیر آباد تھا چند چھوٹے چھوٹے بدوضع
اور [illegible] لکڑی کے مکانات کے علاوہ وہاں کچھ نہ تھا مگر
[illegible] سے [illegible] اور خوش طبع
[illegible] تھے جنہوں نے اس غیر آباد مقام میں زندہ دلی
کی [illegible] چہل پہل [illegible] گی۔ یہ ایک
[illegible] ہیں اور ایک
[illegible] ہے جو دور سے

ایک صف بستہ فوج کی طرح نظر آتا ہے، اس کا ایک حصہ غیر
مرتب اور بے تکے پن سے پھیلا ہوا ہے معلوم ایسا ہوتا تھا
کہ یہ بے لگام پھیلاؤ ساری وادی پر قبضہ کر لے گا، روزانہ
صبح کو اٹھ کر اس صف بستہ فوج کو جو بے حس و حرکت کھڑی
ہوئی نظر آتی تھی دیکھتے رہنا میرا دلچسپ مشغلہ تھا، اور مجھے
اس نظارے میں خاصہ لطف حاصل ہوتا تھا۔

ٹیپاکاو میں ایک لکڑی کا مکان مجھے بھی رہنے کیلیے
ملا تھا یہ ایسی عمارت تھی جو ایک سرے سے شروع ہو کر دوسرے
سرے پر نامکمل رہ گئی تھی، نہ تو اس میں کوئی معمارانہ خصوصیت
تھی اور نہ آرائش و آسائش ہی کے کوئی آثار تھے، یہ ایک
مسافر خانہ تھا جو دور و دراز کا سفر کر کے آنیوالے مسافروں کیلیے
بنایا گیا تھا تاکہ وہ یہاں سستا کر آگے بڑھیں، یہی عمارت
ہوٹل کا کام بھی دیتی تھی جہاں انجینیر ٹھیکہ دار اور دوسرے
لوگ جو پٹڑی اور سڑک وغیرہ کے کام کے سلسلے میں آگئے
یہیں قیام کرتے تھے، ایک سرے پر ایک بڑا ہال تھا جو کھانے کے
وقت بھرا رہتا یا شام کو جبکہ سب لوگ تفریح کی غرض سے
یہاں جمع ہو جاتے تھے۔

ایک روز میں کھانے کے انتظار میں اسی ہال میں بیٹھا
ہوا کاہل باورچیوں کی تاخیر پر غور کرتے کرتے تھک کر
ایک پرانے اخبار کا پرچہ جو وہاں پڑا ہوا تھا دیکھ رہا تھا کہ
مجھے ایک نوجوان چینی اس ہال میں داخل ہوتا ہوا نظر آیا
جو دبکتے دبکاتے میری طرف بڑھ رہا تھا میں نے جب غور سے
دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کی داڑھی مونچھیں صاف ہیں اور
اور سر سے پاؤں تک ایک اودے ریشمی لباس میں لپٹا ہوا
ہے اور پاؤں میں مخملی جوتی ہے، وہ ایک خوشحال چینی تھا
اس کے چہرے پر ایک ہلکے سے تبسم کی لہر تاک سے شروع
ہو کر آہستہ آہستہ منہ، گال اور آنکھ [illegible] تمام [illegible]
میں نے حیرت بھری نگاہوں سے اس کو گھورا [illegible]
[illegible] کہ وہ اپنے ڈھیلے ڈھالے لباس میں چھپا ہوا

نظر آیا، اس نے میرے قریب پہنچ کر متانت آمیز تبسم سے
نہایت ادب کے ساتھ جھک کر سلام کیا جب میں نے بھی مسکرا کر
سلام کا جواب دیا تو اس نے رکتے ہوئے کہنا شروع کیا "حضور!
میں ہوں آپ کا غلام لی ثا سے جنوبی ملک کا سوداگر، مجھے
معلوم ہوا کہ حضور کو آثار قدیمہ اور خصوصاً قدیم چینی مصنوعات
کے جمع کرنے کا شوق ہے، خدا حضور کے ماں باپ پر رحمت نازل
کرے اگر حکم ہو تو میں اپنا سامان ملاحظے میں پیش کر دوں"
اتنا کہہ کر اس نے جھک کر تعظیم دی اور ایک خاص قسم کا تبسم
اس کے ہونٹوں پر لہرانے لگا۔ میں نے بھی اسی طرح خم ہو کر
اس کا جواب دیا اور کہا "مسٹر لی ثا سے! تم سے مل کر مجھے
بڑی خوشی ہوئی۔ تم کو یہ اطلاع صحیح ملی ہے کہ مجھے آثار قدیمہ
کا شوق ہے مگر مجھ میں خریدنے کی استطاعت نہیں ہے۔"
یہ سن کر اس کے چہرے پر ناامیدی کی ایک اداسی چھا گئی، مگر
اس نے سنبھل کر اپنے الفاظ میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا
"مگر حضور! اس بنڈل میں بڑے خوبصورت قدیم چینی کے
بت ہیں"۔ پھر معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھ کر
مسکرانے کی کوشش کرتا ہوا کانا پھوسی کے لہجے میں نہایت
رازدارانہ طریقہ پر کہا "ایک امیر کے ساتھ خوش معاملگی
کرنے کی وجہ سے یہ چیزیں مجھے حاصل ہوئی ہیں ...
نہایت نفیس اور قدیم چینی صنعت ہے ... یہ کل نو دیوتا
... خوش نصیب بنانے اور برسانے تقدیر پلٹ دینے
والے دیوتا، جس کے گھر میں یہ ہوں گے اسے مالا مال
کر دیں گے وہ شہرت اور دولت کے انتہائی مدارج طے
کریگا ... بے حد ناموری ... بڑی دولت بے
انتہا عزت حاصل ہوگی"
"لی ثا سے! تم نے جو کچھ کہا درست مگر دیوتاؤں
کو اگر وہ قوت حاصل ہے جو تم بیان کر رہے ہو یعنی یہ بہت
اپنے رکھنے والے کو شہرت اور دولت دے سکتے ہیں تو پھر
تم جیسا سمجھدار انسان ان کو فروخت کیوں کر رہا ہے" میں نے مسکرا کر
کہا، لی ثا سے کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اس سوال
کے لیے پہلے ہی سے تیار تھا اور اس کا جواب بھی اس کے
پاس موجود تھا، نہایت ہی نرمی سے ہاتھ ملتے ہوئے
پر جوش لہجے میں ادب سے جھک کر جواب دیا "حضور بجا ہے
یہ معقول سوال ہے لی ثا سے اس کا جواب بھی معقول دے گا
حضور جانتے ہیں کہ غلام ایک معمولی حیثیت کا آدمی ہے جسے شہرت
اور نام وری کی ضرورت نہیں ــــ اور نہ دولت کی" اس
کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے میں نے کہا، لی ثا سے نے بغیر
کسی قسم کے کشمکش و پیچ کے اطمینان سے جواب دیا "حضور!
کیا مجھے ان بتوں کو پیش کرنے کی اجازت دیں گے ...؟
یہاں نہیں بلکہ تنہائی میں"
"کیوں یہاں کیوں نہیں"؟ اس سوال پر وہ کچھ پریشان
سا ہو گیا پھر کہنے لگا "حضور! عوام اس قابل نہیں کہ ان
خوبصورت اور نادر دیوتاؤں کے درشن کر سکیں ــــ"
"ہاں! اچھی بات ہے میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ" میں اٹھ کر
اپنے کمرے کی طرف چلا اور وہ میرے پیچھے پیچھے تھوڑے
سے فاصلے سے ادب کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا اور وہاں
پہنچتے ہی اس کی لمبی اور پتلی انگلیاں ریشمی بستے کو بڑی تیزی
کے ساتھ کھولنے لگیں اس کی لمبی لمبی انگلیوں کا اس پھرتی
کے ساتھ بستے کو کھولنا مجھے بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا، پھر
اس نے کئی تہوں کو کھول کر پتھر کی ایک نفیس مورت کے پاس
نکالی اور پھر چند نگین مورتیوں کو نکال کر تپائی پر قطار میں
میں جا دیا، پھر ایک دم چند قدم پیچھے ہٹ کر دیوتاؤں کا تصور
باندھ کر بدن کو خم کر دیا اور اس طرح رکوع میں جا کر کسی
اسٹیج ڈائرکٹر کی طرح میرے تاثرات کا اندازہ کرنا شروع
کیا، اس مورت کے پاؤں بالکل ان سفید [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

نیلی اور سنہرے اصلی یعنی بادامی اور سرخ عنابی رنگ کی تھیں
یہ مورتیاں صنعت گری اور دستکاری کا بہترین نمونہ تھیں،
صناع نے بڑی خوبی اور چابک دستی سے کام کیا تھا۔ چہرے
کے باریک سے باریک آثار چڑھاؤ صاف نمایاں اور لباس
کی سلوٹیں تک عیاں تھیں کل نو مورتیں تھیں، چھ مردوں
کی اور تین عورتوں کی، سب سے بڑی مورت جو بیچ میں تھی
ایک سفید بالوں والے بزرگ کی مورت تھی چہرے سے تقدس
بزرگی، ہمدردی اور تامل اندیشی برس رہی تھی اس میں
بڑا اعلیٰ درجہ کا کام کیا گیا تھا، ضعیف چہرے کی باریک
باریک جھری سفید اور مقدس ڈاڑھی کا ایک ایک بال
ہاتھوں کی پتلی پتلی انگلیاں بڑی سبک کاری سے بنائی
گئی تھیں، اس مقدس ہستی کے پہلو میں ایک ڈراونی شکل
کا کھڑا ہوا تھا جس کا چہرہ مصائب و آلام سے
داغدار تھا۔ دوسری طرف ایک مجسمہ نصف آدمی اور نصف
بکری کا تھا یہ بکری عجیب مضحکہ خیز طریقے پر دبکی ہوئی بیٹھی
تھی اور بناوٹی ہنسی اس طرح ہنس رہی تھی گویا دانت
پیس رہی ہے۔ ان کے پیچھے مختلف عمر کے تین آدمیوں کے
مجسمے تھے جو خاکی لباس پہنے ہوئے تھے جن میں تقابل
کا کوئی سوال نہ تھا سب سے اونچی تین پری پیکر نازنینا
جمیل عشوہ و انداز کے ساتھ کھڑی ہوئی تھیں، ان کی
ٹھوڑی اور گردن کا خوشنما حصہ نصف سے زیادہ
زیر نقاب تھا، پتلے پتلے گلابی ہونٹ، مخروطی چپٹی چپٹی
ناک اوپر اٹھی ہوئی، اچھی نظریں، خوشنما پیشانی اور
اس پر پیچ لٹکے ہوئے لمبے کالے بال، یہ سب اس صناعی
اور [illegible] سے بنائے گئے تھے کہ صناع کی اعلیٰ قابلیت
مسلمہ دستکاری اور بے انتہا چابکدستی اور کمال فن
کا اعتراف ناگزیر تھا۔

میں ان [illegible] کی حسن کاری کے دیکھنے میں
اتنا [illegible] کہ [illegible] کا خبر نہ رہی لی ٹاسے کا
خیال بھی مجھے نہ رہا مگر چالاک لی ٹاسے برابر مجھے دیکھ
رہا تھا اور میری از خود رفتگی دیکھ کر اسے اپنی کامیابی
کا اطمینان ہوگیا، وہ اسی طرح ہاتھ ملتا ہوا کھڑا تھا۔
اور اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔

میں نے یکایک دریافت کیا "ٹاسے! یہ چیزیں
تم نے کہاں سے خریدیں؟"

اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور دغابازی کے
پسینے کے قطرے اس کی پیشانی پر نمودار ہوگئے ہکتے
رکتے کہا "حضور! ایک ہی طریقہ ایسا ہے جس کے ذریعہ
یہ چیزیں حاصل ہوتی ہیں . . . یعنی کسی چینی امیر کے ساتھ
خوش معاملگی . . . . ."

"اچھا ٹاسے! یہ چیزیں مجھے بہت پسند ہیں ان کی
قیمت کہو؟"

پر خلوص طریقے سے مسکرا کر اس نے پس و پیش ظاہر کرنا
شروع کیا اس طریقے سے وہ باور کرانا چاہتا تھا کہ قیمت
کا سوال اس کے لیے ایک اچانک سوال ہے اور وہ
اس کے جواب کے لیے تیار نہیں، آخر اس نے ایک لمبی
سانس کھینچ کر یہ باور کراتے ہوئے کہ بالآخر اس نے ان
کو بیچنے کا ارادہ کر ہی لیا ہے کہا!

"حضور! کیا آپ اس کے چالیس روبل[1] دیں گے؟"

"لی ٹاسے! تم تو غضب کر رہے ہو اس قیمت میں
تو کوئی بھی انہیں نہ خرید سکے گا۔ مجھے خوف ہے کہ تمہیں
ان کی فروخت سے ناامید نہ ہونا پڑے دیکھو اگر تم مجھ
سے مشورہ کرو تو میں ہرگز اس کی قیمت چالیس روبل مقرر
کرنے نہ دوں گا، اتنی بڑی رقم میں تو ادا نہیں کر سکتا"

اس کے چہرے پر فکر کے آثار پیدا ہوگئے کہنے لگا،
"حضور! کیا ان خداوندان چین" کی خوبصورتی کی قیمت

---

[1] روبل روسی سکہ جس کی قیمت [illegible] شلنگ [illegible] پنس ہوتی ہے۔

بیس روپل بھی نہیں"۔

"ہاں ہاں بیس بالکل مناسب ۔۔۔ مگر چالیس نہیں"

"اور یہ دیوتا جو آپ کو خوش قسمتی عطا کریں گے ان کا نذرانہ بیس روپل"

"ٹی ٹاسے! کیا تم مجھے بنانا چاہتے ہو؟"

اس نے پریشان ہو کر کہا "نہیں حضور! میں نہیں سمجھتا کہ ایسا ہے" پھر حیرت ناک لہجے میں کہا "شاید آپ ان کے معتقد نہیں"

"ٹی ٹاسے! اس معاملہ میں میں کچھ کہنا نہیں چاہتا بہت ممکن ہے کہ یہ دیوتا مجھے پسند نہ کریں یا اس سے پہلے کہ ان سے مجھے کسی قسم کا فائدہ پہنچ سکے اگر یہ گم ہو جائیں یا کوئی انہیں چرا لیجائے بہرحال میں کسی طرح مطمئن نہیں ہوں اسلیے میں صرف ان کی اصلی قیمت بیس روپل دے سکتا ہوں"

ٹی ٹاسے نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "حضور...!"

"ٹی ٹاسے! یہ مجھے پسند ضرور ہیں مگر افسوس ہے کہ میں ان کی قیمت اس سے زیادہ نہیں دے سکتا"

"حضور......!"

"خدا حافظ! ٹی ٹاسے!!"

"حضور! کیا آپ اپنی خوش قسمتی کے بیس روپل بھی نہیں دیں گے؟"

میں نے گرجدار آواز میں کہا "نہیں"

"اور خوبصورتی کے متعلق ...... بھی ...... کچھ نہیں"

مجھے بے تحاشا ہنسی آگئی مگر میں نے ضبط کیا، میں نے محسوس کر لیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح سودا کر ہی لیگا، اس لیے میں نے رقم دیدی اور ٹی ٹاسے نے اپنی فطری زندہ دلی کا اظہار کیے بغیر روپے لے لیے۔

"حضور! خدا آپ کے والدین پر رحمت نازل فرمائے ان خالص سند یافتہ واسطے دیوتاؤں کا سایہ آپ کے سر پر رہے اور آپ کو نام وری اور دولت حاصل ہو لنداما نقاما"

"خدا حافظ ٹی ٹاسے"

اس دن بقیہ وقت میں نے رپورٹ لکھنے کاغذات دیکھنے اور مختلف سرکاری کاموں میں گزار دیا، جب میں واپس ہوا تو رات زیادہ گذر چکی تھی، یہ دیوتا اسی طرح اپنی جگہ پر سجے ہوئے تھے، موم شمع کی روشنی ان میں غیرمعمولی دلفریبی کشش اور مسحور کرنے والا حسن پیدا کر رہی تھی، میں نے شمع کو ہٹا کر دوسری جگہ رکھا تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ان دیوتاؤں کی پوشاک کا سایہ بھی روشنی کے ساتھ ساتھ متحرک ہے۔ دیوتاؤں کی مخمور بادامی آنکھیں چمک رہی تھیں وہ مسکرا رہے تھے وہ دیوتا جو نصف آدمی تھے اس کے چہرے سے اظہار پسندیدگی ہو رہا تھا، اور ضعیف آدمی کے شگفتہ نہ چہرے پر کبھی نہ بجھنے والی آگ کی سی روشنی چمک رہی تھی۔

میں نے ان سے قطع نظر کرکے دوسرے دن کے کام کی طرف توجہ کی ایک روز پہلے دس ہزار روبل کے نوٹ مجھے وصول ہوئے تھے جو ملازمین کی تنخواہیں تقسیم کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے، یہ ایک بڑی ذمہ داری تھی جب تک تنخواہیں تقسیم نہ ہو جائیں اس رقم کی حفاظت مجھے کرنی تھی، اس لیے یہ نوٹ میرے لیے ایک مصیبت تھے۔

میرے کمرے کا دروازہ پرانی وضع کی ایک لوہے کی چٹخنی سے بند ہوتا تھا، یہ مکان دوسری عمارتوں سے خاصہ دور ایک گھنے جنگل کے کنارے تھا، بستر پر لیٹنے سے پہلے میں نے نوٹوں کے بٹوے کو بڑی احتیاط کے ساتھ توشک اور تکیوں کے بیچ میں چھپا دیا اور پستول سرہانے رکھ کر بغیر لباس تبدیل کیے بستر پر لیٹ رہا، دیاسلائی، موم بتی اور گھڑی بھی ایک کرسی پر بستر سے قریب ہی رکھ دی، ایک تاریک جنگل کے کنارے الگ تھلگ وضع کے غیرمحفوظ لکڑی کے مکان میں تنہا، سرہانے نوٹوں کا بنڈل رکھ کر اطمینان سے گہری نیند سونا اور خوشگوار خواب دیکھنا کتنا مشکل ہے۔

باقی کے لیے صفحہ [illegible]

اندر اندر ہوشیاری سے سر میں چکر شروع ہو گیا اور آہستہ آہستہ نیند کا غلبہ ہونے لگا اور میں خوش بخت بانسہ کے لیے دیوتا کا خواب دیکھنے لگا۔

جنگل کے قریب بغیر گرے ہوئے درختوں کے پاس ضعیف آدمی اپنی شفقت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا اس کے پاؤں کے پاس نیم آدمی اپنی انتہائی خوفناک صورت لیے دانت پیستا ہوا بیٹھا تھا اس کی پتلی پتلی لمبی انگلیاں بے شمار سونے کے سکوں سے کھیل رہی تھیں اور دوسرے دیوتا اسے کرے کے فرش پر رول گئے نوٹ بکھیرے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ناچ رہے تھے اور وہ تینوں ترچھی نظروں چاند کی شکلوں والی دیویاں بھی ان کے ساتھ تھیں۔ یہ منظر یکایک بدل گیا اب صرف نیم آدمی تھا جو حسب سابق نہایت مضحکہ خیز اور بدباطن نظر آ رہا تھا خواب میں میں نے ایسا محسوس کیا کہ وہ میری طرف بڑھ رہا ہے اس کا کالا ہاتھ میری طرف آہستہ آہستہ بڑھتا ہوا نظر آیا، جو آخر کار میرے بازو کو چھونے لگا اس خوفناک حالت کو دیکھ کر نیند ہی نیند میں میرے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکل گئی اور میں نے اس کی کلائی تھام لی، ناکام اور نامراد غصہ ور کی کا ایک ہیبت ناک آواز میرے کان میں آئی اور ایک تنومند شخص کا پورا وزن میرے اوپر محسوس ہونے لگا جو میرے اوپر چڑھا ہوا تھا۔ اب میں بالکل چست و چالاک اور ہوشیار تھا، میں نے غیظ و غضب کی حالت میں اس دبوچنے والے کی مقاومت شروع کی، چونکہ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا جس سے وہ مجھے ہلاک کرنا چاہتا تھا اس لیے میں نے بڑی جد و جہد کے بعد وہ چاقو اس کے ہاتھ سے چھین لیا، باہر طوفان باد و باران تھا اور عجیب و غریب آوازیں اس طوفانی ہوا اور بجلی کی [illegible] اس پریشانی میں ان آوازوں سے [illegible] تیزی کے ساتھ اپنا ہاتھ سرہانے پہنچایا اور پستول نکال کر آواز کر ہی رہا تھا تھوڑی ہی دیر کے بعد میرے جسم پر سے بوجھ کم ہونے لگا اور پھر کوئی ڈگمگاتی چال سے چلتا ہوا معلوم ہوا، میں نے اس گرفت سے آزاد ہوتے ہی بٹن دبایا اور بجلی کی روشنی سے میرا کمرہ جگمگانے لگا میں نے ایک بدباطن مضحکہ خیز صورت دیکھی جس کے بائیں پہلو سے خون بہہ رہا تھا۔

انتہائی تحیر کی حالت میں میرے منہ سے نکلا "مٹی ناسے" مگر وہ خاموش چلا گیا۔

اس رات اور دن بھر طوفان شدت اور تیزی کے ساتھ جاری رہا تیسری رات کو کہیں کچھ کمی ہوئی اور کمی بھی صرف اتنی کہ بجلی کا چمکنا اور بادل کا گرجنا موقوف ہو گیا مگر بارش جوں کی توں رہی بانسا کاو کے جنگل اور لکڑی کے مکان متاثر ہوتے رہے جس طرح ایک مضبوط اور قوی ہیکل آدمی رسیوں سے بندھا ہوا دشمن کے قبضہ میں بے دست و پا مجبور بیٹھا ہوا تازیانے کھائے اسی طرح درخت بھی ناقابل برداشت تکلیف سے متاثر ہو کر فریاد و فغاں کر رہے تھے، رات بھر یہی حال رہا دوسرے روز صبح کو چل کر کہیں سفیدی ظاہر ہوئی اور بتدریج بڑھتی گئی مطلع کچھ کچھ صاف ہوا مگر آفتاب کے نظر آنے کی توقع پھر بھی نہیں تھی۔

اس بارش کی وجہ سے رنگ اندازی کا کام بالکل بند رہا، وقت کا زیادہ تر حصہ میں نے بیکاری ہی میں گذار دیا۔ آخر تھک کر میں نے رات کو آتے ہوئے خط کا جواب لکھنا شروع کیا، کوئی گھنٹہ بھر کے بعد دروازہ پر دستک سنائی دی میں نے پکار کر کہا "اندر چلے آؤ"

دروازہ کھلا اور دو آدمی ایک مرد اور ایک عورت اندر داخل ہوئے، مرد فوجی قسم کا تھا، قد متوسط سے کچھ زیادہ، پہلی نظر میں تو وہ دہان پان معلوم ہوا مگر مضبوط ہاتھ پاؤں والا متناسب جوان تھا اس کی قوت و طاقت، تہذیب و شائستگی لیے ہوئے تھی اور [illegible]

"پیارے دوست کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ یہ دیوتا تم نے کہاں سے حاصل کیے؟"

میں نے ان کی خریداری کا سارا قصہ سنایا اور پھر کہا۔

"سوہوسین! میں یہ جانتا ہوں کہ یہ دیوتا مجھے غیر معمولی طور پر خوش نصیب اور کامران بنا دیں گے مگر تم سمجھ سکتے ہو کہ مجھے لکھ پتی بننے کے لیے بہت عرصہ لگے گا" یہ کہہ کر میں نے ہنسنا شروع کیا۔

سوہوسین نے معنی خیز تبسم کے ساتھ چائے کی پیالی میں چمچا چلانا شروع کیا پھر معنی خیز سنجیدگی کے ساتھ سگریٹ جلاکر اس سے کھیلتے ہوئے کچھ غور کرتا رہا اور یکایک کسی خاص نتیجہ پر پہنچ کر کہا۔

"پیارے دوست! ہمارے قدیم علم کے لحاظ سے تمام مادی کامیابیوں کا دارومدار قلبی کیفیات اور واقعات پر ہے، واقعات کی ہم آہنگی، موافقت اور خوش رفتاری پر یہ ساری باتیں منحصر ہیں، اگر کسی شخص کا مطمح نظر حصول دولت اور کامرانی ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ غیر خوش آیند اور ناموافق خیالات کو پہلے اپنے موافق بنانے ماحول کو اپنا معاون کرے یہ کام کچھ آسان نہیں اس لیے کہ ہم عام طور پر اس کی نیکی یا بدی کی پیروی کرتے ہیں جس سے ہمیں دل دماغ سابقہ پڑتا ہے اور مشکل اس سے منحرف ہوتے ہیں اچھا یہ تو بتاؤ ان دیوتاؤں میں سے تمہیں سب سے زیادہ کونسا دیوتا پسند ہے؟"

"منحنی آدمی اور تنا سب اعضا والی عورتیں" میرا جواب سنکر اس نے اظہار مسرت کے طور پر سر ہلا دیا، پھر کہا کہ ان میں کا ہر ایک صورت نیکی اور بدی کی قائم مقام ہے مگر اس [illegible] ایک جگہ رہنا ضروری ہے اس لیے کہ ایک دوسرے [illegible] ہیں اور ترقی کے زینے پر چڑھنے اور دولت [illegible] میں ایک دوسرے کو مدد دیتی ہیں یہ کمبخت [illegible] ملی دولت کی قائم مقامی کرتا ہے جو سب کے ہیچ اور صدر بنا رہتا ہے یہ چھوٹی بھولی حسین اور دلکش عورتیں فیاضی، وفاداری اور ہمدردی ہیں ان کا بتایا ہوا راستہ سیدھا کامیابی کے زینے پر پہنچا دیتا ہے"۔

تھوڑی دیر کے لیے رک کر کچھ کیدی کیفیت ظاہر کرتے ہوئے اس نے کہنا شروع کیا، "مگر یہ یاد رکھو کہ جو شخص مادی کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہو اس کیلئے پانچ دیوتاؤں کی پوجا بھی ضروری ہے، یہ سرخ بالوں والا عیار دغا ہے اور یہ بدذات کیڑا ریاکاری اور اس کے ساتھ ظلم، خودغرضی اور احسان فراموشی ہیں، جیسا موقعہ پیش آئے ویسا ان کی قربانی کرنی پڑیگی اور جو شخص جس قدر خلوص اور انہماک سے ان کی پوجا کریگا اتنا ہی انعام پائے گا"۔

میرا زیادہ وقت ڈیمبڑیف کی صحبت میں گذرتا تھا کبھی وہ میرے پاس آجاتے اور کبھی میں ان کے پاس چلا جاتا، یہ زمانہ نہایت اطمینان اور مسرت انگیز طور پر گزر رہا تھا اور کپتان سے میری دوستی پرخلوص اور مستحکم ہوتی جارہی تھی۔

ایک روز میڈم ڈیمبڑیف کو میرا اپنے شوہر کے ساتھ تنہا اپنے کمرے میں اس طرح داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر شرارت آمیز تبسم اس کے ہونٹوں پر کھیل رہا تھا، میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔

"آہ! میرے دوست! مجھے اس حالت میں یہاں دیکھ کر تم متعجب ہوں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ حیرت ناک اقدام ان دیوتاؤں کی وجہ سے ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب سے میں نے انہیں دیکھا ہے، ان کا خیال بری طرح مجھ پر مسلط ہوگیا ہے میں نے اس خیال کو نکالنے کی بہت کوشش کی مگر ناکامی ہوئی" [illegible] اس نے عجیب صورت بنا کر ہنسنا شروع کیا۔

میں نے آہستہ سے پوچھا "خوش قسمت بنانے [illegible]

"ہاں ہاں! کیا تم ان کو اسی نام سے موسوم کرتے ہو؟ جب سے میں نے انہیں دیکھا ہے ان کا خیال میری روح میں سما گیا ہے میں خواب میں بھی انہیں کو دیکھتی رہتی ہوں ..... ان دیوتاؤں نے میری زندگی کا لطف کھو دیا ہے میں تم کو اس کا یقین دلاتی ہوں کہ یہ نادر روزگار اور عجیب و غریب ہیں" یہ کہکر اس نے دیوتاؤں کی طرف نظر دوڑائی ایسا کرتے ہوئے اس کی آنکھیں غیر معمولی طور چمک اٹھیں اور اس نے یکایک میری طرف پلٹ کر کہا۔

"مسٹر ہاورڈ! تم جانتے ہو ان کا کیا مطلب ہے؟"

مجھے سو ہو مین نے جو بتایا تھا میں نے وہ سب بیان کر دیا۔ وہ نہایت سکون اور توجہ سے سنتی رہی پھر بڑے اضطراب کے ساتھ میری طرف بڑھنے لگی اس کے ہونٹ حرکت کر رہے تھے اور وہ تیزی سے کہہ رہی تھی۔

"مسٹر ہاورڈ! کیا تم ان بتوں کو بیچو گے؟"

"کیوں ..... پیاری میڈم ..... میرا ارادہ ..... مطلق نہیں ....."

"رحم رحم ...... رحم کیجیے ...... میرے پیارے دوست ...... تمہیں نہیں معلوم کہ میرے دل میں ان دیوتاؤں کی کتنی محبت ہے! شاید تم کو ان ..... پر اعتقاد نہیں ہے ...... جلد اور آسانی سے دولتمند بننے کے لیے ان کی شدید ضرورت ہے، اللہ کے واسطے میری درخواست رد نہ کیجیے ...... مجھے مایوس نہ پھیریے"

میں نے انکار کرتے ہوئے سر ہلا دیا۔

سسکتی ہوئی آواز میں اس نے کہنا شروع کیا۔

"آپ یہ نہیں چاہتے کہ وہ میرے پاس آئیں .... تو پھر میں خود ان کے پاس آتی ہوں ... پیارے دوست! تمہارے پاس یہ جسم ..... اس نے آگے بڑھ کر مجھے لپٹا لیا اور سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔ میں نے سختی کے ساتھ اسے علٰحدہ کرتے ہوئے گرجدار آواز میں کہا۔

"میڈم نہیں کیا ہو گیا ہے تمہاری عقل ماری گئی ہے، ہوش سنبھالو اگر ان بتوں کو تم ایسا ہی چاہتی ہو تو اے خاتون! خدا تم کو اپنی حفاظت میں رکھے ..... انہیں لیجا ؤ میں تمہارے حوالے کرتا ہوں، اس کا کوئی معاوضہ نہیں چاہتا تمہیں مبارک ہوں"۔

"اوہ! میرے محسن! کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں شکریہ ...... بہت بہت ...... شکریہ"

میں نے ان دیوتاؤں کو اسی ریشمی بستے میں لپیٹ کر اس کے حوالے کر دیا اور کہا۔

"یہ لو تمہارے پیارے دیوتا حاضر ہیں مگر میڈم تمہارے یہاں سے رخصت ہونے سے قبل میں تم کو یہ یاد کرا دینا چاہتا ہوں کہ میں تمہارے شوہر کا وفادار دوست ہوں اور تم میرے دوست کی بیوی ہو"۔

میں نے جھک کر سلام کیا اور وہ دیوتاؤں کا بستہ چھاتی سے لگائے ایسی حالت میں رخصت ہوئی کہ اظہار تشکر کے لیے اسے الفاظ نہیں مل رہے تھے اور اس کا قلب جذبات تشکر و امتنان سے معمور تھا اس کی زبان خاموش تھی اور وہ آیندہ خوشگوار زندگی دولتمندی اور خوش نصیبی کے تخیل میں کھوئی تھی۔

اس کے بعد بھی مدت تک کپتان اور میں حسب معمول ملتے رہے آخر میں کپتان کا تبادلہ کسی اور مقام پر ہو گیا اور وہ میاں بیوی مجھ سے جدا ہو گئے" پھر چار پانچ برس گذرے ہوں گے کہ ایک خوش منظر اور دل افروز صبح کو میں ٹی ڈی .... ایک ہنڈل .... میں دباے آہستہ سے میرے کمرے میں داخل ہوا، ایک پرانے دوست کو غیر متوقع طور پر آتا دیکھ کر میں چلا اٹھا۔

"میرے بہادر کپتان تم میرے گھر میں .... خوش آمدید ...... کہو خیر تو ہے؟"

میں نے گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا مگر وہ نہایت کمزور
معلوم ہو رہا تھا۔
"کپتان! کیا تم بیمار ہو؟"
اس نے بطور انکار سر کو جنبش دی۔
"نہیں یہ بات نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ یہ لو! تمہارے دیوتا
واپس لایا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔"
اس نے بنڈل کھول کر دیوتاؤں کو میز پر سجانا شروع کیا اور کہا۔
"یہ دیوتا وان میں سے کچھ کم تو نہیں ہوئے؟"
"ہاں' ان میں سے ۔ ۔ ۔ ریاکاری ۔ ۔ ۔ خود غرضی
۔ ۔ ۔ اور احسان فراموشی ۔ ۔ ۔ ۔ غائب ہیں"
"درست ۔ ۔ ۔ ریاکاری ۔ ۔ ۔ خود غرضی ۔ ۔ ۔
اور احسان فراموشی ۔ ۔ ۔ تینوں غائب ہیں"
پھر نہایت تلخ لہجے میں کہا "اور ان کے ساتھ میری بیوی بھی"
"اف کپتان ۔ ۔ ۔ غضب خدا کا ۔ ۔ ۔ مجھے یہ
سننے سے اس قدر افسوس ہوا بیان نہیں کر سکتا ۔ ۔"
"ہاں! بہت درست ہے! یہ ایک افسوس ناک بات ہے"
وہ ان ناپاک دیوتاؤں کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی تھی ۔ ۔
آخر ایک روز ایک چینی دولتمند سوداگر کے ساتھ بھاگ
گئی ۔ ۔ ۔ ریاکاری' خود غرضی' اور احسان فراموشی
۔ ۔ ۔ وہ بڑی ہوشیار عورت تھی اسے معلوم تھا کہ
کونسے دیوتا اس کے مفید مطلب ہیں آخر انہیں دیوتاؤں
نے اس کی خوش نصیب اور دولتمند بنا دیا' وہ بڑی
سمجھدار بھی تھی اس نے میرے لیے جن دیوتاؤں کو چھوڑا
ہے وہ کیا ہیں ۔ ۔ ۔ عزت ۔ ۔ ۔ وفاداری
۔ ۔ ۔ ہمدردی ۔ ۔ ۔ ۔"
وہ رونے لگا رقت کی وجہ سے اس کی آواز میں
ہچکیاں پیدا ہو گئیں۔
تھوڑی دیر تک ہم دونوں نہایت ہی خاموش بیٹھے رہے
پھر یکایک میرے دل میں ایک خیال پیدا ہوا

اور میں نے دریافت کیا۔
"کپتان! تمہیں اس چینی کا نام بھی معلوم ہے؟"
ایک لمحے تک اس نے غور کیا پھر کہا۔
"کیوں نہیں ۔ ۔ ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ۔ ۔ ۔
اس کا نام تھا ۔ ۔ ۔ ٹی ۔ ۔ ۔ شا ۔ ۔ ے ۔ ۔ ۔
ٹی ۔ ۔ ۔ شا ۔ ۔ ے"
"ہاں کپتان! تم ٹھیک کہتے ہو اس کا نام یہی تھا" میں
نے کہا "کیا تم اس سے واقف بھی ہو"
کپتان نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اچھی طرح"
اس کی نظروں میں غصہ بھرا ہوا تھا
میں نے دریافت کیا "کیا تم اس کے کردار سے بھی واقف ہو"
"وہ ایک پکا بدمعاش تھا" اس نے دانت بھینچ کر کہا۔
"ہاں کپتان! میرا بھی یہی خیال ہے"
"تم نہیں جانتے ہاورڈ کہ وہ اول نمبر کا دغاباز تھا"
"ممکن ہے ایسا ہی ہو" میں نے بے پروائی کے ساتھ کہا۔
"ہاورڈ [illegible] سب کا نام [illegible] ہے۔ سنو! اچھا سنتے ہو تو
سنو! ایک عرصے سے وہ میری بیوی کو بھگا لیجانے کی فکر میں تھا۔
وہ اس کا عادی ہے۔ اس نے اب تک کئی عورتیں بھگا لے گیا ہے
وہ ایک پیشہ ور بدمعاش ہے۔ مجھے اس سے ہمیشہ ہی خطرہ لگا
رہتا تھا۔ آخر میرا شبہ ٹھیک ہی نکلا"
"وہ عورتوں کو بھگا لیجا کر کیا کرتا ہے" میں نے دریافت کیا۔
"تم نہیں جانتے میرے دوست!" کپتان نے بھرائی ہوئی آواز
میں کہا "وہ ہمیشہ اسی طرح بیچے کرتا ہے۔ خوبصورت عورتوں کو بیچ کر
دولت کماتا ہے — بدمعاش!"
"بدمعاش کہیں کا" میں نے غصے کے ساتھ کہا۔
"دیکھو تو! ہاورڈ۔ کیا میری بیوی واپس مل سکتی ہے؟"
"جانے بھی دو" میں نے کہا "جو چیز دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھ چکی اس کی
واپسی کا سوال ہی کیا"
"دیوتا بھینٹ ۔ میرا بیٹا" کہتا ہوا وہ بیہوش ہو گیا۔

تمکین کاظمی

الفت خاموش

چندا کیسی ہے ـــــ؟ یہ تو میں آپکو صحیح طور پر نہیں بتا سکتا ہاں خوبصورت اُسے سب کہتے ہیں اور وہ سب کو اچھی لگتی ہے لیکن میں تو اس سے محبت کرتا تھا - اور کرتا کیا تھا - کرتا ہوں - میں اسکے بچپن پر فریفتہ ہوں - اسکی سیاہ آنکھوں کی گہرائیوں پر میں سب کچھ قربان کرسکتا ہوں - اسکے لیے میں دوزخ کی خوفناک آگ میں بھی کودنے کو تیار ہوں - مجھے اس سے بے اندازہ محبت ہے - بہت ممکن ہے آپ خیال فرمائیں یہ محبت تو "الفت لیلوی" قسم کی ہوئی - کچھ بھی ہو، مگر میں تو چندا کے خشک ہونٹوں میں عجیب کشش پاتا ہوں۔

× × ×

جس دن میں نے چندا کو دیکھا - اس روز نہ تو گہر کا دھند لکا تھا - نہ بارش ہو رہی تھی - ہلکا ابر آسمان پر محیط تھا - بالکل ہلکا - جیسے کسی نے نیلے سمندر پر ہلکی ہلکی برف جما دی ہو - ایسے ہی سہانے سمے میں نے چندا کو دیکھا تھا - پھر مجھے اس سے محبت ہو گئی تو اس میں میرا کیا قصور؟

× × ×

آہستہ آہستہ شام کا دھندلکا کا کتنا گہرا ہو گیا اور فضا اداس ہو چلی تو مانو پھنسے لگا - قسمت رات کا خیر مقدم اداسی سے کیوں کرتی ہے ـــــ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ چونک پڑا - میں نے دیکھا، چندا گگریا پانی کا گھڑا لیے آہستہ آہستہ جا رہی ہے - اسکی صورت بھولی اور چال میں الھڑ پن تھا - وہ الھڑ سندرتا ہے - میں نے چاہا اسے آواز دوں لیکن اسے مخاطب کرنے کا کوئی عنوان میرے ذہن میں نہ آیا - میری زبان گنگ تھی - میں سمجھتا آ رہا تھا کہ محبت اندھی ہوتی ہے - آج معلوم ہوا گونگی بھی ہوتی ہے!

× × ×

[illegible] پانی بھرنے آئی تھی - میں ادھر گزر رہا تھا - اچانک ہماری آنکھیں آپس میں ٹکرا گئیں - کنواں سنسان تھا - گرد و پیش کوئی نہ تھا - جی چاہا کہوں ـــ "چندا! مجھے تم سے محبت ہے!" لیکن نہ جانے کیوں الفاظ حلق میں پھنس کر رہ گئے - چندا نے گھڑا کمر پہ رکھا اور چلی گئی -

× × ×

نہ جانے کیوں اب چندا اپنی سکھیوں کیساتھ پانی بھر کر چلی جانے کے بعد تنہا پنگھٹ پر آتی ہے - اور جب تک میں ادھر سے گزر نہیں جاتا کسی نہ کسی بہانے بیٹھی رہتی ہے - کبھی منہ دھوتی ہے - کبھی پتھر پہ اپنی گلابی ایڑیاں رگڑتی ہے -
میں کنوئیں کے پاس سے گزر کر کبھی پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو وہ بھی میری طرف دیکھتی رہتی ہے -
کبھی کبھی آنکھیں ہی زبان بن جاتی ہیں - ہم منہ سے کبھی نہیں بولتے لیکن آنکھیں دل کا سارا بھید کہہ جاتی ہیں -

× × ×

میں اس کو گھورتا ہوں وہ بھی چور نظروں سے مجھے دیکھتی ہے - میں ہنستا ہوں وہ مسکرا دیتی ہے - اس کی ایک مسکراہٹ پر ہزاروں بجلیاں قربان ہو جاتی ہیں - چندا کی ان ہی ادائیوں سے فائدہ اٹھا کر میں نے پنگھٹ پر روزانہ حاضری دینا شروع کر دی - یہ وہ وقت ہوتا جب کہ پنگھٹ پر میرے اور چندا کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا - ہم دونوں دور ہی دور رہتے لیکن ہمارے دل قریب سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں -
تب میں نے چاہا کہ میں اس کا نام لے کر پکاروں مگر پھر خیال کرتا ہوں کہ کہیں اس کو ناگوار نہ گزرے - اسی لیے دل مسوس کر خاموش ہو جاتا ہوں -
مجھے چندا سے بے حد محبت ہے اس لیے میں ہر وقت خاموش رہتا ہوں میں یہ بھی جانتا ہوں کہ چندا بھی مجھے دل و جان سے چاہتی ہے اسی لیے وہ بھی خاموش رہتی ہے نہ معلوم ہمارے محبت بھرے سکوت کی مہر کب اور کیسے ٹوٹے گی

آسی رام نگری

"عجیب لڑکی ہے یہ۔ سوائے گانے کے اس کو کسی کام سے نہیں" طبیعات کی کتاب بند کرتے ہوئے میں نے امی سے کہا۔

"بیٹی! خفا نہ ہو۔ میں اس کو منع کر دوں گی بچی تو ہے اس میں سمجھ بوجھ کہاں" امی نے سمجھانے کی خاطر مجھ سے کہا۔

بنو تھی تو ہمارے گھر کی نوکرانی کی لڑکی مگر گھر والوں سے زیادہ اس کی خاطر داریاں کی جاتیں۔ قصہ اصل میں یہ ہے کہ بنو کی ماں زچگی کی حالت میں چل بسی اور اس واقعہ سے چند ہی روز پہلے ہمارا ایک نومولود بھائی مر چکا تھا اس لیے بنو کو ہماری ماں نے اپنا دودھ پلا کر پالا تھا۔ اس لیے امی ابا، بڑے بھائی، منجھلے بھائی، سنجھلے بھائی، خالہ جان، پھوپی جان، جو منسوب ہی بنو سے گھر کی لڑکی کی طرح سلوک کرتے تھے امی ابا تو اس کو نظروں سے دور ہونے نہیں دیتے تھے اور پیار کا یہ عالم کہ بنو جب تک کھانا نہ کھائے امی جان بھی نہ کھاتیں گی۔ بعض بعض وقت تو ابا میاں بھی امی کا ساتھ دیا کرتے تھے۔

بنو ضدی ضرور تھی مگر اس کی ضد کا جادو امی ابا کے سوا کسی اور پر نہ چلتا تھا خالہ جان، پھوپی جان اور بڑے بھائی جان بھی کبھی کبھار اس کے نخروں کو سہہ لیتے مگر بھابی جان تو ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ سے کام لیتی تھیں اس پر اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ امی اور بھابی میں دو دو ہاتھ ہو گئے ابا بیچ بچاؤ کر دیتے۔ بھابی کے مقابلے چونکہ بھائی جان کو تو جرأت بھی [illegible]

بنو کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھا گیا تھا وہ [illegible]

جماعتیں ایک بار فیل ہونے کے بعد تعلیم چھڑا دی گئی عرصے سے موسیقی کی تعلیم کے لیے ایک استاد گھر پر [illegible] بنو کو ہر قسم کا ساز بجانا آتا تھا اور گاتی بھی خوب تھی طبیعت میں چنچل پن بہت تھا اس لیے گھر کے ہر فرد [illegible] کو چھیڑ چھیڑ کر گانے سنایا کرتی جب گانا سننے کے لیے کوئی نہ ہوتا تو تنہا باغ میں جھولا جھولتے ہوئے گا گا کر خود سن لیتی۔

جھولا میرے کمرے کے سامنے ہی تھا۔ وہ جھولے پر زور سے گاتی اور میری طرف دیکھ کر داد کی طالب ہوتی کئی بار تو میں بھی اس کو دھتکار دیتی مگر وہ شریر میری دھتکار کو کب خاطر میں لانے والی تھی ہنس کر زور زور سے گا کر پینگ کر رہی کہتی "دیکھو بنو! اگر تجھے خوب پیٹوں گی۔ خاموش رہ۔ ورنہ یہاں سے چلی جا۔ میرا امتحان قریب ہے۔ تنہائی کی سخت ضرورت ہے بھلا تیری چیخ پکار میں پڑھائی ہوگی مجھ سے تو کچھ یاد نہیں کیا جاتا۔"

میری باتیں سن کر وہ جھولے سے کود کر کمرے میں آئی اور کہنے لگی بی بی! اگر آپ کو یاد نہیں ہوتا ہے تو میں ابھی بلا لاتی ہوں۔ وہ طبیعات کے ماہر ہیں سجاد [illegible] کے فرسٹ کلاس ایم، ایس۔ سی ہیں کہیں تو ٹیچر بی بی بلا لاؤں؟

وہ شریر اس انداز سے کہتی جیسے مجھے وہ [illegible]

"انور؟" اس نام سے ہی مجھے محبت تھی [illegible] ساتھ پلے بڑھے ہوئے اور ایک استاد سے [illegible] میرے چچیرے بھائی تھے جن کے ساتھ بچپن ہی میں میری [illegible] تھی۔ ام۔ ایس سی تک ابا جان کرنے کے بعد ہی [illegible] شادی کر دینا چاہتے تھے لیکن بی۔ ایس سی کا [illegible] میں نے شادی سے انکار کر دیا [illegible] مجھے مشورہ دیا تھا [illegible]

[illegible]

میں [illegible] کی صحبتوں میں گزر آئی ہوئی تھی میرا صرف ایک بھیجنے
کے لیے قیام تھا جسنے ٹھیک کیا تھا۔ انور کی امداد کی مجھے
وہ بھی ضرورت تھی۔ کبھی کبھار ان سے بعض مسائل میں تبادلہ
خیال کرتا تھا۔ انور گانے کے بڑے شوقین تھے۔ کتب بینی کے
بعد ان کا اکثر و بیشتر وقت گانے بجانے میں گزرتا تھا۔ وہ نجو کا
گانا سننے کے لیے روزانہ ہمارے گھر آیا کرتے تھے فن میں چونکہ
انہیں بھی دخل تھا اس لیے نجو کو کچھ بتایا بھی کرتے تھے۔

نجو اس وقت سولہویں سال میں تھی۔ آنکھ ناک کی سیدھی
اور رنگ صاف تھا۔ چہرے پر ملاحت اور صباحت کا ایک ایسا
امتزاج تھا کہ ہر دیکھنے والے کی نظر جذب ہو کر رہ جاتی تھی
مجھے بھی اس پر پیار آتا تھا۔ اس کی شرارتوں سے تنگ آکر میں
کبھی غصے میں آجاتی تو اس کا بھولا بھالا چہرہ دیکھ کر میرا غصہ
سب رفو چکر ہو جاتا تھا۔ اس کی باتوں میں ایسی گھلاوٹ تھی کہ
ہر سننے والا شخص اس کے مزے لیتا تھا۔ وہ ہنستی تو پھول جھڑتے
اور روتی بھی تو اس سے لاڑ [illegible] چھیل چھبیلی تھی کہ اتنی
بڑی ہونے کے باوجود بھی [illegible] نہیں تھی [illegible] بچپن
اس کی طبیعت میں الھڑپن تھا۔ [illegible] نام کو نہ تھا۔ وہ ایک
ہرنی کی طرح اچھلتی کودتی اور کوئل کی طرح ہر وقت کوکو کا راگ
الاپا کرتی تھی۔ ان تمام خوبیوں کے قطع نظر مجھے وہ ایک ڈائن
اور ایک ڈسنے والی ناگن دکھائی دیتی تھی۔ نہ معلوم کیوں؟
میں نے بارہا اس بیہودہ خیال کو دل سے نکال دینا چاہا
مگر [illegible] نفرت سے مجبور تھی۔ ایک چبھن سی دل میں محسوس ہوتی
[illegible] کھٹکتا رہتا تھا ۔۔۔ نہ معلوم کیا!
جیسے جیسے دن گزرتے گئے نجو سے کچھ نفرت سی ہو چلی
[illegible] نہیں جانتی تھی کہ آخر یہ سب کچھ ۔۔۔ کیوں؟
[illegible] گیا ایک دو بار میں نے انور کو
[illegible] سے زیادہ نہ ملا کریں۔ وہ ہنس
[illegible] ہنس کر ٹال جاتا۔
[illegible] جاتی کہ [illegible] تھی

میں [illegible] کیوں کہ وہ گانے کے شوقین تھے [illegible]
بجائے [illegible] گانا سننے آتے ہوں گے۔

اسکول میں لڑکیوں کے گانے کا مقابلہ ہونے والا
تھا۔ انور نے امی کی اجازت سے نجو کا نام بھی لکھوا دیا۔
نجو کا استاد بیمار پڑ چکا تھا۔ مقابلے میں جانے سے پہلے باقاعدہ
مشق کی ضرورت تھی۔ یہ کام خود انور نے اپنے ذمے لیا اور
روز دو گھنٹے اس کو مشق کراتے۔

گانے کا مقابلہ ہوا۔ نجو اول آئی۔ ریڈیو پر [illegible] پہلی
مرتبہ نجو کی آواز سنی اور ہر ایک شیدائی ہو گیا۔ دوسرے دن
اخباروں میں نجو کے چرچے ہونے لگے۔ اس کو تو اس کا احساس
تک نہ تھا مگر انور اپنی استادی کا فخر کرتے پھولے نہ سماتے تھے۔
اب ہفتہ میں چار روز وہ ریڈیو پر گایا کرتی تھی۔ اب بھی وہ ویسی
ہی بھولی بھالی تھی مگر ذرا ذرا سا اس میں بھی احساس پیدا
ہو چلا تھا۔ وہ دل سے انور کی ممنون تھی۔ اب انور اور وہ
گھنٹوں ایک ساتھ گزار دیتے۔ گھر کی چھوکری تھی کسی کو کسی قسم
کا خیال تک نہ تھا ۔۔۔ پر میرے دل میں رہ رہ کر خلش
ہوتی تھی ۔۔۔ نہ جانے کیوں؟

میں شہر میں تھی امتحان بالکل ہی قریب تھا۔ پڑھائی
میں میرا دل نہ لگتا تھا۔ طبیعت پریشان سی رہتی تھی۔ امتحان
کی گھڑیاں بڑی کٹھن معلوم ہو رہی تھیں۔ کب امتحان ہوگا
اور کب ہم دونوں ایک ہو جائیں گے۔ اسی قسم کے خیالات
میں میں ہر وقت غرق رہتی۔

امتحان ختم ہوا میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ میں
رات دن گھر اور انور کے سندر سپنے دیکھا کرتی تھی۔ اب وہ
دن آگیا تھا جب کہ میں اپنے گھر لوٹ کر جی کی مراد پا لوں
ہاسٹل کی سہیلیاں ہر چند مجبور کر رہی تھیں کہ دو چار روز اور ٹھہر
جاؤں تاکہ سب مل کر پکنک پارٹی پر جائیں [illegible]
اپنی [illegible]
[illegible] مگر میرے لیے ایک ایک [illegible]

تھا۔ اس لیے انہوں نے والد صاحب سے اجازت حاصل کی اور ہاسٹل
کے ملازمین کو رخت سفر تیار کرنے کے لیے کہدیا۔
ناشتے سے فارغ ہو کر میں نکلنے والی ہی تھی کہ خادمہ نے
ایک خط لا کر دیا۔ خط چاک کر کے میں نے پڑھنا شروع کیا۔
"صبیحہ! یہ تو مجھے معلوم ہے کہ تمہارا امتحان ختم ہو چکا
اور مجھے اس کا یقین ہے کہ تم آج کل میں وہاں سے نکل جاؤگی۔
میں جانتا ہوں کہ اگر تم پڑھائی کر از سکتی تو امتحان کے فوراً بعد یہاں
پہنچ جاتیں۔ یقیناً تمہیں میری دشمن ہوگی۔ میں تمہاری محبت
کا شروع ہی سے قایل ہوں۔ تم بڑی اچھی لڑکی ہو۔ تمہاری قابلیت
و قابلیت کے کیا کہنے میں تمہاری دل سے قدر کرتا ہوں۔"
"صبیحہ! تم ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت ہو! تم سمجھ سکتی ہو
کہ عشق کس اندھے جذبے کا نام ہے یہ بھی معلوم ہوگا کہ محبت کے
اندھے عشق کے بھی اندھے ہوا کرتے ہیں۔ اس وادی پر خار میں
پھنسنے کے بعد اس سے نکلنا ناممکن ہے۔ نہ معلوم اب تک تم نے
اس کا کیا مطلب لیا ہو!"
"مجھے کچھ حجاب سا محسوس ہو رہا ہے۔ میں پریشان ہوں۔
میرے حواس بجا نہیں ہیں میری عقل ٹھکانے نہیں ہے تمہیں بتاؤ
صبیحہ کہ میں کیا کہوں — تمہیں کس طرح منہ دکھاؤں۔ میں نادم ہوں
میں قصوروار ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں دکھ پہنچا رہا ہوں لیکن
— یہاں پہنچتے ہی صبیحہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا وہ پریشان ہو گئی
حیران تھی کہ وہ کیا پڑھ رہی ہے۔ انور اور صبیحہ کو دکھ پہنچائے" نہیں!
ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا" کہتے ہوئے اس نے خط کا باقی حصہ پڑھنا
شروع کیا —
"صبیحہ! میری بہن —" صبیحہ کا دماغ چکرا گیا اس کے ہوش
جاتے رہے۔ عقل رو چکر ہو گئی۔ انور اس کا پیارا انور۔ اس کو دل
وجان سے چاہنے والا انور۔ وہ انور جو اس کو اپنی ہونے والی بیوی
سمجھتا ہو — بہن کے لقب سے مخاطب کرے۔
[illegible] لڑکی تھی اس نے دل کڑا کر کے خط کو
[illegible]

— میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔ تم سے بھیک مانگتا
ہوں۔ ہاں بھیک اپنی زندگی کی بھیک۔ یقین جانو کہ میری موت و حیات
تمہارے ہاتھ ہے — صبیحہ! نجمہ نے نہ جانے کیا جادو کر دیا ہے"
"نجو! نجمہ — نجمہ نے کیا جادو کر دیا ہے۔ میرا شبہ میرا
وسوسہ او وہم و گمان نہیں حقیقت یا یقین تھا۔ میں اس آنے والے
خطرے کو خوب سمجھتی تھی۔"
"نجو! ڈائن! ناگن!! زہریلی ناگن" کہتے ہوئے صبیحہ نے پھر
خط پڑھنا شروع کیا —
"— یقین جانو کہ صبح شام اور ہر وقت دل پر اثر رہتا ہے۔
میں اپنے رویں رویں میں اس کو بسا ہوا پاتا ہوں۔ اس کے بغیر میری
زندگی ناممکن ہے۔ اگر تم کو مجھ سے کچھ محبت ہے تو میری خاطر۔ میری
زندگی کی خاطر تم مجھ سے شادی سے انکار کر دو۔ نجو کو میں اپنا صرف اس
وقت بنا سکتا ہوں جب تم مجھ سے نفرت کا اظہار کرو۔ صبیحہ! صبیحہ میں
تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ پر ہے۔ آخر میں میں
یہ کہدینا ضروری سمجھتا ہوں کہ نجو اس میں بالکل بے قصور ہے۔"

تمہارا بھائی
انور

"میرا بھائی! میرا بھائی! انور — ہاں ہاں میرا بھائی۔
کیوں نہیں آخر وہ میرا بھائی ہی تو ہے۔"
"بھائی! بھائی!! بھائی!!! اچھا تو اس کو اپنا بھائی ہی بنا دوں گی
جس کے دل میں میری محبت نہ ہو!"
صبیحہ کا پورا خاندان آزاد خیال تھا۔ شادی بیاہ کے معاملے میں
لڑکا لڑکی کی رائے کو خاص اہمیت دی جاتی تھی صبیحہ کے گھر جانے کے بعد [illegible]
نے اس بات سے اسکی شادی کی چل پل شروع کر دی۔ جب اسکو اس کا علم ہوا
تو اس نے اپنے والدین سے صاف انکار کر دیا کہ اس کو انور سے قطعی کوئی
محبت نہیں ہے اور نہ قریب میں وہ شادی ہی کرنا چاہتی ہے۔
صبیحہ کا یہ غیر متوقع جواب سنکر پورا خاندان حیران تھا [illegible]
صبیحہ کو اپنی صورت تک دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ [illegible]
سے نجو انور کا بیاہ ہو گیا [illegible]

فسانہ

قیدی

قیدی، رنجور، دل شکستہ
غمگین، مضطر، ذلیل، خستہ

زنداں کی مصیبتیں اٹھائے
بیٹھا تھا غریب سر جھکائے

آئینہ درد و یاس چہرہ
آنکھیں سونی اداس چہرہ

اشکوں کے حجاب میں نگاہیں
تھم تھم کے لبوں پہ سرد آہیں

ڈوبی ہوئی، غرق شادمانی
پیری سے ضعیف تر جوانی

ناخن لانبے بڑھے ہوئے بال
بے حس، مغموم، زرد، بے حال

ہر سانس تھی اک فسانۂ غم
کھوئی ہوئی زندگی کا ماتم

ہستی اک بد دعا تھی اس کو
گیتی دام بلا تھی اس کو

اب اس کے لیے تھی اک کہانی
پچھلی آزاد زندگانی

بے روح بہار، ابر تاریک
دنیا مانند قبر تاریک

بے یار و دیار زار و تنہا
مدت سے غریب قید میں تھا

آنکھوں میں گہرہائے الم تھی
ہلکی سی امید کی تجلی

شاید کوئی راستہ نکل آئے
زندان بلا کا قفل کھل جائے

ہو غیب سے کوئی شکل پیدا
ممکن ہے کہ رحم کھائے دنیا

شاید نالوں میں کچھ اثر ہو
اس شام ملال کی سحر ہو

یہ آس جلائے جا رہی تھی
قیدی کو بنائے جا رہی تھی

لیکن کچھ دن کے بعد دیکھا
پیش زنداں ہجوم سا تھا

حد غم سے گزر گیا وہ
پوچھا تو کہا کہ مر گیا وہ

کل تک اسے کیا نہ جستجو تھی
دل میں صد رنگ آرزو تھی

اللہ رے فریب آرزو کا
کتنا سادہ! عجیب!! گہرا!!!

داستان حیات

ماضی:—

تم آئے تھے گلوں میں گلفشانی ہوتی جاتی تھی
تمہارے آگئے نکہت پانی پانی ہوتی جاتی تھی
نظر افروز کچھ یوں نوجوانی ہوتی جاتی تھی
کہ میری زیست کی رنگیں کہانی ہوتی جاتی تھی
نگاہوں کی کچھ ایسی مہربانی ہوتی جاتی تھی
کہ میری زندگانی زندگانی ہوتی جاتی تھی
شب مہتاب تھی، تم سامنے تھے اور تنہائی

حال:—

دل مشتاق پر چشم کرم کم ہوتی جاتی ہے
قیامت ہے کہ جو ہی مجھ پہ برہم ہوتی جاتی ہے
مری آنکھوں میں جیسے بزم شبنم ہوتی جاتی ہے
حیات گمشدہ منت کش غم ہوتی جاتی ہے
مری ناکامیوں میں زندگی ضم ہوتی جاتی ہے
مری ہر سعی کامل سعی مبہم ہوتی جاتی ہے
دل صد چاک ہے غمخواریاں ہیں اور ویرانی

مستقبل:—

تمنائے وصل کی اک حسرت دل ہوتی جائیگی
رہوں گا جس قدر بھی دور منزل ہوتی جائیگی
رگ جاں نشتر مژگاں سے بسمل ہوتی جائیگی
بہار نو خزاں کی سمت مائل ہوتی جائیگی
وہی کچھ اور ہے کچھ اور محفل ہوتی جائیگی
اسی صورت اجل میری مقابل ہوتی جائیگی
تمہاری یاد ہوگی، اشک ہوں گے اور مایوسی

مشتاق جلیلی

ضبط سکوں

مرا کام آہ و فغاں نہیں

نہ کسی کو راز بتاؤں گا
نہ کسی کو داغ دکھاؤں گا
نہ سنوں گا کچھ نہ سناؤں گا
کوئی بات لب پہ نہ لاؤں گا
کہ شہید ضبط وفا ہوں میں
مرا کام آہ و فغاں نہیں

مجھے سوز عشق میں ہے سکوں
جو ہے حال دل سے کیا کہوں
مرے سر میں ہے اثر جنوں
نہیں کچھ خبر میں کہاں پہ ہوں
مجھے درد ہجر عزیز ہے
مرا کام آہ و فغاں نہیں

مجھے اپنے اشکوں سے پیار ہے
مجھے درد ہی میں قرار ہے
کروں کیا جو گلشن پہ نکھار ہے
مجھے نوک خار بہار ہے
مرے دل کے داغ ہرے رہیں
مرا کام آہ و فغاں نہیں

وہ چمن میں آئے تو کیا کروں؟
جو بہار لائے تو کیا کروں؟
گل اگر کھلائے تو کیا کروں؟
جو گلوں پہ چھائے تو کیا کروں؟
میں خزاں رسیدہ میں مست ہوں
مرا کام آہ و فغاں نہیں

انھیں ناز حسن و جمال پر
مجھے فخر فکر و خیال پر
وہاں رنگ و بو پہ زوال پر
مرا جذب عشق کمال پر
مری روح نغمہ طراز ہے
مرا کام آہ و فغاں نہیں

نغمہ
(لکھنوی)

ایک شام

کل شام گیا تھا جو میں دریا کے کنارے
پھرتے ہیں نگاہوں میں ابھی تک وہ نظارے

چلتی تھی وہ بے پاؤں کچھ اس طرح ہوائیں
جھرمٹ میں حسینوں کے ہوں جس طرح اشارے

غنچے تھے نہ گل تھے، نہ روش صحن چمن کی
اس پر بھی کسی نے مرے جذبات ابھارے

بھینی سی فضاؤں میں تھی پھیلی ہوئی خوشبو
ہر سو تھے رواں دلکشی و حسن کے دھارے

طاری تھا سکوت ایسا سر آب کہ جیسے
ستانے کو رک جائیں مسافر تھکے ہارے

دریا پہ چمکتے ہوئے خورشید کی کرنیں
سوئے ہوئے پانی پہ رواں نور کے دھارے

پانی پہ کوئی سرخ سی بانات بچھی تھی
رنگین شفق کے تھے دلاویز نظارے

اک کیف سا چھایا ہوا تا حد نظر تھا
میں محو نظارہ تھا تخیل کو سنوارے

اتنے میں صدا کان میں پازیب کی آئی
افلاک سے بہنے لگے موسیقی کے دھارے

دامان تصور پہ گری برق شرر بار
ہنگام سحر جیسے پریشاں ہوں ستارے

گگری لیے بانہوں میں اک الھڑ سی حسینہ
تھی محو خرام اور تھے محبوب نظارے

سمجھا میں کوئی حور ہے فردوس بریں کی
آباد ہے دنیائے طرب جس کے سہارے

پڑ جائے اگر اس پہ نظر صحن چمن کی
ہو جائے ہر اک پھول کلی رشک کے مارے

گگری بھرے پانی سے جو وہ جانے کو پلٹی
دیکھا مجھے اور چونک پڑی خوف کے مارے

کچھ سوچ کے پھر خود ہی نظر اپنی جھکا لی
رقصاں ہوئے ہونٹوں پہ تبسم کے شرارے

گگری کو سنبھالا کبھی آنچل کو سنوارا
رفتار پہ قربان ہوئے عرش کے تارے

کچھ دور گئی تھی کہ پلٹ کر مجھے دیکھا
اف مست نگاہوں کے گہربار اشارے

آباد ہے دنیائے تخیل میں ابھی تک
وہ شوخ نظر اور وہ رنگین نظارے

عزیز احمد بی اے

مجبوری

باز آ! میری محبت کے جنونِ خام سے!!
دیکھ! دامن کو بچا لے تلخیٔ انجام سے!!

چھوڑ دے میرے لیے یہ بیقراری چھوڑ دے!
میری خاطر روز و شب کی اشکباری چھوڑ دے!
یہ بظاہر جذبِ غم کی پردہ داری چھوڑ دے!

باز آ! میری محبت کے جنونِ خام سے!!
دیکھ دامن کو بچا لے تلخیٔ انجام سے!!

یہ تری بہکی جوانی، یہ ترا سوتا شباب!
منتشر انگڑائیاں لیتا ہوا حسنِ خراب!
بن گئی ہے زندگی گویا مسلسل اک عذاب!

باز آ! میری محبت کے جنونِ خام سے!!
دیکھ دامن کو بچا لے تلخیٔ انجام سے!!

کس لیے بے کیف و بے رونق ترے لمحات ہیں!
کس لیے افسردہ و غمگیں ترے جذبات ہیں؟
کس لیے تاریک و یاس انگیز احساسات ہیں؟

باز آ! میری محبت کے جنونِ خام سے!!
دیکھ! دامن کو بچا لے تلخیٔ انجام سے!!

رات کی خاموشیوں میں تیرے نالوں کی پکار!
سسکیوں کے ساز پر آہوں کے نغمے بیقرار!
سن کے اکثر کانپ اٹھتا ہے مرا غم دیدہ دل!

باز آ! میری محبت کے جنونِ خام سے!!
دیکھ دامن کو بچا لے تلخیٔ انجام سے!!

تجھ کو میرے جذبۂ ناکام حسرت کی قسم!
تشنگیٔ ذوقِ احساسِ محبت کی قسم!
شامِ ویرانی کی قسم، صبحِ قیامت کی قسم!

باز آ! میری محبت کے جنونِ خام سے!!
دیکھ دامن کو بچا لے تلخیٔ انجام سے!!

میری خاطر زندگی کو روشناسِ غم نہ کر!
دیکھ! رہ جائیں کہیں نالے نہ محرومِ اثر!
یوں کہیں تنہا بھی ساری عمر ہوتی ہے بسر!

باز آ! میری محبت کے جنونِ خام سے!!
دیکھ! دامن کو بچا لے تلخیٔ انجام سے!!

یہ محبت آگ ہے، اے کاش تو بھی جان لے!
آتشیں سا ناگ ہے، اے کاش تو بھی جان لے!
عشق دیپک راگ ہے، اے کاش تو بھی جان لے!

باز آ! میری محبت کے جنونِ خام سے!!
دیکھ دامن کو بچا لے تلخیٔ انجام سے!!

عشق کی راہوں میں تیرے ساتھ چل سکتا نہیں!
اس طریقِ کارِ ہستی کو بدل سکتا نہیں!
واسطے تیرے کفِ افسوس مل سکتا نہیں!

باز آ! میری محبت کے جنونِ خام سے!!
دیکھ! دامن کو بچا لے تلخیٔ انجام سے!!

میرے انہدِ حقیقت پر نہ کر اتنا ملال!
سچ تو یہ ہے میرا پا لینا ہے اک امرِ محال!
ہو سکے تو چھوڑ دے [illegible] خیال!

باز آ! میری محبت کے جنونِ خام سے!!
دیکھ دامن کو بچا لے تلخیٔ انجام سے!!

صہبا لکھنوی

غلام کا خواب

(ایچ۔ ڈبلیو لانگ فیلو کی نظم "دی سلیوز ڈریم" کا آزاد ترجمہ)

دھان کے اک لہلہاتے کھیت میں بیٹھا ہوا اک غلام بے نوا تھا فصل اپنی کاٹتا
ہاتھ میں اس کے درانتی تھی گریباں چاک تھا بال تھے بکھرے ہوئے اور تھا پسینہ بہہ رہا
لوریاں دیتی تھی گو، دشت و بیاباں کی ہوا خواب راحت کا مزا لینا مگر ممکن نہ تھا
تھا جوانی کا نشہ اور اس پہ محنت کا اثر کھیت کی ٹھنڈی ہوا میں سو گیا وہ بے خبر
خواب میں وہ دیکھتا ہے اپنی پچھلی زندگی جس کو اس نے اس غلامی میں بسر کی ہی نہ تھی
خود کو آزادی میں جب پانے لگا وہ نوجواں آنکھ سے اس کے خوشی کے ہو گئے آنسو رواں
دیکھتا ہے خواب میں اپنے وطن کا وہ سماں جب کہ وہ تھا اس جگہ کا ایک اعلیٰ حکمراں
دشت میں بہتا ہے دریا تیز رفتاری کے ساتھ اور صنوبر کے شجر بہر ادب باندھے ہیں ہاتھ
گیت گاتی تھی ہوا اور رقص میں تھا آسماں
دل بھر آیا آنکھ سے اس کی ہوئے آنسو رواں

ایسے میں آ کر لیے بیوی نے شوہر کے قدم دیکھتے ہی ننھے بچوں کو مٹا سب رنج و غم
مسکرا کر کھیلتے تھے گود میں لخت جگر باپ نے لپٹا لیا سینہ سے ان کو دوڑ کر
ساحل دریا پہ آہستہ رواں تھا کارواں
گیت گاتی تھی ہوا اور رقص میں تھا آسماں

سرخ بگلوں کی قطاریں اڑتی تھیں سوئے فلک یہ سلیمان زماں تھا سایہ گستر تھے فلک
ڈھل چکا تھا دن نمایاں شام کے آثار تھے ظلمت و نور آسماں پر برسر پیکار تھے
رات کی تاریکیوں میں جا رہا تھا اپنے گھر راستا معدوم تھا پھر بھی تھا وہ گرم سفر
دفعتاً آیا اسے اپنی غلامی کا خیال فکر میں ڈوبا ہوا تھا اور طبیعت تھی نڈھال
دیکھا دریا کی طرف جو تھا بیاباں میں رواں
گیت گاتی تھی ہوا اور رقص میں تھا آسماں

سارے جنگل سے صدائیں آ رہی تھیں پر اثر نغمے آزادی کے گاتے تھے طیور اور جانور
دیکھ کر یہ کہہ اٹھا کیا ایک میں ہی قید ہوں مجھ سے دیکھا جائے گا اپنا یہ احوال زبوں؟
دیکھ کر پھر مسرت میں کہا ہنستا ہوا "کیا کبھی میں چھوڑ سکتا ہوں یہ جنگل کی ہوا"
"کوئی مجھ کو اس جہاں میں قید کر سکتا نہیں اور یہاں میں بے بسی کی موت مر سکتا نہیں"
چل بسا سوئے فلک "وہ" چھوڑ کر خاکی جہاں
گیت گاتی تھی ہوا اور رقص میں تھا آسماں

مسعود الدین رفیع

عہد آفرین برقی پریس
روبرو معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد
آپ کی ہر قسم کی علمی خدمات انجام دے سکتا ہے۔ توقع ہے کہ
آپ اپنی جملہ علمی ضروریات کیلئے مطبع ہذا ہی کو خدمت گزاری
کا موقع عطا فرمائیں گے۔
دفتر وکالت سے متعلق جملہ مطبوعہ فارم ہمارے یہاں بکفایت ملسکتے ہیں
منکران خدا سے خطاب
بھی اقرار توحید کرا لیا۔ مولانا ابوالاعلیٰ
مودودی کے بلند پایہ مقدمہ نے اس کو
اور بھی گراں قدر بنا دیا ہے۔
قیمت ۹ آنے
محشرستان
جملہ حقوق

ٹوپی

ٹوپی ایران اور ترکستان سے ہندستان آئی اور یہاں اس کی اتنی قسمیں بن گئیں کہ کوئی یونیورسٹی اپنے شعبہ تحقیقات میں اس پر ریسرچ مقرر کرے تو تحقیق کرنیوالے کو تقریباً ڈیڑھ دو سال تک کد و کاوش کرنی پڑے گی، ابتداً ایک ٹوپی ترکستان سے آئی اور ایک ایران سے ان دونوں نے مل کر سینکڑوں قسمیں اختیار کیں، تر پوش، (یا طرپوش) کلاہ، چہار گوشہ، پپاق، ستری، ترکی، برکی، ہزاروں ٹوپیاں بنیں اور ختم ہوئیں۔ ایرانی انھیں "ترکان کج کلاہ" پر جان دیتے تھے اور ہندی شاعر بھی انھیں ——

دلی کے کجکلاہ لونڈوں نے کار عشاق تمام کیا!
کوئی عاشق نظر نہیں آتا ٹوپی والوں نے قتل عام کیا!

کہہ کر روتے رہتے، غدر دہلی کے بعد بھی سینکڑوں ٹوپیوں کے نمونے موجود تھے انگریزی حکومت نے آہستہ آہستہ ٹوپیوں پر اثر کیا اور ایک ایک کر کے ٹوپیاں غایب ہوتی گئیں بیسویں صدی عیسوی کے اوایل میں صرف چند ٹوپیاں رہ گئیں۔

ہمارے بچپن میں چکن، دو پلڑی، کپی، کنٹوپ، چوگوشہ، کشتی نما، ایرانی، ترکی، ٹوپیاں پھر بھی نظر آجاتی تھیں مگر آہستہ آہستہ یہ بھی غایب ہو گئیں اب صرف چند ٹوپیاں رہ گئیں اور بس۔

ترکی ٹوپی اس نام سے ابتداً استنبول سے بانات کی عمدہ ٹوپیاں آتی تھیں اس کے بعد ایطالیہ، جرمن، انگلستان اور جاپان نے بھی ایسی ٹوپیاں بھیجنی شروع کر دیں مگر نام وہی رہا، اس ٹوپی کو سارا ہندستان پہننے لگا سر سید نے مسلم یونیورسٹی کے یونیفارم میں داخل کر دیا، حیدر آباد دکن میں پولس کو بھی یہی ٹوپی دی گئی اور دوسرے محکموں جنگلات، "آبکاری" کروڑگیری وغیرہ کے خاکی ڈریس کے ساتھ یہی پہنے جانے لگی، سارا ہندستان اس کو بغیر قالب چڑھائے پہنتا یا اوڑھتا تھا مگر دکن میں قالب پر چڑھا کر اس کی قلب ماہیت ہو گئی اس قالب چڑھانے کو دکن میں "استری" کہتے ہیں۔ پہلے صرف اس خیال سے استری کی جاتی تھی کہ چندوا گول اور ہموار رہے بعد میں یار لوگوں نے اس میں گوند کا پانی دے کر اس کو سخت بنا دیا جس کی ولایتی وضع بن گئی اور "کرسٹی" نام پڑا، اس کرسٹی کے استر میں تبدیلی کر کے چندوے کو ذرا چھوٹا کر دیا اور دیوار لمبی کر کے مصر والوں نے "مصری ٹوپی" بنا دیا جو دیکھتے دیکھتے ہندستان بھر میں چل گئی (اعتراض کی سند نہیں جب جوتا چلتا ہے تو ٹوپی کیوں نہ چلے؟ سنیے حضرت اکبر فرماتے ہیں ؎

بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اک مضمون لکھا!
ملک میں مضموں نہ پھیلا اور جوتا چل گیا!

اس کرسٹی، مصری اور ترکی کے دوش بدوش ایک اور ٹوپی نے بھی بڑی ہمہ گیری اختیار کی یہ "جینا ٹوپی" ہے جو دراصل قدیم فوجی ٹوپی کی سی ہے، اب جو گرانی بڑھی اور کرسٹی مصری اور ترکی ٹوپی بہت گراں بلکہ گراں ترین ہو گئی تو لوگوں نے دو ہی ٹوپیاں زیادہ پسند کیں ایک "جینا ٹوپی" اور دوسری "گاندھی ٹوپی" "گاندھی ٹوپی" بڑی کم خرچ اور سستی ہے بعض لوگوں نے جو جینا یا گاندھی کی ٹوپیوں سے متفق نہ تھے بعض نئی وضع کی ٹوپیاں بھی پہننی یا اوڑھنی شروع کیں، ایرانی ٹوپی کو ذرا بدل کر نواب معین الدولہ اور سالار جنگ بہادر نے گول وضع کی چھوٹی دیوار کی ٹوپی بنوائی تھی جس کو سالار جنگ بہادر اب بھی کبھی کبھی استعمال کرتے ہیں مگر نواب معین الدولہ نے انتقال تک وہی ٹوپی استعمال کی، اب اس ٹوپی کا استعمال حیدر آباد میں بڑھ رہا ہے، نواب صاحب رامپور نے رامپوری کشتی نما ٹوپی میں ذری سی تبدیلی فرما کر جو مروج کیا ہے "جو ایجاد تھی" اب رامپوری اور مروج کیا ہے یہ دونوں ٹوپیاں زیادہ استعمال ہو رہی ہیں مگر یہ دونوں ٹوپیاں [illegible]

شیریں

سرحدی لوگوں کی زندگی بھی عجیب ہے ۔ آج یہاں کل کہیں اور ۔ گویا یہ بھی خانہ بدوشوں کی ایک قسم ہے ۔ چند روز ہوئے کہ ان لوگوں کی ایک جماعت ہمارے شہر کے اسٹیشن سے قریب ایک وسیع میدان میں اتری تھی ۔ میدان میں دس پندرہ راوٹیاں لگی ہیں، ان میں بچے، جوان، بوڑھے مرد، عورت سبھی ہیں جو اونچے پورے اور تندرست ہیں ۔ مرد زیادہ تر پنجابی طرز کے تہبند باندھے اور قمیاں پہنے ہوئے ہیں ۔ عورتوں کے گہرے رنگ کے گھاگرے اور ڈھیلے ڈھالے کرتے ہیں ۔ انھوں نے سر پر اوڑھنے، لال لال کسادے بھی باندھے ہیں ۔ یہاں بکریاں بندھی ہیں، وہاں مرغیاں پلی ہیں ۔ یہاں وہاں دو ایک تازی کتے بھی سو رہے ہیں ۔ ادھر کچھ ننھے بچے چلاتے بھاگتے پھرتے ہیں، ادھر کچھ مرد، عورت ہنستے بولتے تاش کھیل رہے ہیں ۔ ایک عورت نل سے پانی بھر کے لا رہی ہے ۔ دوسری بیٹھی کچھ پکا رہی ہے ۔ ایک بڑے میاں کے ہاتھ میں تیتر کا پنجرا ہے ۔ یہ اس جتھے کے سرغنہ ہیں ۔ آگے آگے یہ پیچھے پیچھے تیتر بولتا چلا آتا ہے ۔ چو طرف باتوں کا شور ہے ۔ کوئی ہندستانی بول رہا ہے، کوئی فارسی، کوئی پشتو ۔ یہ خانہ بدوش بھی عجیب لوگ ہوتے ہیں ۔ آج یہاں کل وہاں ۔ کل تک اس میدان میں کچھ نہ تھا ۔ آج ان کا بسرام ہے ۔ کل چلے جائیں گے ۔ نشان راہ چھوڑ جائیں گے !

کچھ دیر میں، یہ دیکھا کہ، ان ہی میں کے اور مرد عورت بھی آ رہے ہیں ۔ مردوں کے پاس حقہ ہے جس سے لمبے لمبے کش لیتے چلے آتے ہیں ۔ عورتوں کے شانوں پر تھیلے ہیں، ہاتھوں میں رانجس کے چھری؟ ... ہیں، انھیں ... کے

آ رہی ہیں ۔ آذوقہ ساتھ لا رہی ہیں ۔ آتے ہی ان میں سے ایک عورت نے واحد خان کہہ کر پکارا ۔ یہ شخص نوجوان تھا، کیکر کے درخت سے لگا بیٹھا تھا، عمر کوئی چوبیس پچیس ہوگی ۔ نظریں آسمان کی طرف تھیں، سگریٹ پیتے جاتا تھا، آسمان کو دیکھے جاتا تھا، جیسے کوئی باولا ہو ۔ آواز سن کر دوسری عورت نے کچھ کہا، اور وہ ذرا بگڑ کے کہا، تیسری کچھ اور بولی اور زیادہ بگڑ کے بولی ۔ یہیں تو تو، میں میں ہونے لگی ۔ پھر یہ عورتیں جھنجھلے جھنجھلے لڑنے لگیں ۔ ایک نے دوسری کی چوٹی پکڑ لی ۔ دوسری نے تیسری کا گریبان چاک کر دیا ۔ عورتیں لڑتی ہیں، مرد برا بھلا کہتے جاتے ہیں، انھیں چھڑانے جاتے ہیں ۔ اس لڑائی میں دو چار مرتبہ شیریں کا نام بھی سننے میں آیا ۔ پھر سن کے وہ آدمی جو کیکر سے لگا بیٹھا تھا، اٹھا، اور شیریں شیریں کے فلک شگاف، اور دلخراش نعرے لگاتا دوڑتے دوڑتے ان کی طرف آیا ۔ جھگڑا چکاتے ہوئے شیریں کا نام بار بار وہ اس طرح لے رہا تھا کہ سننے والے کا دل ہلا جاتا تھا ۔

بارے لڑائی ختم ہوئی اور میں سوچنے لگا کہ لڑتے میں جو انھوں نے شیریں کا نام بار بار لیا، تو گویا تو یہ لوگ ماہر آثار و تاریخ ہیں اور اس بات پر جھگڑ رہے ہیں کہ اگلے وقتوں کوئی شیریں تھی بھی کہ نہیں یا کوئی ماڈرن شیریں انھوں نے کھوج نکالی ہے جس پر وہ کسی وجہ سے لڑ رہے ہیں یا پھر وہ آدمی جو باولا سا ہے اور برشے وردیلے طور پر شیریں کا نام لے رہا ہے، خود کوئی ہیرو ہے اور شیریں اس کی ہیروئن ۔

(۲)

وہ ایک روز سے واحد خان کے پاس جا رہا ہوں، وہ سگریٹ بہت پیتا تھا اس لیے روزانہ گولڈ فلیک کا ایک ڈبا لے جاتا ۔ اگرچہ دو سال سے سگریٹ چھوڑ دیا تھا، مگر واحد خان سے ملاقات کی خاطر یہ شغل پھر سے شروع کر دیا ہے اور ایک آدھ سگریٹ ... پی ... لیتا ہوں